اشاعت خاص

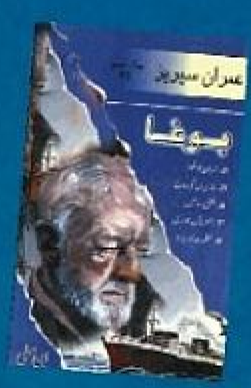
ماہنامہ

قومی زبان

کراچی

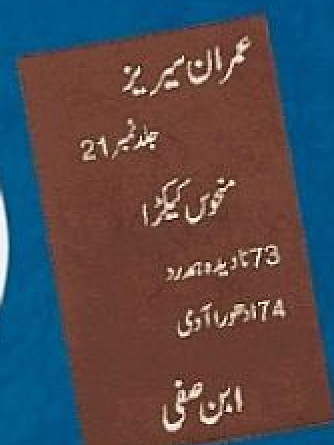
جولائی ۲۰۲۲





ابن صفی نمبر







انجمن ترقی اردو پاکستان

اشاعت خاص

ماہ نامہ کراچی

قومی زبان

جولائی ۲۰۲۲

جلد: ۹۴ — شمارہ: ۷



قیمت: ۷۵۰ روپے

ابن صفی نمبر

بانی: بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

جاری شدہ: ۱۹۴۸ء

فی پرچہ: ۱۵۰ روپے

سالانہ (صرف رجسٹری سے): ۲۰۰۰ روپے

(عام ڈاک سے): ۱۶۰۰ روپے

سالانہ (ہوائی ڈاک سے) ۵۰ پونڈ/۱۰۰ ڈالر

کتب و رسائل کی خریداری کے لیے منی آرڈر/بنک ڈرافٹ بنام
انجمن ترقی اردو پاکستان ارسال کیجیے۔

انجمن ترقی اُردو پاکستان

شعبۂ تحقیق و تالیف و تصنیف

اُردو باغ، ایس ٹی۔۱۰، بلاک ۱، گلستان جوہر، کراچی

رابطہ: ۰۲۱-۳۴۱۶۱۱۴۳ شعبۂ فروخت: ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳

atup.khi@gmail.com http://www.atup.org.pk

سید ایف ایچ عابد رضوی، مدیر منتظم نے انجمن ترقی اُردو پاکستان، اردو باغ، کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

فہرست

اداریہ

تجسّس اور ٹوہ لگانا انسان کی فطرت میں ہے۔ نامعلوم کو معلوم کرنا اسے اچھا لگتا ہے۔ اگر ہم گزشتہ صدیوں کی بات کریں تو اس میں بھی شہنشاہ، راجا، مہاراجا باقاعدہ جاسوسی کے لیے ہرکارے رکھا کرتے تھے جو دشمنوں کی اور پڑوسی ریاستوں کی معلومات اکٹھا کرنے اور ٹوہ لگانے پر مامور ہوا کرتے تھے۔ تحقیق و تفتیش کی مدد سے مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے، حقائق تک رسائی ہوتی ہے۔ جرائم بے نقاب ہوتے ہیں اور مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جاتا ہے۔ جب کوئی مصنف اپنی تحریروں میں انسانی رویوں کا ذکر کرتا ہے، ان کی عادات اور حرکات وسکنات کو زیرِ بحث لاتا ہے یا نفسیاتی الجھنیں بیان کرتا ہے تو اس کے پیچھے گہرا مشاہدہ اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جاسوسی یا سِرّی ادب لکھنے والا بھی قارئین کو ایک ایسے جہان میں لے جاتا ہے جہاں جرائم ہیں، تجسّس ہے، خفیہ مہمات ہیں، سراغ رسانی ہے، تفتیش ہے، پولیس ہے، انٹیلی جنس ہے، انڈر ورلڈ ہے، خیر وشر کے معرکے ہیں، پُراسراریت ہے اور ذہانت کا امتحان ہے جو اس دنیا میں چلا گیا، اس کا واپس آنا مشکل ہوتا ہے۔

جاسوسی ادب کا آغاز مغرب سے ہوا۔ مغربی ادیبوں میں خاص طور پر ایڈگر ایلن پو، سر آرتھر کانن ڈائل، اسٹینلے گارڈنر وغیرہ نے اس پر بہت کام کیا۔ انھیں جاسوسی کہانیوں سے متاثر ہوکر برصغیر میں اردو ناول نگاروں نے جاسوسی ادب کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ اس کی شروعات فیروز الدین مراد اور ظفر عمر نے کی۔ انھوں نے مغربی ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ لوگوں کو ایڈونچر سے لبریز ادب بہت پسند آیا اور اس کی پذیرائی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ اور قلم کار بھی اس میدان میں آنے لگے۔

شروع شروع میں یہی خیال کیا جاتا تھا کہ جاسوسی ادب کا معیار اتنا بلند نہیں ہے کہ اسے ادبِ عالیہ کا حصہ سمجھا جائے۔ ناقدینِ ادب جاسوسی ادب کو غیر سطحی اور عامیانہ سمجھتے تھے۔ شاید آغاز میں ایسا ہی رہا ہو لیکن جب ایک ادبی گھرانے کے چشم و چراغ اور ایک وسیع المطالعہ شخص نے اس میدان میں قدم رکھا تو جاسوسی ادب کے تخلیق کاروں کے متعلق رائے بدل کر رکھ دی۔ ان کی موضوعات پر گرفت جغرافیے پر عبور، سراغ رسانی کی باریکیوں سے آشنائی، جرائم اور مجرموں کی نفسیات سے آگاہی، تیکھے جملے، کاٹ دار طنز اور ایسا مزاح کہ زیرِ لب مسکراتے مسکراتے قاری قہقہے لگانے پر مجبور ہوجائے، سب سے بڑھ کر تحریر کا بانکپن وہ خوبیاں تھیں جو انھیں دوسرے لکھاریوں سے بہت آگے لے گئیں۔

ابنِ صفی کے قاری صرف ان کے ناول پڑھنے کے شوقین نہیں تھے بلکہ یہ ایک نشہ تھا جو انھیں عمران سیریز یا جاسوسی دنیا پڑھے بغیر چین نہیں لینے دیتا تھا۔ ایسی غیر معمولی شدت اور پسند بہت کم افراد کے حصے میں آتی ہے اور ابنِ صفی ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں

سے تھے۔ ان کی ایک اور انفرادیت ان کی دنیا کے مختلف ملکوں، شہروں، محلّوں اور ہوٹلوں کی معلومات تھیں، ایسا لگتا تھا وہ ان مقامات پر برسوں گزار چکے ہیں۔ وہ اپنے قاری کو مختلف جگہوں کی سیر کرا دیا کرتے تھے۔ بلاشبہ ابنِ صفی انتہائی ذہین شخص تھے جنھیں اپنے موضوعات پر مکمل دسترس تھی جو عام ڈگر سے ہٹ کر انوکھے ہوا کرتے تھے۔ ان کے ناول تفننِ طبع کے ساتھ مقصدیت لیے ہوئے ہوتے تھے۔ اپنے ناولوں کے ذریعے انھوں نے قارئین کی فکری سطح کو بلند کیا، انھیں حب الوطنی، قانون کا احترام اور اپنی معاشرتی قدروں سے محبت کرنے کا درس دیا۔

ابنِ صفی نے اپنے ناولوں کے ذریعے معاشرے کو سدھارنے کے لیے جاسوسی اور تفتیشی نوعیت کے ناول لکھے اور ان میں جرم کو ایک خرابی کی صورت میں پیش کیا۔ ایسا نہیں کیا کہ ناول پڑھ کر قاری مجرم کا دل دادہ ہوجائے اور جرائم کی طرف مائل ہوجائے۔ انھوں نے غیر محسوس طریقے سے معاشرے کی تربیت بھی کی۔ اور ایک ایسے زمانے میں جب تفریحی ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ لوگوں کی آمدنی زیادہ نہیں تھی، اس وقت اپنی خوب صورت اور دل کش تحریروں کے ذریعے قاری کا کتاب سے رشتہ استوار کیا اور ایک عہد کو متاثر کیا۔

ابنِ صفی پاکستان میں جاسوسی ادب کے ایسے محسنوں میں شمار ہوتے ہیں جن کی وجہ سے نوجوان اپنا وقت فضول سرگرمیوں میں ضائع کرنے کے بجائے کتاب کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کے ہوکر رہ گئے۔ انھوں نے بھی اپنے قاری کو کبھی مایوس نہیں کیا بلکہ اپنے اعلیٰ معیار کو ہمیشہ قائم رکھا۔ یقیناً یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کے ۴۲ برس بعد بھی قارئین ان کا نام سن کر مسکراتے ہوئے اپنی یادیں تازہ کرتے ہیں، اپنے پسندیدہ کرداروں علی عمران اور کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے مکالمے دہراتے ہیں اور ابنِ صفی سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی ایک تخلیق کار کی کامیابی ہے۔ اور ابنِ صفی ایسے ہی کامیاب ترین بلکہ خوش قسمت ترین ناول نگار ہیں جن کا ایک زمانہ پرستار ہے۔

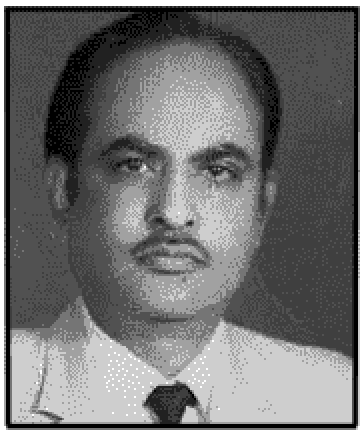
ابنِ صفی نمبر شائع کرنے کا مقصد اور اصل مطمحِ نظر بھی یہی ہے کہ ابنِ صفی سے محبت کرنے والوں کے علاوہ اردو کے وہ قارئین اور نوجوان جو ابھی تک ابنِ صفی سے مکمل طور پر واقف نہیں ہیں، ان کے لیے بھی ایک بھرپور معلوماتی اشاعت ہو جو ان کی تحریروں کا اچھی طرح احاطہ کرے۔

ہمیں خوشی ہے کہ الحمدللہ بڑی تعداد میں دنیا بھر سے مضامین موصول ہوئے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ صفی کے چاہنے والے دنیا بھر میں موجود ہیں اور ان کی تحریروں کی شگفتگی ان کے قارئین کے ذہنوں میں آج بھی تازہ ہے۔

اس مرتبہ ہم نے مختلف ممالک سے اردو دنیا کی نمایاں شخصیات کی ابنِ صفی اور جاسوسی ادب کے حوالے سے آرا بھی شاملِ اشاعت کی ہیں۔ ہم اپنے تمام قابلِ احترام قلمی معاونین کے تہِ دل سے شکرگزار ہیں کہ آپ سب نے اپنی مصروفیات میں سے ہمارے لیے وقت نکالا اور اپنی قیمتی تحریروں سے نوازا۔

(ی س ف)

طارق احمد ❁



ابنِ صفی ایک نظر میں

- نام ۔اصل نام اسرار احمد اور قلمی نام ابنِ صفی ہے۔
- پیدائش ۔۲۶ر جولائی ، ۱۹۲۸ء۔
- جائے پیدائش ۔نارا، الہٰ آباد، بھارتی ریاست یو پی۔
- والد کا نام ۔صفی اللہ۔
- والدہ کا نام ۔نضیرہ بی بی۔
- دادا کا نام ۔مولوی عبدالفتح۔
- ابتدائی تعلیم ۔آبائی علاقے ''نارا'' سے حاصل کی۔
- میٹرک ۔''ڈی، اے، وی اسکول'' الہٰ آباد سے کیا۔
- انٹرمیڈیٹ ۔''ایون کرسٹن کالج''، الہٰ آباد سے کیا۔
- پیشہ ۔اسکول ٹیچر، اُجن، مدھیا پردیس، بھارت۔
- قلمی سفر کا آغاز ۔ابنِ صفی نے پہلی کہانی ۷ سال میں عمر میں لکھی جو ہفتہ وار ''شاہد'' میں شایع ہوئی۔
- تحریری رنگ ۔ابنِ صفی نے ۸ سال کی عمر میں ''طلسمِ ہوشربا'' کا (مکمل ۸ جلدوں) مطالعہ کیا جو ان کی تخلیقی کام پر اثر انداز رہا۔
- شاعری کا آغاز ۔انھوں نے شعر گوئی کا آغاز ۸ سال کی عمر میں کیا، شاعری میں نکھار یونی ورسٹی کے دور میں پیدا ہوا۔
- تخلص ۔ابنِ صفی نے ''اسرار ناروی'' کے نام سے شاعری کی۔
- شعری اصناف ۔ان کی شاعری میں حمد، نعت، غزل، مرثیہ، منقبت اور نظمیں شامل ہیں۔
- یونی ورسٹی میں داخلہ ۔ابنِ صفی نے ۱۹۴۷ء میں الہٰ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر تقسیم ہند کے باعث مکمل نہ کر سکے۔
- پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا ۔ابنِ صفی ۱۹۴۸ء میں نکہت پبلی کیشن کے ''ایڈیٹر آف پوئٹری'' کے عہدے پر رہے۔
- ابنِ صفی بطور مضمون نگار ۔۱۹۴۸ء میں ''طغرل فرغان'' کے نام سے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔

❁ ریسرچ اسکالر، شعبۂ ابلاغِ عامہ، وفاقی اردو یونی ورسٹی، کراچی

- تعلیم۔ ۱۹۴۹ء میں آگرہ یونیورسٹی سے ''بیچلر آف آرٹس'' مکمل کیا۔
- ہجرت۔ اگست ۱۹۵۲ء میں ابن صفی ہجرت کرکے الٰہ آباد سے پاکستان آگئے اور تین سال بعد یہاں سے ''عمران سیریز'' کا آغاز کیا۔
- سکونت۔ کراچی کے علاقے لالوکھیت سی ون میں سکونت اختیار کی۔
- شادی۔ ۱۹۵۳ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔
- شریکِ حیات۔ ان کی شریک حیات کا نام ''امہ سلمہ خاتون'' تھا۔
- اولاد۔ ابنِ صفی کے ساتھ بچے تھے، چار بیٹے، تین بیٹیاں۔
- بیٹے۔ ابنِ صفی کے چار بیٹے داکٹر اسرار صفی، ابرار احمد صفی، ڈاکٹر احمد صفی، افتخار احمد صفی ہیں۔
- بیٹیاں۔ ابنِ صفی کی تین بیٹیاں نذہت افروز، ثروت اسرار اور محسنہ صفی ہیں۔
- ناول/سیریز۔ ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی دوسیریز ''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران'' ہیں۔
- جاسوسی ناول۔ ابن صفی کا پہلا جاسوسی ناول ''دلیر مجرم'' ۱۹۵۲ء میں ادارہ نکہت الٰہ آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔
- جاسوسی دنیا کے ناولوں کی تعداد۔ ناول ۱۲۵ ناول شایع ہوئے، اس کے مقبول کردار ''کرنل فریدی'' اور ''کیپٹن حمید'' تھے۔
- عمران سیریز کا آغاز۔ عمران سیریز ناول کا آغاز ۱۹۵۵ سے ہوا۔
- عمران سیریز کی کل تعداد۔ عمران سیریز کی کل تعداد ۱۲۰ ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ''عمران'' تھا۔
- ابنِ صفی ناولوں کی مجموعی تعداد۔ ابن صفی کے کل ناولوں کی تعداد ۲۴۵ ہے
- عمران سیریز کا پہلا ناول۔ پہلا ''خوف ناک عمارت'' تھا جو اگست ۱۹۵۵ء میں اے اینڈ ایچ پبلی کیشن کے زیرِ اہتمام کراچی سے اور دسمبر ۱۹۵۵ء میں ماہ نامہ ''نکہت'' کے زیرِ اہتمام الٰہ آباد سے شایع ہوا۔
- پبلی کیشن ہاؤس کا قیام۔ اکتوبر ۱۹۵۷ میں اسرار پبلی کیشن کی بنیاد لالوکھیت کراچی میں رکھی گئی۔
- پبلی کیشن ہاؤس کی منتقلی۔ ۱۹۵۸ء میں ناظم آباد رہائش اختیار کرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں فیروز کالونی، ناظم آباد دونمبر، کراچی منتقل ہوا۔
- اسرار پبلی کیشن کی پہلی اشاعت۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں جاسوسی ناول ''ٹھنڈی آگ'' پاکستان کراچی اور انڈیا الٰہ آباد سے شایع ہوا۔
- جاسوسی دنیا میگزین۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں ''جاسوسی دنیا میگزین'' کا آغاز ہوا۔
- جاسوسی دنیا میگزین کی اشاعت۔ اس میگزین کی محض ۴ اشاعت ہوئیں، خرابیِ صحت کے باعث جلد ہی اس کو بند کردیا گیا۔
- ناولوں کی اشاعت میں عارضی بندش۔ ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۳ء بیماری کے باعث ابنِ صفی نے کوئی ناول شایع نہیں کیا۔
- ''ڈیڑھ متوالے'' کی غیر معمولی مقبولیت۔ یہ ناول ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ عوامی مقبولیت کے باعث ۱۵ دنوں میں دوسرا ایڈیشن

شائع کرنا پڑا۔

- عمران سیریز پر فلم بندی۔ ۱۹۷۵ء میں ابن صفی کی عمران سیز یر ناول ''بے باکوں کی تلاش'' پر فلم ''دھاکہ'' بنی۔
- عمران سیریز پر ٹی وی ڈرامہ۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں عمران سیریز پر پی ٹی وی نے ڈرامہ بنایا جو سنسر کی پابندی کے باعث نشر نہیں کیا جا سکا۔
- عمران سیریز کا اختتام۔ ''آخری آدمی'' ابنِ صفی کا آخری ناول تھا جو ان صفی کی وفات کے بعد ۱۱/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو شائع ہوا۔
- علالت۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں ابن صفی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے۔
- وفات۔ ماہ رمضان ۱۲واں روزہ، بروز ہفتہ ۲۶/جولائی ۱۹۸۰ء کو اسرار احمد عرف ابنِ صفی دارِفانی سے کوچ کر گئے۔
- تدفین۔ اردو کے نامور جاسوسی ناول نگار ابنِ صفی پاپوش نگر، کراچی کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔
- تحقیقی مقالے۔ کام ابنِ صفی پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے ہیں۔

ڈاکٹر حسن منظر ٭

ابنِ صفی

جیسے کسی زبان کو اس کے عالم اور دانش ور نہیں، عام بولنے والے زندہ رکھتے ہیں، لکھی ہوئی زبان یعنی ادب جس میں ہر نوع کے فکشن کو شامل رکھنا چاہیے، زندگی کا دارومدار ''ٹھوس'' ادبی کتابوں، رسالوں پر نہیں ہے، اُن سستی تالیفات وتصنیفات پر ہے جنھیں سوسائٹی کا بڑا حصہ جگہ جگہ پڑھتا، اور پڑھوا کر سنتا نظر آتا ہے۔ بس میں، کارخانوں میں، گھر کے دالانوں میں جہاں کام سے لوگوں کو مہلت ملی ہو۔ ضروری نہیں کہ سننے والے کے ہاتھ بھی خالی ہوں۔ اگر ہاتھوں ہاتھوں پھرنے والی فکشن کی کتابوں اور پاپولر رسالوں کا مارکیٹ کسی بیرونِ اردو دنیا ملک کے کسی بڑے شہر میں نہیں ہے تو وہاں فیضؔ اور شمس الرحمٰن فاروقی بھی نہیں پہنچے ہوں گے۔ کسی بھی ادب (اردو) کے بازار میں ''پاپولر'' (عام) ''علمی'' کو لے جاتا ہے، اس کا الٹ نہیں ہوتا۔

ابنِ صفی کو جو زیادہ پڑھے لکھے ناک سکیڑ کر دیکھتے ہیں، یہ دیکھنا بھول جاتے ہیں کہ موصوف، تعلیمی قابلیت صرف گریجویٹ کے دم سے بک اسٹالز پر زندگی ہوتی تھی اور اُن سے اور اُن جیسوں سے، اب بھی ہوتی ہے— ''اندرسبھا'' اور ''آگ کا دریا'' سے نہیں۔

اس نکتے کو میں نے اس رُخ سے بھی دیکھا ہے: اردو کو بھارت میں سانس لیتا رکھنے میں بڑا ہاتھ اُن ہندو، سکھوں کا رہا ہے جو ۱۹۴۷ء کی رستاخیز سے پہلے پنجاب اور سرحدی صوبے میں بسے تھے، اردو جن کی مادری زبان نہیں تھی، لکھنے پڑھنے کی زبان تھی مگر ملک بدلتے ہوئے وہ اُسے پیچھے پھینک کر نہیں گئے۔ کام کی زبان تھی، ساتھ لیتے گئے۔ اردو کو اضافی زندگی بھارت میں انھوں نے دی یا اردو ''غزل''، ہندوستانی (اردو، ہندی) فلموں، لتا منگیشکر، مُکیش، انیل بسواس جیسوں نے شمشاد بیگم، محمد رفیع اور نوشاد علی خاں نے جو کیا اُس کی اُن سے توقع تھی۔

یہ کم اہمیت والوں کے اہم کردار ادا کرنے کی مثال ہے۔ ابنِ صفی کو بھی بڑے مستند ادیب، تنقید نگار، معیار تصنیف میں کم رتبہ دیتے ہیں، گو اہمیت کے لحاظ سے وہ مستند فکشن نگاروں سے اردو کی ترویج میں کسی حیثیت سے کسی سے کم نہیں— بھارت میں بھی، جسے وہ چھوڑ آئے تھے، جہاں لکھی اردو کا چاند اب بہ مشکل پہلی دوسری کیا، تیرھویں، چودھویں کو دیکھنے میں آتا ہے۔

جو بات میں کہنے جا رہا ہوں اس کی حمایت میں ایک سنا ہوا واقعہ ذہن میں آتا ہے: ایک دیسی صاحب جو 'ویسٹرن' گھرانے کے پلے بڑھے تھے جہاں کھانے کی میز تک گھر کے چھوٹے بڑے انگریزی میں بات کرتے ہیں، لندن سے قانون کی ڈگری لے کر آنے پر پریشان تھے کہ کورٹ کی زندگی سے کیسے نپٹوں؟ مقامی بولی ٹھیک سے آتی نہیں اور ان کے پاس آنے والے اردو سے بالا

٭ مکان نمبر ۱۰۹/۲، اسٹریٹ ۲۱، خیابانِ سحر، ڈی ایچ اے، کراچی۔ فون: ۰۳۴۵۔۲۱۳۴۰۰۳

نہیں: کیا مؤکل اور کیا اُسے لانے والا۔ ایک بزرگ نے کہا، ''بچپن میں جو تھوڑی بہت اردو پڑھی تھی، اس سے کام چلاؤ۔'' انھوں نے کہا، ''وہ اتنی نہیں کہ کورٹ کے کاغذات پڑھ سکوں اور مؤکل اتنی انگلش نہیں جانتا کہ اپنی بات سمجھا سکے۔''

بزرگ نے صورتِ حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا، ''جتنی اردو یاد ہے اس سے کام لے کر ابنِ صفی کے ناول پڑھ ڈالو۔ پیشہ ورانہ زندگی کے لائق اردو آجائے گی اور یہی ہوا ان ناولوں کو پڑھتے پڑھتے۔ شاید چند ہی ہفتوں میں کورٹ کی زبان بولنے لگے ہوں گے اور دو تین ماہ میں مؤکل کے مکالموں کا لکھنا بھی ان کی گرفت میں آگیا ہوگا اور بے چارے اقبال اور ابوالکلام آزاد کو پڑھنے کے مشوروں سے چُھوٹے کہ اصل اردو اُنھیں ان جیدّوں کے پائے کے ادیبوں کو پڑھ کر آئے گی، اس سے پہلے نہیں۔

تو یہ تھے ابنِ صفی۔ عوام کے فکشن نویس۔

یہ اردو تنقید نگار جہاں اور بہت کچھ اپنی ادبی کھوج میں بھول جاتے ہیں، اس حقیقت پر بھی ان کی نظر نہیں پڑتی ہے کہ موجودہ فکشن ریلوے انجن کی طرح کوئی ایجاد نہیں ہے جو وہ نہیں جانتے، اپنے اندر کیا قبول کرے گی، کیا نہیں۔ فکشن سنے ہوئے واقعات سے اپنی پہلی اسٹیج میں اور پھر آگے چل کر داستانوں سے بھری ہے۔ یہ قدرتی مظہر تھا۔ داستانیں اپنے دور کے رہن سہن سے پیدا ہوتی تھیں اور اس سے زیادہ اس سب کے تصور میں آنے سے جو انسان کی پہنچ میں نہ تھا۔ مثلاً، زر و جواہر سے آراستہ ہیرو، زر و جواہر کی زین اور لگام سے لدے پھندے آندھی رفتار گھوڑے پر سوار ولن کے تعاقب میں۔ مگر کہانیوں کا تخلیقی دماغ دیکھ رہا تھا زندگی میں اور بہت کچھ بھی ہے جسے داستان کی فکشن میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ ہر قسم کا جرم، قتل، ڈاکہ، کسی حویلی کے بارے میں مشہور ہونا کہ سحر زدہ ہے اور ان سب سے بڑھ کر اسی ماحول میں کسی ایسی ہستی کا بھی موجود ہونا جو ان واقعات کو جوں کا توں، سنسنی خیزیت، خوف، 'مارو اور چھپ جاؤ' تک محدود نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ جانتا تھا، ہر سحر زدہ کوٹھی کے پیچھے کسی کا کوئی ذاتی مقصد چھپا ہے۔

لکھے ہوئے ادب نے جب یورپ سے ہماری طرف رُخ کیا تو وہ مغربی سنسنی خیز، دہشت انگیز دولت کی چاہ کے پیچھے چھپے جرم کے ناول تھے۔ بڑی حد تک ترجمے، مشکل حصوں میں اُن میں مترجم کا اپنا اضافہ اور زوردار اشعار جو اضافہ در اضافہ ہوتے تھے۔ مثلاً ''تھک جائے گی جب عقل تو خود باز رہے گی۔'' ماسٹر تیرتھ رام فیروز پوری اور کتنے ہی دوسرے اردو ناولوں کے مترجم اس دور پر چھائے ہوئے ہیں۔ سر آرتھر کونن ڈوئل اور دوسروں کے نام پڑھنے والے پہچاننے لگے تھے اور محلہ لائبریریاں ان کے دم سے چل رہی تھیں— نئے اور ایک آنہ روز کرائے پر ملنے والے ناولوں کی دکانیں اپنی پہچان رکھتی تیں۔ ''آنہ'' ایک سکّہ ہوتا تھا جس میں دوسری جنگ مہیب (عظیم) تک میں تین تندرست کیلے خرید سکتا تھا۔ خود ابنِ صفی نے سر آرتھر کونن ڈوئل سے جو استفادہ کیا اس کی ایک بنیاد یہ تھی کہ ایک مسئلہ ہے، جرم ہو چکا ہے یا ہونے والا ہے۔ کیس ڈوئل کے جرائم کے سراغ رساں شرلاک ہومز کے پاس جاتا ہے۔ اور ہومز کے ایک ڈاکٹر دوست سے بھی کم و بیش ہمیشہ وہاں پڑھنے والے کی ملاقات ہوتی ہے۔ اس دوست کو ہومز آخیر میں سمجھاتا ہے، کیسے اس نے جرم کا معما حل کیا، گتھی کو کھولا۔ کونن ڈوئل کا طور تھا، سوسائٹی میں ہوتے رہنے والے ''خاموش'' یا ''مشہور'' جرائم میں پر شرلاک ہومز کی نظر کا رہنا خواہ اُسے حل کرنے کے لیے اُسے بلایا گیا ہو نہ بلایا گیا ہو، کیوں کہ وہ اور پڑھنے والا جانتا تھا، آخر کار اُسے بلایا جائے گا، معاملے (جرم) کو اپنی عقل سے حل کرنے اور مجرم کو پڑھنے والا بالآخر سلاخوں کے پیچھے دیکھے گا۔ کہانیوں کا یہ سلسلہ ''سیریز''

تھا۔ مرکزی کردار نہیں بدلتے تھے، کہانی بدل بدل جاتی تھی۔ ابنِ صفی نے بھی ''سیریز'' کو اپنایا لیکن باقی سب کچھ ان کا اپنا تھا۔

ابنِ صفی نے جاسوسی کہانی سنانے کے اس طور کو اپنایا— غصہ، چند جانے پہچانے کردار اور ان کے پیچھے کام کرنے والا ایک دماغ۔ اس کے علاوہ ابنِ صفی نے آرتھر کونن ڈوئل سے اور کچھ نہیں لیا۔ کہانی ان کی اپنی ہوتی تھی۔

ناول اور افسانوں کے اوّلین دور میں جب داستان سے فکشن کی مختلف شاخیں پھوٹی تھیں تو ناول اردو میں نظر آئے تھے جو مغربی اور ہمارے ادب کا میل تھے۔ ان میں ''رومانس''، ''تاریخی''، ''مذہبی'' اور شجاعت کے جذبات بھڑکانا مقصود ہوتا تھا۔ انھی میں جاسوسی اور سنسنی خیز فکشن اُبھری تھی اور ایک عرصے تک پڑھی جانے والی دنیا پر چھائی رہی۔ پھر جیسے وہ چراغ دھیما پڑتا گیا۔

جاسوسیت کی دنیا کی کمی کو پورا کیا ابنِ صفی نے— نئی طرح جاسوسی کہانی کا طریقہ ڈھونڈ کر ان کے ناول اس حد تک پڑھے جاتے تھے کہ عام گھرانوں میں دادا کے بعد پوتی منتظر رہتی تھی کب کتاب اس کے ہاتھ میں آئے گی اور اس کے بعد پوتا اور پھر ماں۔

اس کامیابی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کا ناول پورا گھر پڑھ سکتا تھا، اس کا مصنف کہانی پڑھنے والے، والی کی دل چسپی کو بڑھانے کے لیے انسان کے لطف اٹھانے کے اخلاق سے گرے عناصر استعمال نہیں کرتا تھا— نہ وحشیت کا عنصر اس کی تحریر کی جان ہوتا تھا۔

اس کی زبان عوام کی زبان تھی۔ صاف، رواں لیکن درست۔

ابنِ صفی کی یہ خدمت نہ صرف جاسوسی ادب کی تھی، بلکہ مکمل اردو دنیا میں اردو زبان کی بھی تھی۔ کس طرح ابنِ صفی اپنی تحریر میں کامیاب رہا، اور رہا بھی یا نہیں اس کا ایک ہی پیمانہ ہے: اُن کی کتابوں کا بار بار چھپنا۔ نجانے کتنوں کی قومی زبان پڑھنے کی صلاحیت ابنِ صفی کے ناول برقرار رکھ رہے ہوں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل ٭

ابنِ صفی — انفرادیت اور امتیاز

ہمارے معاشرے میں، دیگر تمام عالمی معاشروں کی طرح، مقبولِ عام ادب (Popular literature) تخلیق کرنے اور اس سے لطف اٹھانے والوں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ ایسے ہی تخلیق کاروں میں اردو زبان وادب میں ایک ابن صفی بھی تھے جن کی عوامی مقبولیت بھی اپنے عہد میں ایک مثال رہی ہے۔ اسی مقبولیت کا مظہر تھا کہ جب سے ابن صفی نے لکھنا شروع کیا وہ اردو ناول نگاری کا یوں بھی ایک مثالی دور تھا اور ناول لکھنے والے اور ان کی لکھی ہوئی اس وقت کی ناولوں کا اگر شمار کرنا یا اندازہ لگانا چاہیں تو آج یہ ممکن نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ اس دور میں شائع ہونے والی ناولوں کی اگر کتابیات مرتب کرنے کی بڑی سے بڑی اور اہتمام سے کی جانے والی کوشش بھی ہو تو شاید یہ منصوبہ پورا نہ کر سکے۔ لیکن یہی دور اردو میں عمدہ وفنی ناول نگاری کا بھی دور تھا جب ممتاز ناول نگاروں نے اردو ادب کو بہترین اور لازوال ناولیں دیں جو ہمیشہ ادبی تاریخ میں شمار میں آتی رہیں گی لیکن یہی دور عوامی ادب کی تخلیق کے لحاظ سے بھی ایک مقبولِ عام لیکن تجرباتی دور بھی تھا جب اردو میں مقبول عوامی ادب بھی جنم لے رہا تھا اور ناولوں کی صنف میں متعدد ناول نگار بھی اپنے اپنے فن کے ساتھ وارد ہونے لگے تھے، جن میں اگرچہ متعینہ اور مسلمہ فن تو نہ تھا لیکن اسی کی خام کوششیں ضرور تھیں۔ یہ مصنف اگر فن کے معیار کو چھو نہ سکتے تھے لیکن بہترین اور معروف ومقبول ناولوں کو اپنے سامنے رکھ کر ان کی پیروی کی اپنی سی کوشش کر لیتے تھے۔

ایسی ہی کوششوں میں معیادی ناولوں کی ایک روایت بھی چلنے لگی جو حد درجے مقبولِ عام بھی ہوئی، یعنی ماہانہ ناول کہ کوئی ادارہ، بالعموم ناشرین، ہر ماہ کسی مقبول و پسندیدہ مصنف سے ناولیں لکھوانے اور شائع کرنے کا ایک کامیاب سلسلہ شروع اور جاری کرنے میں کامیابی حاصل کرتے رہے اور یہ روایت عام بھی ہوگئی اور اولاً خصوصاً ہندوستان کے شہر الٰہ آباد میں اہتمام سے وجود میں آئی اور عام ہوئی۔

اسی روایت میں ابن صفی کا نام خاصا نمایاں ہوا جنھوں نے اس روایت میں اپنے قیام الٰہ باد کے عرصے میں ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور اس حد تک کامیابی اور مقبولیت حاصل کی کہ اسی کے ہو کر رہ گئے! اولاً انھوں نے ''جاسوسی دنیا'' کے سلسلے کے تحت ناولیں لکھنی شروع کیں اور سلسلے کی تخلیق میں اس قدر محو ہوئے کہ صرف یہ ایک سلسلہ انھیں اپنے تخلیقی اظہار کے لیے ناکافی لگا تو جلد ہی انھوں نے ایک دوسرا سلسلہ ''عمران سیریز'' بھی شروع کیا جو فنی لحاظ سے قدرے کرداروں کے فرق اور کہانی، پلاٹ اور واقعاتی مزاجوں کی تبدیلی کے ساتھ اپنے انداز میں مخصوص رہا اور یہ بھی خاصا پسند کیا جانے لگا۔

ابن صفی میں تخلیقی اُپج اس قدر تھی کہ ہر ماہ بالعموم دو ناولوں کی تخلیق جو ضخامت میں فی ناول سوسوا سو صفحات پر مشتمل ہوتی تھی،

٭ بی۔ ۲۱۵، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی۔

جب کہ ہر دو تین سال کے بعد ایک نسبتاً ضخیم ناول خاص نمبر کے طور پر پیش کرتے اور اس طرح پیش کرتے کہ اس پابندیِ وقت اور کثرتِ تخلیق میں ان کے فن اور اس کے متعینہ اوصاف وفضائل بھی متاثر نہ ہوتے اور قارئین کی دل چسپی و پسندیدگی میں بھی کوئی کمی نہ آتی۔

اس سے قطعِ نظر کہ ناول کا فن کیا ہے اور اسے کیا ہونا چاہیے اور کن خصوصیات سے وہ مرصع ہو، بس دل چسپی ایک ایسا وصف رہتا کہ کہانی، کردار نگاری اور تحیر وتجسس سب ہی ایک وصف پر مرکوز رہتے، لیکن اسلوب سب پر بھاری رہتا۔ ابن صفی کے خاص اوصاف میں اسلوب سب سے نمایاں وصف رہا ہے اور مکالموں کی فنی خوبی، برجستگی و بے ساختگی اور ساتھ ہی زبان و بیان کی شگفتگی اور برمحل وموزوں الفاظ کا استعمال ابن صفی کی اضافی خوبیاں ہوتیں کہ جو ابن صفی کے اسلوب کا امتیاز بنی رہتیں۔ مزاح و شگفتگی اور بذلہ سنجی مکالموں میں اگر در آتے تو اسلوب کا حسن بڑھاتے اور قارئین کے لیے مزید دل چسپی کا سبب بنتے۔

کردار نگاری میں بھی ابن صفی نے اپنا خوب خوب وصف دکھایا ہے اور بعض ایسے کردار بالخصوص فریدی اور عمران اپنی غیر مرئی قوتوں یا صلاحیتوں پر مبنی اپنی انفرادیت کے سبب قارئین کے لیے خاصی کشش کے حامل تھے۔ فریدی اور عمران جیسے مرکزی کرداروں کے ساتھ ساتھ حمید جیسے کردار بھی کسی انفرادیت سے زیادہ عمومیت کے اظہار میں بھی پرکشش رہے۔

کہانی کے لحاظ سے بھی ابن صفی نے وہ کہانیاں تخلیق کیں جنھیں ان کے قارئین بھلا نہیں پاتے تھے اور وہ بعد میں بھی ان کے لیے اپنے میں ایک کشش رکھتی تھیں۔ طور اطوار اگرچہ ان کا جاسوسی کہانیوں کی خصوصیات لیے ہوتا لیکن ان کے اسرار اور جرائم بھی ایسے ہوتے کہ جن میں بے پناہ پُراسراریت قارئین کو گھیرے رہتی اور تا دمِ آخر قارئین کہانی اور کردار سے جڑے رہتے۔

اس طرح مقبول عام ادب کے قارئین کی دل چسپیوں کا سارا سامان ابن صفی اپنی ناولوں: جاسوسی دنیا اور عمران سیریز میں سموئے رکھتے تھے جو ایک مثالی مقبولیت اور شہرت پر منتج ہوتی رہی۔ ان ناولوں کی تخلیق کے لیے ایک بہت مناسب ماحول یہ بھی تھا کہ یہ دور ماہانہ ناول نگاری کی سیریز کی کامیابی کا دور تھا اور جسے ہر گلی کوچے میں اس وقت نمودار ہونے والی ایک آنہ لائبریری کا بھی بڑا دخل رہا۔ مجھے یاد ہے کہ مقررہ تاریخ کے آس پاس ایک آنہ لائبریری کے مستقل قارئین لائبریری کے چکر لگا کر اپنی پسندیدہ سیریز کے ناول کا انتظار کرتے رہتے۔ اسی ایک آنہ لائبریری میں معروف و ممتاز لکھنے والوں کی مشہور مشہور ناولیں بھی دستیاب رہتیں بل کہ عبدالحلیم شرر، نسیم حجازی، پریم چند، رئیس احمد جعفری، قیسی رامپوری، جیسے سارے ہی اس وقت کے مصنّفین کی کتابیں جو زیادہ تر ناولیں ہوا کرتی تھیں، لیکن مذہبیات سے متعلق کتابیں بھی دستیاب رہتیں۔ راقم الحروف نے اپنے پرائمری اسکول کے زمانے میں ان ہی ایک آنہ لائبریریوں سے روزانہ ہی فیض اٹھایا اور اسی دور میں اردو کا شاہکار افسانوی ادب بھی گھول کر پی لیا تھا اور خاطر خواہ فائدے حاصل کیے تھے۔ ابن صفی کی ساری ہی ناولیں ان ہی ایک آنہ لائبریوں کے فیض سے پڑھنے کا موقع ملا تھا جو ہر ماہ پابندی سے مل جایا کرتی تھیں جب کہ اگر خریدنا چاہیں تو ایک ناول صرف دس آنے قیمت پر اخبار فروشوں کے پاس مل جاتی تھی۔

اسی زمانے میں ابن صفی کو پڑھتے ہوئے، جو میرا ابتدائی تعلیمی دور تھا، میں نے اس وقت دو باتیں ایسی اخذ کیں جنھوں نے مجھے بعد کی تعلیمی اور علمی زندگی میں بے حد فائدے پہنچائے۔ ان میں سے ایک یہ کہ میں نے دیکھا کہ ابن صفی اپنے اسلوب میں اردو زبان بہت صاف ستھری وہ استعمال کرتے رہے جو نہایت سلیس و رواں ہوتی تھی اور اس میں ایک خوبی اس کی یہ بھی بہت نمایاں تھی کہ ابن

صفی عمومی رواج کے باوجود انگریزی الفاظ سے خاصا پرہیز کرتے تھے اور کہیں کبھی غیر ضروری طور پر کوئی انگریزی لفظ استعمال نہ کرتے تھے جو ان کی بڑی خوبی تھی۔ اور دوسرے ایک یہ بھی خوبی میں نے ان میں دیکھی کہ شاید اپنی عادت کے مطابق یا ارادتاً اپنے قارئین یا نئی نسل کی تربیت کی خاطر وہ اپنے مکالموں میں ایسے خیالات ونظریات بھی بیان کردیتے جو تعمیری یا تدریسی مقصد کی حامل ہوتیں جیسے دورانِ گفتگو یا مکالموں میں جیسے اس وقت اشتراکیت یا ترقی پسندی کا ادب میں خاصا شور اور چرچا ہوا کرتا تھا لیکن ابن صفی ایسی ترقی پسندی کے قائل نہ تھے کہ جو غیر ملکی نظریات اور لامذہبی عقائد پر مبنی ہوتے تھے جو اگرچہ آج ہمارے معاشروں اور ساتھ ہی ادب سے بھی دور ہو گئے ہیں لیکن میں نے اسی زمانے میں ہر طرح کے ''ازم'' کے خلاف ابن صفی کے خیالات کو عام ہوتے اور بہ تاکید انھیں بیان کرتے ہوئے پایا جو میں سمجھتا ہوں کہ ابن صفی کا ایک بہت مفید رویہ تھا اور جس نے میری طرح نہ جانے کتنے ہی ناپختہ ذہنوں پر اپنے مثبت اثرات قائم کیے ہوں گے۔ بہرحال یہ ایسی چند صفات ہیں جو میں نے ابن صفی کے معاصرین کے مقابلے میں ابن صفی میں دیکھیں جنھیں میں سمجھتا ہوں کہ ان اوصاف کے سبب ابن صفی میں ایک تو انفرادیت خاصی تھی اور دوسرے اپنی ایسی صفات کے باعث انھیں اپنی قبیل کے معاصرین میں امتیاز بھی حاصل رہا۔

پروفیسر علی احمد فاطمی ٭

عوامی ادب کی شعریات — ابنِ صفی کے حوالے سے

اردو کے ممتاز تذکرہ نگار نواب مصطفیٰ علی خاں شیفتہ نے جب اپنا مشہور تذکرہ گلشنِ بے خار لکھا تو اس میں بعض معمولی شعرا کا تذکرہ تو کیا لیکن عوامی شاعر نظیر اکبرآبادی کا تذکرہ نہیں کیا۔ عقیدت مندانِ نظیر نے اعتراضات کیے اور جب براہ راست شیفتہ سے سوال کیا گیا تو جواب تھا کہ عوامی اور بازاری شاعر ہے اس کا ذکر کیا معنی۔ جواب میں شاگردانِ نظیر قطب الدین باطن نے گلستانِ بے خزاں جیسا تذکرہ لکھ ڈالا جن میں نظیر کا بڑھا چڑھا کر تذکرہ کیا گیا ہے۔ ایسے نجانے کتنے تذکرے، تجزیے ہیں جہاں ہم نے عوامی شاعری عوامی ادب جسے آج پاپولر لٹریچر کہا جا رہا ہے اس کو نظر انداز کیا۔ کچھ دنوں تک ہم نے پریم چند کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا کہ یلدرم، نیاز، مجنوں وغیرہ کے رومانی افسانوں کے گلابی ماحول میں جب پہلی بار گُڑ گوبر، دھول دھکڑ مفلسی غریبی کے مٹ میلے ماحول کی بات چھڑی تو اردو کا معیار پرست اور تعیش پسند قاری تلملا اُٹھا اُس نے فوراً الزام لگایا کہ پریم چند ہماری صدیوں کی رومان پرور داستانوی تہذیب کے پرخچے اڑا رہے ہیں ہمارے معیاری ادب کو غیر معیاری بنا رہے ہیں۔ وہ تو کہیے کہ پریم چند نثر میں قصہ کہانی لکھتے تھے کہ جس کی ہمارے یہاں قدیم روایت ہے اور بیسویں صدی کا آغاز ہو چکا تھا مغرب کے اثرات کی بھی آمد آمد تھی ورنہ ہم نے پریم چند کو بھی فراموش کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی تھی لہٰذا انھیں رویوں کی بنیاد پر پریم چند کے بیٹے اور ہندی کے ممتاز ادیب امرت رائے نے اپنی انگریزی کی متنازع کتاب *A House Divided* لکھی جس میں یہ تھیسیس قائم کی گئی کہ اردو زبان و ادب کا اپنا کوئی عوامی سرمایہ یا فوک لٹریچر نہیں ہے اس لیے اردو کوئی اوریجنل زبان ہی نہیں ہے کہ جس زبان کی اپنی عوامی۔ ثقافتی اور زمینی روایت نہ ہو، فوک لٹریچر کا سرمایہ نہ ہو، عوامی گیت نہ ہوں، وہ اہلِ زباں ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ ایک بڑا الزام تھا جس کے جوابات کم دیے گئے یا اُس وقت ہم دے سکنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ البتہ امرت رائے کے ہی بیٹے الوک رائے نے اپنی کتاب *Hindi Nationalism* میں اس کے تھوڑے بہت جواب دیے ہیں۔ آنجہانی گیان چند جین نے اپنی متنازع کتاب ایک بھاشا دو لکھاوٹ جان بوجھ کر امرت رائے کے نام منسوب کرتے ہوئے انھی خیالات کو آگے بڑھاتے ہوئے اور بھی بہت کچھ لکھ ڈالا تو ہنگامہ مچ گیا۔ جواب در جواب آئے لیکن وہاں معاملہ کچھ اور بھی تھا۔

نظیر اکبرآبادی کے انتقال (۱۸۳۰ء) کے ایک سو دس سال کے بعد ۱۹۴۰ء میں نیاز فتح پوری نے نگار کا نظیر اکبرآبادی نمبر شائع کیا لیکن اس طویل مدت تک نظیر اور عوام یا عوامی شاعری پر کوئی علمی یا تنقیدی بحث نہیں ہوئی جبکہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد

٭ سابق صدر، شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونی ورسٹی، الٰہ آباد، ہندوستان۔

سرسید، حالی، آزاد وغیرہ کی کوششوں نے فکر کے روّیے اور شعر و ادب کے دھارے بدل دیے۔ مقصدِ ادب، مقصدِ زندگی، اخلاق و اصلاح تعلیم وتربیت وغیرہ پر خوب خوب باتیں کی گئیں لیکن ایک خاص معنوں میں عوام کا لفظ بہر حال غائب رہا۔ نگار کے نظیر نمبر میں پہلی بار چند ترقی پسند نقّادوں نے نظیر پر مضامین لکھے تو اُن کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے۔ نظیر اکبرآبادی اور عوام از احتشام حسین۔ نظیر اور عوام از آل احمد سرور۔ نظیر کی شاعری میں جمہوریت کا آغاز از مجنوں گورکھپور وغیرہ۔ ان مقالات میں پہلی بار نظیر کے حوالے سے عوامی ادب عوامی شاعری کے مزاج و مذاق پر گفتگو کی گئی کہ ترقی پسند تنقید کا مطمحِ نظر ہی تھا ادب اور زندگی، ادب اور عوام کے رشتوں کو استحکام بخشنا۔ چناچہ یہ روایت آگے بڑھی اور تخلیق وتنقید دونوں سطح پر انقلابی مزاحمتی اور زمینی حقائق پر خوب خوب ادب لکھا گیا کہ ان دنوں پریم چند کے افسانوں اور جوش کی انقلابی نظموں کا طوطی بول رہا تھا اور شعر و ادب میں سجی ہوئی نرم و نازک عورت کے بجائے دھنیا، سکھدا، منّی جیسی معمولی اور میلی کچیلی عورت جگہ پانے لگی اسی طرح مردوں میں بھی گیسو مادھو، کالو بھنگی، منگو کوچوان جیسے معمولی کرداروں نے اپنی جگہ بنائی۔ شاعری میں بارجے اور چلمن سے نکل کر محبوب کھیت اور کھلیان میں پہنچ چکا تھا اور مجاز آنچل سے پرچم بنانے کی آواز دے رہے تھے اس آواز میں کچھ آزادی کے انقلابی ترانے بھی شامل ہو گئے۔ لیکن آزادی کے بعد بالعموم اور ۱۹۶۰ء کے بعد بالخصوص جب جدیدیت کا غلغلہ اُٹھا تو ایسے عوامی ادب کو خارجی، سماجی نعرے بازی اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر راندۂ درگاہ کرنے کی ناکام کوششیں کی گئیں اور ایسے عوامی ادب اور ترقی پسند ادب کے خلاف جدیدیت تنقید آزاد ہوگئی اور انجانے میں ہم نے عصبیت سے پُر اس آواز کو تقویت پہنچائی جو امرت رائے اور گیان چند جین جیسے ادیبوں کے ذہن میں سمائی ہوئی تھی۔ آج نظیر (جواب ایک علامت بن گئے ہیں) واحد عوامی شاعر ہیں جو عوامی ادب و شاعرں کی آبرو بنے ہوئے ہیں لیکن اسی نظیر کے بارے میں کبھی شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ کہا تھا:

> میں یہ بات شروع میں ہی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں نظیر کو بڑا شاعر نہیں مانتا۔ اچھا شاعر بھی نہیں سمجھتا۔ اچھی اور بڑی شاعری ان کے دائرے باہر ہے۔

مثالیں اور بھی ہیں جن کو پیش کرنے کا مقصد کسی بزرگ ومحترم ادیب کی تحقیر ہر گز نہیں ہے۔ عرض مُدعا یہ ہے کہ ترقی پسند دور میں ہم نے عوامی ادب کی جو طرف تھوڑی بہت توجہ دی تھی جدید ادیبوں نے طرح طرح سے اس کی نفی کی اور طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا لیکن ضرورت اور حقیقت تو سر چڑھ کر بولتی ہے۔ ماحول اور حالات کے جبر اور تقاضائے عصر نے پھر مجبور کر دیا کہ ہم عوامی ادب یا پاپولر لٹریچر (جس میں جاسوسی ادب بھی شامل ہے) پر نئے سرے سے غور کریں خاص طور پر ابن صفی جیسے مقبول عام ناول نگار کی خدمات کا ازسرِ نو جائزہ لیں۔

سنتے آئے ہیں کہ ادب میں کلاسک کا درجہ وہی پاتا ہے جو خواص اور عوام میں یکساں طور پر مقبول ہو۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلتا ہے کہ جو خواص میں یا صرف عوام میں مقبول ہو اور وہ کلاسک یا بڑا ادب تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اردو میں ناسخ۔ دبیر وغیرہ خواص میں ضرور پڑھے جاتے ہیں لیکن عوام میں مقبول نہیں اس لیے قادر الکلام شاعر ہوتے ہوئے بھی میر وغالب کی طرح کلاسک نہیں ہو سکے۔ غالب صرف اپنی مشکل پسندی کی وجہ سے عظیم نہیں ہوئے بلکہ ان کے بہت سارے اور مصرعے زبان زدِ خاص و عام ہیں مثلاً:

نیند کیوں رات بھی نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ مصرعے نہیں محاورے ہیں جو کم پڑھے لکھے لوگوں میں بھی مقبول ہیں۔ قبولیت کے معاملات عجیب وغریب ہوا کرتے ہیں۔ اسی صف میں کھڑے ہیں ابن صفی جن کی مقبولیت کا کیا کہنا۔ ان کے جاسوسی ناولوں نے دیوانگی، جنون، شوق کے تمام خواں طے کر لیے۔ راقم الحروف الٰہ آباد کا باشندہ ہے جہاں کے نکہت پبلیکیشنز سے یہ ناول شائع ہوتے تھے۔ کم عمری نوجوانی کے عالم میں ان ناولوں کی شہرت اور دیوانگی کا یہ ہیچمداں بھی گرفتار ہوا۔ والد ثقہ مجاز کے تھے۔ گھر میں ایسے ناولوں کا مطالعہ ممنوع تھا چناں چہ چھپ چھپ کر، لحاف کے اندر، رات میں چھت پر اور نہ جانے کہاں کہاں یہ ناول نہ صرف پڑھے جاتے بلکہ غیر معمولی طور پر پسند کیے جاتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ فرید، حمید، عمران جیسی حرکتیں کرنا، بولنا چالنا، جملے دُہرانا اس عہد کا فیشن ہو گیا۔ بہر حال ہزاروں کی تعداد میں یہ ناول شائع ہوتے۔ کثرت سے پڑھے جاتے اور خوب پسند کیے جاتے لیکن احتیاط سے رکھے نہیں جاتے۔ جبکہ نذیر احمد، شرر وغیرہ کے معاشرتی اور اصلاحی ناول آج بھی کتب خانوں میں ذاتی لائبریریوں میں محفوظ ہیں اور اسکولوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ خود میری ذاتی لائبریری کہ جس میں سیکڑوں کی تعداد میں ناول اور افسانوں کے مجموعے ہیں لیکن ابن صفی کا کوئی بھی ناول اب موجود نہیں ہے جب کہ میں نے انھیں ناولوں کو پڑھ کر فکشن کی قرات کے ادب وآداب سیکھے۔ ابن صفی کی مقبولیت پر اور بھی باتیں کی جاسکتی ہیں اور مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مقبولیت کے تعلق سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے دو جملے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ان دنوں کانپور بھی ہندوستان کے دوسرے تمام مرکزوں کی طرح ''ابن صفی وبا'' میں مبتلا تھا۔
> پاکستان آکر مجھے معلوم ہوا کہ یہاں بھی ابن صفی دور کا دورہ چل رہا ہے۔

اور یہ جملہ بھی:

> یوں ابن صفی نے جاسوسی ادب کی طرف سے لوگوں کا رُخ نہیں موڑا بلکہ ہندوستان میں اُردو کی بقا کے سلسلے میں بھی تاریخی کردار ادا کیا۔

اور یہ خیال صوفی صد دُرست ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ ادب میں کلاسک کا مقام وہی پاتا ہے جو خواص اور عوام دونوں میں یکساں مقام ومقبولیت رکھتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری ہوں یا اعجاز حُسین، ابوالخیر کشفی ہوں یا حسن عسکری دوسرے سنجیدہ ومعیاری ادیب یہ سب کہ سب ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی مقبولیت پر تو اظہار رائے کرتے ہیں لیکن ادب میں ان کے سنجیدہ مقام ومرتبہ پر خاموش سے رہتے ہیں اور یہ کہنے میں تکلف

بھی نہیں کرتے۔

بقول کشفی:

یہ درست ہے کہ کردار نویسی کے اعلیٰ معیار اور موضوع کی سنجیدگی کے بغیر جاسوسی ناول محض پیچیدہ اور تحیّر افزا پلاٹ کی بنا پر ادب کی بارگاہ میں جگہ نہیں بنا سکتا۔

کافی تعریف و تجسّس کے بعد مجنوں صاحب یہ کہنے پر مجبور ہیں......

لیکن چند کو چھوڑ کر ان کے (ابن صفی) ناول عام طور سے ہم کو تھکاتے نہیں بلکہ وقت گزاری کے لیے اچھا ذریعہ ہوتے ہیں۔

اور کشفی نے بھی کہا:

ان ناولوں کی رفاقت میں اچھا وقت گزارنے کا موقع ملتا ہے۔

خود ابن صفی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

بعض احباب کہتے ہیں مجھے مقصدی ادب پیش کرنا چاہیے میرا خیال ہے کہ تفریح بجائے خود ایک مقصد ہے۔ اسے بھی ایک مقصد فریضہ سمجھنا چاہیے۔

کچھ باتیں واضح ہو جانے کے باوجود یہ سوال ہنوز قائم ہے کہ یہ پاپولر ادب یا جاسوسی ادب سنجیدہ میعاری ادب کی صف میں کیوں نہیں کھڑا ہو پایا۔ اردو فکشن کے دورِ عروج میں ابن صفی کی لامحدود شہرت ہوتے ہوئے بھی کیوں محدود رہی جبکہ اُنھیں ذی علم حضرات ادیب و نقاد وغیرہ نے بھی پڑھا اور پسند کیا عمر اور فکر کے ارتقائی سفر میں ابن صفی زیادہ دور تک نہیں چل پاتے؟ کم سفری اور کم نظری کا یہ سفر مختصر اور محدود کیوں رہا؟ کیا اس کے پیچھے اردو کی وہی معیار پرست سوچ کام کرتی رہی ہے جس نے دیگر عوامی موضوعات کی طرح جاسوسی ادب کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھا۔ کیا اردو کی عشقیہ شاعری میں وہ خمار اور نشہ جو ادب کو صرف حُسن و جمال اور ہجر وصال تک محدود رکھتا ہے۔ کیا ادب یا ناول کا کثرت سے پڑھا جانا اور مقبول عام آنا اُس کے غیر معیاری ہونے کی دلیل ہے۔ سوالات اور ہیں جن کے اردو تہذیب اور اردو تنقید دونوں سے بار بار کیے جانے کی ضرورت کل بھی تھی اور ابن صفی کے حوالے سے بطور خاص آج بھی ہے۔ خود ابن صفی نے بھی ایک سوال قائم کیا تھا جب اُن سے کہا گیا تو وہ ادب کی بھی کچھ خدمت کریں تو اُن کا سوال تھا۔ ''میرے احباب کا اعلیٰ وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے؟'' (میں نے لکھنا کیسے شروع کیا) جواب نما یہ سوال بیحد اہم ہے لیکن اسی سے وابستہ ایک اور جواب بھی غور طلب ہے کہ جب مجنوں گورکھپوری جیسے سنجیدہ ادیب و ناقد نے ابن صفی سے سوال کیا کہ اردو کے جاسوسی ناولوں میں غیر فطری قسم کی دھما چوکڑی مار پیٹ کیوں ضروری ہے اردو کے جاسوسی ناولوں میں اس کی بھرمار ہے اور پڑھنے والوں کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ سُراغ رسانی تین چوتھائی پہلوانی اور دنگل ہے۔ میں نے ابن صفی سے سوال کیا کہ ایسا کیوں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ عوام یہی چاہتی ہے اور اس کے بغیر کتابوں کی اتنی مانگ نہ ہوگی جتنی کہ اس وقت ہے۔ میں چُپ رہا۔ اس لیے کہ اُن کا کہنا صحیح بھی تھا اور معیار سے الگ خالص سوداگری یا تجارتی نقطہ نظر سے یہ بات

صحیح ہے لیکن ایک لکھنے والے کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ عوام کی مانگ کو مدّنظر رکھتے ہوئے دھیرے دھیرے ان کی سطح شعور کو بلند کرتا رہے۔'' (اردو میں جاسوسی افسانہ)

لیکن یہ اُس وقت اور بھی ممکن نہیں ہوتا جب پاپولر ناول کو کمرشل ناول بھی بنانے کا منصوبہ چل رہا ہو۔ اس عمل میں ابن صفی بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے اور اس سے زیادہ اُس کے ساتھ ساتھ ناشر عبّاس حسینی راتوں رات مالا مال ہوئے۔ شہرت بھی ملی اور دولت بھی ......لیکن یہ بات بھی تو اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ ناول خواہ کتنا ہی دل چسپ اور پُرتجسّس کیوں نہ ہو ایک عمدہ ناول صرف دل چسپ قصّہ نہیں ہوتا بلکہ فلسفہ بھی ہوتا ہے۔ لارنس نے کہا تھا فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن نہیں ہوسکتا۔ تو کیا یہ جاسوسی ناول اسی لیے ادب عالیہ کا حصّہ نہیں بن سکے کہ ان میں فکر و فلسفہ کا فقدان تھا۔ حالاں کہ ابن صفی نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ حیات و کائنات کا کون سا ایسا فلسفہ ہے جیسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔'' لیکن مجنوں نے تو یہ کہا:

> میری نظر اور میری فکر ادب میں گہرائیاں ڈھونڈتی ہے اور یہ خصوصیت مجھے شرلک ہومز کے ناولوں میں بھی نہیں ملی۔

عام طور پر ابن صفی کے ناولوں کی پسندیدگی اور مقبولیت کی پہلی اور اہم وجہ اس کا دلکش بے مثال اسلوب قرار پاتی ہے اور یہ سچ بھی ہے حالاں کہ اسلوب کی تعریف وتہذیب بحث طلب ہے اور مواد سے اس کے رشتے غور طلب ہیں۔ تاہم زیادہ بحث میں پڑے بغیر یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ ابن صفی کے اسلوب میں جادو تھا اور اس کے مکالموں میں غیر معمولی دل چسپی اور شگفتگی۔ الہ آباد کے ہی ایک نستعلیق ادیب اعجاز حسین نے ایک جگہ لکھا ہے:

> آزادی کے بعد ناول خوانی کا ذوق جاسوسی دُنیا سے بہت وابستہ نظر آتا ہے ......ایسے ناولوں کی اشاعت قابلِ رشک ہے۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کے خاص نامہ نگار ابن صفی کی دلکش تحریر میں مضمر ہے۔

نئے ادیب اور ناول نگار خالد جاوید نے بھی ابن صفی پر عمدہ مضمون لکھتے ہوئے سب سے زیادہ اسلوب کی دلکشی کو اہمیت دی۔ فکر سے زیادہ فن کو اہمیت دیتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

> جو شے ابن صفی کی تحریروں کو ادبیت یا ادبی چاشنی بخشتی ہے وہ ان کی فارم ہے نامور روسی ہیبت پرست رومن جیکب سن کا خیال ہے کہ کسی بھی تحریر کو ادبی تب ہی کہا جاسکتا ہے جب اس میں ادبیت (Litertiness) پائی جاتی ہے۔ موضوع سے ہی کوئی فن پارہ بڑا یا ادبی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تحریر کی ادبیت ہی گویا سب سے اہم سے ہوتی ہے۔

حالاں کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں ......''عام ادب میں کردار اتنے پیچیدہ اور سلیقے نہیں ہوتے۔ ایسے ناولوں کی فضا میں کسی قسم کی بصیرت کا ہونا ممکن نہیں ہوتا۔'' بصیرت کے بغیر ادبیت کتنی دور چل سکے گی غور کرنے کی بات ہے اور یہ بھی کوئی فن پارہ محض اسلوب کی وجہ سے دور تک سفر کرسکے یہ بھی غور کرنے کی بات ہے ابن صفی کے حوالے سے خالد جاوید یہ بھی کہتے ہیں:

یہ تمثیل اور علامت نہیں ہیں۔ یہ سچے اور حقیقی بیانیہ پر مبنی ہیں اور حقیقت نگاری کی اس روایت کی بھی پاس داری کرتے نظر آتے ہیں جو ترقی ادیب کی دین تھی۔

یہ کئی طرح کے بیان اس لیے بھی سامنے آتے ہیں کہ ابن صفی نے جو جاسوسی ناول لکھے ان کی تخلیق کے سوتے دراصل کہیں اور سے برآمد ہوتے ہیں۔ ایک جگہ ابن صفی خود لکھتے ہیں:

> طلسم ہوش رُبا اور رایٹر ہیگیرڈ کے اثرات نے آپس میں گڈ مڈ ہو کر میرے لیے ایک عجیب سی ذہنی فضا مہیا کر دی تھی جس میں ہمہ وقت ڈوبا رہتا۔ ایسے ایسے خواب دیکھتا کہ بس۔

میرے عزیز شاگرد لئیق رضوی جوان دنوں ابن صفی پر خاصا کام کر رہے ہیں، ایک مضمون میں وہ لکھتے ہیں:

> ان کے ناولوں میں زندگی کی مکمّل تصویر نہ سہی لیکن اس میں رنگ نظر آتے ہیں ایسے زندہ رنگ جو شعور کو متحرک کر دیں۔

یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارے یہاں عمدہ ناول کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ ناول صرف تصویر حیات نہیں ہوتا بلکہ تعبیرِ حیات بھی ہوتا ہے اب تو تنقید حیات بھی جہاں صرف رنگ دکھانے سے کام نہیں چلتا بلکہ زنگ بھی دیکھنا اور دکھانا پڑتا ہے اور کبھی کبھی چُھڑانا بھی پڑتا ہے۔ ابن صفی کے ناول مزاج میں دلکشی ضرور پید کرتے ہیں لیکن شعور و وجدان کو تحریک کبھی کبھی ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کی وجہ اس کا منفرد قصّہ اس کا جاسوسی پلاٹ ہوسکتی ہے۔ فریدی کا ذہین کردار کیس کی گتھی ضرور سُلجھاتا ہے لیکن زندگی کی گتّھی سُلجھانا اُس کا کام نہیں شاید اس کی ذمے داری بھی نہیں کچھ لوگ ناول کی بھی ذمے داری نہیں مانتے اور نہ بصیرت پر یقین رکھتے ہیں کہ انھیں اس میں بھی نعرہ بازی کا گمان ہونے لگتا ہے لیکن ابن صفی کا ذہین دماغ اس عمل اور شعور عمل سے واقف ہے کہ وہ کوئی سماجی ناول نہیں بلکہ جاسوسی ناول لکھ رہا ہے اور جاسوسی ناول کے اپنے مخصوص رنگ اور تقاضے ہوا کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض مقامات اور مکالمات حیات اور کائنات کے تئیں معنی خیز اور فکر انگیز جملے ملتے ضرور ہیں لیکن شاید وہ حیات کے تئیں اتنے پروبنگ (probing) نہیں ہوتے جتنے کہ اُس قاتل یا قتل سے متعلق ہوتے ہیں۔ ان کے اکثر ناول قاتل کی تلاش میں زیادہ سرگرداں نظر آتے ہیں اسباب قتل پر کم۔ حالانکہ اس سرگردگی یا جاسوسی کا بھی اپنا الگ فن ہے۔ مجنوں یہ بھی کہتے ہیں:

> جاسوسی افسانے کا فن ایک اعتبار سے بہت مشکل ہے۔ اگر مجرم اور اس کے جرم کو بہت ادنیٰ اور معمولی بنا کر پیش کیا گیا تو اسی مناسبت سے سراغ رساں یا جاسوس کی بڑائی گھٹ جائے گی۔ مجرم کے پُرفتن اور خطرناک ہونے پر جاسوس کی عظمت کا دارومدار ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس میں آزمائش اور خطرہ یہ ہے کہ کہیں مجرم کا کردار جاسوس سے فائق اور اُس پر غالب نہ ہوجائے۔

یہ بات تسلیم کہ اس عمل اور فن میں انسانی معاشرت اور زندگی کی حقیقت اُس طرح کُھل کر سامنے نہیں آپاتی جو عام طور پر کسی عمدہ ناول کے عناصر قرار پاتے ہیں۔ فریدی بیحد پڑھا لکھا ہے کئی مضامین پر قدرت رکھتا ہے لیکن پھر کی اس کی امیج ایک سمارٹ اور ذہین جاسوس داں کی ہی بنتی ہے۔ اسی طرح حمید جو ذہین کے ساتھ کھلنڈرا ہے مسخرہ ہے خوب ہنساتا ہے لیکن اس کی حیثیت فانہ آزاد کے خو

جی کی نہیں بنتی اس لیے کہ خوجی کا کردار صرف ایک کردار نہیں بلکہ تاریخ وتہذیب کی علامت ہے۔ اور سرشار کی ایک ایسے مصنف کی جو اُس تہذیبی زوال کو اپنی نم آنکھوں سے دیکھ رہی تھے اور اسی نم آنکھوں کی چمک نئی تہذیب کا استقبال بھی کر رہی تھی۔ ان سب امور سے ناول کا کینوس بڑا ہوتا ہے اور مقصد و پیغام بھی۔ عمدہ سے عمدہ جاسوسی ناول میں اس امکان کی تلاش فضول ہے کہ جاسوسی ناول کے فن اور تقاضے ہی مختلف ہوا کرتے ہیں اور ناول سے ایک ہی قسم کا تقاضہ یا ایک ہی قسم کی تویف سبھی طرح کے ناولوں پر منطبق کر دی جائے یہ بھی مناسب نہیں۔ دراصل یہ بھی ہماری شعریات کی غلطی ہے کہ ہم نے ایک قسم کی شعریات سے تمام قسم کے ناولوں کی جانچ پرکھ کی اور غلط قسم کے نتیجے نکالتے رہے اور اس غیر اصولی وغیرہ تنقیدی عمل کا شکار ہوا عوامی ادب، جاسوسی ادب، ابن صفی اور دوسرے فن کار، یہ بالکل ایسے ہی ہوا جیسے غزل کی شعریات پر مرثیہ کی جانچ پرکھ ہو اور جب وہ شاعر اس معیار پر کھرا نہ اُترے تو اسے بگڑا شاعر کہہ دیا جائے۔ جیسے ہم نے عوامی شاعری، مزاجی شاعری، رزمیہ شاعری کی شعریات سے سب کو آنکتے اور جانچتے رہے اور نظیر جیسے بہترین عوامی شاعر کو بازاری شاعر کہتے رہے۔ اسی طرح ہم فکشن کی بھی ایک ہی قسم کی شعریات سے تمام قسم کے ناولوں کو جانچتے پرکھتے رہے۔ اور ہم بھول گئے کہ جیسے تاریخی ناول٫ رومانی اور سماجی ناول سے الگ ہوتے ہیں٫ اسی طرح جاسوسی ناول کی بھی ذمے داری اور فن کاری مختلف ہوا کرتی ہے اچھے سے اچھا جاسوسی ناول گئودان نہیں ہو سکتے اور گئودان کا بھی عمدہ جاسوسی ناول کا مقابلہ کرنا فضول ہوگا۔ جاسوسی ناول کا مقابلہ دیگر زبان کے جاسوسی ناولوں سے ہی کیا جا سکتا ہے اور ہم نے یہ نہیں کیا۔ ان کی عوامی مقبولیت اور افادیت پر غور نہیں کیا اور نہ ہی ابن صفی کے ان جملوں پر:

> میرا طریقہ ہمیشہ عام لوگوں سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لیے کیوں لکھوں یا میں اس انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔

آخری جملہ غور طلب ہے جو عوامی ادب کی شعریات کی کنجی ہے ہم نے ان پر غور نہیں کیا اور صرف اعلیٰ قسم کی کتابی تنقید کی طرف دیکھتے رہے اور یہ نہیں دیکھا کہ ایسے عوامی اور پاپولر ناولوں نے عوام کی سطح پر زبان و ادب کی شہرت عطا کرنے میں تاریخی اور غیر معمولی رول ادا کیا۔

اعجاز حسین نے جہاں ایک طرف یہ کہا کہ ایسے ناولوں میں تخیّل اور فن کی عظمت کے عناصر بہت کم ہیں،'' سوال یہ بھی ہے کہ جاسوسی ناولوں کے فن کا تصوّر کیا ہے اور وہاں تخیّل و وجدان کا کیا رول ہے؟ ۔لیکن اعجاز حسین نے پوری فراخ دلی اور دریا دلی کے ساتھ یہ اعتراف بھی کیا:

> ایک لحاظ سے ایسے ناول لکھنے والے قابلِ قدر ہیں کہ وہ اس طبقہ کو کتب بینی میں مصروف رکھتے ہیں جو شاید صحت مند ادب دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کرتا۔ ان ناولوں کو دیکھ کر اس کی معلومات، دل چسپی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے ایسے مصنّفین کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک مقصد

بھی ہوتا ہے جو عوامی تحریک کا معاون ہوتا ہے مثلاً جاسوسی دُنیا اپنے افسانوں میں عبارت و ادبیت کی خوبی کے علاوہ فاحشیت کے خلاف ہمیشہ جنگ کرتا رہا اپنے ناولوں میں ایسے عمور پیش کرتا رہتا ہے آمریت یا فاشیت پر شبہ پڑتی رہتی ہے۔ (اردو ادب آزادی کے بعد، ص ۲۶۰)

یہ عوامی ادب کیا ہے۔ اس کی مقبولیت اور پسندیدگی کے معیار کیا ہیں؟ اس کے جواب تلاش کیے جائیں تو جاسوسی ناولوں کی قدر و قیمت کا مسئلہ بھی حل ہوسکتا ہے۔ دراصل مسئلہ کتابی تنقیدی کا ہے یا پُرشکم معیار پرست تہذیب کا ورنہ مسئلہ نہ قارئین کا ہے نہ مصنف کا۔ ابن صفی تو بڑی سادگی، ایمانداری سے یہ اعتراف کرتے ہیں:

آپ مقام و قام کے چکّر چھوڑیے اور مجھے وہیں رہنے دیجیے جہاں میں ہوں اگر آپ کو میری کہانیاں پسند ہیں اور آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں آپ کے تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے معیاری تفریح مہیّا کر رہا ہوں تو میں اس پر مطمئن ہوں۔ (پیش لفظ تیسری ناگن)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

میں کچھ بھی پیش کر رہا ہوں اسے کسی بھی ادب سے کمتر نہیں سمجھتا۔ ہوسکتا ہے کہ میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملیں گی۔ ہر کتاب بار بار پڑھی جاتی ہے میں نے اپنے لیے ایسے میڈیم کا انتخاب کیا ہے کہ میرے افکار زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکیں۔ ہر طبقہ میں پڑھا جاؤں اور میں اس میں کامیاب ہوں۔ (الف لیلہ ڈائجسٹ جولائی ۷۲ء)

پہلے اقتباس میں ''معیاری تفریح'' اور دوسرے اقتباس میں ''ہر طبقہ'' کا لفظ غور طلب ہے اعلیٰ ادب کے اعلیٰ تصورات کے حوالے سے ان جملوں پر بحث ہوسکتی ہے لیکن عوامی ادب یا پاپولر ادب کے تصور میں تو اکثر یہی معیار کرار پاتے ہیں۔ قلم کے سنجیدہ و معیاری ادب تفریح سے بلند ہوتا ہے لیکن یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ تفریح کا تصور کیا ہے کہ ہر شخص کی تفریح کے معیار بھی الگ الگ ہوا کرتے ہیں ایک عمدہ اور بڑا ناول لکھنا بھی ایک رومانی اور وجدانی عمل ہے اور کیفیت و فرحت کے بغیر یہ عمل ممکن نہیں، اس لیے زیادہ غور طلب بات یہ ہے کہ ارتقائے حیات کا سفر عموماً دو عناصر پر ٹکا ہوا ہے تجسّس و تحیّر (اس کے بعد فکر و عمل) اور یہی دو بنیادی عناصر جاسوسی ناول کے بھی ہیں انھیں کے بطن سے خواب آرزو اور تمنائیں جنم لیتی ہیں جو اکثر فریب مسلسل میں مبتلا تو رکھتے ہیں لیکن زندگی کی ایک رومانی حقیقت یہ بھی ہے بقول شاعر۔ ''اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا'' آپ ہمہ وقت فکر و فلسفہ میں غرق نہیں رہ سکتے۔ آپ کی زندگی میں گلاب کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی زندگی سے بے تعلقی۔ بے گانگی بھی زندگی کا حصّہ ہی نہیں فلسفہ بن کر اُبھرتی ہے۔ اسی خواب و شکستِ خواب کی پرچھائیاں اکثر و بیشتر جاسوسی ناولوں میں ملتی ہے۔ ایک واقعہ، ایک پلاٹ کی شکل میں۔ یہ پرچھائیاں اگر فکر و فلسفہ کے ساتھ قرۃ العین حیدر کے یہاں ملتی ہیں تو بڑا ناول بن جاتا ہے اور واقعہ حادثہ کی شکل میں ابن صفی کے ناول میں ملتی ہیں تو وہ چھوٹا معمولی ناول قرار دیا جاتا ہے۔ مجھے یہ تسلم کرنے میں تامّل ہے کہ جاسوسی ناول کی پُراسراریت کا تعلق زندگی کی مسرت سے بالکل نہیں ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اس کے کوئی سماجی سروکار نہیں ہوتے۔ قتل ہوتا ہے تو بڑے جاسوسی ناول راست طور پر

قاتل کی تلاش کرتے ہیں تو بالواسطہ یا بلا واسطہ اسباب قتل پر روشنی پڑتی ہے۔ افراد و اقدار سبھی زد میں آتے ہیں ظاہر ہے کہ ایک جاسوسی ناول کی ہئیت اور فارم میں کرداروں کے دلت وعمل اور مکالمات کا انداز مختلف ہوتا ہے اس کی پیش کش بھی مختلف ہوتی ہے (لیکن زندگی سے سے مکمل طور پر کٹ نہیں سکتی) اور یہ سارے عناصر ابن صفی کے عمدہ ناولوں میں رواں دواں نظر آتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ابن صفی ناولوں پر قدغن لگانے کی بجائے جاسوسی ناول کے فکر وفن پر کھلی ہوئی گفتگو کی جائے۔ غیر جانب دارانہ انداز سے معروضی بحث چلائی جائے۔ جس دن یہ گفتگو کسی نتیجے پر پہنچ جائے گی ابن صفی کا مقام ازخود طے ہو جائے گا۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ادب میں ایسے معاملات اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتے کہ اس کے پس منظر میں خفیہ طور پر تہذیبی اقدار اور معاشرتی کردار کام کرتے ہیں۔ اور ایک پیچیدہ اجتماعی نفسیات بھی، خالد جاوید نے ایک اور اچھی بات لکھی ہے:

> ادب کے معاملے میں یہ سب کچھ گڈ مڈ کر کے سہل پسندی سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی طبقہ اشرافیہ نچلے درجے کے فن سے لطف اندوز نظر آتا ہے اور کبھی کبھی کبیر اور نظیر جیسے عوامی اور مقبول عام شاعروں کے نام ادب عالیہ میں بھی اپنے لیے ایک الگ اور ممتاز و منفرد مقام کا مطالبہ کرتے نظر آتے ہیں۔

بہر حال گفتگو جاری ہے۔ مباحثے مزاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ بیجا حمایت ہو مخالفت سلوک سگا ہو یا سوتیلا۔ ایک وقت آتا ہے جب وقت خود آئینہ دکھاتا ہے کہ کس طرح عوامی ادب نہایت خاموشی اور سلیقہ سے سنجیدہ ادب کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے اور سنجیدہ ادب کس خوب صورتی سے عوامی شہرت اختیار کر کے اُسی کا حصّہ بن جاتا ہے۔ ادب میں خواص وعوام کی یہ سرحدیں وہی لوگ زیادہ کھینچتے ہیں جو خود سرحدوں وطبقوں میں قید رہتے ہیں اور عام زندگی سے کٹ کر زندگانی کتب بنے رہتے ہیں۔ بڑا ادب خواہ وہ طبقہ اشرافیہ کا ہو یا عوامیؔ زیادہ دنوں تک سرحدوں میں تقسیم نہیں رہ سکتا۔ یہ انسانی فطرت ہی نہیں ادب کی سرشت کے بھی خلاف ہے اور تہذیب کے مشترک اقدار کے بھی حق میں نہیں ہے۔

خالد جاوید کا ایک اور اہم سوال:

> کیا پاپولر لٹریچر صرف اس لیے نکال باہر کیا جائے گا کہ عوام نے اسے پسند کیوں کیا؟ ترقی پسند افراد کو اس پر اور بھی زیادہ غور خوض کرنے کی ضرورت ہے۔

ادب کو بحیثیت مجموعی انسانی واجتماعی سرمایہ بننے کے لیے صرف ترقی پسندوں کو ہی نہیں ادب کے ہر سنجیدہ، ذی شعور قاری کو غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے کہ ادب کسی کا اور کسی قسم کا ہو وہ ہم سبھی اردو زبان وادب سے مُحبّت کرنے والوں کا تہذیبی ثقافتی سرمایہ ہے اور اس کے تحفّظ اور بقا کی ذمہّ داری کو تقسیم نہ کیجیے، ورنہ ہم پھر غیر ضروری نظریاتی اُلجھنوں میں گھر جائیں گے اور ان اُلجھنوں سے دور، بہت دور کھڑا ہمارا محبوب و مقبول فن کار (ابن صفی) پھر اپنی تلاش میں گم ہو جائے گا۔

ڈاکٹر طاہر مسعود ❁

ابنِ صفی — عظیم جاسوسی ناول نگار

کتاب پڑھنا ایک دل چسپ ترین مشغلہ ہے۔ یہ احساس جن ادیبوں کو لڑکپن میں پڑھ کر ہوا، ان میں سب سے نمایاں نام نسیم حجازی اور ابنِ صفی کے ہیں۔ نسیم حجازی تاریخی ناول نگار تھے تو ابنِ صفی جاسوسی ناول نگار۔ ایک کا تعلق مقصدی ادب کی تخلیق سے تھا تو دوسرے کا تفریحی ادب سے۔ ادب کی بھی بہت سی قسمیں ہیں جیسے رومانی ادب، کلاسیکی ادب، علامتی ادب اسی طرح مقصدی اور تفریحی ادب بھی ادب ہی کا حصہ ہیں۔ انھیں اعلیٰ ادبی معیارات سے فروتر پا کر دائرۂ ادب سے خارج کرنا انتہا پسندی ہے۔ ہر زمانے اور ہر زبان میں ایسا ادب لکھا جاتا رہا ہے بلکہ دیکھا جائے تو ایسے ادب کو پڑھنے والوں میں زیادہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی حاصل رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا دائرۂ اثر ایک مخصوص زمانے تک رہتا ہے اور پھر ان کی جگہ نئے ادیب لے لیتے ہیں۔ لیکن اس سے ایسے ادب اور ادیبوں کی اہمیت اور ضرورت کسی طرح بھی کم نہیں ہوتی۔ اعلیٰ ادب اپنے مطالعے کے لیے تربیت یافتہ ادبی ذہن کا تقاضا کرتا ہے۔ اور معاشرے میں ایسے اذہان بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اوسط اور اس سے کم درجے کا ذہن ایسے ادب کے مطالعے کی طرف مائل ہوتا ہے جو اُن میں رومان، شجاعت و بہادری، تجسّس و استعجاب جیسے جذبات جگا کر انھیں مسرت و اطمینان سے ہم کنار کرے۔ اس لحاظ سے نسیم حجازی اور ابنِ صفی نے اپنے قارئین کو جتنا متاثر کیا ہے اور جس طرح اُن کے اعصاب پہ چھائے رہے ہیں، اس کی کوئی اور مثال ہمارے ادب میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ابنِ صفی سے ایک مرتبہ پوچھا گیا تھا کہ آپ کو نقادانِ ادب تو ادیب تسلیم ہی نہیں کرتے۔ ابنِ صفی نے اس کا نہایت دل چسپ جواب دیا۔ کہنے لگے، ''ادب کے جو نقاد مجھے ادیب نہیں مانتے، ان کے تکیوں کے نیچے آپ کو میرے ہی ناول رکھے ملیں گے۔'' گویا جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے۔

ابنِ صفی نے جس زمانے میں جاسوسی ناول نگاری شروع کی، وہ معاشرتی اور سماجی لحاظ سے پُرسکون زمانہ تھا۔ آج جیسی افراتفری، انتشار اور ہاڑا ہوڑی جو نظر آتی ہے، ذرائع ابلاغ خصوصاً فیس بک، سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل میڈیا کا جیسا دباؤ ہماری اجتماعی نفسیات پر ہے، اس کا کوئی تصور تب نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس گنی چُنی تفریحات تھیں اور فرصت کے اوقات وافر طور پر میسر تھے۔ ایسے میں ابنِ صفی کے جاسوسی ناول کا مطالعہ اُن کی وقت گزاری کا بہترین ذریعہ تھا۔ ابنِ صفی بی اے تب پابندی سے ہر ماہ ایک جاسوسی ناول اپنے پڑھنے والوں کی نذر کرتے تھے۔ ان کے تخلیق کردہ کردار عمران، کرنل فریدی اور کیپٹن حمید قارئین میں ایسے مقبول اور انھیں ایسے ہر دل عزیز تھے جیسے وہ ان ہی کے خاندان کے فرد ہوں۔ ان کے ناول عمران کے کارناموں کی بابت ہوتے تھے یا پھر کرنل

❁ اپارٹمنٹ نمبر سی۔۱، بلڈنگ نمبر ۱۰۱، سیکٹر ایف، عسکری فیز ۵، ملیر کینٹ، کراچی۔ برقی پتا: ۰۳۰۰-۲۵۳۹۶۰۹

فریدی اور کیپٹن حمید کی مہم جوئی کے متعلق۔ ایک ناول میں ابنِ صفی نے ان تینوں کرداروں کو جمع کر دیا تھا جو پڑھنے والوں کے لیے دل چسپ اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔

ابنِ صفی سے پہلے بھی اردو میں جاسوسی ناول نگاری کی تھوڑی بہت مثالیں ملتی ہیں لیکن جاسوسی ناول نگاری کے مطالعے کو ایک مقبولِ عام رجحان بنا دینا ان ہی کا کارنامہ ہے۔ وہ اپنے ناولوں کا پلاٹ نہایت مہارت سے تیار کرتے تھے۔ واقعات میں قدم قدم پہ تجسّس، مہم جوئی، ناول کے ہیرو کے کمالات بھید بھرے رازوں کا افشا ہونا، جرائم کے محرکات کی تہ تک پہنچنا اور نہایت ذہانت سے مجرموں کی گروہ کو گرفت میں لے لینا، یہ سارے عناصر ناول کی پُراسرار فضا میں قاری کو حیران کر دینے اور ان کے جذبۂ تجسّس کو اپنے نکتۂ عروج تک پہنچانے کے لیے بہت کافی ہوتے تھے۔ ابنِ صفی کا خلاف ذہن، ان کی قوتِ متخیّلہ، زبان و بیان پر ان کی گرفت، منظرکشی اور مکالمہ نگاری۔ بے شک وہ ایک نابغۂ ادب تھے۔ جاننے والے بتاتے ہیں کہ ابنِ صفی اپنے کسی بھی ناول کو نکلنے سے پہلے باقاعدہ تحقیق کرتے تھے، جس ملک اور جن مقامات کو وہ اپنے ناول کا موضوع بناتے تھے، اس کے لیے وہ انسائیکلوپیڈیا، سفرنامے، تاریخ اور جغرافیے کی کتابیں غرض کہ جہاں جہاں سے اور جن جن مآخذات سے انھیں معلومات مل سکتی تھیں، وہ ان سب سے استفادہ کرتے تھے۔ اس کے لیے انھیں جتنی جاں کاہ محنت کرنی پڑتی تھی، وہ اتنی محنت اور تگ و دو کرتے تھے اور کسی سُستی اور کوتاہی کے مرتکب نہ ہوتے تھے۔ ان کی خاص و عام میں مقبولیت ہی تھی کہ ہمارے ادب میں جاسوسی ناول نگاری کا ایک باقاعدہ دور شروع ہوا۔ نئے نئے لکھنے والے سامنے آئے۔ ان میں بہت سے تو نقال تھے جو ابّن صفی اور نجمہ صفی کے ناموں کے ساتھ طلوع ہوئے اور پھر غروب بھی ہوگئے۔ ابنِ صفی کے مقام تک ان میں کوئی نہ پہنچ سکا۔ شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہمارے ادب میں گزرا ہو جس کے ناول کی اشاعت کا بے تابی سے انتظار کیا جاتا ہو اور اسٹال پر ناول کے پہنچتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا ہو۔

یہ بحث بھی اٹھائی جاتی ہے کہ جاسوسی ناول چوں کہ جرائم کے گرد گھومتے ہیں، اس لیے یہ معاشرے کی ذہنی صحت کے لیے مضر ہیں۔ جرائم اور قانون شکنی کا تعلق انسان کے مزاج اور اس کی فطرت سے ہے۔ انسان اس زمانے سے جرائم کرتا آرہا ہے جب ناول نویسی کی داغ بیل بھی نہ پڑی تھی۔ جرائم اور قانون کی آنکھ مچولی ہی نے جاسوسی ناول نگاری کی طرف لکھنے والوں کو راغب کیا۔ لہٰذا جاسوسی ناولوں میں جہاں مجرموں کی عیاری، سفاکی اور چال بازی کو موضوع بنایا جاتا ہے، وہیں یہ بھی دکھایا جاتا ہے کہ قانون کے محافظ کس ذہانت اور چالاکی کے ساتھ مجرموں تک پہنچ کر ان کی حقیقت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ابنِ صفی نے اپنے جاسوسی ناولوں میں یہی دکھایا ہے۔ لہٰذا ان کے پڑھنے والے ناول میں شر کی قوتوں سے متاثر نہیں ہوتے، وہ خیر کی قوتوں کا اثر قبول کرتے ہیں جس کے نمائندے عمران اور کرنل فریدی ہیں۔ چناں چہ کراچی یونی ورسٹی کے طلبہ یونین کی ادبی عدالت میں جب ابنِ صفی پر مقدمہ چلایا گیا اور وکیلِ استغاثہ نے اُس زمانے میں پی آئی اے کے ہائی جیکنگ کیس جس میں ایک ہائی جیکر نے طیارہ اغوا کرلیا تھا جسے پی آئی اے کے چیئرمین ایئر مارشل نور خان نے نہایت بہادری اور ذہانت سے ہائی جیکر سے مذاکرات کے دوران اس پر قابو پا کر طیارہ کو چھڑا لیا تھا، اس واقعے کا حوالہ دے کر ابنِ صفی سے پوچھا کہ ہائی جیکر نے طیارے کے اغوا کا ارادہ آپ ہی کے ایک ناول کو پڑھ کر کیا تھا۔ ابنِ صفی نے بے ساختہ جواب دیا کہ ’’ایئر مارشل نور خان نے کرنل فریدی بن کر ہائی جیکر کو قابو میں کرلیا۔ کیا آپ اس کی داد مجھے نہیں دیں گے۔‘‘

کہنے والے تو یہاں تک بتاتے ہیں کہ ابنِ صفی کے ناولوں میں جرائم کی پیچیدگیوں کو جس باریک بینی سے حل کیا جاتا اور مجرموں کا سراغ لگایا جاتا تھا کہ کراچی پولیس کے اعلیٰ افسران مشکل کیسوں کی تہ تک پہنچنے کے لیے ابنِ صفی سے مشورے اور رہنمائی کے لیے رابطے بھی کرتے رہے تھے۔ اور ایسا ہونا کوئی تعجب خیز امر نہیں۔ ناول بھی سماج کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس میں جو واقعات پیش آتے ہیں اور کرداروں کی جو فطرت سامنے آتی ہے، اسے حقیقت سے بعید نہیں کیا جاسکتا۔ ابنِ صفی نے جس طرح ناول لکھ لکھ کے ڈھیر لگا دیے، وہ ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا جاسوسی ناول نگار اب شاید ہمارے ادب کے نصیب میں نہ ہو۔ بے شک ہمارا ادب خوش قسمت ہے کہ اسے ابنِ صفی جیسا غیر معمولی ادیب میسر آیا۔ وقت آ گیا ہے کہ اس عظیم جاسوسی ناول نگار کی بازیافت ہو، اسے ازسرِ نو پڑھا جائے، اس کی عظمت کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ کیوں کہ اب کوئی ماں ایسے بے پناہ خالق کو جنم نہ دے سکے گی۔

مشتاق احمد قریشی ٭

عہد ساز فن کار

محترم ابن صفی صاحب کے قلم کا سفر غالباً ۱۹۵۱ء سے شروع ہوا تھا، شاید میں کچھ غلط لکھ گیا ہوں، دراصل سفر نہیں بلکہ ایک نئے عہد کی ابتدا ہوئی تھی، اب ابن صفی کسی شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عہد کا استعارہ بن چکا ہے۔ابن صفی نے جب قلم سنبھالا اس وقت لکھنے والوں یا ناول نگاروں کی ایک بھیڑ تھی جو بھیڑ چال چل رہی تھی، وہی لگے بندھے جملے، وہی لگے بندھے مکالمے، منظر نامے اور قاری کی دل چسپی کے لیے بے ہودہ اور فحش نگاری کی جا رہی تھی۔ یوں تو اردو ناول کی ابتدا کا سہرا ڈپٹی نذیر احمد کے سر جاتا ہے جو ان کے ناول ''مراۃ العروس سے شروع ہوتا ہے، اس کے بعد ایک طویل سلسلہ ہے جو منشی پریم چند تک پہنچتا ہے، ان کے بعد ہی ناول کے مزاج میں نمایاں تبدیلی آئی اور ناول اخلاق سوز ہوتا چلا گیا، اس دورِ پُرفتن میں ابن صفی نے ایک مجدد بن کر اپنے قلم کا علم بلند کیا، وہ اس میدان غلاظت میں اترے تاکہ معاشرے میں پھیلی ایک کریہہ الصورت رسم تحریر کو غلط اور غلیظ ثابت کر کے اس سے پڑھنے والوں کو نجات دلائی جا سکے، یقیناً یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا جسے انھوں نے نا صرف سچ ثابت کر دکھایا بلکہ لوگوں میں اردو پڑھنے اور سمجھنے کا شعور اور شوق بھی پیدا کیا، ہندوستان یعنی بھارت جہاں اردو دم توڑ رہی تھی کسی قریب المرگ مریض کی مانند ایڑیاں رگڑ رہی تھی کو ابن صفی کے قلم نے سہارا ہی نہیں دیا بلکہ نئی زندگی بھی دی، بھارت میں تمام پڑھے لکھے لوگوں نے، اشاعتی اداروں نے اردو نستعلیق کی جگہ دیوناگری رسم الخط اپنا لیا تھا، ابن صفی کے ناول اس اندھیری کال کوٹھڑی میں روشنی کی کرن بن کر سامنے آئے، ان کے جادو اثر قلم نے وہ کر دکھایا جو اس وقت کے جغادری لکھاری سوچتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔ابن صفی کے عہد ساز قلم نے نا صرف قارئین میں اردو ناول پڑھنے کا ذوق پیدا کیا بلکہ معاشرے سے قلم کی گندگی کا صفایا بھی کیا، اب ابن صفی کسی فرد واحد کا نام نہیں بلکہ ایک عہد ہے جو ان کے پڑھنے والوں کو قانون کی پاسداری، فحش لغویات سے دوری و اجتناب، بڑوں کی عزت و احترام کرنے کا سلیقہ، اپنے اردگرد کی سازشوں سے ہوشیار ہوتے ہوئے معاشرے کے سلگتے ناسوروں، جرائم پیشہ افراد سے نمٹنے اور اپنے اخلاق سے اپنے آپ کو سنبھالنے کا فن سکھاتا ہے۔ابن صفی نے معاشرے کے بگاڑ کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت سوچ سمجھ کر لوگوں کو قانون کا احترام کرنے اور ان کی سوچ و فکر کو تعمیری بنانے کا جو عزم کیا تھا اسے سچ کر دکھایا وہ اپنے اردگرد کے ہی نہیں بلکہ پورے معاشرے کو جرائم سے پاک کر کے صراط مستقیم پر چلنے والا بنانا چاہتے تھے انھوں نے اپنے ہم عصر لکھنے والوں کے خلاف جو غیر فطری رومانی قصے کہانیوں کے ذریعے نئی نسل کو اکسا رہے تھے بہکا رہے تھے ان کے مقابلے میں انھوں نے اردو ادب کے روایتی انداز سے ہٹ کر اپنی راہ الگ بنائی انھوں نے اپنی

٭ کراچی۔فون: ۰۳۳۴۔۸۲۶۴۲۴۲

تمام ہی کہانیاں پاک صاف ماحول اور فلاحی انداز کے ساتھ ساتھ آسان اور رواں اردو کے ذریعے لوگوں کو پڑھنے کی طرف راغب کیا انھوں نے اپنی شعوری کوشش سے اپنی کہانیوں میں کبھی کہیں بھی اردو کے ثقیل الفاظ استعمال نہیں کیے نہ انھیں اردو قابلیت کا کبھی بخار چڑھا انھوں نے اپنے تمام ناول خواص کے لیے نہیں عوام کے لیے لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کی دل چسپی نے اردو سے نابلد افراد کو بھی اردو پڑھنے پر مجبور کر دیا اس باعث ہی بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ ''اردو پر اس کا بڑا احسان ہے'' ان کے ناول ان کی تحریر کسی خاص حلقے یا طبقے کی پسند نہیں تھی بلکہ عام اردو پڑھنے والوں کے لیے انھوں نے لکھا ہے دراصل اگر بغور دیکھا جائے تو انھوں نے اپنی نثر میں شاعری کی ہے ان کے تمام ہی کردار چاہیے وہ مثبت ہو یا منفی ہر ایک کردار جامع اور پوری طرح واضح ہے ان کے جذبات بالکل فطری ان کی سوچ حقیقی نظر آتی ہے وہ ایک دور بین شخصیت کے مالک تھے وہ حال میں رہ کر مستقبل پر پوری نظر رکھتے تھے ابن صفی نے بہت سوچ سمجھ کر اپنے قلم کا اپنے علم کا استعمال کیا ہے انھوں نے ادب کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک کیا ہے اور صاف ستھرے ادب کی ریت ڈالی ہے ان کے چراغ کے آگے بڑے بڑے چراغ گل ہوگئے۔ یوں تو ابن صفی کی ادبی خدمات کو کوئی بھی تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھا یہ بات ہر اردو دان چاہے وہ نقاد ہو یا ادیب ہو شاعر ہو سب بخوبی جانتے سمجھتے ہیں کہ اردو کا بنیادی وصف اس کا رسم الخط کے ساتھ اس کا صوتی آہنگ ہے اور صوتی آہنگ تب ہی پیدا ہوتا ہے جب رسم الخط پختہ ہو ابن صفی صاحب نے اپنے پڑھنے والوں کو اپنے قلم کی گرفت میں اردو رسم الخط اور اس کے صوتی آہنگی سے ہی لیا ہے۔ ابن صفی کا ایک بڑا اہم وصف ان کی مستقبل بینی تھی جس نے اس وقت کے قاری کو تو حیران کیا تھا اور وہ پریشان بھی ہوا تھا کہ یہ شخص کیسی کیسی عجیب وغریب ایجادات اپنی تحریر کے زور پر لوگوں کو بتا رہا ہے دکھا رہا ہے لیکن اس کے بعد کی نسل اور اب موجودہ نسل بھی ان کی تحریر پڑھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ ابن صفی نے ان ایجادات کا ذکر کیا تھا جس کا اس وقت کہیں تصور تک نہیں تھا وہ سب آج حقیقت بن کر سامنے آچکی ہیں یا آرہی ہیں، یقیناً ان کی تحریریں انھیں اردو ادب کا عظیم ادیب قرار دینے کے لیے کافی ہیں، محترم ابن صفی نے جو بھی لکھا، جیسا بھی لکھا وہ اس بات کی گواہی ہے کہ انھوں نے خوب بہت خوب لکھا، آج ابن صفی کی پہلی تحریر کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن اس کا اثر آج بھی اسی طرح محسوس کیا جا رہا ہے جیسا کہ اس وقت جب وہ تحریر لکھی گئی تھی، ان کی تحریروں کا یہی حسن اور یہی خوبی ہے کہ وہ وقت کے گرداب میں کہیں گم نہیں ہوئیں، اس کے پڑھنے والے اب بھی اس سے اسی طرح محظوظ اور لطف اندوز ہو رہے ہیں، جو ابن صفی کے رجحان کا منہ بولتا ثبوت ہے، اسی رجحان نے اُن کے بے پناہ پیروکار پیدا کیے (میں نقال نہیں لکھ رہا) جنھوں نے ان کے کرداروں کے ساتھ جو بھی کیا جیسا بھی کیا وہ اپنی جگہ لیکن وہ تمام ہی لکھنے والے کچھ نہ کچھ لکھنے کی صلاحیت ضرور رکھتے تھے اس کے باوجود ابن صفی کے بنائے ہوئے دائرے سے باہر نہیں نکل سکے، بقول کئی لوگوں کے مکھی پہ مکھی مارنے کے باوجود وہ اپنے قلم کے جوہر اس طرح نہیں دکھا سکے جیسا کہ ابن صفی دکھا گئے کسی بھی لکھنے والے کی پیروی اس وقت ہی ممکن ہے جب نئے لکھنے والے اور شائع کرنے والے کو یہ یقین ہو کہ وہ اگر ابن صفی کی پیروی کرے گا تو ضرور پسند کیا جائے گا، کامیاب ہوجائے گا ورنہ ٹائیں ٹائیں فش ہو کر رہ جائے گا، اسی باعث ابن صفی صاحب کے پیروکاروں کے بھی پیروں کار سامنے آتے چلے گئے (یعنی نقال در نقال) یہی وجہ ہے کہ محترم ابن صفی کے کرداروں پر مختلف نام سے تشبیہ نام سے لکھنے والوں نے اب تک تقریباً تین ہزار

سے زائد ناول لکھے ہیں دنیا بھر میں یہ اعزاز کہوں گا کسی اور مصنف کو حاصل نہیں ہوسکا گو کہ ان تمام ہی اچھے برے لکھنے والوں نے اپنے اپنے طور پر خوب لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ابن صفی صاحب کے کسی طرح بھی مقابل آنے کے قابل ہی نہیں ہیں بقول ابن صفی صاحب کے اللہ نے کچھ لوگوں کا رزق ایسے ہی لکھا ہوا ہے وہ بے چارے بھی مجبور ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ یقیناً ابن صفی صاحب نے اپنے قلم کے جادو سے اردو دنیا کو خصوصاً ایک رجحان بخشا ہے، وہ ایک رجحان ساز شخصیت کے حامل تھے، اگر میں یوں کہوں کہ وہ جدید ناول کے مجدد تھے تو غلط نہ ہوگا، ناول کی جس جہت کو ڈپٹی نذیر احمد نے روشناس کیا تھا (پاکیزہ و بااخلاق) اسے ابن صفی نے ازسرنو نا صرف زندہ کیا ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لیے امر کردیا ہے۔ابن صفی کو قلم سنبھالے نصف صدی سے زیادہ تقریباً بہتر برس گزر چکے ہیں، ان کی تمام تحریریں آج بھی زندہ جاوید ہیں، وہ اسی طرح پر اثر اور دل چسپی لیے ہوئے ہیں جیسا کہ آج سے پچاس ساٹھ سال قبل دل چسپ تھیں، جبکہ ان کے تمام ہم عصر ناول نگار جنھوں نے بے پناہ لکھا صفحات کے صفحات سیاہ کیے ہوئے ہیں اپنے وقت کے بڑے بڑے اور اہم نام آج گمنام ہو چکے ہیں، اس بھیڑ کو چیر کر سامنے آنے والا اپنے قلم کو تیشہ بنا کر لکھنے والا آج بھی اسی طرح مقبول اور ہر دل عزیز ہے اور خوب پڑھا و سمجھا جا رہا ہے، اللہ ان کے پڑھنے والوں، ان کے چاہنے والوں، اور تمام محبانِ ابن صفی کو سلامت رکھے اور قدم قدم کامیابیوں سے ہمکنار کرے، آمین۔ابن صفی صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے پیچھے ان کے ہنر وفن کو سراہنا اور فرض کفایہ ادا کرنا بھی ہے ادب جو صدیوں کی بے اعتنائی بے مروتی کے باوجود محبان ابن صفی کی طرف سے محترم ابن صفی صاحب کے تعلق سے اب تک جتنا کام منظر عام پر آچکا ہے یقیناً اس کا عشرِ عشیر بھی کسی جغادری چوہدری کو حاصل نہیں ہوسکا ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں جب اردو ادب میں بلکہ دنیائے ادب میں ابن صفی صاحب کا نام کسی روشن چاند کی مانند چمک رہا ہوگا۔

قیصر عالم ٭

کچھ ابنِ صفی کے بارے میں

بعض مصنف صرف زبان کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل نہیں کر پاتے۔ مثلاً محمد حسن عسکری نے منٹو کے بارے میں لکھا ہے کہ اگر منٹو کو فرانسیسی جیسی ترقی یافتہ زبان میسرّ ہوتی تو وہ موپاساں کے پائے کا افسانہ نگار ہوتا۔ یہی کچھ ابنِ صفی کیساتھ ہے۔ اُن کے ناول چوں کہ ابھی تک انگریزی زبان میں ترجمہ نہیں ہوئے اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابنِ صفی نہ صرف اردو زبان بلکہ کسی بھی زبان کے ایک بڑے detective ناول نگار ہیں۔

میری ابنِ صفی سے ملاقات (پڑھنے کی حد تک) ۱۹۶۵ء میں شروع ہوتی ہے۔ میری والدہ (باجی) جو بہت پڑھی لکھی خاتون تھیں اور اُن کے پاس اسٹنلے گارڈنر، اگاتھا کرسٹی، جمیز ہیڈلے چیز اور آرتھر کانن ڈائل کے تمام ناول تھے۔ اس لیے میں فرنگی اسکول میں تعلیم پانے کی وجہ سے ۱۹۶۰ء تک ان تمام مصنفوں کے ناول پڑھ چکا تھا۔ پھر میری والدہ نے مجھے ابنِ صفی کا ایک ناول پڑھنے کے لیے دیا۔ اب یاد نہیں وہ کون سا ناول تھا۔ مجھے بہت اچھا لگا، خاص طور پر اُس کی زبان اور مکالمے۔ بس جناب! وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میرے پاس ابنِ صفی کا پورا سیٹ موجود نہ ہو۔

آج میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ابنِ صفی کے ناولوں کا انگریزی میں معیاری ترجمہ ہوجائے تو وہ دنیا کے کسی بھی ناول نگار کے ہم پلہّ ثابت ہوں گے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ جن مغربی مصنفوں کا میں نے ذکر کیا ہے اُن کے ہاں پلاٹ، کہانی اور کردار نگاری تو ظاہر ہے ہوتی ہی ہے لیکن ابنِ صفی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ اپنے ناولوں میں (خاص طور پر ایڈونچر ناولوں میں) تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات کو جس طرح اپنے ناول کا حصہّ بناتے ہیں وہ حیرت ناک ہے۔ اور یہ سب ابنِ صفی نے اُس زمانے میں کیا جب نہ تو انٹرنیٹ تھا اور نہ گوگل۔ مثلاً اُن کا ایک عمران سیریز کا ناول ہے ''ایڈلاوا'' جو اٹلی اور سوئزرلینڈ میں based ہے۔ میں چوں کہ سیاحت کا شوق بھی رکھتا ہوں، اس لیے بعد میں میں نے اٹلی اور سوئزرلینڈ میں وہ تمام مقامات دیکھے جو ناول میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ابنِ صفی اپنی کردار نگاری میں نفسیات کو بہت ہی عمدہ طریقے سے blend کرتے ہیں۔ مثلاً ''شعلوں'' کی سیریز میں خانم کا کردار، دوسرے ناولوں میں بوغا، علاّمہ دہشت گرد، ٹسڈل وغیرہ ''پھر خونی بگولے'' میں ریکھا ڈینیل اور روزا۔ بے شمار کردار ہیں جو اس وقت ذہن میں نہیں آرہے۔ پھر اُن کے اسٹاک کردار یا مجرم ہیں جن کا کردار consistent رہتا ہے۔ ان میں سنگ ہی، تھرلسیا، جونک نمایاں ہیں۔ عمران سیریز پڑھتے ہوئے انداز، ہوتا ہے کہ عمران کے ساتھ ان کرداروں کی عجیب وقریب Love-hate

٭ بی۔ ۲۳، بلاک ۱۵، گلشنِ اقبال، کراچی، برقی پتا: qaiseralam53@gmail.com

relationship ہے۔

پھر ایک بات تو بالکل سمجھ نہیں آتی۔ایک طرف تو لاپرواہ، لاؤبالی عمران ہے تو دوسری طرف جاسوسی کے فنی پہلوؤں کی پاسداری کرنے والا اصولی کرنل فریدی ہے جو اپنے اصول کبھی نہیں توڑتا۔وہ اپنے اسٹینٹ کیپٹن حمید سے ناراض ہی اسی وجہ سے رہتا ہے کہ وہ فریدی جیسی اصولی زندگی نہیں گزارسکتا۔کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ ایک طرف تو ''کام چلاؤ'' عمران کے ناول ہیں تو دوسری طرف ''اصولی'' کرنل فریدی کے ناول ہیں۔اور دونوں ناولوں کا مصنف ایک ہی ہے۔آپ عمران سیریز پڑھنا شروع کردیں تو پڑھتے ہی چلے جائیں گے اور یہی صورت فریدی کے ناولوں کی ہے۔

اور پھر جو سلیس اور عمدہ زبان ابنِ صفی استعمال کرتے ہیں اُس کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ایک بار ابوالخیر کشفی سے محمد حسن عسکری نے شکایت کی کہ بھئی آج کل کوئی اردو نثر ہی نہیں لکھ رہا۔اس پر کشفی صاحب نے کہا کہ آپ ابنِ صفی کو پڑھیے۔عسکری صاحب نے کچھ ناول پڑھے اور پھر کشفی صاحب سے پوچھا کرتے تھے ''بھئی ابنِ صفی کا نیا ناول کیا آ گیا ہے؟''

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ابنِ صفی نے اپنے ناولوں کا آغاز اُس زمانے میں کیا جب پاکستان میں (۱۹۵۵ء) فحش نگاری کا شہرہ تھا اور بظاہر کوئی مصنف اس تحریک کو روکنے پر آمادہ نہیں تھا۔یہ وہ عہد آفریں دور تھا جب ابنِ صفی نے اپنے دوست عباس حُسینی سے مشورہ کرکے اپنے ناولوں کا سلسلہ شروع کیا اور اسے ''جاسوسی دنیا'' کہا گیا۔ پہلا ناول ''دلیر مجرم'' ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے فحش نگاری کی روایت کی جگہ ابنِ صفی کے ''جاسوسی دنیا'' کے ناولوں نے لے لی۔ابنِ صفی کے فن پر ہندوستان میں ڈاکٹر اعجاز حسین، ڈاکٹر علی حیدر اور شمس الرحمان فاروقی نے خوب لکھا۔ پاکستان میں ڈاکٹر سلیم، اختر، بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، حسن عسکری، حسن نثار، امجد اسلام امجد، قاضی اختر جوناگڑھی، ایوب خان اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسے نام شامل ہیں۔

ابن صفی کے بارے میں یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مُلک کی انٹیلیجنس ایجنسیاں مختلف نازک ملکی معاملات پر اُن سے بریفنگ لیا کرتی تھیں۔ یہی صورتحال اسٹینلے گارڈنر کی تھی۔حکومت اُن سے اہم مقدمات میں مشورہ کیا کرتی تھی۔ مجھے پیری میسن اور کرنل فریدی کے کردار ایک ہی پائے کے محسوس ہوتے ہیں۔فرق یہ ہے کہ جاسوسی کے ناولوں میں ایڈونچر زیادہ ہوتا ہے۔ابن صفی کبھی بھی اپنے ناولوں کے بارے جواب نہیں دیتے تھے۔آپ لاکھ پوچھیں کہ آپ نے فریدی اور عمران جیسے متضاد کردار کیسے تخلیق کرلیے تو وہ آٹے دال اور مہنگائی پر بات شروع کردیتے تھے۔

ابن صفی ۱۹۲۸ء میں الٰہ آباد کے ایک گاؤں نارا میں پیدا ہوئے۔اردُو زبان کے شاعر نور ناروی رشتے میں ان کے ماموں لگتے تھے۔ ۱۹۵۲ء میں ابن صفی اپنی والدہ اور بہن کیساتھ پاکستان آ گئے اور ۱۹۵۸ء تک لالوکھیت (لیاقت آباد) میں رہے۔ابن صفی نے بی اے میں داخلہ تو الٰہ آباد یونی ورسٹی میں لیا لیکن تقسیم کے ہنگاموں کی وجہ سے یہ ڈگری انھوں نے بعد میں آگرہ یونی ورسٹی سے حاصل کی۔ابنِ صفی کے ناولوں کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ہر ماہ جنگ اخبار کے بیک پیج پر ایک چھوٹا سا اشتہار چھپتا تھا ''ابن صفی کا نیا ناول مثلاً 'سرخ دائرہ' آ گیا ہے۔'' آپ آٹھ بجے ریگل چوک جائیں لیکن اُس وقت تک تمام ناول فروخت ہوچکے ہوتے تھے۔ابن صفی کے ناول کو ہر عمر کے لوگ پڑھا کرتے۔ابوالخیر کشفی کہتے ہیں:

میں نے کبھی ابن صفی کے ناولوں کو کتابوں کے درمیان چھپا کر نہیں رکھا۔ ہمارے دانشور اسے ایک سب اسٹینڈرڈ مواد گردانتے ہیں۔لیکن ان میں سے کوئی بھی ابن صفی کے تخلیقی ذہن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ ابن صفی کے ناولوں کو کیوں پڑھتے ہیں تو میں جواب دیتا ہوں کیوں کہ ابن صفی ہمارے کئی ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک ابن صفی schizophrenia کے مریض رہے اور پھر پیر کالونی کے حکیم اقبال حسین کی مدد سے نہ صرف صحت یاب ہوئے بلکہ زورِ قلم اور توانا ہوگیا۔ابن صفی کی بیماری کے دوران کئی ''صفی'' میدان میں آگئے لیکن آج کوئی بھی اُن کے نام اور کام کو نہیں جانتا۔

ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن صفی کبھی بھی ہوائی جہاز میں نہیں بیٹھے لیکن آپ ''زمین کے بادل'' اور ''خونی بگولے'' پڑھ لیجیے، محسوس ہوگا جیسے اس شخص نے بے شمار غیر ملکی سفر کیے ہیں۔وہ پیرس شفٹ ہونا چاہتے تھے لیکن کہتے تھے کہ اس کیلیے جہاز میں بیٹھنا پڑے گا اور ایسا میں کبھی نہیں کروں گا۔

پھر اپنے ناولوں میں جزئیات اور تفصیل وہ جس طرح بیان کرتے ہیں اُس کا تو جواب ہی نہیں۔ برازیل اور اٹلی کے ساحلوں، لاطینی امریکا، لندن، افریقا وغیرہ کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں جیسے سال ہا سال سے وہاں رہتے رہے ہوں۔مقامی لوگوں کی بولیاں، ان کا رہن سہن، بود و باش اور رسم و رواج کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری خود کو وہیں محسوس کرنے لگتا ہے۔جبکہ صورتحال یہ تھی کہ بیرونِ مُلک تو کجا، ابن صفی نے کبھی کراچی سے بھی باہر قدم نہیں رکھا۔

ابنِ صفی کا ایک اور کمال یہ تھا کہ اُن کے تقریباً ہر ناول میں climax کبھی بھی predictable نہیں بلکہ probable ہوتا تھا۔ یہ دراصل افسانے کی تیکنیک ہے جسے ابنِ صفی نے مہارت سے اپنے ناولوں میں استعمال کیا۔ وہ قاری کو اندازہ ہی نہیں ہونے دیتے تھے کہ اصل مجرم کون ہے۔میں نے ''جاسوسی دیا'' کا ایڈونچر ناول ''خونی بگولے'' کا ترجمہ کر کے ابنِ صفی کے صاحبزادے احمد صفی کو بھیجا ہوا ہے۔وہ اس کی اشاعت کی اجازت دیں تو باقی ناولوں کا ترجمہ کرنے کیلیے بھی ہمہ وقت تیار ہوں۔اس مضمون میں اسی ناول کے حوالے سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

''جاسوسی دنیا'' کے ایڈونچر ناول (بھیانک جزیرہ، موت کی آندھی،خونی بگولے،شعلوں کی سیریز،زمین کے بادل، خونی ریشے) سب کے سب اپنی جگہ منفرد اور ممتاز ہیں۔لیکن مجھے ''خونی بگولے'' اپنے پلاٹ، کہانی، جغرافیائی اور تاریخی تفصیلات اور کردارنگاری کی وجہ سے بہت پسند ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ سنگ ہی اور ایک ماہر اثارِ قدیمہ ڈاکٹر شیپرڈ کو (ساؤتھ امریکا کے ملک چلی) کی الپوم پہاڑوں میں ایک مردہ شہزادی برف میں دبی ہوئی ملتی ہے۔ڈاکٹر شیپرڈ اس شہزادی کے گلے میں سے چاندی کا ایک طوق اُتار لیتا ہے جو ایک گمشدہ خزانے کی کلید ہے۔ دونوں آپس میں لڑتے ہوئے کرنل فریدی کے ملک پہنچ جاتے ہیں۔سنگ ہی طوق لے اڑتا ہے اور یوں فریدی سنگ ہی اور ڈاکٹر شیپرڈ کے پیچھے ساؤتھ امریکا پہنچ جاتا ہے۔فریدی نے یہ طوق سنگ ہی سے حاصل کر کے اپنی حکومت کی جانب سے

سرکاری طور پر چلی کی حکومت کو واپس کرنا ہوتا ہے لیکن سنگ ہی اور ڈاکٹر شیپرڈ خزانے کی تلاش میں سرگرداں ہوجاتے ہیں۔کرنل فریدی کیساتھ حمید، انور، قاسم اور سنگ ہی کے گروپ کی ایک پُراسرار لڑکی، ریکھا ڈینیل بھی ہوتی ہے۔اس ناول میں ایک کلیدی کردار طارق کا ہے جو کرنل فریدی کے والد کے دوست تھے اور لاطینی امریکی کا کیٹرا کہلاتے ہیں۔اُن کا پیشہ سیاحت اور گمشدہ دفینوں کی تلاش ہے۔ وہ کئی زبانوں پر عبُور رکھتے ہیں جن میں اسپینش اور دیگر مقامی زبانیں شامل ہیں۔طارق فریدی کیساتھ بھیس بدل کر سنگ ہی اور ڈاکٹر شیپرڈ کے قافلے میں شامل ہوجاتا ہے اور ہمیں تاریخی اور جغرافیائی حوالے سے ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو حیرت انگیز ہیں۔ ناول کی کہانی تو میں یہاں نہیں دُھراؤں گا البتہ طارق کے کچھ جملے ضرور کوٹ کروں گا۔

ویسے ساؤتھ امریکا نے مجھے بھی ہمیشہ سے fascinate کیا ہے۔خاص طور پر ایکوارڈ کی انکا تہذیب کی بربادی اور برازیل کے ایمزون کے جنگلات۔''خونی بگولے'' ایکوارڈ میں سیٹ کی گئی ہے۔اس کا دارالخلافہ کیتو سطح سمندر سے تقریباًدس ہزار فٹ بلند ہے اور ٹھیک خطِ استوا پر واقع ہے۔اس لیے یہاں پورے سال موسم سرد رہتا ہے اور دھند چھائی رہتی ہے۔ایکوارڈ کی سرحد چلی سے ملتی ہے جو Andies کے بلند پہاڑوں کے دامن میں شمال سے ایک strip کی شکل میں بحراوقیانوس کیساتھ نیچے جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔

فریدی ہر حال میں طوق سنگ ہی سے حاصل کر کے چلی کی حکومت کے حوالے کرنا چاہتا ہے جبکہ سنگ ہی اور ڈاکٹر شیپرڈ خزانے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ طارق مقامی لوگوں کے مذہبی پیشوا کے بھیس میں فریدی کیساتھ سنگ ہی کی پارٹی میں شامل ہوجاتا ہے۔اُس کے پاس ایک نیولہ ہے جو اُس کے کاندھے پر بیٹھا رہتا ہے۔مقامی لوگ اس نیولے کو''شاکی'' کہتے ہیں اور اس مالک کی بہت عزت کرتے ہیں اور ڈرتے بھی ہیں۔اسی وجہ سے طارق اس پورے قافلے کا لیڈر بن جاتا ہے۔سفر کے دوران وہ تاریخ اور ساؤتھ امریکا کا جغرافیہ بتاتا رہتا ہے، وہ آپ طارق ہی زبان سے سنیے:

> عظیم سُبوتا کا مسکن ...ہلالی شکل کی دو چوٹیاں دیکھ رہے ہو...یہ مقدس ہلالی سُبوتا کا مسکن ہے...کوٹی کی عظیم روح تم سفید فام آدمیوں پر مہربان ہوگئی تھی۔تم جو اس کی تکذیب کرتے ہو۔
>
> ''...تمھارے پہلے حملہ آور فرانسکو ہزارو کو اندھیری رات میں کس نے راستہ دکھایا تھا۔کوٹی کی عظیم روح اپنے قدیم پرستاروں سے ناخوش ہوگئی تھی اور اس نے تم سفید فاموں کے ہاتھوں انھیں ذلت بخشی۔ ہزارو کی فوجیں جب رات کو بھٹک رہی تھیں تو جانتے ہو کیا ہوا تھا...پھر ان مقدس چوٹیوں سے ایک چیخ بلند ہوئی...ایک روشنی پھوٹی اور انکا قوم کی سرزمین پر تباہی نازل ہوگئی...اس روشنی میں رات ننگی ہوگئی تھی...حملہ آور بڑھتے رہے...خون، چاروں طرف خون تھا...پھر ایک وبا آئی ...سُبوتا کے پرستاروں کے جسموں پر بڑے بڑے آبلے پڑنے لگے جن سے زرد رنگ کا پانی بہتا تھا...پھر وہ خوفناک پرندے جن کے پرے کے پرے شمال کی طرف سے آرہے تھے...انھوں نے لاشوں کی طرف رخ بھی نہ کیا...زندہ آدمیوں کی بوٹیاں نوچنے لگے..مگر سُبوتا کا مسکن جیسا تھا ویسا ہی رہا..میں تمھیں آگاہ کرتا ہوں کہ ایک دن پھر ان ہلالی چوٹیوں سے روشنی پھوٹے

گی...رات ننگی ہوجائے گی...اور اُس دن کسانوں کے ہاتھ میں سفید فاموں کے سر ہوں گے...ایسے سر...جن سے ایک ایک بوند کر کے خون ٹپک رہا ہوگا۔''

آپ نے دیکھا ایک پراسرار سفر کے دوران طارق کس طرح انکا تہذیب کی تباہی کا ذکر کر رہا ہے۔آپ صرف تحریر دیکھیے۔کتنی haunting ہے۔جو لوگ ایکوارڈ کی physical geography سے واقف ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ ملک کی مشرق ترائی میں گھنے جنگلوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جہاں ابھی تک انسان نے قدم نہیں رکھا۔صرف National Geographic کے ریسرچ پرچے سے معلوم ہوتا ہے کہ دن میں یہ جنگلات بالکل بنجر ہوتے ہیں لیکن رات کو یہاں اژدہے، چھوٹے بندر اور گلہریاں ہر طرف نکل پڑتے ہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ابن صفی نے اپنے اس ناول میں یہی کچھ لکھا ہے۔وہ اتنی ریسرچ کیسے کرتے تھے، کیا ذرائع تھے اُن کے پاس، یہ ایک معمہّ ہے۔

ناول میں فریدی کیساتھ ایک لڑکے کا بھیس بدل کر ڈاکٹر شیپرڈ کی بیٹی، روزا بھی شامل تھی۔اُسے جب معلوم ہوا کہ ریکھا ڈینیل کو ساتھ صرف اس لیے رکھا گیا تھا کہ وہ خواب میں چلتی تھی۔اُس نے خزانے کی طرف جانے والے سانپوں والے غار میں اُترنا تھا۔اس موقع پر وہ اپنے باپ سے کہتی ہے:۔

وہ پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتی رہی اور پھر بے حوش ہوکر گر گئی۔

> اس طرح نہ دیکھو...روزا ہذیانی انداز میں بولی۔میں روزا ہوں...تمھاری بیٹی...میں تمھاری آنکھوں کے سامنے سانپوں والے غار میں اتر جاؤں گی...فریدی میرے باپ کے ہاتھ باندھ دو!اسے دھکے دیتے ہوئے وہاں تک لے چلو...میں سانپوں والے غار میں اتروں گی...اسے خزانہ مل جائے گا...اسے خزانہ چاہیے...یہ میرا باپ ہے...بس کے گلے میں مقدس صلیب لٹک رہی ہے...اس کی ڈاڑھی کرائسٹ کی ڈاڑھی سے مشابہہ ہے...ہاہا...کرائسٹ ایک معصوم لڑکی کو سانپوں کے حوالے کر رہا ہے...ہاہا۔

ناول کا انجام یہ ہوتا ہے کہ سنگ ہی بظاہر غار میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لیتا ہے، ڈاکٹر شیپرڈ اور اُس کے تمام ساتھی مارے جاتے ہیں۔فریدی ریکھا ڈینیل کو بچا لیتا ہے لیکن طوق سنگ ہی اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔میں ذمے داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ناول کا پلاٹ، کہانی، کردار نگاری، ایڈونچر، تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات...سب مل کر ایک ایسا intense اور gripping ناول بنا دیتے ہیں جس کا موازنہ دنیا کے کسی بھی adventure ناول کیساتھ کیا جا سکتا ہے۔

۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ کو عین اپنی ۵۲ ویں سالگرہ کے دن یہ حیرت انگیز مصنف اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔

عقیل دانش ❁

ابن صفی مرحوم — نابغۂ روزگار

۲۶ جولائی ۲۰۱۳ء کو "سرّی ادب" کے بے تاج بادشاہ ابنِ صفی کو ہم سے بچھڑے ہوئے ۳۳ سال ہوجائیں گے۔ ہرچند کہ بعض لکھنے والوں کے خیال میں وہ اپریل کی کسی تاریخ کو ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔لیکن اقبال کی طرح اب ان کی تاریخِ پیدائش بھی بہ کثرتِ رائے سے ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء تسلیم کر لی گئی ہے۔ابنِ صفی مرحوم کا ذکر آتے ہی ذہن میں یادوں کے کتنے ہی دریچے کھل جاتے ہیں۔اور جگر کی زبان میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

لیکن حقیقت یہ ہے کہ جانے والے کبھی نہیں آتے۔جانے والوں کی یاد آتی ہے۔اسرار احمد ابنِ صفی سے میری پہلی ملاقات مجاہد لکھنوی نے ۱۹۵۴ء میں کروائی تھی، جب وہ لالوکھیت (اب لیاقت آباد) کے ایک مکان میں رہائش پذیر تھے۔میں اس وقت نبی باغ ہائی اسکول میں ساتویں جماعت کا طالبعلم تھا اور "جاسوسی دنیا" الٰہ آباد کے ذریعے مرحوم کا حلقہ بگوش ہوچکا تھا۔اس پہلی ملاقات سے ملاقاتوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا، وہ لالوکھیت سے ناظم آباد منتقل ہوگئے۔میں نے بی۔اے۔میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں داخلہ لے لیا۔اسرار بھائی نے فردوس کالونی میں "عمران سیریز" کا دفتر قائم کیا۔میں تقریباً ہر دوپہر کو کالج سے واپسی میں ان کے دفتر جا پہنچتا جہاں ان کے اور احباب بھی جمع ہوتے اور پھر ادب اور زندگی کے ایسے ترانے چھڑ جاتے اور دیدہ و دانش کے ایسے پھول کھلتے جن کی یاد سے آج بھی مشامِ جان معطر ہے۔۱۹۵۴ء میں ان کے ایک نیازمند کی حیثیت سے میں نے ان کی خدمت میں ایک فاؤنٹین پین پیش کیا تھا وہ انھوں نے محفوظ کر رکھا تھا۔۱۹۶۳ء میں جامعہ کراچی سے فارغ التحصیل ہوکر شعبۂ اردو نیشنل کالج سے وابستہ ہوگیا۔اسرار بھائی سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔کالج کے زمانے میں میں کالج میگزین کے اردو حصے کا مدیر تھا۔اسرار بھائی نے اس دورِ ادارت میں مجھے اپنے صائب مشوروں سے نوازا۔۱۹۶۴ء میں میرا تقرر گورنمنٹ کالج کے شعبۂ اردو میں ہوا تو اسرار بھائی سے ملاقاتوں میں اور تواتر پیدا ہوگیا۔اب وہ گاہے گاہے ناظم آباد نمبر ۵ میں میری رہائش گاہ پر بھی تشریف لے آتے اور ہر مہینے جب "عمران سیریز" بازار میں آتا تو میرا نام لکھ کر اسے میرے حوالے کر کے مجھے ممنون فرماتے۔"عمران سیریز" سے متعلق ایک حقیقت عرض کرتا چلوں جب ریگل سنیما کراچی کے سامنے اقبال بک ڈپو پر ہر ماہ "عمران سیریز" پہنچتا تو خریدنے والوں کی ایک طویل قطار لگ جاتی اور

❁ لندن۔

منٹوں میں رسالہ فروخت ہوجاتا۔ مختلف علاقوں کی لائبریریوں میں عام کتاب ایک آنہ، روز پر مطالعے کے لیے دی جاتی لیکن ''عمران سیریز'' کا روزانہ معاوضہ چار آنے ہوتا۔ گلبہار کی ایک لائبریری کو جب یہ علم ہوا کہ ایک صاحب ''عمران سیریز'' پڑھنے کے لیے لے جاتے ہیں اور کئی اصحاب اسی سے مستفید ہوتے ہیں تو کہکشاں لائبریری نے شرط لگائی کہ جسے ''عمران سیریز'' پڑھنا ہو وہ چار آنے ادا کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر پڑھے۔ اس سے ابنِ صفی کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو میں میری دانست میں وہ پہلے ادیب تھے جو صرف اور صرف ادب کے بل پر روزی کماتے تھے ورنہ ہمارے لکھنے والے مختلف پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ادب اور شاعری ان کا شوق ہوتی ہے۔ ابنِ صفی کی تخلیق نے برسوں پہلے best seller کا اعزاز حاصل کرلیا تھا۔ وہ پاکستان آکر بھی ''جاسوسی دنیا'' الہ آباد کے لیے ہر ماہ لکھتے رہے۔ بہت سے لوگ سمجھتے تھے کہ وہ الہ آباد ہی میں ہیں اور وہیں سے ''عمران سیریز'' لکھتے ہیں۔ وہ کراچی سے ''عمران سیریز'' کے علاوہ ایک اور رسالہ بھی نکالنا چاہتے تھے۔ یہ رسالہ منصۂ شہود پر آیا بھی اور اس رسالے کے غالباً ۲ شمارے (میری یادداشت کے مطابق، یہ بہت ہی مختصر صفحات پر مبنی رسالہ تھا جس میں شکرال کی کہانیاں جگہ پاتی تھیں) شائع بھی ہوتے لیکن اسرار بھائی کی عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہ دوسرا رسالہ جاری نہ رہ سکا۔ ہر مہینے ہند و پاک کے لیے دو ایسے ماہنامے تخلیق کرنا جن کا ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ انتظار کرتے ہوں اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔ میں ۱۹۶۸ء میں لندن آگیا اور اسرار بھائی سے رابطہ ٹوٹ گیا۔ بعد میں علم ہوا کہ کچھ مدت کے لیے اسرار بھائی کا ''قلم'' ''بند'' ہوگیا۔ نہ صرف ان کا قلم جامد ہوگیا بلکہ ان کے کاتب سلام اللہ خاں سندیلوی کی کتابت بھی ایسی منقطع ہوئی کہ وہ چاہنے کے باوجود لکھ نہیں پاتے تھے۔ اس ''عدیم التحریر'' وقفے میں پاکستان کے متعدد شہروں میں بلااجازت ان کی تمام کتابیں شائع کرلی گئیں اور موقعے سے فائدہ اٹھانے والے ''ابنِ صفی'' اور ''ابنّی صفی'' کے نام سے ربط و یابس لکھنے لگے اور بددیانتی کی انتہا یہ ہوئی کہ یہ موقع شناس صاحبانِ قلم اسرار بھائی کے کردار بھی چرانے لگے نہ جانے کتنے ہی ''عمران'' اور ''کرنل فریدی'' پیدا کر لیے گئے۔ ایک طویل مدت تک ابنِ صفی کا قلم جامد رہا۔ بالآخر جماعتِ اسلامی کے ایک فعال کارکن حکیم اقبال کے علاج سے ابنِ صفی کا ذہن صاف ہوا۔ اور انھوں نے طویل مدت کے بعد ایک ضخیم ناول لکھا اور اسے حکیم اقبال کے نام معنون کیا۔ کچھ ہی دن بعد حکیم اقبال پر حکومت کا قہر نازل ہوا اور وہ نظر بند کردیے گئے۔ اسرار بھائی کہتے تھے کہ میں اپنے وقت کا غالب ہوں۔ غالب نے جس کا قصیدہ لکھ دیا یا تو وہ اللہ کو پیارا ہوگیا یا مصائب میں مبتلا ہوگیا۔ ۱۹۷۴ء میں میں کراچی گیا تو بڑی محبت سے ملے دوسری ملاقات میں بہت خوش نظر آتے تھے۔ میں نے خوشی کی وجہ دریافت کی تو فرمانے لگے یہ نیا شمارہ دیکھو وجہ سمجھ میں آجائے گی۔ اسرار صاحب ہر ناول کا ''پیش رس'' لکھتے تھے جو ادبِ عالیہ کا معیار رکھتا تھا۔ اس ماہ کے پیش رس میں لکھا تھا۔ ''میری بیماری کے دوران کتنے ہی پبلشرز نے بلااجازت میری کتابیں شائع کرلیں، کتنے ہی لوگ میرے نام پر تشدید اور نکتے لگا کر لوگوں کو دھوکا دیتے رہے، میں کس کس پر مقدمہ قائم کروں۔ ایسے تمام لکھنے والوں کو میں ایک مشورہ دے سکتا ہوں کہ اگر انھیں نام، عزت، شہرت اور دولت حاصل کرنی ہو تو اپنے باپ کی جگہ میرے باپ کا نام لگالیں۔'' واضح رہے کہ اسرار بھائی کے والد کا نام صفی اللہ تھا۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی انتقام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسرار بھائی کی خوشی کی وجہ پڑھ کر میرا دل بھی باغ باغ ہوگیا۔ ابنِ صفی اپنی ذات میں پوری انجمن تھے۔ کہتے تھے کہ کئی بار عباس حسین کی ادارت میں نکلنے والے رسالے میں مختلف ناموں

سے وہ خود لکھ کر رسالہ بھر دیتے تھے۔ ان کے متعدد ناموں میں اسرار ناروی، طغرل، فرغان وغیرہ بہت مشہور ہوئے۔ انھوں نے انگریزی فکشن بڑی دلجمعی سے پڑھا تھا۔ ان کے بعض ناولوں میں انگریزی جاسوسی ناولوں سے استفادہ بھی کیا گیا تھا۔ انھوں نے اپنے ایک ناول میں اس کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن ایسا صرف ۲۔۳ ناولوں ہی میں ہوا۔ ورنہ ان کی تمام کہانیاں طبع زاد ہوتی تھیں۔ سرّی ادب کی بنیادیں تو چند ناولوں میں اپنی جھلک دکھا چکی تھی لیکن ظفر عمر زبیری کی ''نیلی چھتری'' سے جاسوسی ناول نگاری کا سلسلہ شروع ہوا اور اسے بامِ عروج تک پہنچایا ابنِ صفی مرحوم نے۔ ان کے یہاں ادب کا ایسا رچاؤ تھا کہ جاسوسی کہانیوں کو بھی ادبی شہ پاروں کا درجہ مل جاتا تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر اور ناقد بھی تھے۔ مشاعروں سے گریز کرتے تھے۔ صرف دوستوں کے درمیان کبھی کبھی شعر گوئی کی طرف آجاتے تھے۔ مدتوں اردو کے کج نظر ناقد ابنِ صفی کو نظرانداز کرتے رہے لیکن میں نے خود ان ناقدین کے ہاتھ میں متعدد بار ''عمران سیریز'' دیکھی، انھوں نے اردو پڑھنے والی کم از کم دو نسلوں کو ذہنی فرحت عطا کی ان ناقدین کے لیے خود ابنِ صفی کے لیے کہا تھا:

ڈوب جائے گا کسی روز یہ خورشیدِ انا
مجھ کو دہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

اور آج اردو کے بہت سے ناقدین انھیں مثالوں کی طرح دہرا رہے ہیں وہ اپنے الفاظ کی جنت میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر شبیر احمد قادری ٭

سِرّی ادب کے باکمال ادیب — ابنِ صفی

ابنِ صفی نے اپنے ناولوں کے چرم کو خوب خوب کمایا، محنت کی، محنت کی، نت نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرم رہے، مسلسل لکھنے پڑھنے کی بدولت وہ صاحبِ اسلوب ادیب بن کر اُبھرے، اُن کا نام ادب کی اس خاص جہت سے جُڑ گیا جسے سرّی، جاسوسی اور رموزی ادب کہتے ہیں۔ یوں تو سارا کا سارا ادب رموزی ہوتا ہے۔ مبالغہ اس کی شان اور شناخت ٹھہرتا ہے۔ شاعری ہو یا فکشن، فی الجملہ — 'بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر' قاری اور مصنف کے درمیان حائل یہی مہین پردہ، ادب کا حسن ہے۔ صحافت اور ادب میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ادب براہِ راست اظہار کا نام نہیں ہے۔ صحافی اور صحافت بلاواسطہ تحریر وتقریر پر یقین رکھتے ہیں۔ ادب کبھی تشبیہ اور استعارے کا سہارا لیتا ہے اور کبھی علامت اور پُرزور مبالغے کو اپنا کر اپنا ظہور کرتا ہے۔ تہ در تہ صورتِ احوال ہی شعر اور افسانے اور ناول کا حسن ہے۔ جاسوسی ادب میں تو پردہ داری جزوِ لاینفک ہے۔ ابنِ صفی نے جاسوسی ادب کو شہرت اور مقبولیت کی انتہا تک پہنچا دیا۔

کردار تراشنا اور اس کی تراش خراش اس انداز اور ہنر سے کرنا کہ وہ شاہ کار بن جائے، ابنِ صفی کو اس شعبے میں کمال حاصل تھا۔ یہ کردار ہی ہیں جن کے توسل سے مصنف، گاہ اپنی بات زیبِ قرطاس کرتا ہے، گاہ دوسروں کے افکار کو زبان دیتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک نے درست لکھا ہے:

> ابنِ صفی کو انسانی نفسیات میں بڑا رسوخ اور کردار نگاری پر بڑی مہارت حاصل تھی جس کی بِنا پر وہ اپنی زعفرانی کہانیوں میں ایسا سماں باندھتے تھے کہ قاری اُن میں کُھب کر رہ جاتا تھا۔[۱]

ابنِ صفی بلند فکر اور وسعتِ خیال کے حامل ادیب تھے۔ وہ اُن تمام ادیبانہ حربوں سے کام لیتے تھے جنھیں اُن کے عہد میں پذیرائی حاصل تھی۔ اکرم کنجاہی نے درست لکھا ہے:

> صاف ستھرے اور معیاری ادب میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ تعلیم وتربیت کا اہم فریضہ سرانجام دیتا ہے، معلومات بہت پہنچاتا ہے اور تفریح کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ تہذیب کا اظہار تخلیقات سے ہوتا ہے، زبان تخلیق مظہر ہے اور شاعری زبان کے حسن کا تحفظ کرتی ہے۔ معیاری ادب نے دنیا کی اہم تحریکوں میں فکری انقلاب برپا کیا ہے۔[۲]

٭ سابق صدر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد، مکان نمبر ۵۹ ۴۴، گلی نمبر ۸ نزد گرلز ہائی اسکول، اشرف پورہ، منصور آباد، فیصل آباد

ابنِ صفی اس بات پر بہت خوش تھے کہ انھوں نے ناول لکھ کر اردو زبان کی بقا اور ترقی کے ضمن میں تاریخی کردار ادا کیا۔ ایسا یقیناً ہوا کہ ابنِ صفی کے قارئین ناول ہی اردو زبان بھی پڑھ رہے تھے۔ ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی کی رائے ملاحظہ ہو، جس میں وہ ابنِ صفی کی زبان کی تعریف کر رہے ہیں، ''میں نے ابنِ صفی کی جاسوسی دنیا کو نہ تو لفافے میں چھپایا اور نہ کتابوں کے درمیان دبایا۔ ہمارے دانش ور جاسوسی ناول پڑھنے کو ایک عامیانہ حرکت سمجھتے مگر اُن دنوں وہ سب مل کر میری جارحیت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی پوچھتا کہ ابنِ صفی کو کیوں پڑھتے ہو تو میں پوری قوت سے جواب دیتا کہ ابنِ صفی آپ کی بستی کے عظیم ناول نگاروں سے بہتر زبان لکھتا ہے۔ اُن دنوں محمد حسن عسکری صاحب نثر کے مٹتے ہوئے فن پر آزردہ تھے۔ میں نے اُنھیں ابنِ صفی کی دو تین ناولز پڑھنے کو دیں اور پھر تو معاملہ یہ ہوا کہ وہ ہر مہینے پوچھتے، ''خیر صاحب! نیا ناول آیا؟''[۳]

ابنِ صفی بہت سے کمالات کے مالک تھے۔ اُن کے ناولوں کی ایک اہم شناخت، اُن کی کردار سازی کی صلاحیت تھی۔ وہ اُن کرداروں سے جس نوعیت کا کام لینا چاہتے تھے، بہت آسانی سے لینے کا ہنر جانتے تھے۔ ان کے کرداروں کے نام مستقل وہی تھے۔ لیکن اس خلاّق فن کار کے ہاتھوں میں اُن کی حیثیت موم کے مانند تھی، وہ جس قالب میں اُنھیں ڈھالنا چاہتے، ڈھال لیتے تھے۔ جس قسم کی حرکات چاہتے، اُن کے کردار اُس پر مجبور تھے، وہ جو مکالمہ ادا کرنے کا ارادہ کرتے، ان کا کردار وہی بات کرتا۔ اس ''خلاّقیت'' کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ابنِ صفی کا فن یکسانیت کا شکار نہیں ہونے پایا۔ تا دمِ آخر وہ تازہ اور جاذبِ توجہ رہا۔ ابنِ صفی کی پیروی میں بہت سے اور جاسوسی ناول لکھنے والے معرضِ شہود پر آئے مگر جو مقام اور مقبولیت ابنِ صفی کا مقدر ٹھہری، اُن کے متبعین میں کسی کو نہ مل سکی۔ ابنِ صفی واقعی جادو نویس مصنف تھے۔ ان کا تتبع اتنا آسان کام نہیں تھا۔ اُن کی ادیبانہ حیثیت کسی بلند مقام پر کھڑے ادیب کی سی تھی جسے لوگ رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے بیش تر لوگ خوش ہوتے اور کچھ محض آہ بھر کر رہ جاتے۔ ابنِ صفی کے فن کے بارے میں مجنوں گورکھ پوری کی یہ رائے بہت اہمیت کی حامل ہے، ''اردو میں جاسوسی ادب کے سلسلے میں جن اوّلین کے نام میں نے گنائے ہیں، اُن کے بعد ابنِ صفی ہی ایسے لکھنے والے ہیں جنھوں نے جاسوسی افسانے کو اپنا مستقل فن بنایا اور اسی پر آج تک اپنی تمام تر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ وہ مسلسل چھوٹے بڑے جاسوسی ناول لکھے جا رہے ہیں اور وہ اپنی سی پوری کوشش کرتے ہیں کہ چند مخصوص کرداروں سے افسانوں کی ساخت کے باوجود واقعات اور آغاز و انجام کے اعتبار سے ان میں تنوعات ہوں۔ ایسے تنوعات جو ایک افسانے کو پچھلے کسی افسانے کی چھاپ نہ بننے دیں۔ انھوں نے جس کثرت کے ساتھ جاسوسی ناول لکھے ہیں، اُن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ یہ ایک مشکل کام ہے۔''[۴]

مجنوں گورکھ پوری نے ابنِ صفی کے ناولوں کے دو نمایاں اوصاف کی جانب توجہ دلائی ہے۔

۱۔ ...جن میں روزمرہ کے جرائم اپنی تمام نئی پیچیدگیوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور سراغ رسانوں کا مخصوص گروہ اُن کو بے نقاب کرنے اور متعلق مجرموں کو ٹھکانے لگانے میں بالآخر کامیاب ہوتا ہے۔

۲۔ دوسری قسم وہ ہے جن میں مجرم یا مجرموں کا ایک مخصوص گرگا موجودہ سائنسی دنیا کے جدید ترین

آلات اور ذرائع سے کام لیتا ہے اور سراغ رسانوں کے لیے ان کا سراغ لگانا ایک جنگی مہم سے بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی قسم کے افسانے کے تحت وہ افسانے بھی آتے ہیں جن میں غیر ملکی جاسوس وطن کے غداروں کے ساتھ مل کر جرم کا ایک پورا جال بُن لیتے ہیں اور اکثر سراغ رسانوں کی زندگی بھی خطرے اور ہلاکت میں پڑ جاتی ہے۔ فریدی اور عمران کے سلسلوں کے تمام ناول انھیں دو قسموں میں آجاتے ہیں۔(۵)

ابنِ صفی نے اپنے مخصوص اور متعین کرداروں کے خاکوں میں ایسے دل کش رنگ بھر دیے ہیں کہ برسوں گزر جانے کے باوجود ان میں کشش اور جاذبیت موجود ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے مؤرّخین اور ناقدین نے جاسوسی ادب کو ادب ہی شمار نہیں کیا۔ ورنہ اس شعبے میں بہت لولوے لالا موجود ہیں۔ اپنی زبان، اپنے بیان اور اپنے مخصوص طرزِ اظہار کی بدولت ان کا شمار مقبول اور محبوب لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ تجسّس تو ادب اور ادیبوں کو خاص نہج پر لاتا ہے، اس سے تحریروں میں قاری کی دل چسپی بڑھ جاتی ہے۔ ابنِ صفی تو وہ تھے جن کی پہلی کہانی چھپنے پر رسالے کے مدیر نے انھیں ''مصورِ جذبات'' کی حیثیت سے متعارف کرایا حالاں کہ اس وقت وہ ساتویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔ یہ کہانی ابنِ صفی کے الفاظ ہی میں ملاحظہ ہو:

> ... ایک دن میں نے بھی ایک کہانی لکھ ڈالی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ساتویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ یہ افسانہ میں نے ہفت روزہ ''شاہد'' بمبئی میں چھپنے کے لیے بھیج دیا۔ جناب عادل رشید اس جریدے کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے مجھے کوئی معمر آدمی سمجھ کر کچھ اس طرح میرا نام کہانی کے ساتھ شائع کیا تھا۔
>
> نتیجۂ فکر مصورِ جذبات حضرت اسرار ناروی کہانی چھپتے ہی میری شامت آ گئی۔ گھر کے بڑوں نے کچھ اس انداز میں مخاطب کرنا شروع کر دیا: ''اے او مصورِ جذبات، ذرا ایک گلاس پانی لانا۔''
>
> وقتاً فوقتاً ''شاہد'' ویکلی میں کہانیاں چھپتی رہیں، زیادہ تر رومانی کہانیاں ہوتیں۔ میٹرک پہنچتے پہنچتے شاعری کا چسکا بھی لگ گیا۔(۶)

اسرار احمد ناروی سے ابنِ صفی کا لبادہ اوڑھنے تک کا سفر بہت دل چسپ ہے۔ انھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ادیب کا نام اس کی تخلیقات پر کس طور نظر انداز ہوتا ہے۔ اسرار، سرّی ادب نہ لکھتے تو اور کیا لکھتے۔ دیگر سرّی ادب لکھتے تو ''کوہ کندن و کاہ برآوردن'' کی مثال بن جاتے مگر ابنِ صفی تو کمال کے ادیب تھے۔ جن کے حرف حرف کو شائقینِ ادب نے چوما، ازبر کیا اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے۔ اس درجہ مقبولیت اردو کے بہت کم ادیبوں کو ملی جتنی ابنِ صفی کا مقدر ٹھہری۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، ''اردو نثر میں طنز و مزاح''، بیت الحکمت، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۱۱

۲۔ اکرم کنجاہی، ''افہام و تفہیم''، رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۲۲ء، ص ۴۳

۳۔ ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی، ''کچھ ابنِ صفی کے بارے میں''، مشمولہ سہ ماہی ''آمد''، پٹنہ، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۷

۴۔ مجنوں گورکھ پوری، ''اردو میں جاسوسی افسانہ''، ایضاً، ص ۱۶۰۔۱۶۱

۵۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۶۔ ابنِ صفی، ''میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟''، ایضاً، ص ۱۷۰۔۱۷۱

اخلاق احمد ٭

ایک تھا جادوگر

لفظوں کی ایک علاحدہ دنیا ہوتی ہے۔ پیچیدہ اور پراسرار۔ انگریزی کا ایک لفظ ہے، مینٹور۔ اردو میں اسے اتالیق یا راہ نما یا استاد وغیرہ کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کا مفہوم تجربہ کار اور قابل بھروسہ مشیر یا تربیت کار وغیرہ بتایا جاتا ہے۔لیکن میرا خیال ہے کہ اس لفظ کا اصل مفہوم شاید اس سے بھی سوا ہے۔

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ابن صفی ایک مینٹور تھے۔ ایک غیبی مینٹور۔ وہ کسی جامعہ میں نہیں پڑھاتے تھے،فکشن کا کوئی کوچنگ سینٹر نہیں چلاتے تھے، لکھنے لکھانے والوں سے بھرے کسی آڈیٹوریم کے اسٹیج پر لیکچر دینے نہیں آتے تھے، پھر بھی وہ لاکھوں قارئین کے محبوب تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی درجنوں، سیکڑوں، شاید ہزاروں خاص لوگوں کے مینٹور تھے۔ ان لوگوں کے مینٹور، جنھوں نے بعد میں فکشن کا رخ کیا، ناول اور افسانے لکھے، تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہے، نام ور ہوئے۔

یہ شاید ۱۹۶۵ء کی بات ہے۔ ہم لاہور کے علاقے دھرمپورہ میں رہتے تھے۔ میرے بڑے بھائی احمد اقبال ان دنوں ایک سرکاری محکمے سے وابستہ تھے۔ اس محکمے میں لائبریری قائم کرنے کی ذمے داری بھائی جان کو سونپی گئی تو چند دنوں کے لیے ہمارے گھر میں کتابوں کا ڈھیر لگ گیا۔ جب تک دفتر میں لائبریری کے لیے جگہ تیار ہوتی رہی، فرنیچر کا بندوبست کیا جاتا رہا، اس وقت تک سُتلی سے بندھے کتابوں کے وہ بہت سے بنڈل ہمارے ہی گھر رہے۔

ایک دن میں نے بہت احتیاط سے ایک ایسا بنڈل کھولا جس میں پتلی پتلی بہت سی کتابیں تھیں۔ نونہال اور تعلیم و تربیت جیسے بچوں کے رسائل پڑھنے کے باعث، میرا خیال تھا کہ یہ کتابیں کم صفحات کی ہیں تو شاید بچوں کی کتابیں ہوں گی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ اس پہلی کتاب کے ذریعے کوئی نئی، انوکھی دنیا مجھ پر اپنے در کھولنے والی ہے۔

وہ عمران سیریز کا کوئی ناول تھا جو میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اپنی کم عمری کے باعث میں کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ مگر بیزاری نہیں ہوئی، کچھ الگ سا مزا آیا۔ پتا نہیں ایکسٹو کا کیا مطلب تھا، ٹوسیٹر کیا بلا تھی، اور جولیانا فٹز واٹر جیسا عجیب وغریب نام کیوں رکھا گیا تھا۔ مگر وہ پوری فضا بڑی مزے دار تھی، عمران کی شوخی بڑی چٹ پٹی تھی اور جملے عجب تیکھے سے تھے۔ دو دن میں یہ کتاب ختم کر کے واپس بنڈل میں رکھی، اور دوسری نکال لی۔

تیسری چوتھی کتاب تک میں معاملات کو کچھ کچھ سمجھنے لگا تھا اور اگر درمیان میں دو اجنبی، یعنی فریدی اور حمید نہ آ جاتے اور میں ان

٭ ادیب، کراچی۔ برقی پتا:itisakhlaq@gmail.com

کاسیٹ اپ سمجھنے کی کوششوں میں نہ الجھ جاتا تو عمران کسی قریبی دوست کی طرح میرے بہت قریب آ چکا ہوتا۔ اس دوران ہی وہ کتابیں بھائی جان کی دفتری لائبریری چلی گئیں اور ہم ستمبر کی جنگ کے بعد کراچی منتقل ہو گئے۔

کراچی آنے کے کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ ہمارے گھر سے کچھ دور جمشید روڈ نمبر ۲ پر ایک لائبریری ہے جہاں سے ہر طرح کے ناول، رسالے کرائے پر مل جاتے ہیں۔ اس زمانے میں ایسی لائبریریاں ہر محلے میں ہوتی تھیں۔ تو اس طرح جمشید روڈ کی ایک نیم تاریک، سیلن زدہ، اقبال لائبریری کے ذریعے میں نے عمران سے، فریدی اور حمید سے، اور ابن صفی سے تعلقات دوبارہ استوار کیے۔

آج پلٹ کر دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ ابن صفی کوئی جادوگر تھے جنھوں نے وہ راز پا لیا تھا جو چند مصنف ہی جان پاتے ہیں۔ یعنی اثر کرنے والی، دل میں اترنے والی، باندھے رکھنے والی کہانی تخلیق کرنا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آسان ہوتا تو ہر ماہ درجنوں اچھے کہانی کار منظر عام پر آتے اور کہانی کاروں کی قلت کا شکوہ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

آج ابن صفی کی مقبولیت کے زمانے کا احوال بیان کریں تو شاید اس پر مبالغے کا گمان ہو، مگر میں نے اپنی نوعمری میں ہی ان کے نئے ناول کی آمد کے اعلان سے پیدا ہونے والا عوامی جوش وخروش دیکھا ہے۔ میں نے کراچی کے ریگل چوک پر ان کے ناولوں کے اجرا پر بے تاب قارئین کی قطاریں دیکھی ہیں۔ اور میں محلہ محلہ قائم لائبریریوں میں ان کا نیا ناول کرائے پر حاصل کر کے پڑھنے کے خواہش مندوں کی لڑائیوں کا شاہد ہوں۔ عوامی سطح پر تیز رفتار فروخت کے یہ مناظر میں نے صرف دو مطبوعات کے لیے ہی دیکھے ہیں۔ ابن صفی کے ناول، یا پھر سب رنگ کے تازہ شمارے کی آمد۔

عوامی سطح پر ایسی مقبولیت کسی اتفاق کی بدولت نہیں ہوتی۔ یہ لکھنے کے فن میں مہارت، ذہن کی زرخیزی، عمدہ اسلوب اور برسوں پر محیط محنت کے ذریعے ہی نصیب ہوتی ہے۔ اور اسے برقرار رکھنے کا مرحلہ، بار بار ایک نئے امتحان میں سرخرو ہونے جیسا دشوار ہے۔

اردو ادب میں ایک ایسا طبقہ موجود ہے (شاید ہمیشہ سے موجود رہا ہے) جو اعلیٰ ادب، خالص ادب، مقبول ادب، عوامی ادب جیسی اصطلاحات کے سہارے کسی بھی تخلیق کار کا مقام اور مرتبہ طے کرنے کا اختیار اپنے پاس رکھنے کا آرزومند رہتا ہے۔ ان میں روایتی مبصرین بھی شامل رہے ہیں، تنقید نگار بھی، اور بعض اوقات خود لکھنے والے بھی۔ اس طبقے نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ابن صفی کے ناولوں کو ادب نہ سمجھا جائے بلکہ پاپولر ادب جیسے کسی کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ اور ایک ابن صفی پر ہی کیا موقوف ہے، اس طبقے نے آہستہ آہستہ سب کچھ مسترد کرنا شروع کر دیا ہے۔ کرشن چندر بھی، ممتاز مفتی بھی، اشفاق احمد اور بانو قدسیہ بھی، اے حمید بھی۔ استرداد کی تلوار ہے جو اندھا دھند چلائی جا رہی ہے، یہ سوچے بغیر کہ ادب میں کسی کے اچھا یا کم اچھا ہونے، معیاری یا اوسط درجے کا ہونے کے بارے میں اصل فیصلہ وقت کرتا ہے۔ جس دیے میں جان ہوتی ہے، وہی دیا رہ جاتا ہے۔ باقی سب وقت کے غبار میں گم ہو جاتا ہے۔ سو اگر آج ابن صفی کا نام، ان کے رخصت ہو جانے کے بیالیس سال بعد بھی زندہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ رد و قبول کے جو پیمانے ان ماہرین نے ایجاد کیے تھے، وہ بے کار ثابت ہوئے۔

یہ سب کچھ تو بہت بعد میں سمجھ آنا شروع ہوا۔ اس سے بہت پہلے ہی، ابن صفی کی زندگی میں ہی، یہ چٹکلہ مشہور ہو چکا تھا کہ ادب سے وابستہ بہت سے لوگ چھپ چھپ کر ابن صفی کے ناول پڑھتے ہیں لیکن ادبی نشستوں میں ان ناولوں کو ادب کا حصہ ماننے

سے انکار کر دیتے ہیں۔ یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے ابن صفی کو کبھی پڑھا ہی نہیں۔

ایسی باتوں سے ابن صفی پر اور ان کی مقبولیت پر بھلا کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ سو عمران سیریز اور جاسوسی دنیا سیریز کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ناولوں کے قارئین کی تعداد بڑھتی گئی۔

ادب اور غیر ادب کی بحث میں پڑے بغیر، تعصب کی کوئی عینک لگائے بغیر، ابن صفی کی زندگی کے سارے کام کو دیکھا جائے تو چند باتیں سامنے آتی ہیں۔ پہلی یہ، کہ وہ کہانی کی بنت کے ماہر تھے۔ غیر معمولی ماہر۔ انھوں نے سراسر فینٹسی کی دو دنیائیں تخلیق کیں اور ان دنیاؤں کو پڑھنے والوں کے لیے قابلِ یقین بنا دیا۔ اتنا قابلِ یقین بنا دیا کہ لوگ ان خالص تخیلاتی کہانیوں سے عشق کرنے لگے۔

انھوں نے دوسرا بہت اہم کام یہ کیا کہ اردو فکشن کے بے شمار قاری پیدا کیے اور اردو زبان کو ایک نئے ڈھنگ سے فروغ دیا۔ کسی بھی زبان کو فروغ دینے، عوامی سطح پر لوگوں کو زبان کی تعلیم دینے اور باریکیاں سمجھانے کے لیے دل موہ لینے والے فکشن سے بڑا ہتھیار آج تک ایجاد نہیں ہو سکا ہے۔

ابن صفی کا تیسرا کارنامہ وہ ہے جس کا آج بھی کشادہ دلی سے اعتراف نہیں کیا جاتا۔ انھوں نے ایسے لوگوں میں کہانی لکھنے کی تڑپ پیدا کی جن میں تخلیق کی کوئی نہ کوئی چنگاری موجود تھی۔ اچھا مصنف اپنے فن کے ذریعے نئے مصنف پیدا کرتا ہے۔ ابن صفی نے دو طرح کے مصنّفین پیدا کیے۔ ایک تو وہ، جنھوں نے دیکھا دیکھی اپنی ہی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا سیریز لکھنا شروع کیں جن کے کردار وہی ابن صفی والے تھے، مہم جوئی مختلف تھی۔ یہ ناول بھی ان لوگوں میں خوب مقبول ہوئے جو ابن صفی کے ناول چاٹ چکے تھے مگر ہر مہینے اسی فضا میں لکھے گئے مزید دو چار ناول پڑھنا چاہتے تھے۔ کچھ لوگوں نے ابن صفی کے ناولوں سے ملتے جلتے ناول بھی لکھے جن میں بالکل نئے کردار تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ابن صفی نے ایسے کہانی کار بھی پیدا کیے جنھوں نے اپنے لیے جاسوسی ادب یا سری ادب سے مختلف راہ منتخب کی۔ ان لوگوں نے ابن صفی کی تحریروں سے تربیت حاصل کرنے کے بعد عام زندگی کے افسانوں کی جانب، ناولوں کی جانب، فکشن کی تاحدِ نگاہ پھیلی دنیا کی جانب رخ کیا اور پھر زندگی بھر یہیں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔

میری کم نصیبی رہی کہ مجھے زندگی میں ابن صفی سے ملنے کا کبھی موقع نہ مل سکا۔ ایک بار موقع مل سکتا تھا لیکن میرے فطری تذبذب نے یہ موقع ضائع کر دیا۔ ہم کراچی یونی ورسٹی میں صحافت پڑھتے تھے۔ دوستوں سے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ ایک ادبی رسالہ نکالا جائے۔ اس رسالے ''شفق'' کا اشتہار بھی یونی ورسٹی ہی کے ایک اخبار میں چھاپ دیا۔ رسالے کی اشاعت کے لیے دو ڈھائی ہزار روپے درکار تھے۔ طے ہوا کہ کچھ اداروں اور لوگوں سے پانچ پانچ سو روپے کے اشتہار لیے جائیں۔ سو ایک تعارفی لیٹر اور ٹیرف تیار کیا گیا اور مختلف دوستوں کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ اپنے اپنے جاننے والوں سے اشتہار حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

چار پانچ دن بعد، پہلے پانچ سو روپے آ گئے۔ اب بالکل یاد نہیں کہ یہ کامیابی کس کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ ہاں، یہ یاد ہے کہ ہم کیسے دنگ رہ گئے تھے۔

یہ پانچ سو روپے ابن صفی صاحب نے بھجوائے تھے!!

مجھے تو یوں لگا جیسے کسی استاد نے میرے کاندھے پر تھپکی دی ہو۔ ایک ایسے استاد نے، جسے معلوم بھی نہیں کہ میں اور مجھ جیسے نہ

جانے کتنے لوگ اس کے شاگرد ہیں، جس نے بالکل انجان طلبہ و طالبات کی حوصلہ افزائی اس لیے ضروری سمجھی ہو کہ وہ ایک ادبی رسالہ نکالنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔

ہم نے ان پیسوں سے کتابت شروع کرا دی۔ لیکن وہ رسالہ کبھی شائع نہ ہو سکا کیوں کہ ابن صفی صاحب کے سوا کسی نے ہمیں مالی تعاون یا اشتہار فراہم کرنے کے قابل نہ سمجھا۔ ہم چند ماہ سوچتے ہی رہے کہ ایک روز جا کر ان کا شکریہ ادا کریں اور انھیں بتائیں کہ رسالہ کیوں نہیں نکل سکا۔ لیکن اسی دوران ایک روز وہ دل دوز خبر آ گئی کہ ابن صفی صاحب رخصت ہو گئے ہیں۔

کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں ہی ایسی کامیابی، ایسی مقبولیت حاصل کریں کہ انھیں پورے اعتماد کے ساتھ لیجنڈ کہا جا سکے۔ ابن صفی انھی گنے چنے لوگوں میں سے ایک تھے۔

احمد صفی ۞

ابنِ صفی کی شخصیت کے چند پہلو

مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس مضمون میں والد صاحب یعنی ابن صفی کو ان کے نام سے پکارنے کے بجائے ابو کہہ کر اسے مکمل کر سکوں۔ نام لے کر تحریر کرنے میں تصنع اور تعلّی کا پہلو در آتا ہے۔ ہاں میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ مضمون میں کہیں ان کے فن اور تحریروں سے متعلق کوئی رائے پیش کی جائے تو اسے پدرم سلطان بود کا نعرہ نہ سمجھا جائے بلکہ ایک قاری اور لاکھوں پرستاروں میں سے ایک پرستار کی رائے سمجھا جائے۔ یہ توضیح میں تقریباً ہر ایسے مضمون میں پیش کیا کرتا ہوں جہاں ابو کا ذکرِ خیر کرنا ہو۔

ابو پر جب بھی مجھے کچھ کہنے یا لکھنے کی دعوت دی جاتی ہے تو عموماً مدعا یہی ہوا کرتا ہے کہ ان کے ناولوں اور کرداروں سے ہٹ کر ان کی ذاتی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر روشنی ڈالوں کیوں کہ یہ سب معلومات تو اب مختلف مضامین اور ابو کی مستند ویب سائیٹ ابن صفی ڈاٹ انفو (ibnesafi.info) میں موجود ہیں اور ایک کلک میں دستیاب ہیں۔ اگر کہیں کسی سیمینار یا محفل میں مخاطب ہونے کا موقع ملے تب بھی شرکاء سوالوں کے وقفے میں ذاتی زندگی ہی کے بارے میں سوالات کرتے ہیں۔ اسی لیے جب انجمن ترقی اردو کے مجلّے کے لیے یہی دعوت ملی تو میں نے سوچا کیوں نہ ابو کی ذاتی زندگی ہی کے بارے میں کچھ بات کر لی جائے۔ سو یہی سوچ کر تحریر کا آغاز کر دیا ہے۔ ادبی درجہ بندی میں اس مضمون کو خاکہ ہی سمجھ لیجیے۔ امید ہے کہ شاید ان کی زندگی کے کچھ ایسے گوشوں پر روشنی پڑ جائے جو پچھلی تحریروں میں شامل نہ ہو سکے ہوں۔ اور اگر کوئی بات دوبارہ درج ہو گئی ہو تو اسے قندِ مکرر سمجھ لیجیے گا۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ایک سوال اکثر ہوتا ہے کہ وہ کب لکھتے تھے اور کیسے لکھتے تھے؟ دن بھر میں کیا مصروفیت رہتی تھی اور گھر میں سب کے ساتھ کیسے تھے؟ تو چلیے پہلے ان کے گھر میں گزرے ہوئے اوقات کا ذکر ہو جائے۔ ابو کے لکھنے کے اوقات مقرر نہ تھے جس وقت طبیعت رواں ہو جائے وہ لکھنا شروع کر دیتے تھے اور اس کے لیے ضروری نہیں تھا کہ انھیں مکمل خاموشی اور الگ جگہ درکار ہو۔ ہمارا ناظم آباد نمبر دو میں ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں ابو کے لکھنے لکھانے کے لیے الگ سے کوئی کمرہ نہ تھا۔ چار کمروں کے اس مکان میں سات بچوں، بیوی اور والدہ کے ساتھ رہتے ہوتے انھوں نے شاہکار ناول تخلیق کیے۔ دو پہر میں سوتے تھے اور اکثر رات کو بھی دیر تک لکھتے رہتے تھے۔ صبح جب ہم لوگوں کی آنکھ کھلتی تھی تو دیکھتے تھے کہ ان کا چھالیہ تمبا کو والا بٹوہ سینے پر دھرا ہے اور وہ بیدار ہوتے ہی تمبا کو سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سن انیس سو ستر تک پان بھی کھایا کرتے تھے تو پان کی ڈبیا بھی سرہانے ہی رکھی رہتی تھی جس میں امی پان بنا

۞ اپارٹمنٹ نمبر 23/6-A، سیکٹر ایف، آرمی آفیسرز ہاؤسنگ کمپلیکس، عسکری X، لاہور کینٹ، برقی پتا: ahmadsafi@gmail.com

کر رکھ دیا کرتی تھیں۔ ایک مخصوص پان والا لگا ہوا تھا جو گھر پر آ کر تازہ پان دے جایا کرتا تھا۔ ابو کے لیے ڈھاکہ والا پان آتا تھا۔ دو اقسام ہوتی تھیں سانچی اور بنگلہ۔ ابو اور آپا (ہم امی کو آپا کہتے تھے) نے سن ستر میں پان کھانا چھوڑ دیا تھا مگر دادی (اماں) کے لیے بدستور پان لیے جاتے تھے۔ پان تمباکو سے لطف اندوز ہونے کے بعد ابو حوائج ضروریہ میں وقت لگاتے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر پھر واپس چار پائی پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ یہ وہی چار پائی ہے جس کے بارے میں ان کا بیان تھا کہ یہی چار پائی مجھے سارے جہان کی سیر کرا دیتی ہے۔ اس چار پائی کا احوال بھی دل چسپ ہے۔

ابو کے چار پائی کی قابل ذکر شے ان کا تکیہ تھا۔ اس تکیہ کے نیچے پرستاروں اور نیوز ایجنٹوں کے خطوط، مختلف النوع رسیدیں، بل، اور دیگر کاغذات کی تہیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ چابیاں، بٹوہ اور ایک زمانے میں سگریٹ کیس بھی تکیے ہی کے نیچے پائے جاتے تھے۔ جب وہ لکھنے لگتے تھے تو بائیں کروٹ لیٹ کر تکیہ بغل کے نیچے دبا لیتے تھے اور دائیں ہاتھ سے فول سکیپ کاغذ پر لکھتے تھے جو کلپ والے گتے پر لگا رہتا تھا۔ دو کاغذوں کے درمیان کاربن کاغذ لگا رہتا تھا تاکہ ہندوستانی ایڈیشن کے لیے مسودے کی کاپی بھی ساتھ ساتھ ہی بنتی رہے۔ یہ کاپی ڈاک پر پابندی کے زمانے میں براستہ انگلستان یا افریقا بذریعہ ڈاک ہندوستان میں عباس حسینی چچا تک پہنچائی جاتی تھی جو اسے وہاں سے شائع کرتے تھے۔ یہ تاریخی چار پائی نہ صرف ان شاہکاروں کی جائے تخلیق تھی بلکہ کچھ اور کاموں کے لیے بھی مخصوص تھی۔ مثلاً بچپن میں ہم نے ابو کو اسی چار پائی پر بیٹھ کر داڑھی بناتے یعنی شیو کرتے بھی دیکھا ہے۔ آپا ان کی سبز پلاسٹک کی کٹوری میں پانی اور برش شیونگ کریم اور ریزر وغیرہ ایک ٹرے میں رکھ کر لے آتی تھیں اور وہ وہیں چار پائی پر بیٹھے ہوئے شیو کر لیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہ ٹریٹ بلیڈ اور وِلکنسن سورڈ کے بلیڈ شیونگ کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چار پائی پر شیو کرنا بعد میں ترک کر دیا تھا کیوں کہ پھر وقت کے ساتھ ساتھ جدید باتھ رومز اور واش بیسن کا زمانہ آ گیا تھا۔

صبح کے وقت شیو سے فارغ ہو کر اسی چار پائی پر ہی ابو ناشتہ بھی کر لیا کرتے تھے۔ یہ ناشتہ تلے ہوئے انڈے اور گھی نمک کی روٹی پر مشتمل ہوتا تھا جسے ہم بچے اچھی والی روٹی اور بڑے ٹکیہ کہا کرتے تھے،۔ اس کے ساتھ ہی چائے کی ایک پیالی۔ چائے میں آدھا یا ایک چمچ دودھ کا ڈالا جاتا تھا اور چینی بھی برائے نام ہی ہوتی تھی۔ یہ کالی چائے انھیں بہت مرغوب تھی۔ زیادہ دودھ والی چائے کہیں پینی پڑ جاتی تو دل پر جبر کر کے پی لیتے تھے، شکایت ان کے مسلک میں حرام تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر حالاتِ حاضرہ سے واقفیت کے لیے اخبار کا مطالعہ ضروری تھا۔ اس کے لیے بھی کہیں اور جانے کی کیا ضرورت تھی، وہیں چار پائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے تھے اور جنگ اخبار سامنے بچھا کر پڑھتے رہتے تھے۔ جنگ کے علاوہ چھٹی والے دن انگریزی اخبار ڈان بھی لیا جاتا تھا کیوں کہ اس کی ضخامت اور مضامین زیادہ ہوتے تھے۔ صحافت اور زبان کے معیار کے لیے وہ اسے ہم سب بچوں کو پڑھنے کی ہدایت بھی کرتے تھے۔ حالاتِ حاضرہ سے مطلع رہنے کے لیے ان کے سرہانے مرفی رچرڈز کا ایک والو والا بجلی کا ریڈیو بھی رہتا تھا۔ ٹی وی کے زمانے سے قبل شام کو سب اس کے پاس بیٹھ کر بی بی سی پر سیربین، خبریں اور پھر اسٹوڈیو نمبر نو پر ڈرامے بھی سنا کرتے تھے۔ سو آپ نے دیکھا کہ یہ چار پائی سونے، پڑھنے، لکھنے، شیو کرنے، کھانے پینے اور ریڈیو سننے ہر کام کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ابو کا یہ کہنا کہ یہ ان کو سارے جہان کی سیر کرا دیتی ہے سو فیصد درست تھا کہ ان کا جہان ہی یہ چار پائی تھی۔

دوپہر کا کھانا ابو خال خال ہی گھر پر کھاتے تھے اور اگر دن کا زیادہ حصہ گھر سے باہر گزرتا تو قرین قیاس یہی ہے کہ شاید وہ اپنی اصطلاح میں لنچ ''گول'' ہی کر جاتے ہوں گے۔ ایک زمانے میں احباب کے ساتھ باہر برنس روڈ وغیرہ جا کر مشہور کبابیوں کے یہاں سے کباب اور دیگر ماکولات سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے مگر آخر عمر میں صحت کے مسائل کی وجہ سے یہ مشاغل ترک کر دیے تھے۔ اگر دوپہر کو گھر پر رہے تو، ہماری بہنوں نزہت باجی اور ثروت اپّی کے بیان کے مطابق ایک چپاتی اور کسی ترکاری سے شوق کرتے تھے۔ انھیں گاجر کی ترکاری مرغوب تھی۔ ویسے وہ گوشت کھانا زیادہ پسند کرتے تھے اور ان کے قارئین ان کے پیش رس پڑھ پڑھ کر اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں۔ رات کے کھانے میں بکرے کا گوشت پسند کرتے تھے بھنا ہوا یا سالن کی شکل میں۔ اس کے ساتھ درمیانے سائز کی تین پتلی چپاتیاں اور بس۔ بڑے کا گوشت صحت کے مسائل کی وجہ سے کم کر دیا تھا۔ پھر بھی شامی کباب کے مقابلے میں کچے قیمے کے کباب زیادہ مرغوب تھے۔ چاول کم ہی کم کھایا کرتے تھے۔ بقرعید پر خاندانی ترکیب سے بنے ہوئے تکے اور کباب خود بھی کھاتے تھے اور اعزا، اقربا اور احباب کو کھلا کر بھی خوش ہوتے تھے۔ رات کا کھانا ہم سب عموماً ساتھ کھاتے تھے۔ ٹی وی کی آمد سے قبل ہم سب صحن کے ساتھ برآمدے میں تخت پر بیٹھ کر کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ امی اور بہنیں دادی کے کمرے میں کانا کھاتی تھیں کیوں کہ دادی ایک زمانے میں چل پھر نہیں پاتی تھیں مگر پھر آخری دور میں صحت یاب ہو کر چلنے پھرنے لگی تھیں۔ ابو کبھی کبھی اپنی چارپائی ہی پر ڈنر بھی کر لیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں ٹی وی کی آمد کے بعد پھر ہم سب بڑے کمرے میں، جسے آج کل کی اصطلاح میں ٹی وی لاؤنج کہہ لیجیے، ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھایا کرتے تھے۔ کھانے کا وقت ٹی وی پر ڈراما ختم ہونے کے بعد نو بجے خبرنامے کے ساتھ شروع ہوتا تھا۔

گھر میں جب ابو لکھ پڑھ نہ رہے ہوں تو ان کا وقت بڑے کمرے ہی میں گزرتا تھا۔ اس وقت ٹی وی کے اوقات شام چھے بجے سے رات دس بجے تک ہوتے تھے اس سے قبل ہم سب بہن بھائی بھی اپنی اپنی تدریسی مصروفیات سے فارغ ہو کر وہیں جمع ہوتے تھے۔ ابو عموماً تخت پر نیم دراز ہوتے تھے اور ہم سب ارد گرد جمع ہوتے تھے اس میں پھر خوب ہنسی مذاق اور گفتگو ہوا کرتی تھی۔ ایثار بھائی، ابرار بھائی، افتخار اور میں اکثر بحث و مباحثہ کرتے رہتے۔ بہنیں نزہت اور ثروت طرح دیتی رہتیں۔ چھوٹی بہن محسنہ کی ہم بھائیوں سے معصومانہ جھڑپوں سے محظوظ ہوتے تھے پھر ہم لوگوں کو منع کرتے تھے کہ اسے تنگ مت کرو۔ ابو ہمارے لیے ایک دوست ہی کی طرح تھے ہم ان سے ہر طرح کی بات کر لیا کرتے تھے البتہ ہم بچوں کی کسی قسم کی بدتمیزی یا حد سے تجاوز کرتی جرأت پر وہ ناراضگی کا اظہار کرتے تھے اور ہم سب کو سانپ سونگھ جاتا تھا۔ وہ شرارت پر کبھی ناراض نہیں ہوئے مگر بدتمیزی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اگر باتیں کرتے کرتے لکھنے کا موڈ ہو جاتا تو اپنا کلپ بورڈ لا کر یہیں لیٹے لیٹے لکھنا شروع کر دیتے جبکہ ہم لوگ اپنی اپنی باتوں میں مگن رہتے تھے۔ انھوں نے کبھی لکھنے کے دوران کسی کو خاموش رہنے اور ہٹ جانے کو نہیں کہا۔ اگر کبھی آپا ڈانٹ بھی دیتیں تو یہی کہتے کرنے دو، کبھی کبھی ان سب باتوں سے بھی لکھنے کی تحریک ہوتی ہے۔

بڑے کمرے میں سن انیس سو انہتر میں ایک عدد انیس انچ کا بلیک اینڈ وہائیٹ مٹسوبیشی ٹیلیویژن لا کر رکھا گیا۔ یہ اس وقت کے ایک فلم پروڈیوسر اختر حسین صاحب کی ٹیکنیکل رائے سے لیا گیا تھا اور ایک طویل عرصے تک بنا کسی خرابی کے چلتا رہا۔ اس زمانے میں ابو بہت شوق سے اردو ڈرامے، گفتگو کے پروگرام، انگریزی شوز اور فلمیں اور خبریں وغیرہ دیکھا کرتے تھے۔ راگ رنگ اور دیگر

موسیقی کے پروگرام بھی بہت شوق سے دیکھتے تھے۔ انگریزی پروگراموں میں The Desilu Playhouse, High Road Story, Alfred Hitchcock Hour, Danger Man, The Prisoner, The Saint, The Man from Uncle وغیرہ بہت پسند کرتے تھے۔ ہم بچوں میں سے کوئی پڑھائی میں دیر تک مصروف نظر آئے تو ضرور آواز دے کر بلاتے تھے کہ ویک اینڈ سنیما یا مڈ ویک سنیما میں بہت اچھی فلم آرہی ہے آکر دیکھ لو۔ اگر کوئی کہے کہ پڑھائی بہت کرنی ہے تب تو ضرور اصرار کرتے تھے کہ وقفہ کرو اور تازہ دم ہوکر پھر پڑھائی کرو۔ توشیبا کا رنگین ٹی وی انیس سو اٹھتر میں لایا گیا تھا، جو مٹسوبیشی ہی کہ جگہ پر رکھا گیا اور مٹسوبیشی کسی اور گھر کی زینت بن گیا۔ بڑا والا کمرہ مسلسل سب کے مل بیٹھنے کی جگہ بنا رہا۔ رات کو مزید بستر بچھا کر یہ ہم بھائیوں کے لیے خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوجاتا تھا۔

صبح کے ناشتے اور اخبار سے فارغ ہوکر ابو آفس جانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔ قدیمی دور کے بارے میں ہماری باجی نزہت بتاتی ہیں کہ باہر والے کمرے میں اس وقت ایک چوکی پر کاتب جناب احمد اللہ خاں سندیلوی صبح سے آکر کتابت کا کام شروع کر دیتے تھے۔ ابو آفس جانے سے قبل کچھ وقت ان کے ساتھ گزارتے تھے کہ کتابت کے کام پر نظر ڈال لیں اور اگلے صفحات کتابت کے لیے ان کے حوالے کر دیں۔ کسی کے پاس اس دور کی کتابت شدہ طبع زاد اشاعت والے ناول ہوں تو احمد اللہ صاحب کی کمال کی کتابت دیکھ سکتے ہیں ایک ایک لفظ اپنی جگہ جڑا ہوا۔ حروف اور الفاظ کے پیمانے یکساں، ذرہ بھر فرق نہیں۔ حق مغفرت کرے کیا فن کار تھے۔ اس کے بعد ابو آفس کے لیے تیار ہوتے تھے۔ پتلون قمیص پہنا کرتے تھے اور پاؤں میں ہمیشہ چمڑے کے ناگرہ جوتے ہی پہنتے تھے۔ انھیں بہت کم ڈریس شوز پہنے دیکھا۔ یہ روایت سے انحراف ان کے دور کے لیے بھی منفرد ہی تھا۔ شاید انھوں نے بھی اپنے دور کے حساب سے نئی طرز ایجاد کی ہو۔ ابو پیدل چلنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے گھر میں ہمیشہ گاڑی اور ڈرائیور دیکھا۔ ساٹھ کی دہائی میں ابو کے پاس ہل مین ہنٹر گاڑی تھی، پھر ستر کے اوائل میں اوپل ریکارڈ اور اواخر میں ٹویوٹا کرولا تھی۔ پھر بھی ابو موقع ملتے ہی اپنی اصطلاح میں ''پیدلنگ'' ہی کو ترجیح دیتے تھے۔ اکثر آفس پیدل جاتے ہی دیکھا۔ ابو کا آفس پہلی چورنگی ناظم آباد کے اس کارنر پر تھا جو فردوس کالونی میں پڑتا تھا۔ چوراہے کے باقی تین کارنر رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد ایک نمبر اور ناظم آباد دو نمبر میں واقع تھے۔ ہم دو نمبر ناظم آباد میں رہتے تھے۔ آج کل ناظم آباد پر بہت تحقیقی مضامین انٹرنیٹ پر دیکھنے کو ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے چیدہ چیدہ مشاہیر عموماً ناظم آباد ہی کے رہائشی تھے۔ ابو کا آفس جوہر مارکیٹ میں تھا جو ان کے قدیمی دوست جناب سید احمد جوہر دہلوی کی ملکیت تھی۔ یہ معروف عالم سید محمد دہلوی مرحوم کے فرزند تھے۔ ابو جس زمانے میں باقاعدہ آفس جایا کرتے تھے اس وقت ان کے احباب کی آمد و رفت وہاں رہتی تھی جن میں شاہد منصور صاحب، جانِ عالم خاں صاحب، جوہر صاحب، مصطفیٰ زیدی، انوار صدیقی، سرشار صدیقی صاحب، علامہ طالب جوہری وغیرہ شامل تھے۔ محمد رضا کاظمی صاحب نے ایک ملاقات میں ذکر کیا تھا کہ وہ اور جون ایلیا صاحب ابو سے نیا ناول لے کر طالب جوہری صاحب تک پہنچایا کرتے تھے۔ دیگر ملنے والوں میں استاد محبوب نرالے عالم جو ابو کی ناولوں کا ایک امر کردار بن گئے تھے، آرٹسٹ مشیر صدیقی، ولایت آرٹسٹ وغیرہ بھی وہیں ملاقات کو آتے تھے۔ پھر ایک مسئلہ پیدا ہوگیا۔ ناظم آباد شہر کے اچھے کالجوں کا گڑھ بھی تھا اور وہاں کے طلبہ و طالبات ابو سے ملنے اور آٹوگراف لینے کے لیے آنا شروع ہو گئے اس کے بعد پھر ابو کے لیے ممکن نہ رہا کہ وہاں بیٹھ کر کچھ کام کر سکیں لہٰذا انھوں نے آفس بند

رکھنا شروع کر دیا۔ بس شام کو وہاں سے ڈاک نکالنے جایا کرتے تھے۔

ابو کا رویہ گھر والوں، عزیزوں اور اہلِ محلہ سے ایک ہی سا تھا۔ وہ بڑوں سے عزت، چھوٹوں سے شفقت اور اپنے ہم عمروں سے محبت سے پیش آتے تھے۔ محلے میں نکلتے تو ہر ایک سے سلام دعا ہوتی۔ اکثر پڑوسیوں کے بچے بھی انھیں ابو اور ہماری والدہ کو آپا ہی کہتے تھے۔ ہماری سڑک جسے اب ابن صفی اسٹریٹ کا نام دے دیا گیا ہے، اس کے سرے پر پکی آبادی اور دکانیں تھیں ان ہی میں مشہور مچھو پان ہاؤس بھی تھی۔ مچھو صاحب ابو کو گزرتے دیکھتے تو آواز لگا کر ضرور پوچھتے تھے کہ نیا ناول کب آ رہا ہے وہ بھی ابو کے پرستار تھے۔ سن انیس سو ستر تک ابو سگریٹ سے شوق کرتے تھے۔ اس زمانے میں انھی مچھو صاحب کے یہاں سے سگریٹ لائی جاتی تھی۔ ابو تھری کاسلز سگریٹ پیا کرتے تھے۔ سگریٹ چھوڑ دینے کے بعد پھر وہ سال میں گن کر انتیس یا تیس سگریٹ پیا کرتے تھے جس کا انحصار رویت ہلال پر تھا۔ قصہ یہ تھا کہ یہ سگریٹ رمضان میں روزہ کھولنے کے فوراً بعد پی جاتی تھی۔ ابو پورے روزے رکھتے تھے۔ سو اگر انتیس کا چاند نکل آیا تو سال کی انتیس سگریٹیں پوری ہوگئیں ورنہ تیسویں افطاری میں تیسویں سگریٹ شامل ہو جاتی تھی۔ بقول ابو کے سگریٹ نوش روزہ دار کو سگریٹ کے پہلے کش کے ساتھ روزے کا پورا ثواب مل جاتا ہے۔ سگریٹ پینے کی یہی روایت ہم نے اپنے دادا صفی اللہ صاحب مرحوم میں بھی اسی طرح دیکھی۔

محلے داروں سے ابو کا سلوک مثالی تھا۔ اب تو وہ سب گھر مسمار ہو کر نئے فلیٹس بن گئے لیکن اس وقت ہمارے برابر والے ہمسائے نے اپنے گھر کی دیوار اٹھانے کے بجائے ہمارے گھر کی دیوار ہی کو اپنا گھر بنانے میں استعمال کر لیا تھا۔ برسات میں اس وجہ سے اس میں پانی بھی آ جاتا تھا اور دیوار میں دراڑ بھی پڑ گئی تھی۔ لوگوں نے کہا بھی کہ ان سے کہیں اپنی دیوار اٹھائیں مگر نہ کبھی دادا، نہ ابو نے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات کی کیوں کہ انھیں علم تھا کہ ہمسائے کے پاس وسائل کی کمی تھی۔ انھی ہمسائے کے آم کے درخت ہماری چھت سے لگے کھڑے تھے اور گرمیوں میں جتنے آم ہماری چھت پر گرتے تھے ابو کے حکم کے مطابق وہ سب ہمسائے کے یہاں پہنچا دیے جاتے تھے۔ اگر کبھی ہم بچوں کی نیت میں کھوٹ آتا تو ابو سمیت سب بڑوں کی کڑی نگاہیں ہم پر مرکوز ہو جاتی تھیں لہٰذا کبھی خیانت کی ہمت نہ پڑی۔ محلے کے لڑکے بالے بھی ان سے مزے سے بات کر لیتے تھے۔ ان میں سے اکثر انھی کے پرستار تھے۔ عزیز و اقارب کے بارے میں کبھی سخت کلمات ان کے منہ سے نہیں سنے خواہ کسی نے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچا دی ہو۔ پاکستان تو پاکستان، ہندوستان میں موجود اعزہ کا بھی وہ اسی طرح خیال رکھتے تھے اور اگر کسی کو مدد کی ضرورت پڑ جائے تو الٰہ آباد میں موجود اپنے احباب کے ذریعے استعانت کرتے تھے۔ اور اسی طرح جب ان کے ہندوستانی احباب اسی طرح کسی کی مدد کرنا چاہتے تو ابو فوراً بڑھ کر آگے آتے تھے۔ لوگوں کی عمومی مدد کے علاوہ بہت سے طلبہ کی پڑھائی میں ابو نے مدد کی اور ان کے مستقبل سنوارے۔ شاید انھی نیکیوں کے طفیل ہم سب اولادوں نے بشمول اپنی اگلی نسل کے، تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

ابو کو صرف ایک مصنف کے طور پر جانا جاتا ہے اور شاید یہی سمجھا جاتا ہے کہ دیگر ادبا کی طرح ان کا کام ناول لکھ دینے تک ہی محدود تھا۔ مگر ابو ایک مصنف ہی نہیں بلکہ ''یک شخصی ادارہ'' تھے۔ مضمون کے اختتام سے قبل میں چاہتا ہوں ان کی زندگی کے اس پہلو پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ جیسے جیسے ابو ناول لکھتے جاتے تھے کتابت کرواتے جاتے تھے۔ یہ کتابت پیلے چربہ کاغذ پر خاص روشنائی سے ہوتی تھی جس سے جست کی پلیٹوں پر لکھائی منتقل ہوتی پھر یہ پلیٹیں مشین پر چڑھا کر ان سے پرنٹنگ کی جاتی تھی۔ پھر آفسٹ کا دور

آیا۔ کتابت کے بعد فلم بنتی تھی اور اس سے پلیٹیں بن کر چھپائی ہوتی تھی۔ اسرار پبلی کیشنز کا پورا ادارہ ابو کی واحد شخصیت پر مشتمل تھا۔ وہ کتابت کروا کر پریس پہنچاتے تھے جہاں پر پلیٹیں بن کر طباعت کے لیے تیار کی جاتی تھیں۔ اسی دوران یا تو سرورق، جو پہلے سے بنا ہوتا تھا یا کہانی کی مناسبت سے بنوا لیا جاتا تھا، پرنٹ کروا لیا جاتا تھا۔ آرٹسٹوں میں صدیقی آرٹسٹ، مشیر صدیقی صاحب، ولایت صاحب، شیلے آرٹسٹ وغیرہ شامل تھے کچھ سرورق میرے برادرِ بزرگ ابرار احمد صاحب نے بھی بنائے جو اچھے انجنیئر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے آرٹسٹ بھی ہیں۔ سرورق عموماً جان عالم چچا کے تبسم آرٹ پریس میں چھپتے تھے جو پاپوش نگر میں واقع تھا۔ اسی دوران ابو پاکستان چوک کے کاغذی بازار سے کاغذ خرید کر پریس پر پہنچواتے تھے۔ یہاں طباعت کے بعد کاغذ کے دستے دفتری خانے پہنچائے جاتے جہاں طبع شدہ سرورق پہلے پہنچا دیے جاتے تھے۔ یہاں کتاب کی جلد بندی کی جاتی تھی۔ عموماً یہ کام اردو بازار کے مشہور ادارے فضلی سنز میں سرانجام پاتا تھا جس کے مالک فضل الرحمٰن صاحب مرحوم بھی ابو کے احباب میں سے تھے اور ان کے والد ادارے کے بانی مرحوم فضلِ الٰہی صاحب بھی ابو کو عزیز رکھتے تھے۔ ان کی تیسری نسل میں ساجد فضلی اور طارق رحمٰن فضلی آج بھی فضلی سنز کو کامیابی سے چلا رہے ہیں اور کاروبار میں نئی راہیں نکال چکے ہیں۔ جس دوران طباعت اور جلد بندی کا کام ہو رہا ہوتا تھا، ابو تمام نیوز ایجنٹس اور کتب فروشوں کی فہرست تیار کرتے تھے جن کو بذریعہ وی پی کتابیں بھجوائی جاتی تھیں۔ فہرست میں ہر ایجنٹ کو جانے والی کتابوں کی تعداد اور اس کا ڈاک خرچ لکھا ہوتا تھا۔ اس فہرست کی کاربن کاپی بھی تیار ہوتی تھی تا کہ ڈاک خانے والوں کو فرینچنگ مشین سے ڈاک کے ٹکٹ پرنٹ کرنے کے لیے فراہم کی جاسکے۔ انھی فہرستوں کی مدد سے پارسلوں پر لگنے والے لیبل ابو خود لکھتے تھے اور وی پی کے فارم بھی اپنے ہاتھ سے بھرتے تھے۔ اس مرحلے پر تمام ایجنٹوں کو پوسٹ کارڈ روانہ کیے جاتے تھے کہ ان کے آرڈر کے مطابق وی پی روانہ کی جارہی ہے وصول کر کے شکریے کا موقع دیں۔ یہ کارڈ ہم چار بھائیوں میں سے کسی ایک کے ذمے لگائے جاتے تھے اور ان سیکڑوں کارڈز میں خالی جگہیں بھرنے اور پتا لکھنے کا باقاعدہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ پھر جس دن اعلان کے مطابق جلد بندی کے بعد ناول تقسیم کے لیے تیار ہوتا، ابو اسے اونٹ گاڑی (بعد میں ٹرک) پر لدوا کر ریگل چوک پر متعلقہ تقسیم کار ایجنسی تک پہنچاتے۔ اس ایجنسی سے کراچی کے تمام کتب فروش خود آکر مطلوبہ تعداد میں ناول لے جاتے۔ بتانے والے بتاتے ہیں منٹوں میں یہ کام انجام پا جاتا کیوں کہ کتب فروش پہلے سے تیار کھڑے ہوتے تھے۔ ادھر ابو دفتری خانے سے بنوائے ہوئے پارسلوں پر لیبل لگوا کر ان کو ناظم آباد نمبر ایک ریلیکس سنیما والے پوسٹ آفس پہنچاتے۔ ان پر وی پی فارم بھی لف کرا دیے جاتے اور لیبلوں پر ڈاک ٹکٹ چسپاں کروا کے ڈاک خانے والوں کے سپرد کر دیے جاتے جہاں سے یہ پورے پاکستان میں پھیل جاتے۔ یوں ابن صفی کا نیا ناول اپنے قارئین تک ابن صفی ہی کی مسلسل محنت کے نتیجے میں پہنچ جاتا۔ پہلے ایڈیشن کے بعد مزید ایڈیشنز سلطان محمد ڈوگر صاحب کی زیرِ نگرانی اسرار پبلی کیشنز، لاہور سے شائع ہوتے تھے۔ آج بھی ان کے فرزند خالد سلطان اور پوتے عثمان خالد اسی محنت اور محبت سے طباعت کا یہ کام انجام دے رہے ہیں۔

تو یہ تھے ہمارے ابو، ابن صفی کی شخصیت کے وہ چند پہلو جو عموماً ان کے قارئین و پرستاروں کی نظروں سے اوجھل ہی رہ جاتے ہیں۔ انھیں دعاؤں میں یاد رکھیے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک ⃰

ابنِ صفی — ایک زیرک تخلیق کار

معروف جاسوسی ناول نگار ابنِ صفی (اسرار احمد) کا قلمی سفر اٹھائیس برسوں پر محیط ہے جس میں اُنھوں نے لگ بھگ اڑھائی سو ناول تخلیق کیے۔ ان میں سے ستر (۷۰) ایسے ناول ہیں جنھیں سائنس فکشن میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ناول 'جاسوسی دنیا' اور 'عمران سیریز' کے عنوان سے اشاعت پذیر ہوتے رہے۔ 'جاسوسی دنیا' کا پہلا ناول انھوں نے ''دلیر مجرم'' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں تخلیق کیا جب کہ 'عمران سیریز' کا آغاز ۱۹۵۵ء میں ''خوفناک عمارت'' سے ہوا۔ اس ناول میں پہلی بار عمران کا کردار متعارف کرایا گیا جو وقت گزرنے کے ساتھ شہرتِ عام اور بقائے دوام کی منازل طے کر گیا۔ ناول تحریر کرنے کا یہ سلسلہ شیزوفرینیا اور لبلبے کے کینسر میں مبتلا ہونے کے باوجود اُن کی وفات تک کسی نہ کسی طور جاری رہا۔ ابنِ صفی نے اپنے ناولوں میں ایک انوکھی اور منفرد فکشنی کائنات تشکیل دی جس میں نت نئی ایجادات کی مدد سے جرائم کا خاتمہ کیا جاتا تھا۔ ان کے بیشتر ناول قانون کی بالا دستی اور مکافاتِ جرم کے گرد محوِ گردش دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں رومان بھی ہے اور مزاح کی پھلجھڑیاں بھی ہیں۔ ان کے ناولوں کی خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ کہیں بھی انھیں جنسی تلذذ سے آلودہ نہیں ہوتے۔ انھوں نے بھر پور کوشش کی کہ وہ ایسا فکشن تخلیق کریں کہ جو سماج کی تطہیر کا باعث ہو اور معاشرہ فساد فی الارض سے پاک ہوجائے۔ اسی لیے ان کے ناولوں میں جرائم پیشہ افراد ہیرو کے روپ میں سامنے نہیں آتے۔ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد مجرم کو سزا ضرور دلاتے ہیں تاکہ ناول کو قارئین کی اصلاح کے لیے بروئے کار لایا جا سکے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ تخلیق کار کو پر سکون اور ٹھنڈے مزاج کا حامل ہونا چاہیے۔ یہ بات ابنِ صفی کے مزاج کا حصہ تھی۔ وہ متانت اور سنجیدگی سے تمام عمر افرادِ معاشرہ کو قانون کا احترام سکھا کر، تخریب سے تعمیر کا سفر جاری رکھنے کی کوششوں میں مگن رہے۔ انھوں نے ہمیشہ طاؤس و رباب سے لبریز رومانی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا کی جانب پیش قدمی پر اکسایا۔

اُنھوں نے اپنے عہد کے سماجی، ثقافتی اور نفسیاتی مسائل کو ناولوں کا حصہ بنایا اور جاسوسی عناصر کو متن میں شامل کر کے قارئین کی داد اور محبت وُصول کی۔ فکشن میں جاسوسی عناصر کو شامل کرنے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ اس کا سلسلہ الف لیلیٰ سے متعلقہ شہرزاد کی کہانی ''تین سیب'' سے شروع ہوکر ''داستان امیر حمزہ'' تک پھیلا ہوا ہے۔ دورِ جدید میں اس کا آغاز قیسی رام پوری کے ناولوں سے ہوتا ہے جنھوں نے بیسویں صدی کے شروع میں جاسوسی ناول تخلیق کیے۔ رسوا کا بھی اس ضمن میں ''خونی جورو''، ''بہرام کی کہانی'' اور ''خونی شہزادہ'' کی صورت میں کام موجود ہے لیکن جو شہرت اور عزت ابنِ صفی کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوسکی۔ اس حوالے سے

⃰ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جی سی یونی ورسٹی، فیصل آباد۔ برقی پتا: azizmaliksgd@gmail.com

انھیں موجودہ دور میں جاسوسی ناولوں کا موجد اور امام تسلیم کیا جاتا ہے۔ اکرم الہٰ آبادی، اظہار اثر، عارف مارہروی، سراج انور، مظہر کلیم اور محی الدین نواب نے بھی جاسوسی ناول تحریر کیے لیکن وہ ابنِ صفی کے مقام و مرتبے کو پانے سے قاصر رہے۔ اُنھوں نے اپنے ناولوں سے قارئین کا اتنا وسیع حلقہ پیدا کیا جو آج تک کوئی اور اُردو ناول نگار پیدا نہیں کر سکا۔ اِن میں کئی ایسے قارئین بھی شامل ہیں جنھوں نے اُردو زبان محض ان کے ناولوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے سیکھی۔ ان کی شہرت اور عوام میں مقبولیت کی بنیاد پر کچھ ناقدین نے ان کا تقابل سڈنی شیلڈن سے بھی کرنے کی کوشش کی ہے حالاں کہ موضوعاتی سطح پر دونوں ایک دوسرے سے جُدا ہیں۔

ادبِ عالیہ اور پاپولر فکشن کے مباحث کے باعث ان کی ناول نگاری کو اُردو کے سنجیدہ ناقدین نے توجہ نہیں دی جس کی وجہ سے اُردو ناول کی روایت میں اُن کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کے وہ حق دار تھے۔ ان کی وفات کے بعد سے لے کر اب تک ان کی شخصیت پر سوشلستان (سوشل میڈیا) میں بہت سا مواد سامنے آیا ہے جس سے ان کی شخصیت اور فن اُجاگر ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے نظریہ فن اور شخصیت پر راشد اشرف، محمد عارف اقبال، محمد فیصل، خالد محمود اور خالد جاوید نے بھی وقیع کام کیا ہے جو اُن کی شخصیت اور فن کے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کرنے میں معاون ثابت ہوا ہے۔ ناقدین کا خیال ہے کہ انھیں کردار تخلیق کرنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ انسپکٹر احمد کمال فریدی، سارجنٹ حمید اور عمران کی صورت میں اُنھوں نے ایسے لازوال کردار تخلیق کیے جن کی یادیں آج بھی ان کے قارئین کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔ انسپکٹر فریدی سنجیدہ شخصیت کا مالک ہے جس کی زندگی کا مشن قانون پر عملداری کرانا ہے۔ اس خصوصیت کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ایک ''سپر ہیو مین'' تخلیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ سارجنٹ حمید کی شخصیت مزاح کی علمبردار ہے جو قاری کو ہنساتے ہوئے فریدی کے لیے راستا ہموار کرتا جاتا ہے۔ عمران کی شخصیت تہہ دار اور اسراریت کی حامل ہے، ایک ایسا ''ایکس ٹو'' جو جاسوس کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اس سے دیگر ممالک کی جرائم پیشہ تنظیمیں بھی خوف کا شکار رہتی ہیں۔ یہ کبھی خوش مزاج ہوتا ہے تو کبھی بھیانک جیسے اس کردار میں حمید اور فریدی دونوں اکٹھے ہو گئے ہوں۔ بعض مقامات پر تو وہ خود بھی کہیں کہیں اس کردار کے عقب سے جھانکنے لگتے ہیں۔ عمران کے کردار میں کئی ایسے خدوخال بھی موجود ہیں جس کی بنیاد پر کہا سکتا ہے کہ ابنِ صفی طلسم ہوش رُبا کے عمرو عیار سے متاثر ہیں۔ علی عمران کا کردار انھوں نے کہیں سے مستعار نہیں لیا بلکہ اس کا خمیر ہندوستانی معاشرے سے اٹھایا ہے۔ اسی لیے وہ جیتا جاگتا اور زندہ انسان نظر آتا ہے۔ اس کی ساخت کچھ اس انداز سے تعمیر کی گئی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں جدید اور مابعد ہونے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ وہ بظاہر روایتی اصولوں کا قائل نہیں لیکن جب بات دشمنوں اور وطن فروشوں کی آتی ہے اس وقت وہ شدت سے روایت پسندی کا چولا اوڑھ لیتا ہے۔ اسی بنیاد پر کچھ ناقدین نے اس کا موازنہ داستان طلسم ہوش ربا کے کردار عمرو عیار سے کیا ہے۔ درحقیقت وہ ایسا کردار ہے جو انتہائی مایوس کن اور کٹھن صورت میں بھی امیدوں اور آرزوں کے سلسلے کو شکست خوردہ نہیں ہونے دیتا۔ دنیا قنوطیت کا شکار ہو سکتی ہے لیکن عمران ہمیشہ پُر امید نظر آتا ہے۔ مہم جوئی اور سنسنی خیزی اس کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ موجودہ دور کی سائنسی اور تکنیکی صورتِ حال بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ انسان آرام سے نہ بیٹھے بلکہ ہر دم محوِ سفر دکھائی دے۔ کیوں کہ متحرک رہنے میں ہی زندگی ہے اور تھک کر ایک جگہ بیٹھ جانا موت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ انھیں بچپن سے ہی طلسم ہوشربا کے متن نے اپنا اسیر کیے رکھا اور پھر رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں نے، ان کے تخیل کو دوآتشہ کر دیا۔ اردو اور انگریزی پر دسترس کے

ساتھ ساتھ انھیں یونانی اور مصری اساطیر سے بھی بطورِ خاص دل چسپی رہی۔

ان کے ہاں کچھ کردار ایسے بھی ہیں جنھیں منفی کردار کہا جا سکتا ہے۔ان میں تھریسا، سنگ ہی، الفانسے، جیرالڈشاستری، علامہ دہشت ناک اور کبڑا وغیرہ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ناول ''پیاسا سمندر'' میں تھریسا ایک خیالی ملک ''زیرولینڈ'' کی سربراہ ہے جو دنیا کے نقشے میں کہیں موجود نہیں۔ مذکورہ ملک صرف اور صرف ان کے تخیل کی پیداوار ہے۔اس کے رہائشی اپنی ایجادات اور ترقی کے بل بوتے پر پوری دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔''زیرولینڈ'' کی صورت میں انھوں نے ایک ایسا استعارہ تخلیق کیا ہے جس کے ذریعے انھوں نے یہ پیغام دیا ہے کہ یہ دنیا معرکۂ خیر وشر کی آماج گاہ ہے۔طاقت کی مذکورہ تنظیم سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے پوری انسانیت کو اپنے خود ساختہ نظریے کے تابع کرنا چاہتی ہے۔ذہانت اس تنظیم کا امتیازی وصف ہے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے غریب ممالک کو غلام بنانا اس کی ضرورت ہے۔اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے وہ انسانیت کو پامال کرنے سے بھی باز نہیں آتی۔انھوں نے انسانیت کے خلاف بڑی طاقتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے لیے لیزر اور کیمیائی ہتھیاروں کے علاوہ حیاتیاتی ہتھیاروں کی بھی نشان دہی کی ہے۔اسی طرح ''شکرال'' کے علاقے کا بیان بھی ان کے زرخیز تخیل کا کارنامہ ہے جس کے باشندے قبائلی ہیں اور وہ شجاعت، بے خوفی اور جنگ جوئی کی صفات سے مالا مال ہیں۔سنگ ہی اور تھریسا کے کردار بار بار ان کے ناولوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔یہ اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود قاری کو اپنے سحر میں لیے رکھتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہماری جیتی جاگتی دنیا کے فطری انسان ہیں۔ان منفی کرداروں کے اعمال سے معاشرے میں فساد پھیلتا ہے جس کا قلع قمع مثبت کرداروں کے اعمال سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔یہی وجہ ہے ان کے کردار قارئین کے قلب و ذہن پر اپنے اَن مٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔فریدی، عمران، حمیدی، قاسم، آصف، انور، رشیدہ، جولیا، جوزف اور سلیمان جیسے کرداروں پر ابنِ صفی کی گرفت اتنی مضبوط ہے جو انھیں فن کے اعلا درجے پر فائز کرتی ہے۔کردار نگاری کے فن کو انھوں نے اس خوبی سے برتا ہے کہ ان کے کئی کردار منفی ہونے کے باوجود لافانیت کے حامل ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں دو عالم گیر جنگوں کے باعث، سائنسی ترقی اور نت نئے نظریات نے انسان کی فکر میں ایسا انتشار پیدا کیا کہ انسان مذہب بیزار ہو گیا۔اس کا زندگی کی اعلیٰ اقدار سے اعتبار اٹھ گیا۔اس کے اثرات جہاں معاشرے کے دیگر افراد پر مرتسم ہوئے وہیں قلم اور قرطاس سے جُڑے طبقے نے بھی اس چیز کو شدت سے محسوس کیا۔ادیبوں میں کھلی آزادی کی روش زور پکڑنے لگی۔وہ مذہب بے زار ہو کر معاشرے کے جرائم اور ظلم و استحصال میں مذہب کو ذمے دار ٹھہرانے لگے۔ان کے لیے ضروری تھا کہ مذہب میں جو آلائشیں شامل ہو گئی ہیں ان کی اصلاح کی جائے مگر انھوں نے وجودِ الٰہی سے ہی انکار کر دیا۔ایسی صورتِ حال میں حقائق کی بصیرت رکھنے والوں کو کافی مسائل کا سامنا ہوا۔اس صورتِ حال کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ مذہب بیزار مفکرین اپنے ہی نظریات کو سچی حقیقت کا رنگ دے کر یہ ضد کرنے لگے کہ جو کچھ وہ کہ رہے ہیں وہ ہی کائناتی حقیقت ہے۔اس رویے کو اگر دانشورانہ دہشت گردی سے موسوم کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔حالاں کہ عقل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اپنا نظریہ پیش کر کے خاموشی اختیار کر لیتے، کٹر مبلغ نہ بنتے اور آزادیٔ رائے کا تہ دل سے احترام کرتے۔ایسی صورتِ حال میں وہ ادیب جو آفاقی سچائیوں کے قائل تھے انھوں نے ان کے جبر و استحصال کا مقابلہ کیا۔ابنِ صفی کا تعلق بھی ادیبوں کے اسی زمرے سے تھا۔وہ بھی ان نام نہاد ادیبوں کے عتاب کا شکار رہے۔وہ اپنے مخصوص

نظریات کے باعث عوام میں تو ہمیشہ مقبول رہے لیکن مخالف دھڑے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے ان کو ہر محاذ پر نقصان پہنچایا۔

ان کے ناولوں میں ماضی پرستی کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کی تحریریں حال اور مستقبل کو مہارت سے مربوط کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ عام سا فہم رکھنے والا قاری بھی ان کی تحریروں کی زیریں لہروں میں مستقبل بینی کو محسوس کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ سماج میں ہونے والی کج رویوں اور بدعنوانیوں پر عمیق نگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے بین الاقوامی اور ملکی سطح پر موجود نشہ آور اشیاء، جنسی بے راہ روی کے نتیجے میں ہونے والے جرائم، فلمی صنعت کا بگاڑ، وطن فروشی، غداری اور اقتصادی جرائم جیسے موضوعات کو اپنے ناولوں میں پیش کیا۔ ان کی تحریریں اس بات کی غماز ہیں کہ وہ ایک سچے اور کھرے محبِ وطن، دیانت دار شخصیت کے حامل انسان اور بردباری و حلم کا پیکر تھے۔ انھوں نے شروع دن سے ہی جو اپنا نصب العین مقرر کیا آخری دن تک اس پر کاربند رہے۔ وہ اردو زبان سے حقیقی محبت کرتے تھے، اسی لیے ان کی خواہش تھی کہ دنیا کے تمام حصوں میں اردو بولنے، سمجھنے اور لکھنے والے موجود ہوں۔ دوسری عالمی جنگ اور اردو زبان کے بتدریج انحطاط نے انھیں ناول نگاری کی جانب مبذول کیا۔ ورنہ وہ اپنی نثری تحریروں سے پہلے بطور ایک شاعر کے، اپنا آپ منوا چکے تھے۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تاریخ، فلسفہ، نفسیات، جنسیات اور سائنس کے افق کے شناور بھی تھے۔ مسلسل مطالعے اور مستقبل بینی کی عادت کے باعث انھوں نے کئی ایسے ناول تخلیق کر ڈالے جو Futurology کو محیط ہیں۔ خاص طور پر سائنسی ترقی اور اس کے منفی اثرات کی پیش بینی کی اور اس حوالے سے حیرت انگیز انکشافات کیے۔ انھوں نے دوسری عالم گیر جنگ کے بعد بین الاقوامی سیاسی و سماجی صورتِ حال سے اردو قارئین کو آگاہ کیا۔ یوں انھوں نے ادب کو سیاسی و سماجی صورتِ حال سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔

ان کے کرداروں کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں کی شعریات میں خیر و شر کلیدی درجہ رکھتے ہیں۔ وہ انسانی نفسیات اور معاملاتِ زندگی پر جس طرح نظر رکھتے تھے، اسے کسی نہ کسی کردار کے توسط سے ناول کا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کے ناولوں میں عصری معاملات اپنی پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔ صرف یہی نہیں ان کے ہاں عصرِ رواں سے آگے نکل کر دیکھنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ بہت سے تصورات ایسے ہیں جو جس وقت بیان کیے گئے تھے اس وقت وہ محض تصورات تھے لیکن اب حقیقت کا درجہ اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً ''زیرو لینڈ'' میں پیش کیا جانے والا طیارہ ایکو ریڈار آج کے دور میں ڈرون میزائل سے مماثل ہے۔ اسی طرح Cryptography کا تصور ان کے ناولوں میں کافی عرصہ قبل پیش کیا گیا تھا جو آج ہم Password کی صورت میں موبائل، کمپیوٹر اور دیگر آلات میں استعمال کرتے ہیں۔ چمکیلے غبار کے تصور کو Multi Ammunition softkill system سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو جنگی جہازوں کی حفاظت کا ضامن ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ ان کی پیش بینی کی قوت انھیں اپنے معاصر ناول نگاروں سے منفرد مقام عطا کرتی ہے۔

ڈاکٹر شاہد اشرف ٭

ابنِ صفی — ایک غیر معمولی ادیب

بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا رجحان اسکول کے زمانے میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں ''لیل و نہار''، ''تعلیم و تربیت''، ''چاند''، ''بچوں کی باجی''، ''بچوں کا باغ'' سمیت کئی رسائل مطالعے میں آئے۔ ادبی ذوق کی بیداری میں ان رسائل کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ بتدریج اشفاق احمد اور پھر ابنِ صفی کو پڑھنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ''سسپنس ڈائجسٹ''، ''سب رنگ'' اور ''جاسوسی ڈائجسٹ'' کی باری آئی۔ اُن دنوں تفریح کا بہترین ذریعہ رسائل ہوتے تھے۔ یہ الگ بات کہ اُنھیں پڑھنا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کتاب میں رسالہ چھپا کر پڑھنے کی مشترکہ روایت بھی موجود ہے اور پکڑے جانے پر سزا کا ضابطہ بھی یکساں لاگو ہوتا تھا۔ اسی دوران میں، جانے کب باقاعدہ ادب کے مطالعے کا آغاز ہوا جو میری زندگی میں اہمیت اختیار کر گیا۔ البتہ پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو باقاعدہ ادب کے مطالعے سے پہلے جو لکھاری اب بھی اپنے زبان و بیان اور اُسلوب و تکنیک کی بنا پر ممتاز دکھائی دیتا ہے، وہ بجا طور پر ابنِ صفی ہے۔

ابنِ صفی جاسوسی ادب کے باب میں سب سے الگ، منفرد اور جدا حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا زرخیز ذہن نہ صرف کرداروں کی تخلیق بلکہ کہانی کی ترتیب میں بھی حد درجہ کمال رکھتا ہے۔ ہم اس کہانی کا حصہ بن جاتے تھے اور خود کو عمران کی صورت دیکھتے تھے۔

''عمران سیریز'' کے لیے مختلف کرداروں کا انتخاب، نفسیات، زبان اور دائرۂ کار کے پیچھے ایک لکھاری کی غیر معمولی ذہنی صلاحیت حیران کن ہے۔ یعنی عمران، جوزف، کیپٹن صفدر، کرنل فریدی اور قاسم سمیت دیگر کردار الگ الگ خصوصیات کے حامل ہیں۔ سنسنی خیزی، مہمات، سائنسی ایجادات، خوف کی فضا اور ناقابلِ یقیں واقعات کے تناظر میں اُن کے ناول اردو میں ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ تخلیق کار کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں آئندہ کے حالات و واقعات کی پیشین گوئی کرتا ہے۔ ابنِ صفی کے کئی ناولوں میں سائنسی ایجادات اور واقعات من وعن دیکھنے میں آئے ہیں جس کی مثال ''نیلے پرندے'' ہے۔ اس ناول میں امریکا نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عراق پر کیمیائی ہتھیاروں اور ایٹمی ہتھیاروں کو بنیاد بنا کر حملہ کر دیا۔ پچاس سال پہلے اس حملے کی پیشین گوئی کسی غیر معمولی ذہنی صلاحیت کی مرہونِ منّت ہے۔

اسی طرح ''پیاسا سمندر'' ناول میں سائنسی ایجادات کا ہوش رُبا بیان ہے جس میں پانی میں شعاعیں، ٹرانسمیٹر، مصنوعی سیارے وغیرہ شامل ہیں۔ واچ ٹرانسمیٹر حد درجہ کشش کی حامل ایجاد ہے جس کے ذریعے عمران اپنے ارکان سے رابطہ کرتا ہے۔ آج جب بچوں کی کلائی پر یہ واچ دکھائی دیتی ہے۔ تو سوچتا ہوں کہ ابنِ صفی اپنے عہد سے کم از کم پچاس برس آگے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اُس

٭ استاد، شعبۂ اردو، ایف سی یونی ورسٹی، لاہور۔ فون: ۰۳۰۰۔۷۶۱۹۱۶۲

نے واقعات وایجادات کے تناظر میں جن چیزوں کی نشان دہی کی ہے، اُسے قارئین نے اپنی آنکھیں ہوتا ہوا دیکھا ہے۔

اردو ادب میں جاسوسی ادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق مرزا ہادی رسوا نے ماری کوریلی کے پانچ ناول ''خونی بھید''، ''خونی جورو''، ''خونی مصور''، ''خونی عاشق'' اور ''بہرام کی رہائی'' کو اردو میں ترجمہ کیا۔ یوں جاسوسی ادب کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد کچھ غیر معروف ادبا کے جاسوسی ناول بھی منظرِ عام پر آئے مگر اردو میں باقاعدہ جاسوسی ادب کا آغاز بجا طور پر ابنِ صفی سے ہوتا ہے۔ اُن کی تکنیک سب سے جدا ہے۔ وہ کہانی کا اختتام پہلے بنا دیتے تھے اور پھر آغاز کرتے تھے۔ اس طرح ذہن اُلجھا رہتا تھا اور تجسّس برقرار رہتا تھا۔ کہانی کا تانا بانا قاری کو حیرانی اور پریشانی میں مبتلا رکھتا تھا۔ اس دوران میں غیر مربوط واقعات قاری کی ذہنی جستجو کا باعث بنتے تھے۔ ان ضمنی واقعات کو آخر پر مربوط کرنے کا ہنر صرف ابنِ صرف کا خاصا ہے۔ اختتام پر وہ اس عمدگی اور چابک دستی سے واقعات کی کڑیاں ملاتے تھے کہ قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ افسانے میں یہ ہنر تو کئی ادبا کے ہاں نظر آتا ہے مگر دو سو صفحے سے ناول میں اس ہنر کو آزمانا جُوے شیر لانے سے کم نہیں ہے اور وہ اس باب میں خاتم تصور ہوتے ہیں۔ وہ ہماری پہلی ادبی تربیت کرنے والوں میں شامل ہیں۔

میرا خیال ہے کہ وہ واحد رائٹر ہیں جو جاسوسی ادب میں زبان و بیان کی نزاکتوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ اُن کے ہاں تخلیقی جملوں کی بھرمار ہوتی ہے جن میں ادبی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عمران کے مزاحیہ کردار نے اسے فکاہیہ ادب میں بھی خاص مقام عطا کر دیا ہے۔ اُن کے مزاح میں شستگی، برجستگی اور عمدگی پائی جاتی ہے۔ اُنھوں نے مزاح میں اخلاقیات کو بھی ملحوظ رکھا ہے اور یہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اُنھیں علم تھا کہ مزاح میں سستا پن تحریر کو آلودہ کر دیتا ہے۔ یوں اُنھوں نے غیر محسوس انداز میں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ مزاح کے باب میں بھی انفرادیت پیدا کی ہے۔ ایک بات اور بھی اہم ہے کہ اُنھوں نے مزاح اور تجسّس کو یک جا کر دیا ہے جو اس سے پہلے اردو ادب کی تاریخ میں کم دکھائی دیتا ہے یا ناپید ہے۔ عمران محض ایک کردار ہی نہیں ہے بلکہ ہماری روایات، اقدار، تہذیب اور سماج کا نمائندہ بھی ہے۔ سو اس کردار میں وہ تمام رنگ جلوہ گر ہیں جن کی معاشرے میں توقع کی جاسکتی ہے یا ہم اپنی تصوراتی دنیا میں اس کردار کو الگ الگ خال و خد میں دیکھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہیری پورٹر ناولوں پر جب فلمیں بنائی گئیں تو بہت سے لوگوں نے اعتراض کیا کہ جس ہیری پورٹر کا تصور ناولوں کو پڑھ کر ہمارے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ فلم میں اُس سے مختلف ہے اور گراں گزرتا ہے۔ دیکھا جائے تو ''عمران سیریز'' پر فلمیں نہ بنانے سے بہرحال ہمارا الگ الگ عمران اب بھی تصورات میں جلوہ گر ہے۔ اگر فلمیں بن جاتیں تو شاید گراں گزرتا۔

ابنِ صفی کے جن ناولوں نے حد درجہ شہرت حاصل کی، اُن میں ''زمین کے بادل''، ''طوفان کا اغوا''، ''چاندنی کا دھواں''، ''سہمی ہوئی لڑکی'' اور ''قاتل کا ہاتھ''، ''دیو پیکر پرندہ''، ''چمکیلا غبار''، ''زہریلا ستارہ''، ''خوف ناک عمارت''، ''بھیانک آدمی''، ''پُراسرار چیخیں''، ''نیلے پرندے''، ''درندوں کی بستی''، ''لاشوں کا انبار'' سمیت بیسیوں ناول شامل ہیں۔

سرور جاوید*

تجسّس کی دنیا اور ابنِ صفی

حیرت، امید، تجسس اور جستجو سے یہ دنیا عبارت ہے ایک وقت تھا کہ لوگ خواب دیکھا کرتے تھے تعبیروں کی تلاش میں قریہ قریہ اور دیس دیس جاتے۔ آج دنیا کے اس طلسم کدے میں سائنسی ایجادات، انفارمیشن کی بھرمار اور دنیا کی ہر جگہ ہر علم ہر کتاب ہر تصویر انٹرنیٹ کی بدولت ہر شخص کی جیب میں منتقل ہوگئی ہے۔ حاصل کی اس آسانی نے آج کی نسل سے خواب دیکھنے کا رومانس بھی چھین لیا ہے۔ کڑے حقائق کی اس دنیا میں انسان نہ صرف اپنے قریبی رشتوں بلکہ خود اپنی ذات سے بھی دور ہوگیا ہے۔ لاتعلقی کے عفریت نے پہلے ایک پوری نسل کو تنہا کردیا اور پھر رفتہ رفتہ فرد سے اس کی تنہائی بھی چھین لی گئی۔ اب انسان شاید انسان بھی نہیں رہا ایک مشین بن گیا ہے۔ اسے مشین اور ٹیکنالوجی چلا رہی ہے۔ اس کے مستقبل اور ذاتی زندگی کا تعین بھی وہ خود نہیں کر پا رہا۔

شاید اب انسان کے پاس دو ہی راستے باقی رہ گئے ہیں۔ پہلا یہ کہ وہ کلی طور پر ٹیکنالوجی کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ سرنڈر کر دے اور آنکھیں بند کر کے اس راستے پر چلتا جائے جس کا تعین مشینیں اور ٹیکنالوجی ہی اس کے لیے کردیں۔ حتیٰ کہ اس کی نشست و برخاست بھی ان کی تابع ہو جائے۔ اسے کیا کھانا ہے، کیا پہننا ہے، کون سی ورزش کرنی ہے، کون سی دوا لینی ہے، کون سا پیشہ اختیار کرنا ہے، کن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے، قوموں کو کن دوسری قوموں سے تعلق بڑھانا ہے، کن کو نظر انداز کرنا ہے، کون سے مسائل کے بوجھ تلے دب کے رہنا ہے، کن حقیقی مسائل سے اجتناب کرنا ہے۔ غرض انسان کے تمام تر انفرادی افعال اور قومی افکار سب مشینوں اور ٹیکنالوجی کے تابع ہیں۔ اس صورتحال میں انسان کی اپنی کوئی ذاتی حیثیت یا قوم کی اجتماعی سوچ برقرار نہیں رہ سکتی۔

اور دوسرا رستہ یہ کہ وہ خود کو کمپیوٹر اور موبائل کی سکرین سے جس قدر ممکن ہو دور رکھے۔ خود کو اپنے حقیقی رشتوں سے نہ صرف جوڑے بلکہ اس تعلق کو مضبوط ترین کرلے اور خود کو فطرت سے ہم آہنگ کرلے۔ دوسرا راستہ کٹھن ہے لیکن انسان کو حقیقی دنیا سے جوڑ کر رکھنے کا یہی ایک راستہ ہے۔ اس راستے پر چلنے والے لوگ اگرچہ خال خال ہیں لیکن یہی وہ لوگ ہیں جو شرفِ انسانی اور اشرف المخلوقات کہلانے کے مستحق ہیں۔

حالات بہت گمبھیر رخ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ انسان اگر اپنی اصل کی طرف نہ لوٹا تو شاید یہی انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی تہذیب اپنی ثقافت اور اپنی اقدار کا قتل کرکر کے خود کو مشینوں اور ٹیکنالوجی کے سپرد کردے اور اس کی اپنی حیثیت ختم ہوجائے۔ لیکن چند عشرے پیچھے کی طرف سفر کرتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد کے تین عشرے بہت اہم تھے۔ نوزائیدہ مملکت میں ایک قوم تشکیل پا

---

* کوئٹہ

رہی تھی۔ انسان کے بہت سے خواب تھے۔ لوگ محنتی، جفاکش اور قناعت پسند تھے۔ علم کے حصول کے طالب تھے۔ جدید دور کی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔

اس دور کے نوجوان جن ادیبوں کو پڑھا کرتے تھے ان میں ابنِ صفی کا نام بہت اہم ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بڑا ادب تخلیق کر رہے تھے، بلکہ اس لیے کہ وہ نوجوان نسل کے ذہنوں میں موجود حیرت اور تجسس کو اپنی تحریروں اور اپنی کتابوں کے ذریعے کچھ ایسے کرداروں کے توسط سے مقبول بنا رہے تھے جن کے پاس ان کے مسائل کا حل موجود تھا۔ وہ بہت مشکل اور پراسرار مسائل کو نہ صرف فینٹسی دے رہے تھے بلکہ مختلف انداز میں مشکل زندگی، سخت مسائل اور جرائم کے نئے طریقوں کو اپنے کرداروں کے نئے طریقوں سے ناکام بنا رہے تھے۔ وہ پڑھنے والے اپنی کہانیوں کا حصہ بنا لیتے تھے اور پڑھنے والا ان حالات میں خود کو ہیرو تصور کرتا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان مشکل مسائل کو ابنِ صفی کا کردار نہیں بلکہ وہ خود حل کرنے کے مشن پر نکلا ہوا ہے۔ چونکا دینے والے مراحل سے گزر کر کامیابی کی منزل پر پہنچنے والا ابنِ صفی کا کردار نہیں بلکہ وہ خود تھا۔

تجسس نے انسان کے نفسیاتی اور معاشرتی ارتقا میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس طلسم زار میں جو داخل ہوا اس کے لیے امکانات کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے۔ معاشرتی ارتقا میں تجسس کا کردار اس لیے اہم ہے کہ اس کے پیچھے بھاگتے ہوئے انسان تھکا نہیں اور چلتا چلا گیا۔ آگے بھی چلتا رہے گا۔ اس راہ میں منزل کا تعین آپ نے خود کرنا ہے چاہے تو منزلوں سے بھی آگے نکل جائیں۔

نفسیاتی سطح پر تجسس اک صدائے کن فیکون ہے کہ یہ ازل سے اب تک انسانی ذہن کو وسعت دیتی چلی آ رہی ہے۔ مطالعہ دراصل تجسس پیدا کرتا ہے، اور تجسس ذہن کی آبیاری کرتا ہے۔ یوں تو ہر صنفِ ادب قاری کی دل چسپی پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے تجسس ہی کا سہارا لیتی ہے لیکن سائنس فکشن کے لیے یہ کام سب سے زیادہ آسان ہے۔

شرلاک ہومز نے انیسوی صدی کے بعد سے اب تک ذہنوں پر اپنے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ نثر، ڈراما، فلم اور خصوصا جاسوسی ناول اب تک اس کے سحر سے نہیں نکل پائے۔ ابنِ صفی نے مغرب سے اس صنف کو اپنایا اور کامیابی سے مشرقی معاشرے کا حصہ بنا دیا۔ انھوں نے برصغیر کے نوجوانوں کو سائنس فکشن کی مسحور کن دنیا سے متعارف کروایا۔ جاسوسی ناولز ابنِ صفی سے پہلے بھی لکھے جا رہے تھے۔ لیکن ان موضوعات پر سب سے زیادہ سنجیدگی اور قوت سے لکھنے والے ابنِ صفی ہی ہیں اور اس لشکر کا قافلہ سالار بھی انھی کو سمجھا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ ان کو پڑھ کر نامور جاسوسی رائٹر بنے۔ اس کے ساتھ اردو ادب کے بڑے بڑے نام ان کے مداحین میں سے تھے اور انھیں باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔

ابنِ صفی ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ کو اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جاسوسی ناول لکھنے کا آغاز ۱۹۵۲ میں کیا اور اپنی آخری عمر تک لکھتے رہے۔ ان کے ناولوں کی کل تعداد ۲۵۰ ہے جو کہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے نام سے شائع ہوئے۔ ان کے ناولوں کی مقبولیت کے ایسی تھی کہ بک سٹور تک پہنچتے ہی تمام کاپیاں بک جایا کرتی تھیں۔

ابنِ صفی نے اپنے ناول 'زمین کے بادل' کے پیش لفظ میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ان کے (اس وقت تک کے لکھے) آٹھ ناول مغرب سے مستعار لیے گئے تھے۔ ابنِ صفی کا جاسوسی ناول کی طرف مائل ہونے کا فیصلہ مغربی ادب سے متاثر ہوسکتا ہے لیکن

انھوں نے صرف اپنے معاشرے کی ہی کہانی لکھی۔ اور یہ صنف بھی گویا کہ انھی کے لیے بنی تھی۔ انھوں نے جاسوسی طرز کے ناولز کو بہت اچھی طرح سے نبھایا اور اپنے پیرائے میں منفرد اور متاثر کن تحاریر سے نوجوانوں کو مطالعے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے تفنن اور تجسس کے ذریعے انسان کی انفرادی اور سماجی نفسیات کی بہترین عکاسی کی۔

پاکستان میں جاسوسی ناولز کی اس اہمیت سے انکار ممکن نہیں کہ اس کی ریڈر شپ دیگر اصناف سے زیادہ رہی ہے۔ اس نے عام قاری کو سب سے زیادہ اپنی طرف مائل کیا ہے جن کو ادب کی بہت سی دیگر اصناف مائل نہ کر سکیں۔ اور اس میں ابنِ صفی کا بہت اہم کردار ہے کہ انھوں نے ادب دوستی کو فروغ دیا اور نوجوانوں میں پڑھنے اور لکھنے کا شوق پیدا کیا۔

جاسوسی ناولز کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ ان کے کرداروں کو طلسماتی کشش حاصل ہوتی ہے۔ قاری پڑھنے سے پہلے ہی انھیں ایک سپر ہیومن تصور کر چکا ہوتا ہے۔ یہ آزادی مصنف کے لیے امکان بھی ہے اور امتحان بھی۔ کہ کردار کو اتنا کمزور بھی نہیں ہونے دینا کہ قاری کی توقعات ٹوٹ جائیں، اور اتنی طاقت بھی نہیں دینی کہ وہ کہانی سے بڑا ہو جائے۔ ابنِ صفی نے اس فن کو معراج تک پہنچایا۔ انھیں کردار سازی کے فن میں مہارت تھی۔ انھوں نے اتنے خوب صورت اور مضبوط کردار تخلیق کیے جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

ابنِ صفی نے آنے والے زمانے کی نبض جانچتے ہوئے انتہائی سہل پیرایہ اظہار اپنایا۔ ان کا طرزِ بیان اتنا آسان تھا کہ بچے بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اب اسے فائدہ کہیے یا نقصان لیکن ابہام کے باقی رہ جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس سہولت نے ان کے مداحین میں بھی بے پناہ اضافہ کیا اور ناقدین میں بھی۔

ابنِ صفی نے اس صنف کے ساتھ بھی انصاف کیا اور اپنے قاری کی ادب سے جڑی توقعات کو بھی ٹوٹنے نہیں دیا۔ ان کی سہل اور متاثر کن تحاریر نے کتنے ہی لوگوں کو ادب سے روشناس کروایا۔ بہت سے لوگ انھیں پڑھ کر لکھاری بنے۔ ابنِ صفی نے قاری کو یہ اعتماد دیا کہ ان کے کتاب سے جڑنے کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔

ابنِ صفی کا ایک اور کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ایسا میدان کا منتخب کیا تھا جس میں انھیں بھونڈے، ناقص اور متنازع کونٹنٹ کی ضرورت نہیں پڑی۔ انھوں نے نہ مذہب کی نفی کا سہارا لیا، نہ اخلاقیات سے گری ہوئی کوئی بات کی۔ بلکہ اس کے برعکس مشرقی معاشرے کے ان اہم ستونوں کو مزید مضبوط کیا اور انھیں معاشرے کی بہتری کے لیے استعمال کیا۔ یہ بات ان کی تحریروں سے واضح طور پر جھلکتی ہے کہ ہمیں مغرب کے ادب سے شغف ضرور رکھنا چاہیے لیکن مغرب کی کمزور اور بھدی روایات سے اپنے معاشرے کو آلودہ نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں اپنی روایات سے جڑے رہنے پر فخر تھا۔ اور یہی ان کا طرہ امتیاز بنا۔

ابنِ صفی نے حب الوطنی، حق پرستی، وفا، کردار کی پختگی اور ایمان کو ایک ہیرو کی شخصیت کا لازمی جزو بنا کر پیش کیا۔ ابن صفی خود کہتے ہیں: ''یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے...... میں ہر حال میں شر پر خیر کا پرچم لہرانا چاہتا ہوں، میں باطل کو حق کے سامنے سر بلند نہیں دکھانا چاہتا۔'' ایسے لکھاری کسی معاشرے کے لیے نعمت سے کم نہیں۔

میں ابنِ صفی پر چند سطریں لکھتے ہوئے ماضی میں لوٹ گیا تھا۔ وہ ماضی جو میرا تھا۔ جہاں نوجوانوں کی گفتار میں دھیما پن تھا۔ ان کے کردار میں پختگی تھی۔ وہ سادہ دل تھے، قناعت پسند تھے، ان کے جذبے بہت سچے تھے اور دل پر نور تھے۔ ان کے لیے زندگی

آسان نہیں تھی مگر وہ پھر بھی مطمئن تھے۔گلیوں میں لائبریریاں ہوتیں تھیں۔نوجوان وہاں سے کتابیں لیتے انہاک سے پڑھتے۔محبت والی کہانیاں پڑھتے ہوئے ان کی آنکھیں چھلک جاتیں۔ایڈونچر والی کہانی ان کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی۔ پرفکر باتیں ان کے جوان ذہنوں میں ٹھہراو پیدا کرتیں۔خلیل جبران، کرشن چندر، نسیم حجازی کے ناول اور افسانے ان کی زندگیوں پر گہرے نقوش چھوڑ جاتے۔ اور ابنِ صفی ان کی حیرانی کو تجسس میں بدلتا اور پھر ان کے اندر ایک ہیرو کو پالتا، جوان کرتا اور اسے ایک ایسے کردار میں ڈھال لیتا جسے وہ کھوج کی آخری منزل کی کامیابی سمجھ لیتا۔آج میرا بیٹا، میری بیٹی جس دنیا میں ہیں وہ ایک مکمل اور بھرپور دنیا ہے لیکن اس دنیا میں انسان کہیں کھو گیا ہے۔ انسان اپنے حقیقی رشتوں سے بہت دور، قریبی لوگوں سے لاتعلق مگر ایک ایسے حلقہ دوستاں کا اسیر ہو چکا ہے جن سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ دانستہ یا نادانستہ اپنے تمام قریبی رشتے توڑ کے ایک نئے سماجی حلقے میں داخل ہو چکا ہے۔ ایسا حلقہ جس سے اس کی زندگی سے میل نہیں رکھتا۔ مگر وہ اس جادونگری کا اسیر ہے اس کے اپنے اس کے لیے بے گانے ہو چکے ہیں۔ میں صرف یہ مضمون لکھنے ماضی میں گیا تھا مگر میں وہاں سے مکمل حالت میں واپس نہیں آ سکا۔ میرے وجود کا ایک حصہ وہیں رہ گیا ہے۔ میرا ماضی کہ محبت کا امین تھا اور میں نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت میں مبتلا ہونا بھی کسی جنگ پر جانے جیسا ہے اس سے انسان کبھی بھی پہلے جیسا واپس نہیں آتا۔لیکن مجھے تو اس دنیا میں لوٹنا بھی نہیں ہے۔ میں اپنے وجود کا جس قدر حصہ بھی اس خوب صورت ماضی میں چھوڑ آؤں وہی میری اصل کمائی ہوگی کہ آج کی دنیا میری نہیں ہے۔ آپ کی بھی نہیں اور درحقیقت یہ دنیا اب کسی کی نہیں ہے۔ آؤ ہم سب اپنے ماضی میں لوٹ جائیں کہ آنے والا وقت ہم سے ہم کو بھی چھین رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں ٭

جاسوسی ناول نگاری کے شہنشاہ — ابنِ صفی

ابن صفی کا شمار اردو میں جاسوسی ادب کے سب سے بڑے اور اہم قلم کاروں میں ہوتا ہے!

ابن صفی کی پیدائش کی حتمی اور حقیقی تاریخ معلوم نہ ہوسکی ہے البتہ انھوں نے اپنے ایک مضمون 'بقلم خود' میں اس بابت یہ تحریر کیا ہے، ''اپریل ۱۹۲۸ء کی کوئی تاریخ تھی اور جمعہ کا دن شام کے دھندلکوں میں تحلیل ہورہا تھا جب میں نے پہلی بار اپنے رونے کی آواز سنی۔''

الہ آباد سے ایک رسالہ 'نکہت' شائع ہوتا تھا، ابن صفی کافی مدت تک اس رسالہ سے منسلک رہے۔ عام طور سے شعرا غزلیں لکھتے ہیں تو اسی کے ساتھ شاعری کی دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح افسانہ نگار یا ناول نگار افسانوں اور ناولوں کے ساتھ دیگر نثری اصناف جیسے انشائیہ، خاکہ، طنز و مزاح، تمثیل، انٹرویو، سفرنامہ، فکاہیہ، خودنوشت وغیرہ میں بھی زورِ قلم دکھاتے ہیں۔

ابن صفی نے اگرچہ شاعری بھی کی اور اس میں مختلف اصناف کے تحت کلام بھی پیش کیا لیکن نثر میں ان کی پہچان صرف ایک ہی صنف سے ہوئی اور وہ ہے جاسوسی ناول نگاری۔ بہت عرصہ تک جاسوسی ناولوں کو 'جاسوسی ادب' کہنے میں بھی قباحت محسوس کی گئی لیکن اب بہرحال جاسوسی ناولوں کو بھی ایک ادبی درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ البتہ جس طرح نثر و نظم کے کئی قلم کاروں کو برسوں تک نظر انداز کیا گیا اسی طرح جاسوسی ناولوں اور ان کو لکھنے والوں کو بھی وہ درجہ استناد اور مقبولیت نہ مل سکی جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

کوئی قلم کار کیوں اور کیسے لکھتا ہے اور اس کو تحریک کس طرح، کن باتوں، کن چیزوں اور کیسے حالات سے ملتی ہے اس کا اندازہ خود ابن صفی کی تحریر سے لگایا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں، عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں لیکن ۱۹۴۷ میں جو کچھ ہوا، اس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کرکے رکھ دیا۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آگئے اور چیخنا شروع کردیا۔ یہ نہ ہونا چاہیے تھا یہ بہت برا ہوا لیکن ہوا کیوں؟ تم تو بہت پہلے سے ہی چیختے رہے تھے۔ تمھارے گیت دیوانگی کے اس طوفان کو کیوں نہ روک سکے۔ میں سوچتا رہا، سوچتا رہا۔ آخرکار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں

٭ غوث منزل، تالاب ملا ارم، رام پور، ہندوستان۔ برقی پتا: alifnazim@gmail.com

پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی، تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح بھی مہیا کرتا ہوں اور انھیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھاتا ہوں۔فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے زندگی تک داؤں پر لگا دیتا ہے۔(میں نے لکھنا کیسے شروع کیا،از ابن صفی)

اترپردیش کے ضلع الٰہ آباد میں ایک مشہور و معروف قصبہ نارہ نام کا ہے ابن صفی کی نسبت نارہ سے ہی مانی جاتی ہے اسی لیے وہ شروع میں اپنی تخلیقات اسرارناروی کے نام سے شائع کراتے تھے۔اس نام سے انھوں نے شاعری بھی کی تھی اور الٰہ آباد کے مذکورہ رسالہ 'نکہت' میں مضامین بھی لکھتے تھے۔اسرار ناروی کے والد کا نام صفی اللہ تھا اور اسی مناسبت سے اسرار ناروی نے اپنا قلمی نام ابن صفی اختیار کیا اور جاسوسی ادب کے حوالے سے پورے برصغیر میں ان کا یہی نام مشہور و معروف ہوگیا۔

ماہنامہ 'نکہت' نے ۱۹۵۲ میں باقاعدہ طریقے سے ایک جاسوسی رسالے کا اجرا کیا تو اسرار ناروی نے اس میں ابن صفی کے نام سے لکھنا شروع کیا اور اس نام سے انھوں نے اپنا پہلا ناول 'دلیر مجرم' لکھا اور یہ ناول مارچ ۱۹۵۲ میں شائع ہوا۔اس کو جاسوسی دنیا کا پہلا ناول مانا جاتا ہے۔۷۰ کا عدد کافی مبارک اور متبرک مانا جاتا ہے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ۱۹۵۲ سے اب ۲۰۲۲ میں ابن صفی کے جاسوسی ادب کے سفر کو ۷۰ سال ہورہے ہیں۔حالیہ چند برسوں میں ابن صفی پر تحقیقی کام شدومد سے شروع ہوا ہے۔کئی رسائل نے ان کے فن، ان کی ناول نگاری، ان کی شاعری اور ان کی شخصیت کے حوالے سے کئی خصوصی گوشے اور خاص نمبر شائع کیے ہیں۔

کچھ بڑے رسالوں نے ان پر خاص نمبر یا خصوصی گوشے نکالنے کے بجائے بہت خاص مضامین شائع کیے۔ابن صفی پر کتابیں بھی لکھی جارہی ہیں اور انفرادی مضامین بھی تحریر کیے جارہے ہیں۔ابن صفی نے اپنے قلم، اپنی تحریر، اپنے منفرد اسلوب، اپنے فن اور اپنی صلاحیتوں سے اردو زبان اور اردو ادب، دونوں کی خدمت کی ہے۔گزشتہ وقت میں چوں کہ اس طرف کم ہی توجہ تھی لیکن اب ان کے حوالے سے خاطر خواہ تحقیقی اور تنقیدی کام ہورہا ہے اور اس کام کے مختلف پہلو اور کئی جہات ہیں تاکہ ابن صفی کی شخصیت، ان کی حیات اور ان کے ادبی کارناموں اور ان کے فن کا باقاعدہ اور معروضی مطالعہ اور مشاہدہ سامنے آسکے۔

ابن صفی کے ناولوں کی کل تعداد ۲۵۲ بتائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ دو طنزیہ ناول 'تزک دو پیازی' اور 'پرنس چلی' بھی ان کے ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔کچھ لوگ ان کے ناولوں کی تعداد ۳۰۰ بھی بتاتے ہیں جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ان کا آخری ناول 'آخری آدمی' کو تسلیم کیا جاتا ہے جو اکتوبر ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا۔دراصل یہ ان کی زندگی کا آخری ناول تو تھا لیکن ادھورا ہی تھا کہ ان کی وفات ہوگئی اور اس ناول کو ان کے کسی شاگرد نے یا غالباً ان کے بیٹے نے مکمل کر کے شائع کرایا۔البتہ ان کے شائع شدہ آخری ناول کا ناول 'شمال کا فتنہ' ہے جو وہ 'آخری آدمی' سے پہلے مکمل کر چکے تھے اور یہ ناول رسالہ 'نئے افق' میں شائع ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جو لوگ قلم کار یا زود قلم ہوتے ہیں اور بے تکان بہت زیادہ لکھتے ہیں ان کے قلم میں زبان و بیان کی وہ خوبیاں باقی نہیں رہتیں جو کم لکھنے والوں میں پائی جاتی ہیں مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی کلیہ نہیں ہے اور نہ ہم اس کو درست مانتے ہیں۔اردو میں

بے شمار ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے درجنوں کتابیں لکھی ہیں اور ادب کو مالا مال کیا ہے۔ یہ تو بجائے خود ایک بڑی اور اہم خوبی ہے کہ کوئی قلم کار جب قلم اٹھائے تو بے تکان لکھتا چلا جائے اور یہ خوبی ابن صفی میں بھی موجود تھی۔

عام طور سے جاسوسی ناولوں اور پاپولر ادب میں زبان و بیان کی چاشنی اور ادبیت کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا لیکن اس کے برعکس ابن صفی کے ناولوں میں ان کی زبان بہت شائستہ، شستہ، سلیس، دلکش، دلنشیں اور جاذب نظر ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں زبان کے معیار کو ہر صورت میں برقرار رکھا ہے اور ان ناولوں میں طنز و مزاح اور ظرافت کے پہلو کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں یہ خوبی ہے کہ پڑھنے والا اس میں کھو جاتا ہے۔ ان کے اسلوب میں دلکشی ہے اس سلسلے میں ان کے ایک ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں وہ شاعروں اور برسات کے تعلق سے دل چسپ انداز میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> وہ برسات کو شاعروں کی نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا...... جو برسات کی تعریف میں بڑی بڑی نظمیں کہتے ہیں اس کی دانست میں شاعر تو بدھو ہوتے ہیں...... یا سوفی صد چار سو بیس...... کیوں کہ وہ اپنی کھڑکیوں میں اس طرح بیٹھ کر کہ بارش کا ایک قطرہ بھی نہ پڑنے پائے موسم برسات کی شان میں قصیدے کہتے ہیں...... کہیں راستے میں بارش آجائے تو اس طرح جی چھوڑ کر بھاگیں گے جیسے ملک الموت پیچھا کر رہا ہو...... یہی بد ذوق جب شعر کہنے بیٹھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بارش کا ایک قطرہ ان کی روح سے گزر کر زمین پر گر رہا ہو۔ (ناول، ’’رات کا شہزادہ‘‘)

ناول میں مکالموں کی بہت خاص اہمیت ہوتی ہے۔ کسی بھی ناول کا بیشتر حصہ مکالموں پر ہی منحصر ہوتا ہے۔ مکالموں کے ذریعہ ہی پلاٹ کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ ناول کی ضخامت میں مکالموں کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں میں جو مکالمے ہیں وہ کرداروں کی ذہانت اور حاضر جوابی کی عکاسی کرتے ہیں۔ حاضر جوابی اور ذہانت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ابن صفی کے کردار جواب دینے یا بات کہنے میں نہایت برجستگی دکھاتے ہیں۔ ان کے مکالموں میں طنز و ظرافت کا پہلو بھی نمایاں رہتا ہے جس سے قاری کی دل چسپی دوچند ہو جاتی ہے وہ کبھی کرداروں کے حلیے، کبھی ان کی عادات و اطوار، کبھی ان کے عمل اور کبھی ان کی حرکات و سکنات سے طنز و ظرافت کے پہلو نکالتے اور قارئین کو محظوظ کرتے ہیں۔ ابن صفی سماج کی برائیوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتے۔

وہ باتوں باتوں میں اصلاح کے پہلو بھی تلاش کر لیتے ہیں اور ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی رائے بھی پیش کر دیتے ہیں۔ سماج کی برائیوں پر کبھی وہ نشتر کی طرح چرکہ لگاتے ہیں تو کبھی طنز آمیز جملے لکھ کر اپنی بات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہ جملے بڑے معنی خیز ہیں اور ان کے پوشیدہ دکھ کو اجاگر کرتے ہیں: ’’زندہ رہنے کے لیے کھال پر کتنی تہیں چڑھانی پڑتی ہیں! یہ اور بات ہے کہ روح کی کراہ قہقہوں سے بھی جھانکتی ہے۔‘‘ (ناول، ’’الٹی تصویر‘‘)

وہ اپنے ناولوں میں کبھی فلسفیانہ جملے بھی تحریر کر دیتے ہیں جو بڑی معنویت اور گہرائی رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے یہ جملے بڑی سچائی اور گہری حقیقت سے بہت قریب ہوتے ہیں جیسے یہ ایک جملہ:

> آدمی میں جب بدی سے نپٹنے کی سکت ہی نہیں رہ جاتی تو ہمیشہ وہ نیکی اور مسیحائی کے خواب دیکھتا

ہے۔(ناول،''دشمنوں کا شہر'')

ہر فن پارہ چاہے وہ مضمون ہو یا افسانہ یا ناول ایک ہی اسلوب کے تحت نہیں لکھا جا سکتا۔کسی فن پارہ کا موضوع ہی اس کے اسلوب کو متعین کرتا ہے کہ اس تخلیق کو کس اسلوب میں لکھا جائے یا اس کا پیرایۂ اظہار کیا ہو۔ابن صفی کے ناولوں کی بھی یہ خوبی ہے کہ مختلف ناولوں یا تخلیقات میں موضوع کی مناسبت سے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ویسے عام طور سے ان کا اسلوب جاذبیت لیے ہوئے ہے۔

اس میں روانی،سلاست،برجستگی اور نفاست ہے۔ان کا اسلوب نہایت پختہ ہے وہ جو کچھ کہتے اور لکھتے ہیں وہ پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ کہتے ہیں۔چوں کہ ناول کے کرداروں پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور وہ کرداروں کے عادات واطوار سے بخوبی واقف ہیں۔اس لیے ان کے اعمال وافعال کو وہ بہترین اسلوب کے ساتھ پیش کر دیتے ہیں۔ناول میں اس کے مرکزی خیال،تھیم،پلاٹ اور مکالموں کا جہاں ایک خاص مقام ہوتا ہے وہیں کرداروں کا بھی ایک اہم رول ہوتا ہے۔کردار نگاری کسی بھی ناول کی مقبولیت کی ضمانت ہوتی ہے۔ابن صفی کے ناولوں میں کرداروں یا ان کی کردار نگاری کا کمال یہی ہے کہ سارے کردار ہمیں اپنے آس پاس ہی نظر آتے ہیں۔جولیا،صفدر،قاسم،انور،فریدی،حمید،عمران،ظفرالملک ان کے سدا بہار اور معروف کردار ہیں۔

چوں کہ ناولوں میں ان کے کردار مخصوص اور مختص ہوتے ہیں اس لیے وہ قاری کے دل ودماغ پر چھائے رہتے ہیں۔ان کا حلیہ،بات چیت،رہن سہن،عادات واطوار،بات کرنے کے طریقے،اعمال وافعال،ان کے مکالمے،ان کی ظرافت سبھی کچھ قاری کے ذہن میں رہتا ہے۔اس لیے کسی کردار کا نام آتے ہی اس کا حلیہ اور اس کا کام قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ابن صفی کے کردار قارئین کو ازبر ہیں۔ناولوں میں ابن صفی کی منظر کشی بھی بہترین ہوتی ہے۔وہ منظر کشی کو ناول کا لازمی جزو سمجھتے ہیں اور اپنے ناولوں میں موضوع اور پلاٹ کی مناسبت سے حالات وواقعات کی منظر کشی کرتے ہیں۔وہ کرداروں کا حلیہ اس طرح بیان کرتے ہیں گویا وہ شخص ہمارے سامنے موجود ہے ان کے ایک ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور وہ جدید ترین تراش کے ایک سوٹ میں ملبوس تھا۔قمیص بے داغ سفید تھی۔خوش ذوق آدمی معلوم دیتا تھا لیکن اس کی ناک کی بناوٹ چہرے کو کسی حد تک خوفناک ظاہر کر رہی تھی۔آنکھوں میں بھی درندگی کی جھلکیاں تھیں۔(ناول،''اجنبی کا فرار'')

ابن صفی کے ساتھ سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ نہ صرف نقادوں بلکہ عام قلم کاروں نے بھی ان کے فن،ان کی ناول نگاری اور سرے سے جاسوسی ناولوں کو ہی کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا۔برسوں تک ابن صفی پر کوئی مضمون نہیں لکھا گیا اور نہ جاسوسی ناولوں کو 'جاسوسی ادب' نام دیا گیا۔ابن صفی کو بھی اس کا احساس تھا اس لیے قلم کاروں اور خاص کر پیشہ ور نقادوں پر ایک ناول میں انھوں نے گہرا طنز مکالمے کی شکل میں کیا جس میں دو کردار آپس میں بات کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''پھر اب تم کیا کروگے؟''

''اردو ادب کا کوئی نامور نقاد بن کر جاسوسی ناول نویسوں کو گالیاں دیتا پھروں گا۔''(ناول،''جونک کی واپسی'')

ابن صفی نے ڈھائی سو ناول لکھے۔ ظاہر ہے ان کا پلاٹ، تھیم، موضوع اور مرکزی خیال الگ الگ ہی ہوگا اور یہ سب پیش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مطالعہ اور بھی بہت وسیع ہونا چاہیے۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ ابن صفی کا مطالعہ خاصا وسیع اور متنوع تھا۔ ان کو ہر طرح کی معلومات حاصل کرنے کا ایک جنون سوار تھا تاکہ وہ نئے نئے موضوعات کے ساتھ ناول لکھ سکیں۔ عالمی ادب کے معروف فن پاروں کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا تھا۔

ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، اسلامیات وغیرہ سبھی کچھ ان کے مطالعہ میں رہا جس کا پرتو ان کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ اردو کے کلاسیکی ادب کے شہ پاروں کا بھی انھوں نے مطالعہ کیا اور حسب ضرورت اور حسب موقع ان ساری چیزوں کا پرتو ان کے ناولوں میں نظر آتا ہے۔ ان کے ناولوں میں روانی اور برجستگی بھی غضب کی ہوتی تھی۔ بس ایک بہاؤ تھا جو ان کے قلم سے الفاظ کی شکل میں بہتا چلا جاتا تھا ان کے ناولوں میں آورد کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ روانی، برجستگی اور آمد کا ایک طویل سلسلہ تھا جو بحر بیکراں کی طرح ان کے قلم سے پھوٹا پڑتا تھا۔ جہاں ایسی روانی اور بے پناہ برجستگی ہو وہاں پر بہت سی تکنیکی خامیوں اور غلطیوں کا راہ پا جانا ایک عام سی بات ہے اس لیے ابن صفی کے ناولوں میں بھی کئی تکنیکی خامیاں نظر آتی ہیں جو کہیں کہیں مضحکہ خیز بھی معلوم ہوتی ہیں۔

لیکن چوں کہ ان کی تحریر میں اتنی روانی اور اسلوب میں اتنی دلکشی اور ندرت ہوتی تھی کہ وہ قاری کو کچھ سوچنے اور اوراق پلٹ کر یہ دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی تھی کہ گزشتہ صفحات میں انھوں نے کیا بات کہی تھی اور اب اسی بات کو یہاں پر اس طرح پیش کر رہے ہیں۔ غرض جاسوسی ناولوں کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ اس میں بے پناہ بہاؤ ہو اور قاری اس میں پوری طرح کھو جائے اور ابن صفی کے ناول انھیں شاندار خوبیوں سے مزین اور متصف ہیں۔

قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ بیشتر قلم کار بغیر تحقیق کیے دوسرے قلم کاروں کے مضامین سے استفادہ کرتے ہیں۔ ابن صفی پر قلم اٹھانے سے پہلے میں نے کافی مطالعہ کیا اور کئی مضامین میں پایا کہ ناولوں کے نام جن قلم کاروں نے لکھے ہیں یا ابن صفی کے نام سے منسوب کیے ہیں ان کا سرے سے وجود ہی نہیں۔ دراصل اشاریہ سازی ہی ایک ایسا فن ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مجھے ابن صفی کے ناولوں کی جو فہرستیں دستیاب ہوئی تھیں وہ تاریخ وار ترتیب سے تھیں لیکن تاریخ وار ترتیب کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی الفبائی ترتیب سے یا حروف تہجی کی ترتیب سے ہوتی ہے۔ اشاریہ ساز کا کام اسکالرز کو سہولت بہم پہنچانا، ان کا وقت بچانا اور ان کی محنت کو کام میں لانا ہے۔ اس لیے ان ناولوں کی تفصیلات کو میں نے از سر نو کارڈ بنا کر اور ترتیب دے کر درج ذیل سطروں میں پیش کیا ہے۔

مشہور و معروف محقق، ناقد اور مصنف مالک رام صاحب کا ایک معروف تذکرہ ہے اس کا نام ہے 'تذکرۂ معاصرین'۔ اس تذکرہ کو مالک رام صاحب نے قلم کاروں کی تاریخ وفات کی مناسبت سے چار جلدوں میں پیش کیا تھا لیکن مجھے یہ طریقہ پسند نہیں تھا کیوں کہ اس سے محقق اور اسکالر کے وقت کا زیاں ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اس تذکرہ کے بھی از سر نو کارڈ بنا کر ان کو حروف تہجی سے ترتیب دیا۔ یہ تذکرہ ہندو پاک کے ۲۱۸ قلم کاروں کے حالات زندگی پر مشتمل ہے۔ میرا یہ مذکورہ اشاریہ قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے ایک سہ ماہی 'فکر و تحقیق' میں شائع ہوا ہے۔ پھر اس تذکرہ کو میں نے اپنے اشاریہ کی تازہ ترین کتاب 'تذکروں کا

اشاریہ میں بھی شامل کیا ہے۔

میری یہ کتاب ہندو پاک کے تین ہزار قلم کاروں کے اشاریہ پر مشتمل ہے۔ یہ اپنی طرز کی ہندوستان میں پہلی کتاب ہے اور سب جگہ مقبول و معروف ہوئی ہے۔اس کی اشاعت ۲۰۲۰ء میں ہوئی تھی اور اس کو اتر پردیش اردو اکادمی نے خصوصی انعام سے بھی نوازا ہے۔اس پر ہندوستان اور دیگر ممالک کے اخبارات ورسائل میں تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بہر حال یہ تو ضمنی باتیں تھیں لیکن امید ہے کہ ابن صفی کے ناولوں کے اس اشاریہ سے بھی اسکالرز مستفید ہوں گے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دوسری اصناف ادب کے مقابلے جاسوسی ادب کو کبھی اہمیت نہیں دی گئی۔ یہ محض تفریح اور وقت گزاری کا ہی ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔اس کے باوجود کچھ قلم کاروں نے جاسوسی ادب یا پاپولر ادب کو ترقی دی ان میں سے کچھ نام یہ ہیں: تیرتھ رام فیروز پوری، نجمہ صفی، ایم۔ جے۔ عالم، مظہر الحق علوی، دیوان بریندر ناتھ ظفر پیامی، ایم۔ اے۔ راحت، مظہر کلیم، ہمایوں اقبال، ابن صفی، سلامت علی مہدی، سراج انور، اکرم الٰہ آبادی، عارف مارہروی، اظہار اثر، ظفر عمر وغیرہ۔ محل نظر بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر قلم کاروں اور ان کی بے مثال خدمات کو فراموش کر دیا گیا ہے۔البتہ ان میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت ابن صفی کو حاصل ہوئی جن کی کتابیں ہر عمر اور ہر طبقہ کے لوگوں میں پڑھی گئیں۔ ابن صفی کا شمار جاسوسی ادب میں برصغیر کے صف اول کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔

ابن صفی کا اصل نام اسرار احمد تھا۔انھوں نے ڈی۔اے۔وی ہائی اسکول سے ۱۹۴۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد ایونگ کرسچین کالج الٰہ آباد سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۹۴۷ میں پاس کیا۔اس کے بعد انھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ عام قلم کاروں کی طرح اور نوجوانی کی امنگوں اور ترنگوں سے سرشار ابن صفی نے بھی اپنی ادبی زندگی کا آغاز رومانی کہانیاں لکھنے سے کیا اور انھوں نے اپنی پہلی کہانی محض اس عمر میں لکھی جب کہ وہ ساتویں کلاس کے طالب علم تھے۔

اس کہانی کا نام تھا ’ناکام آرزو‘ اور یہ بمبئی کے ایک ہفت روزہ ’شاہد‘ میں شائع ہوئی۔ تیرتھ رام فیروز پوری اور مظہر الحق علوی دو ایسے قلم کار تھے جنھوں نے دوسری زبانوں کے بے شمار ناول اردو میں ترجمہ کیے اور وہ نہایت مقبول و معروف بھی ہوئے لیکن جاسوسی ناول نگاری کا سہرا بہر حال ابن صفی کے ہی سر جاتا ہے کیوں کہ انھوں نے باقاعدہ جاسوسی ادب کو فروغ دیا۔ انھوں نے فریدی حمید سیریز کے ۱۲۶ ناول، عمران سیریز کے ۱۱۶ ناول، ایرج اور عقرب سیریز کے ۳ ناول اور اس کے علاوہ انور۔رشیدہ سیریز کے ۴ ناول تحریر کیے۔ابن صفی نے اس بات کا خود اعتراف کیا ہے کہ ان کے ناولوں کے ذخیرہ میں ۱۸ ایسے ناول ہین جن میں سے کچھ کے پلاٹ اور کچھ کے کردار انگریزی ناولوں سے ماخوذ ہیں۔باقی جو کچھ ادبی خزانہ ہے وہ صرف ان کا اپنا طبع زاد ہے۔

افسانے یا ناول کی طرح جاسوسی ادب کے لیے بھی مختلف تخلیقی عناصر بے حد ضروری ہیں جیسے مرکزی خیال، تھیم، پلاٹ، کردار، اسلوب، زبان و بیان، منظر کشی، مکالمے وغیرہ لیکن ان سب میں جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے اور جس کی وجہ سے ناول کا پلاٹ آگے بڑھتا اور وسیع ہوتا جاتا ہے وہ تجسس ہے۔ اگر تجسس نہ ہو تو کوئی بھی نثری تخلیق اور خاص کر ناول اور افسانہ سند اعتبار حاصل نہیں کر سکتا۔ابن صفی نے اپنے ناولوں میں پلاٹ کو بہت خوب صورتی سے سجایا ہے اور اس کے ذریعہ ناول کی کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔

ان کے ناولوں کے پلاٹ میں خاصا تنوع ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کی ناول نگاری دو چار ناولوں کی تخلیق سے آگے نہیں بڑھتی۔ انھوں نے اگر دنیا کے سپر پاور ممالک کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا تو ساتھ ہی تیسری دنیا کے ممالک کی غربت اور ان کے مسائل کو بھی اجاگر کیا۔موضوع کوئی بھی ہو انھوں نے پلاٹ میں چاشنی اور ندرت پیدا کی اور واقعات کو دل چسپ انداز میں آگے بڑھایا۔ یہی وجہ ہے کہ قاری ان کا ناول کئی کئی دنوں میں نہیں بلکہ چند گھنٹوں میں اور وہ بھی ایک ہی نشست میں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لیے حقیقت یہ ہے کہ دوسرے ناول نگاروں کے مقابلے ابن صفی کے،اول رہنے کی وجہ ان کی منفرد کردار نگاری، واقعات کی بندش، پلاٹ کی چستی، اسلوب کی دلکشی، موضوع کی ندرت، کرداروں کی انفرادیت اور مکالموں کی برجستگی ہے جو قارئین کو بہت متاثر کرتی ہے۔ابن صفی کے اس فن کے سبھی قائل ہیں کہ ان کی انفرادیت، ان کے دلکش و دل نشیں اسلوب نگارش میں ہے۔وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ہی بڑی بات کہہ جاتے ہیں۔کہیں وہ استعاروں اور اشاروں میں ہی بات کہہ دیتے ہیں۔

زبان کے لحاظ سے ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ موقع محل سے، علاقہ اور شہر کی مناسبت سے علامتوں اور محاوروں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔جاسوسی ناولوں کا ایک طرۂ امتیاز یہ بھی ہوتا ہے کہ ان میں بیچ بیچ میں مکالموں کے ذریعہ طنز و مزاح کی چاشنی بھی شامل کی جاتی ہے اور ابن صفی اس فن میں بھی ماہر ہیں۔وہ گنجلک، دقیق، غیر مانوس اور مشکل الفاظ سے گریز کرتے ہیں اور چوں کہ وہ عوامی ادب تخلیق کرتے ہیں اس لیے زبان بھی عام فہم اور عام قاری کی سمجھ میں آجانے والی استعمال کرتے ہیں اور کہیں کہیں وہ شاعرانہ اظہار بھی کر دیتے ہیں۔

ابن صفی کا انتقال ۲۶رجولائی ۱۹۸۰ءکو ہوا۔بہت سے بڑے قلم کاروں کے انتقال پر ایک روایتی جملہ کیا جاتا ہے کہ ایک عہد اور ایک دور ختم ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن صفی کی وفات کے بعد بھی جاسوسی ادب کا ایک عہد، ایک دور، ایک شناخت، ایک پہچان کا وجود ختم ہو گیا۔بہت سے لوگوں نے ان کی بیماری کے زمانے میں اور کچھ نے ان کی وفات کے بعد ان جیسے جاسوسی ناول لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ مولوی مدن والی بات پیدا نہ کر سکے۔

ابن صفی کے انتقال کے بعد جن لوگوں نے ان کے اسلوب میں جاسوسی ناول لکھنے کی کوشش کی ان میں ہمایوں اقبال،ظفر کلیم،مشتاق احمد قریشی، ایم۔اے۔راحت وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں لیکن ان میں بھی ایم۔اے۔راحت، الیاس سیتاپوری اور محی الدین نواب کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی کیوں کہ ان لوگوں نے تاریخی واقعات اور کلاسیکی ادب کے تعلق سے بہت کچھ لکھا جو بہت مقبول بھی ہوا۔ ہزاروں قلم کاروں میں چند لوگ ہی ایسے ہوتے ہیں جو صاحب اسلوب ہوتے ہیں۔

اگرچہ ہر کس و ناکس کے انتقال پر یا اس کی زندگی میں ہی بہت سے لوگ کچھ قلم کاروں کو'صاحب اسلوب' کا تمغہ عنایت کر دیتے ہیں جبکہ ہماری نظر میں صاحب اسلوب صرف وہ شخص ہے جس کی تحریر کا ایک پیراگراف ہی اس کا نام ہٹا کر پیش کر دیا جائے تو پڑھنے والا فوراً پہچان لے کہ یہ فلاں قلم کار کی تحریر ہے۔کہنے کو کوئی کچھ بھی کہے اور کسی کے بھی سر پر سہرا باندھ دے لیکن ہر قلم کار صاحب اسلوب نہیں ہوتا۔آپ 'باغ و بہار' کی صرف چار سطریں پڑھ کر بتا سکتے ہیں کہ یہ میر امن کی تحریر ہے۔بہر حال ابن صفی کے بعد جاسوسی ادب کو زوال ہو گیا۔بعد میں جن لوگوں نے اس فن میں طبع آزمائی کی وہ نہ ایسا منفرد اسلوب نگارش لا سکے، نہ مکالمے لکھ

سکے، نہ پلاٹ کو واقعات کے ذریعہ آسانی سے بڑھا سکے۔

ابن صفی کے احباب ان سے اصرار کرتے کہ تم نے اپنے قلمی نام طغرل فرغان اور اصلی نام اسرار ناروی کو قتل کر کے اچھا نہیں کیا۔ اگر ان ناموں کو زندہ رکھا ہوتا تو ادب عالیہ میں آج تمھارا بھی کوئی مقام ہوتا لیکن اس کے جواب میں ابن صفی کچھ اس طرح جواب دیتے: ''ادب عالیہ کی شمع جلائے پانچ دس آدمیوں کے حلقے میں بیٹھا نظر آتا، میں جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں، کیا یہ کسی ادبی شہ پارہ سے کم ہے! میری کتابیں الماریوں کی زینت نہ بنتی ہوں لیکن تکیوں کے نیچے ضرور ملتی ہیں۔''

ابن صفی نے اپنے خیالات اور اپنے فن کی ترسیل کے لیے جو طریقہ اور ذریعہ اختیار کیا اس سے ان کے افکار وخیالات زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ادب کے ہر طبقہ میں یکساں طور پر مقبول ومعروف تھے اور امیر غریب، پڑھے لکھے اور کم تعلیم یافتہ سبھی طرح کے لوگ ان کے ناولوں کا مطالعہ کرتے اور ان کے فن سے محظوظ ہوتے تھے۔ ابن صفی کی ناول نگاری کی بابت ہندوستان، پاکستان اور دیگر کئی ممالک کے قلم کاروں نے اپنی رائے پیش کی ہے۔ یہاں ایک مضمون سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے:

> جاسوسی دنیا ایک کتابی رسالہ نہ تھا۔ یہ تو ایک ایسا سیلاب تھا جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ہندو پاک کے فحش اور جنسی لٹریچر کو اپنی زد میں لے لیا اور خس وخاشاک کی طرح بہا لے گیا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ اس دور میں فحش اور جنسی کتابوں کی بڑی مارکیٹ تھی۔ ابن صفی اس تحریک کے خلاف جہاد کے لیے آئے تھے۔ جاسوسی دنیا کے چند ہی ناول مارکیٹ میں آئے تھے کہ ابن صفی کا نام ایک طلسم کی طرح لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی جس ملک میں بڑے سے بڑے مصنف کی کتاب کی اشاعت چار پانچ سو سے آگے نہ بڑھتی ہو، وہاں ابن صفی کی کتابوں کی اشاعت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ یہ کسی محیر العقول کارنامے سے کم نہیں تھا۔ ابن صفی ہی وہ واحد مصنف ہیں جنھوں نے عام لوگوں کو کتابیں پڑھنے کا شعور عطا کیا۔ ابن صفی جب بیمار ہوئے اور ایک طویل عرصے تک ان کے ناول مارکیٹ میں نہیں آئے تو ان کی شہرت ومقبولیت کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنے ابن صفی پیدا ہو گئے اور انھیں کے کرداروں کو لے کر ناول لکھنے شروع کیے۔ سلامت علی مہدی، عارف مارہروی، خان محبوب طرزی، اظہار اثر اور شہنشاہ مرزا نے بھی طبع آزمائی کی۔ اکرم الٰہ آبادی نے 'جاسوسی پنجہ' نامی سلسلے میں خان۔ کالے سیریز کے ناول لکھے۔ ان میں سے کچھ نے شمع پبلی کیشنز کے 'مجرم' میں بھی قانون والا اور آفتاب ناصری کے قلمی نام سے ناول لکھے لیکن جو شہرت وقبولیت عام ابن صفی کے حصے میں آئی تھی، وہ کسی کا نصیب نہ بن سکی۔ (''ابنِ صفی: اردو کا طبع زاد جاسوسی ناول نگار''، شبیر عباسی مشمولہ ماہنامہ ''نیا دور''، لکھنؤ، نومبر ۲۰۱۸ء، ص۱۲۹)

ابنِ صفی کردار نگاری اور کرداروں کو تخلیق کرنے میں بڑی اچھی مہارت رکھتے تھے۔ ناول کے پلاٹ، موضوع، اس کے مرکزی خیال کی مناسبت سے نئے نئے کرداروں کو سامنے لانے کی ان کے اندر بہترین صلاحیت تھی۔ ان کے کردار قارئین کے ذہنوں میں

زندہ رہتے تھے اور ان کے مکالمے ان یادوں کو اور زیادہ گہرا کر دیتے تھے۔ابن صفی کے کرداروں میں کرنل فریدی،کیپٹن حمید،علی عمران،انور، رشیدہ، قاسم،ایکس ٹو،صفدر،سعید، جولیانا،روشی، جوزف، رحمٰن،سر سلطان وغیرہ کے نام خاصے اہم اور مشہور ہیں۔

فلموں کی طرح ناولوں اور خاص کر جاسوسی ناولوں میں بھی اینٹی کردار موجود ہوتے ہیں۔یہ اینٹی کردار جن کو عرف عام میں ولن کہا جاتا ہے اور اردو میں ان کو رقیب کہا جا سکتا ہے وہ ابن صفی کے ناولوں میں بھی ملتے ہیں۔ناولوں کی تکنیکی اور فنی ضرورتوں یا پلاٹ کے مطابق انھوں نے ان کرداروں کو تخلیق کیا۔ان میں سے کچھ کردار اس طرح ہیں: ڈاکٹر ڈریڈ، فنچ، ڈاکٹر سلمان، سنگ ہی، بوغا، ناکوتہ، الفانسے،تھریسیا، بمل آف بوہیا، لیونارڈ،لوزاٹا،علامہ دہشت ناک وغیرہ۔

یہاں اگر تحقیق کے ہی حوالے سے دیگر باتیں بھی لکھی جائیں تو سارا مضمون اسی کی نذر ہو جائے گا لیکن پھر بھی یہ اشارہ ضروری ہے کہ کسی نے ابن صفی کو نور ناروی کا نواسہ لکھا ہے تو کسی دوسرے نے نوح ناروی کا اس لیے ہمیشہ بنیادی مآخذ کا ہی مطالعہ ضروری اور لازمی ہوتا ہے۔اسی طرح ابن صفی کے ناولوں کی تعداد تقریباً ۲۵۰ بتائی جاتی ہے لیکن ایک قلم کار یہ تعداد ۳۰۰ بتاتے ہیں، ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

> ابن صفی کے مشورے پر ادارہ 'نکہت' نے جنوری ۱۹۵۲ میں جاسوسی ناولوں کا سلسلہ شروع کیا اور اس سلسلہ کا نام 'جاسوسی دنیا' رکھا۔اپنے انتقال تک اس سلسلہ میں تقریباً تین سو ناول لکھے جن میں صرف آٹھ انگریزی سے ماخوذ ہیں باقی سب کے سب طبع زاد ہیں۔الٰہ آباد میں صرف سات ناول لکھے جس میں پہلا ناول 'دلیر مجرم' تھا۔اگست ۱۹۵۲ میں کراچی ہجرت کر گئے اور بقیہ ناول یہیں لکھے۔ ۱۹۵۶ میں کراچی سے 'عمران سیریز' کا سلسلہ شروع کیا۔یہ دونوں سلسلے بے حد مقبول ہوئے۔(ایضاً،ص ۲۸)

ابن صفی کی تاریخ وفات ۲۶/جولائی ۱۹۸۰ ہے لیکن اس میں بھی بہت سے لوگوں کو اختلاف ہے۔بشارت علی خاں فروغ رام پوری اردو کے ایک اہم محقق تھے۔ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ان کی ایک اہم کتاب 'وفیات مشاہیر اردو' ہے۔یہ کتاب ۲۰۰۰ میں شائع ہوئی۔اس کے صفحات کی تعداد ۶۷۲ ہے۔اس میں ۱۲۵۱۵ اہم شخصیات کی تاریخ وفات،تاریخ پیدائش، تلمذ، کتابوں کے نام اور دوسری ضروری معلومات درج کی گئی ہیں۔ابن صفی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی بابت ان کی تحریر اس طرح ہے:

> اسرار ناروی،اسرار احمد، جاسوسی ناول نگار،نوح ناروی کے نواسے، ولادت یکم /اپریل ۱۹۲۸ء، نارہ ضلع الٰہ آباد، وفات: ۲۶/جولائی ۱۹۸۰ء کراچی، پاکستان، تصانیف تقریباً سو کے قریب......
> (۲۵ کتابوں کے نام بھی دیئے گئے ہیں)۔(''وفیاتِ مشاہیرِ اردو''،مرتب: بشارت علی خاں فروغ رام پوری، ۲۰۰۰ء،ص ۱۱)

ابن صفی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات میں جگہ جگہ تفاوت پایا جاتا ہے۔تاریخ ولادت میں تو فرق کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک صدی قبل آج کی طرح تاریخ ولادت کا اندراج باقاعدہ طریقے سے نہیں ہوتا تھا لیکن تاریخ وفات میں فرق ہونا باعث

حیرت اور تشویش کا باعث ہے۔ ۲۶ر جولائی کے حوالے سے ایک دوسری کتاب کا حوالہ بھی ملاحظہ ہو:

> مگر ان کے جانے کے بعد ان کے اہل خانہ اور احباب نے انھیں اردو کا شیکسپئر بنانے کے چکر میں ان کی تاریخ پیدائش ۲۶ر جولائی اور تاریخ وفات ۲۶ر جولائی نہ صرف مشہور کی بلکہ ان کے کتبہ پر بھی لکھوا دی جبکہ یہ غلط ہے۔ (ابن صفی اور اردو ادب، مصاعد قدوائی، روشان پرنٹرس دہلی، ۲۰۲۱ء، ص ۸۷)

ڈاکٹر عرفان عباسی اردو تذکرہ نگاری میں ایک اہم نام ہے۔ ابن صفی کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کی بابت ڈاکٹر عرفان عباسی کیا لکھتے ہیں:

> ''ابن صفی تقسیم ملک کے چند سال بعد پاکستان منتقل ہو گئے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔ وہاں وہ اشاعتی کاروبار کے ساتھ فلمی دنیا سے منسلک تھے۔ تقریباً ۵۳ سال کی عمر میں ۲۹ر جولائی ۱۹۲۸ء کو انتقال ہو گیا۔'' (کتاب: نثر نگاران اردو۔اتر پردیش، جلد اول، مرتب: ڈاکٹر عرفان عباسی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۹۔۴۰)

ابن صفی کی تاریخ وفات سے متعلق یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو:

> ''۱۷ر ستمبر ۱۹۷۹ء کی رات کو اچانک شدید درد کا سامنا کرنا پڑا اور پھر اس کے بعد مسلسل طبیعت ناساز رہنے لگی۔ دو ماہ کی مدت میں بیماری شدت اختیار کر گئی۔ ڈاکٹروں نے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا تو ان کو کراچی کے جناح اسپتال میں داخل کرایا گیا...... ۲۴ر جولائی کو آپ کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہوگئی اور ٹھیک دو دن بعد یعنی عین اپنی سالگرہ والے دن ۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء کو دار فانی سے رخصت لے لی۔'' (مضمون: ابن صفی اور اردو ادب، مضمون نگار: اسریٰ رضوی، مشمولہ ماہنامہ ''نیا دور''، لکھنؤ، ص ۳۸)

بہت سے مختلف قلم کاروں نے ابن صفی کی شخصیت، ان کے کارناموں، ادب میں ان کے مقام اور ان کی خدمات کے تعلق سے بے شمار مضامین میں اظہار رائے کیا ہے۔ یہاں چند قلم کاروں کی تحریروں سے کچھ اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ محترم ابن صفی نے ہر موضوع پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ ہر موضوع پر لکھنا اور اس سے انصاف کرنا بلکہ پورا انصاف کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ابن صفی کا فن تحریر و تخلیق اللہ تبارک و تعالیٰ کی دین تھی۔ جو کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز بطور ایک چیلنج کیا۔ سری ادب کی طرح ڈالی، ایک ایسے ہیبت ناک دور میں جب بڑے بڑے اور اچھا لکھنے والے بھی جنسی فحاشی اور عریانی کے سحر میں گرفتار تھے۔ ہر تحریر ایک ہی رنگ میں نظر آتی تھی۔ اہل قلم حضرات بلکہ اس وقت کے نامی گرامی ناشر ادارے بھی اس بات پر پورا یقین و اعتماد رکھتے تھے کہ چٹ پٹے جملوں، فقروں اور عریاں جنسی مناظر کے بغیر قاری مطمئن ہی نہیں ہوتا اور کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اس ماحول میں جناب ابن صفی نے یہ چیلنج ایک عزم، ایک ولولہ تازہ کی مانند نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے

ثابت بھی کر دکھایا کہ نہ صرف فحش لکھنے والے بلکہ انھیں شائع کرنے والے بھی غلطی پر تھے۔'' (مشتاق احمد قریشی)

۲۔ سہ ماہی 'روشن' بدایوں کی ادارت (۱۹۸۳ء-۱۹۹۰ء) کے دوران مخصوص شمارے مرتب و شائع کرنے کے متعدد منصوبے زیر غور رہے۔ ان میں ایک منصوبہ ابن صفی سے مخصوص کر کے ایک شمارہ شائع کرنا بھی تھا لیکن 'روشن' کو جن اہل قلم کا تعاون حاصل تھا ان کو ابن صفی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ یہ ادیبوں و شاعروں کا وہی طبقہ اعلیٰ و اولیٰ تھا جو ابن صفی کو تیسرے درجے کا مصنف سمجھتا تھا۔ ان میں بعض حضرات سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے کہا شمس صاحب! آپ کا رسالہ ڈائجسٹ تو نہیں جو ابن صفی پر نمبر مرتب کرے۔ آپ کو اپنے رسالے کے تحقیقی مزاج کو سمجھتے ہوئے موضوعات کا انتخاب کرنا چاہیے۔ چلیے بات آئی گئی ہوگئی۔

جب میں نے پہلے پہل ابن صفی کی تحریروں کا مطالعہ کیا تب ان کے توانا قلم، منظر نگاری، مزاح نگاری، اپنے کرداروں کی تعارف نگاری اور ذہانت و ذکاوت سے بھرپور چھوٹے چھوٹے جملوں سے اس حد تک متاثر ہوا تھا کہ میں نے گفتگو میں کام آنے والے مکالمے، طنزیہ جملے، مزاح سے بھرپور چٹکیاں ایک کاپی میں سلسلے وار لکھ لی تھیں اور وقتاً فوقتاً ان کو دیکھتا رہتا تھا اور اپنی گفتگو میں ان کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان دنوں جب میں ابن صفی کے مکالموں، طنزیہ جملوں، نفیس عبارتوں کو اپنی گفتگو میں استعمال کیا کرتا تھا تو لوگ میری ذہانت و برجستگی سے محظوظ و مرعوب ہوتے تھے۔ ان کو علم ہی نہیں تھا اس کثیف زبان میں لطافت کہاں سے آئی ہے۔ وہ کاپی جس میں یہ مکالمے درج ہیں، ابھی بھی کہیں دبی پڑی ہوگی۔'' (ڈاکٹر شمس بدایونی)

۳۔ ......ابن صفی کی دوسری خوبی جس نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ان کے مکالموں کی برجستگی اور روانی ہے۔ ان کی تحریر اکثر و بیشتر آپ کو سوچنے پر بھی مجبور کرتی ہے کہ وہ باتوں باتوں میں ادب، نفسیات، سماجیات، تہذیب، قانون کی پاسداری اور فلسفے کے حوالوں سے دانش کے موتی بکھیرتے چلے جاتے ہیں لیکن کام وہ اس قدر مہارت اور باریکی سے کرتے ہیں کہ تحریر کی روانی میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑتا اور قاری غیر محسوس طریقے سے بہت سی اہم اور گہری باتیں سیکھ اور سمجھ جاتا ہے۔'' (امجد اسلام امجد)

۴۔ یہ میری کوتاہی اور کم توفیقی ہے کہ میں ابن صفی کی حیرت انگیز عبارت آرائیوں، بے مثال کردار سازیوں اور خیرہ کن افسانہ طرازیوں سے لطف اندوز نہ ہوسکا لیکن مجھے اندازہ ہے اور میرے علم میں ہے کہ جاسوسی ادب پڑھنے والا اور اسے پسند کرنے والا کس ذوق و شوق سے ہر مہینے ابن صفی کے نئے ناول کا انتظار کیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں بھی ان کی مقبولیت کا یہی عالم تھا۔ ان کے طرز بیان میں عجیب طرح کی ساحرانہ کشش تھی اور جاسوسی کارناموں کی تشکیل و تدوین میں ان کے کمالات کا اعتراف ہر شخص کرتا تھا۔ ابن صفی مرحوم کی تقلید جس وسیع پیمانے پر کی گئی وہ بجائے خود ناقابل تصور ہے۔ شاید ہی اس عہد میں کسی ناول نگار کو اتنے مقلد اور اتنے چربہ ساز نصیب ہوئے ہوں۔ بسیار نویسی کے باوجود ان کے یہاں بیان کی تازگی اور موضوع کی ندرت آفرینی مسلّم تھی۔'' (رئیس امروہوی)

۵۔ ابن صفی آج بھی اردو والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ انھوں نے ناول نگاری میں نئی منزل کا تعین کیا۔ انسان کو خود غرضی اور خود پسندی کے گھیرے سے باہر نکالا۔ انسان حالات حاضر میں بہت بے چین اور بے اطمینان ہے اور اس کو اسی بے اطمینانی نے داخلیت پسند اور فرار کا حامل بنا دیا ہے......اچھا ادب وہی ہے جو انسان کے شعور کی تطہیر کا کام انجام دے اور زندگی میں نئے توازن کی تلاش میں معاون ثابت ہو۔ ابن صفی کے ناول اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ یہ انسان کو عہد حاضر کی سچائیوں سے آنکھ ملانے کی

جرأت سکھاتے ہیں۔'' (قاضی مشتاق احمد)

مختصر یہ کہ تحقیق کا سفر جاری رہتا ہے اور تحقیق میں حرف آخر کچھ نہیں ہوتا اس میں اضافوں اور نئی دریافتوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں کی فہرست کو بھی حتمی نہیں کہا جا سکتا ہے کیوں کہ جو کچھ بھی دستیاب ہو سکا ہے وہ پیش کر دیا گیا ہے۔ مختلف مضامین میں کئی ایسے ناولوں کے بھی نام ملتے ہیں جو کسی فہرست میں شامل نہیں۔ چوں کہ ابن صفی پر تحقیقی کاموں کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اس لیے امید کی جاسکتی ہے کہ مزید نئی تحقیق میں کچھ نئے اضافے ضرور ہوں گے۔ اس سے ابن صفی کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہی ہوگا، ان شاء اللہ!

درج ذیل سطروں میں ابن صفی کے ناولوں کا باعتبار حروف تہجی اشاریہ پیش کیا جا رہا ہے:

نمبر شمار	ناول کا نام	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱۔	آپریشن ڈبل کراس (سلسلہ وار)	پاکستان	جولائی ۱۹۷۴ء
۲۔	آتش دان کا بت (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۵۸ء
۳۔	آتشی بادل (سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ ۱۹۶۶ء
۴۔	آتشی پرندہ	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۳ء
۵۔	آخری آدمی (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ۱۹۸۰ء
۶۔	آدھا بٹیر (سلسلہ وار)	پاکستان	نومبر ۱۹۷۵ء
۷۔	آدھا تیتر (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ۱۹۷۵ء
۸۔	آگ کا دائرہ (سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ ۱۹۷۹ء
۹۔	آنکھ شعلہ بنی (سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری ۱۹۶۷ء
۱۰۔	آوارہ شہزادہ	ہندوستان	اگست ۱۹۵۸ء
۱۱۔	آہنی دروزاہ	پاکستان	نومبر ۱۹۵۶ء
۱۲۔	اجنبی کا فرار	ہندوستان	جنوری ۱۹۷۱ء
۱۳۔	احمقوں کا چکر	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۲ء
۱۴۔	ادھورا آدمی	پاکستان	مئی ۱۹۷۴ء
۱۵۔	اشاروں کے شکار	ہندوستان	---۱۹۶۴ء
۱۶۔	الٹی تصویر	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۹ء
۱۷۔	الفانسے (سلسلہ وار)	پاکستان	فروری ۱۹۵۷ء
۱۸۔	اندھیرے کا شہنشاہ	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۵ء

۱۹۔ انوکھی رہزنی	ہندوستان	جولائی۱۹۵۹ء
۲۰۔ انوکھے رقاص	ہندوستان	جولائی۱۹۵۷ء
۲۱۔ اونچا شکار	ہندوستان	جولائی۱۹۵۸ء
۲۲۔ ایڈلاوا(سلسلہ وار)	پاکستان	نومبر۱۹۷۴ء
۲۳۔ ایش ٹرے ہاؤز(سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ۱۹۷۲ء
۲۴۔ باباسگ پرست(سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری۱۹۷۷ء
۲۵۔ بحری یتیم خانہ	پاکستان	مارچ۱۹۷۰ء
۲۶۔ برف کے بھوت	ہندوستان	اکتوبر۱۹۵۴ء
۲۷۔ بزدل سورما(سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر۱۹۷۱ء
۲۸۔ بلی چیختی ہے	پاکستان	مارچ۱۹۶۴ء
۲۹۔ بلیک اینڈ وہائٹ	پاکستان	فروری۱۹۷۴ء
۳۰۔ بھیانک آدمی	پاکستان	جنوری۱۹۵۶ء
۳۱۔ بھیانک جزیرہ	ہندوستان	جون۱۹۵۳ء
۳۲۔ بھیڑیئے کی آواز	ہندوستان	جولائی۱۹۷۰ء
۳۳۔ پیاکوں کی تلاش(سلسلہ وار)	پاکستان	مئی۱۹۶۵ء
۳۴۔ بیگم ایکس ٹو	پاکستان	مارچ۱۹۷۵ء
۳۵۔ بیمبو کیسل	پاکستان	دسمبر۱۹۷۴ء
۳۶۔ بے آواز سیارہ(سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ۱۹۶۰ء
۳۷۔ بے چارہ/ بے چاری	ہندوستان	دسمبر۱۹۶۳ء
۳۸۔ بے چارہ شہ زور(سلسلہ وار)	پاکستان	اپریل۱۹۷۶ء
۳۹۔ بے گناہ مجرم	ہندوستان	مئی۱۹۵۴ء
۴۰۔ پاگل خانے کا قیدی	ہندوستان	مارچ۱۹۵۶ء
۴۱۔ پاگل کتے	پاکستان	اکتوبر۱۹۵۷ء
۴۲۔ پاگلوں کی انجمن	پاکستان	جون۱۹۷۰ء
۴۳۔ پانی کا دھواں(سلسلہ وار)	ہندوستان	فروری۱۹۵۷ء
۴۴۔ پتھر کا آدمی(سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر۱۹۷۹ء

۴۵۔ پتھر کا خون	پاکستان	اگست ۱۹۵۶ء
۴۶۔ پتھر کی چیخ	ہندوستان	جنوری ۱۹۵۴ء
۴۷۔ پراسرار اجنبی	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۲ء
۴۸۔ پراسرار چیخیں	پاکستان	دسمبر ۱۹۵۵ء
۴۹۔ پراسرار کنواں	ہندوستان	جولائی ۱۹۵۲ء
۵۰۔ پراسرار موجد	ہندوستان	جون ۱۹۵۷ء
۵۱۔ پراسرار وصیت	ہندوستان	مئی ۱۹۵۵ء
۵۲۔ پرچھائیوں کے حملے (سلسلہ وار)	ہندوستان	فروری ۱۹۷۸ء
۵۳۔ پرنس وحشی	ہندوستان	جون ۱۹۶۰ء
۵۴۔ پرہول سناٹا	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۴ء
۵۵۔ پوائنٹ نمبر ۱۲ (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۷۴ء
۵۶۔ پہاڑوں کی ملکہ	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۲ء
۵۷۔ پہاڑوں کے پیچھے	پاکستان	مارچ ۱۹۷۱ء
۵۸۔ پہلا شعلہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	ستمبر ۱۹۵۶ء
۵۹۔ پھر وہی آواز (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ۱۹۷۲ء
۶۰۔ پیاسا سمندر	پاکستان	نومبر ۱۹۵۷ء
۶۱۔ تابوت میں چیخ (سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ ۱۹۶۸ء
۶۲۔ تاریک سائے	ہندوستان	اگست ۱۹۵۵ء
۶۳۔ تباہی کا خواب (سلسلہ وار)	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۶۸ء
۶۴۔ تجوری کا راز	ہندوستان	مئی ۱۹۵۲ء
۶۵۔ تجوری کا گیت	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۳ء
۶۶۔ تصویر کا دشمن	ہندوستان	اپریل ۱۹۶۷ء
۶۷۔ تصویر کی اڑان	پاکستان	---۱۹۶۸ء
۶۸۔ تصویر کی موت	پاکستان	اپریل ۱۹۷۳ء
۶۹۔ تلاش گمشدہ (سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری ۱۹۷۹ء
۷۰۔ تیسرا شعلہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۶ء

۷۱۔ تیسری ناگن (سلسلہ وار)	ہندوستان	نومبر ۱۹۶۹ء
۷۲۔ تین سنکی (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۷۵ء
۷۳۔ ٹسڈل کی بیداری (سلسلہ وار)	ہندوستان	دسمبر ۱۹۶۷ء
۷۴۔ ٹھنڈا جہنم	ہندوستان	جون ۱۹۷۳ء
۷۵۔ ٹھنڈا سورج (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۸ء
۷۶۔ ٹھنڈی آگ	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۷ء
۷۷۔ جاپان کا فتنہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۷ء
۷۸۔ جڑوں کی تلاش (سلسلہ وار)	پاکستان	نومبر ۱۹۵۸ء
۷۹۔ جزیروں کی روح (سلسلہ وار)	پاکستان	فروری ۱۹۵۹ء
۸۰۔ جنگل کی آگ	ہندوستان	فروری ۱۹۵۵ء
۸۱۔ جنگل کی شہریت (سلسلہ وار)	پاکستان	جولائی ۱۹۷۷ء
۸۲۔ جنگل میں منگل (سلسلہ وار)	پاکستان	جولائی ۱۹۷۵ء
۸۳۔ جونک اور ناگن (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۷۶ء
۸۴۔ جونک کی واپسی (سلسلہ وار)	پاکستان	جون ۱۹۶۴ء
۸۵۔ جہنم کا شعلہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۶ء
۸۶۔ جہنم کی رقاصہ	پاکستان	فروری ۱۹۵۶ء
۸۷۔ چار شکاری	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۴ء
۸۸۔ چار لکیریں	پاکستان	جولائی ۱۹۵۸ء
۸۹۔ چالیس ایک باون	پاکستان	اگست ۱۹۵۸ء
۹۰۔ چاندنی کا دھواں	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۸ء
۹۱۔ چٹانوں کا راز (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۷۸ء
۹۲۔ چٹانوں میں فائر	پاکستان	ستمبر ۱۹۵۵ء
۹۳۔ چمکیلا غبار	ہندوستان	مئی ۱۹۵۹ء
۹۴۔ چیختی روحیں (سلسلہ وار)	پاکستان	اپریل ۱۹۵۹ء
۹۵۔ چیختے دریچے	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۴ء
۹۶۔ حماقت کا جال	پاکستان	جون ۱۹۵۷ء

۹۷۔ خطرناک انگلیاں (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۹ء
۹۸۔ خطرناک بوڑھا	ہندوستان	اگست ۱۹۵۲ء
۹۹۔ خطرناک جواری (سلسلہ وار)	پاکستان	جون ۱۹۵۹ء
۱۰۰۔ خطرناک دشمن	ہندوستان	جنوری ۱۹۵۵ء
۱۰۱۔ خطرناک ڈھلان (سلسلہ وار)	پاکستان	جون ۱۹۷۵ء
۱۰۲۔ خطرناک لاشیں	پاکستان	فروری ۱۹۵۸ء
۱۰۳۔ خوشبو کا حملہ (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۶ء
۱۰۴۔ خوفناک جنگل	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۲ء
۱۰۵۔ خوفناک عمارت	پاکستان	اگست ۱۹۵۵ء
۱۰۶۔ خوفناک منصوبہ	ہندوستان	جولائی ۱۹۶۸ء
۱۰۷۔ خوفناک ہنگامہ	ہندوستان	فروری ۱۹۵۴ء
۱۰۸۔ خونخوار لڑکیاں	ہندوستان	جولائی ۱۹۵۶ء
۱۰۹۔ خونریز تصادم	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۲ء
۱۱۰۔ خون کا دریا	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۳ء
۱۱۱۔ خون کے پیاسے (سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری ۱۹۵۷ء
۱۱۲۔ خونی بگولے	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۵ء
۱۱۳۔ خونی پتھر	ہندوستان	مئی ۱۹۵۳ء
۱۱۴۔ خونی ریشے (سلسلہ وار)	ہندوستان	ستمبر ۱۹۶۹ء
۱۱۵۔ خونی فن کار (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۷ء
۱۱۶۔ خیر اندیش (سلسلہ وار)	پاکستان	اگست ۱۹۷۴ء
۱۱۷۔ درندوں کی بستی (سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ ۱۹۵۷ء
۱۱۸۔ دست قضا (سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ ۱۹۷۲ء
۱۱۹۔ دشمنوں کا شہر (سلسلہ وار)	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۷ء
۱۲۰۔ دل چسپ حادثہ (سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری ۱۹۶۰ء
۱۲۱۔ دلیر مجرم	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۲ء
۱۲۲۔ دوسرا پتھر (سلسلہ وار)	پاکستان	نومبر ۱۹۷۹ء

۱۲۳۔ دوسرا رخ (سلسلہ وار)	پاکستان	اگست ۱۹۷۸ء
۱۲۴۔ دوسرا شعلہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۶ء
۱۲۵۔ دوسری آنکھ (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۶۶ء
۱۲۶۔ دوہرا قتل	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۴ء
۱۲۷۔ دہشت گر	ہندوستان	ستمبر ۱۹۷۷ء
۱۲۸۔ دھواں اٹھ رہا تھا	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۹ء
۱۲۹۔ دھواں ہوئی دیوار	ہندوستان	مارچ ۱۹۶۹ء
۱۳۰۔ دھوئیں کا حصار (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ء ۱۹۷۳
۱۳۱۔ دھوئیں کی تحریر	پاکستان	جون ۱۹۵۶ء
۱۳۲۔ دیو پیکر درندہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	اگست ۱۹۶۷ء
۱۳۳۔ ڈاکٹر دعا گو (سلسلہ وار)	پاکستان	---۱۹۶۴ء
۱۳۴۔ ڈاکٹر ڈریڈ (سلسلہ وار)	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۷ء
۱۳۵۔ ڈیڑھ متوالے (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ۱۹۶۳ء
۱۳۶۔ رات کا بھکاری (سلسلہ وار)	پاکستان	جون ۱۹۸۰ء
۱۳۷۔ رات کا شہزادہ	پاکستان	مئی ۱۹۵۶ء
۱۳۸۔ رائفل کا نغمہ	ہندوستان	ستمبر ۱۹۵۷ء
۱۳۹۔ رائی کا پربت	پاکستان	ستمبر ۱۹۵۷ء
۱۴۰۔ رقاصہ کا قتل	ہندوستان	اگست ۱۹۵۳ء
۱۴۱۔ رلانے والی	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۶۶ء
۱۴۲۔ روشن ہیولیٰ (سلسلہ وار)	ہندوستان	جون ۱۹۷۱ء
۱۴۳۔ ریت کا دیوتا	ہندوستان	جون ۱۹۷۲ء
۱۴۴۔ ریشوں کی یلغار (سلسلہ وار)	پاکستان	مئی ۱۹۷۵ء
۱۴۵۔ ریگم بالا (سلسلہ وار)	ہندوستان	جنوری ۱۹۷۰ء
۱۴۶۔ زرد فتنہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	اگست ۱۹۷۱ء
۱۴۷۔ زلزلے کا سفر (سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری ۱۹۷۴ء
۱۴۸۔ زمین کے بادل	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۸ء

۱۴۹۔ زہریلا آدمی	ہندوستان	فروری ۱۹۶۰ء
۱۵۰۔ زہریلا سیارہ	ہندوستان	فروری ۱۹۷۵ء
۱۵۱۔ زہریلی تصویر (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ۱۹۶۴ء
۱۵۲۔ زہریلے تیر (سلسلہ وار)	ہندوستان	جنوری ۱۹۵۷ء
۱۵۳۔ زیبرا مین (سلسلہ وار)	پاکستان	جون ۱۹۷۷ء
۱۵۴۔ ساتواں جزیرہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	جنوری ۱۹۶۵ء
۱۵۵۔ سازش کا جال	ہندوستان	ستمبر ۱۹۵۵ء
۱۵۶۔ سانپوں کا مسیحا	ہندوستان	فروری ۱۹۷۳ء
۱۵۷۔ سانپوں کے شکاری	پاکستان	اپریل ۱۹۵۶ء
۱۵۸۔ سائے کی لاش	ہندوستان	اگست ۱۹۵۶ء
۱۵۹۔ سایوں کا ٹکراؤ (سلسلہ وار)	ہندوستان	اپریل ۱۹۷۸ء
۱۶۰۔ سبز لہو (سلسلہ وار)	پاکستان	جولائی ۱۹۶۹ء
۱۶۱۔ ستاروں کی چیخیں (سلسلہ وار)	ہندوستان	دسمبر ۱۹۶۴ء
۱۶۲۔ ستاروں کی موت (سلسلہ وار)	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۶۴ء
۱۶۳۔ سرخ دائرہ	ہندوستان	جون ۱۹۵۶ء
۱۶۴۔ سمندر کا شگاف (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۳ء
۱۶۵۔ سنہری چنگاریاں	ہندوستان	اگست ۱۹۶۵ء
۱۶۶۔ سوالیہ نشان	پاکستان	جنوری ۱۹۵۸ء
۱۶۷۔ سہ رنگا شعلہ (سلسلہ وار)	پاکستان	جنوری ۱۹۶۶ء
۱۶۸۔ سہ رنگی موت (سلسلہ وار)	پاکستان	جون ۱۹۷۶ء
۱۶۹۔ سہمی ہوئی لڑکی (سلسلہ وار)	ہندوستان	اپریل ۱۹۶۶ء
۱۷۰۔ سیاہ پوش لٹیرا	ہندوستان	ستمبر ۱۹۵۴ء
۱۷۱۔ سیکڑوں ہم شکل	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۸ء
۱۷۲۔ شادی کا ہنگامہ	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۸ء
۱۷۳۔ شاہی نقارہ	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۵۳ء
۱۷۴۔ شعلوں کا ناچ	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۶ء

۱۷۵۔ شفق کے پجاری	پاکستان	جولائی ۱۹۵۷ء
۱۷۶۔ شکاری پرچھائیاں (سلسلہ وار)	ہندوستان	جنوری ۱۹۷۸ء
۱۷۷۔ شوگر بینک (سلسلہ وار)	پاکستان	---۱۹۶۷ء
۱۷۸۔ شہباز کا بسیرا (سلسلہ وار)	پاکستان	اپریل ۱۹۷۵ء
۱۷۹۔ شیطان کی محبوبہ	ہندوستان	مئی ۱۹۵۷ء
۱۸۰۔ شیطانی جھیل (سلسلہ وار)	ہندوستان	مارچ ۱۹۶۵ء
۱۸۱۔ صحرائی دیوانہ (۱)	ہندوستان	جون ۱۹۷۹ء
۱۸۲۔ صحرائی دیوانہ (۲)	ہندوستان	جولائی ۱۹۷۹ء
۱۸۳۔ طوفان کا اغوا	ہندوستان	اگست ۱۹۵۷ء
۱۸۴۔ ظلمات کا دیوتا (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۵۹ء
۱۸۵۔ عجیب آوازیں	ہندوستان	جولائی ۱۹۵۳ء
۱۸۶۔ عظیم حماقت	ہندوستان	جولائی ۱۹۷۴ء
۱۸۷۔ عقابوں کے حملے	پاکستان	اگست ۱۹۷۲ء
۱۸۸۔ علامہ دہشت ناک (سلسلہ وار)	پاکستان	فروری ۱۹۷۶ء
۱۸۹۔ عمران کا اغوا (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۵۸ء
۱۹۰۔ عورت فروش کا قاتل	ہندوستان	اپریل ۱۹۵۲ء
۱۹۱۔ فرشتے کا دشمن (سلسلہ وار)	پاکستان	مارچ ۱۹۷۶ء
۱۹۲۔ فرہاد ۵۹	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۹ء
۱۹۳۔ فریدی اور لیونارڈ	ہندوستان	جون ۱۹۵۲ء
۱۹۴۔ فضائی ہنگامہ (سلسلہ وار)	پاکستان	اپریل ۱۹۶۸ء
۱۹۵۔ قاتل سنگریزے	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۳ء
۱۹۶۔ قاتل کا ہاتھ (سلسلہ وار)	ہندوستان	جون ۱۹۶۶ء
۱۹۷۔ قاصد کی تلاش	پاکستان	اگست ۱۹۵۷ء
۱۹۸۔ قبر اور خنجر	پاکستان	اکتوبر ۱۹۵۶ء
۱۹۹۔ کالی تصویر	پاکستان	دسمبر ۱۹۵۷ء
۲۰۰۔ کالی کہکشاں	پاکستان	مئی ۱۹۷۶ء

۲۰۱۔ کالے چراغ (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۵۶ء
۲۰۲۔ کھلی ہوئی لاش	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۵ء
۲۰۳۔ کنگ چانگ (سلسلہ وار)	پاکستان	ستمبر ۱۹۷۳ء
۲۰۴۔ گارڈ کا اغوا	ہندوستان	فروری ۱۹۵۸ء
۲۰۵۔ گمشدہ شہزادی	پاکستان	مئی ۱۹۵۷ء
۲۰۶۔ گھر کا بھیدی (سلسلہ وار)	پاکستان	---۱۹۶۴ء
۲۰۷۔ گیارہ نومبر	پاکستان	جنوری ۱۹۶۹ء
۲۰۸۔ گیارھواں زینہ	ہندوستان	مئی ۱۹۵۶ء
۲۰۹۔ گیت اور خون	پاکستان	اگست ۱۹۶۶ء
۲۱۰۔ گیتوں کے دھماکے	ہندوستان	اگست ۱۹۵۴ء
۲۱۱۔ گیند کی تباہ کاری	پاکستان	مئی ۱۹۵۸ء
۲۱۲۔ لاش کا بلاوا	ہندوستان	جنوری ۱۹۵۸ء
۲۱۳۔ لاش کا سوداگر	ہندوستان	نومبر ۱۹۵۵ء
۲۱۴۔ لاش کا قہقہہ (سلسلہ وار)	ہندوستان	مارچ ۱۹۵۷ء
۲۱۵۔ لاش گاتی رہی	پاکستان	نومبر ۱۹۷۶ء
۲۱۶۔ لاشوں کا آبشار	ہندوستان	جون ۱۹۵۴ء
۲۱۷۔ لاشوں کا بازار	پاکستان	ستمبر ۱۹۵۶ء
۲۱۸۔ لرزتی لکیریں (سلسلہ وار)	پاکستان	مئی ۱۹۷۹ء
۲۱۹۔ لڑاکوں کی بستی	ہندوستان	فروری ۱۹۵۹ء
۲۲۰۔ لڑکیوں کا جزیرہ	پاکستان	جولائی ۱۹۵۶ء
۲۲۱۔ لوبولی لا (سلسلہ وار)	پاکستان	دسمبر ۱۹۶۵ء
۲۲۲۔ لیونارڈ کی واپسی	ہندوستان	جنوری ۱۹۵۶ء
۲۲۳۔ متحرک دھاریاں (سلسلہ وار)	پاکستان	جولائی ۱۹۷۶ء
۲۲۴۔ مصنوعی ناک☆	ہندوستان	ستمبر ۱۹۵۲ء
۲۲۵۔ معصوم درندہ	پاکستان	دسمبر ۱۹۷۴ء
۲۲۶۔ مناروں والیاں (سلسلہ وار)	پاکستان	فروری ۱۹۶۹ء

۲۲۷۔ موت کا مہمان (سلسلہ وار)	پاکستان	---۱۹۶۴ء
۲۲۸۔ موت کی آندھی	ہندوستان	جنوری ۱۹۵۳ء
۲۲۹۔ موت کی آہٹ (سلسلہ وار)	پاکستان	جولائی ۱۹۷۸ء
۲۳۰۔ موت کی چٹان	ہندوستان	جون ۱۹۵۵ء
۲۳۱۔ موروثی ہوس	ہندوستان	اکتوبر ۱۹۷۶ء
۲۳۲۔ مونالیزا کی نواسی (سلسلہ وار)	پاکستان	اکتوبر ۱۹۷۷ء
۲۳۳۔ مونچھ مونڈنے والی	ہندوستان	جولائی ۱۹۵۴ء
۲۳۴۔ مہکتے محافظ (سلسلہ وار)	پاکستان	فروری ۱۹۷۷ء
۲۳۵۔ مہلک شناسائی (سلسلہ وار)	ہندوستان	نومبر ۱۹۶۸ء
۲۳۶۔ نادیدہ ہمدرد	پاکستان	اپریل ۱۹۷۴ء
۲۳۷۔ نیلم کی واپسی	ہندوستان	جنوری ۱۹۷۶ء
۲۳۸۔ نیلی روشنی	ہندوستان	ستمبر ۱۹۵۳ء
۲۳۹۔ نیلی لکیر	ہندوستان	جولائی ۱۹۵۵ء
۲۴۰۔ نیلے پرندے	پاکستان	مارچ ۱۹۵۶ء
۲۴۱۔ وبائی ہیجان	ہندوستان	جون ۱۹۵۸ء
۲۴۲۔ ہلاکت خیز (سلسلہ وار)	پاکستان	مئی ۱۹۷۷ء
۲۴۳۔ ہلاکو اینڈ کو	پاکستان	اکتوبر ۱۹۷۰ء
۲۴۴۔ ہمزاد کا مسکن (سلسلہ وار)	ہندوستان	جون ۱۹۷۸ء
۲۴۵۔ ہولناک ویرانے	ہندوستان	دسمبر ۱۹۵۵ء
۲۴۶۔ ہیروں کا فریب	پاکستان	نومبر ۱۹۵۹ء
۲۴۷۔ ہیرے کی کان	ہندوستان	فروری ۱۹۵۳ء

....

نوٹ: مشہور ہے کہ ناول ’مصنوعی ناک‘ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے دوران پانی کے جہاز پر ہی لکھا گیا۔

ڈاکٹر عقیل عباس جعفری ٭

ابنِ صفی، تخیل کی طاقت اور سائنس فکشن

اردو ادیبوں میں ابن صفی ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ شروع شروع میں ادب کے سکہ بند ناقدین نے انھیں درخور اعتنا نہیں سمجھا مگر پھر سب ان کے قلم کے اسیر ہوتے چلے گئے۔ ابن صفی کا قلمی سفر ۲۸ سال پر محیط ہے۔ اس سفر کے دوران انھوں نے ڈھائی سو کے لگ بھگ ناول تخلیق کیے جو جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔ جنوری ۱۹۵۲ء میں جاسوسی دنیا کا پہلا ناول دلیر مجرم اور اگست ۱۹۵۵ء میں عمران سیریز کا پہلا ناول خوفناک عمارت شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ ان کی وفات تک جاری رہا۔ ان ناولوں میں انھوں نے ایک نئی دنیا ایجاد کی جس میں نت نئے طریقوں اور ایجادات کی مدد سے جرائم کا خاتمہ کیا جاتا تھا۔

سائنس فکشن کے تعلق سے ممتاز مصنف عرفان جاوید اپنی کتاب ''عجائب خانہ'' میں لکھتے ہیں کہ: ''حیران کن طور پر مغرب میں بہت سے ناول اور افسانے سائنسی ایجادات کا باعث بنے ہیں۔ ان ناولوں سے نئے خیالات نے جنم لیا جن سے نئے امکانات کی کونپلوں نے سر اٹھایا اور چند شوریدہ سروں نے خیال کو ٹھوس شکل دینے کی ٹھانی اور کام یاب ٹھہرے۔ داستان انسان درحقیقت شوریدہ سروں کی داستان ہی تو ہے۔

مارٹن کوپر نے ۱۹۷۰ء کی دہائی میں پہلا موبائل فون ایجاد کیا، وہ اس ایجاد کا سہرا ایک ناول پر بننے والی ٹی وی سیریل اسٹار ٹریک کو دیتا ہے۔ اس امریکی سیریز نے ایک پوری نسل (بہ شمول پاکستانی نسل) کو متاثر کیا تھا۔ اس میں کئی نئے معروف ہونے والے آلات میں ایک آلہ Communicator کمیونی کیٹر تھا۔ یہ بے تار کا فون تھا اور جدید موبائل فون کا جدامجد بھی۔

فرانسیسی مفکر اور ناول نگار جولز ورن کو ''بابائے سائنس فکشن'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے معروف ناولوں میں ''زمین کے بیچ تک کا سفر''، ''دنیا کے گرد اسی روز میں'' اور ''سمندر کے نیچے ہزار لیگز (فاصلہ پیما)'' وغیرہ شامل ہیں۔

جولز ورن نے زیر آب چلنے والے ایک ایسے بحری جہاز کا تصور دیا جو بجلی سے چلتا تھا۔ اس زیر آب جہاز کا نام ''نوٹیلس'' رکھا گیا تھا۔ اس تصور نے سائمن لیک نامی لڑکے کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ایسی ایجاد کرنے پر تل گیا اور بالآخر دنیا کی پہلی آبدوز بنانے میں کام یاب ہوگیا۔ سائمن نے اس کا نام آرگوناٹ رکھا۔

جولز ورن نے ۱۸۶۵ء کے ایک ناول میں انسان کے چاند پر اترنے کی تفصیلات کی حیران کن طور پر درست تصویر کشی کردی تھی۔ حقیقی طور پر انسان اس ناول کے تحریر کیے جانے کے ۱۰۴ برس بعد چاند پر اپنے قدم رکھنے میں کام یاب ہوا تھا۔ چاند پر کششِ ثقل

٭ مکان نمبر ۹۴/۱، اسٹریٹ نمبر ۲۶، فیز ۶، ڈی ایچ اے، کراچی۔ فون: ۰۳۲۱-۹۲۴۲۰۹۸

زمین کی نسبت کم ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان چاند پر زمین کی طرح قدم جما نہیں پاتا۔ جولز ورن ۱۸۶۵ء میں دیگر تفصیلات کے علاوہ تحریر کرتا ہے۔ ''ان تینوں کو محسوس ہوا کہ ان کے بدن وزن سے محروم ہوگئے ہیں۔ اگر وہ اپنے بازو بڑھا دیتے تو بھی گرنے کا خدشہ نہ تھا۔ ان کے سر ان کے کندھوں پر ہلتے تھے، ان کے قدم جمتے نہ تھے اور وہ خمار آلودگی کے شکار آدمیوں کی مانند استحکام سے محروم تھے۔''

۱۸۰۹ء کا واقعہ ہے۔ ابھی ٹیلی فون بھی عام نہ ہوئے تھے۔ معروف مفکر و ادیب مارک ٹوئن نے اپنی کہانی ''۱۹۰۴ کے لندن ٹائمز سے'' میں ایک ایجاد کا خاکہ پیش کیا جسے ''ٹیلی کیٹرو اسکوپ'' کا نام دیا۔ وہ ایجاد ٹیلی فون سسٹم کے ذریعے ایک ورلڈ وائڈ نیٹ ورک (www) قائم کرتی ہے جس کے ذریعے معلومات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ یوں مارک ٹوئن نے انٹرنیٹ کا ابتدائی تصور پیش کیا۔

مغربی سائنس فکشن میں ایسی بے شمار ایجادات کا تذکرہ وضاحت کے ساتھ ملتا ہے جو بعد ازاں معرض وجود میں آئیں۔ گویا ذہن نارسا کو اسی توسط سے رسائی میسر آئی۔ ان میں خودکار چہرہ شناسی (Automated Face Recognition) جسے آج کے ٹچ اسکرین فون تک میں عام کر دیا گیا ہے، ناول ''ڈارون کی اولاد'' از گریگ بیر میں موجود ہے۔ اسی طرح دیگر ایجادات میں شامل، ٹچ ٹیبلیٹ، ڈرون، ای۔ پیپر اور دیگر بے شمار آلات و اشیا کے ابتدائی خیال فکشن میں پیش کر دیے گئے تھے۔''

ابن صفی کے سوانح نگار راشد اشرف نے اپنی کتاب ''ابن صفی، شخصیت اور فن'' میں ابن صفی کی تحریروں پر مغربی اثرات کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ ''ابن صفی نے اپنے ناول ''زمین کے بادل'' کے ''پیش رس'' میں ابن صفی نے اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ ان کے (اس وقت تک کے لکھے) کل ناول آٹھ ناول مغرب سے مستعار لیے گئے تھے، لکھتے ہیں: ''میرا پہلا ناول دلیر مجرم تھا۔ پہلا ناول تھا اس لیے کسی بیرونی سہارے کی بھی ضرورت تھی لہٰذا اس کا مرکزی خیال مغربی ادب سے لیا گیا۔ لیکن حمید اور فریدی میرے اپنے کردار تھے۔ اس کے علاوہ جاسوسی دنیا میں ایسے ناول اور بھی ہیں جن کے پلاٹ میں نے انگریزی سے لیے تھے مثلاً پراسرار اجنبی، رقاصہ کا قتل، ہیرے کی کان، خونی پتھر۔ ان پانچ ناولوں کے علاوہ آپ کو میرے ۱۰۲ ناولوں میں ایک بھی ایسا نہیں ملے گا جن کا پلاٹ میرا اپنا نہ ہو۔ عمران کے سارے ناول بے داغ ہیں۔ ان میں نہ آپ کو کوئی ایسی کہانی ملے گی جس کا پلاٹ انگریزی سے لیا گیا ہو اور نہ کوئی ایسا کردار ملے گا۔ وہ پانچ ناول جن کے پلاٹ میں نے انگریزی سے لیے ہیں ترجمے نہیں ہیں۔ ان کی ایک ایک سطر پر میرا دعویٰ ہے۔''

''زمین کے بادل'' کی اشاعت کے بہت برسوں بعد ریڈیو پاکستان کراچی کے پروگرام ''آپ جناب'' کے کیے ریکارڈ کیے گئے انٹرویو میں ابن صفی نے پہلی مرتبہ اپنی تحریروں پر مغربی اثرات کے بارے میں کھل کر بات کی تھی۔ یہ نہایت اہم مکالمہ ذیل میں ملاحظہ ہو:

> نجم الحسنین: یہ بتائیے کہ آپ کے افکار پر خاص طور سے جاسوسی طرز نگارش پر باہر کے رویے کے کتنے اثرات ہیں؟
>
> ابن صفی: دیکھیے یہ تو طے ہے کہ جاسوسی ناول ہم لوگوں میں باہر ہی سے آیا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ میں نے باہر ہی سے لکھا۔ لیکن میرے ادب پر اس چیز کے اتنے ہی اثرات ملیں گے جتنے کہ معاشرے پر ملتے ہیں۔ اگر میں کسی ایسے طبقے کے بارے میں لکھتا ہوں جس پر مغربیت کا سایہ ہے تو ظاہر ہے

اس کی جھلکیاں میری تحریر میں بھی ملیں گی۔ اس کی وجہ سے بسا اوقات لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب یہ اینگلو اردو ادب پیش کررہے ہیں، یہ اردو ادب نہیں ہے۔ بھائی! یہ بھی تو دیکھیں کہ میں کس طبقے کی عکاسی کررہا ہوں۔ جب میں متوسط یا نچلے طبقے کی بات کرتا ہوں تو وہاں مغربیت کی پرچھائیاں تک نہیں ملیں گی۔ لیکن جب کوئی ذات مغرب زدہ ہے اور میں اس کی بات کروں گا تو مغرب کی پرچھائیں ضرور ملیں گی۔

راشد اشرف نے محمد اسلم غازی کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے جس میں ان سائنسی ایجادات کا تذکرہ ملتا ہے جو ابن صفی کی تحریروں میں موجود ہیں۔ محمد اسلم غازی کے مطابق ''ابن صفی آرٹس گریجویٹ تھے لیکن ان کی قوت متخیّلہ کسی سائنسدان سے کم نہیں تھی۔ اپنے ناولوں میں انھوں نے ایسی ایسی محیرالعقول مشینوں اور آلات سے متعارف کرایا تھا جو تیس، چالیس سال بعد واقعی عالم وجود میں آ گئیں۔ مثلاً ساتواں جزیرہ، میں انھوں نے آئیڈنٹیٹی کاسٹ اکوپمنٹ یعنی شناخت ڈھالنے کا آلہ پیش کیا جس کے ذریعے کرنل فریدی چہرے، آنکھوں، ناک اور ہونٹوں وغیرہ کی مختلف ساختوں کو یادداشت کے سہارے یکجا کرکے مجرم کا حلیہ تیار کرلیتا ہے۔ آج کل پولیس اور خفیہ محکمے یہ مشین استعمال کرکے مشتبہ ملزموں کے چہروں کے خاکے روزانہ اخبارات میں شائع کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے کنفیشن چیئر یعنی سچ اگلوانے والی مشین کا تذکرہ اپنے کئی ناولوں میں کیا ہے۔ اسی طرح ''چاندنی کا دھواں'' میں ابن صفی نے ایک ایسا ٹی وی پیش کیا تھا جس کی تصاویر فضا میں دیکھی جاسکتی تھی۔ تقریباً بیس پچیس سال قبل ایک فرانسیسی کمپنی نے بمبئی کے گرگاؤں چوپاٹی ساحل پر اسی طرح کا ایک شو کیا تھا جس میں ہوا میں تصاویر نظر آتی تھیں۔ اسی طرح زیر لینڈ سیریز کے ایک ناول میں ابن صفی کے تخیل نے تصاویر اور آواز کی طرح انسان کو بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسمٹ کردیا تھا۔ ممکن ہے کہ سفر کا یہ جدید ترین طریقہ بھی سائنس جلد ہی دریافت کرلے۔

راشد اشرف لکھتے ہیں کہ ''چاندنی کا دھواں'' نامی جس ناول کی بات اسلم غازی نے کی ہے اس میں پیش کردہ تکنیک کو آج کی دنیا میں Hologram Technology کے نام سے جانا جاتا ہے۔

جاسوسی دنیا کے ناول ''طوفان کا اغوا'' میں ابن صفی نے فولادی نامی روبوٹ کو پیش کیا تھا۔ آگے چل کر روس میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ اس تجربے کا ذکر خود ابن صفی نے اپنے ایک ''پیش رس'' میں کیا تھا۔ ابن صفی نے اپنے ناولوں میں الیکٹروگس اور فے گراز کا ذکر سنہ پچاس کی دہائی میں کیا تھا۔ اس کے بہت بعد میں الیکٹروگس، لیزر گن کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا جبکہ فے گراز کو ہم اڑن طشتری کہہ سکتے ہیں۔ عمران سیریز کے ناول ''سبز لہو'' میں ایک شخص پر فائر کیے جاتے ہیں اور اس کے جسم پر موجود لباس میں سے سبز رنگ کا رقیق مادہ بہہ نکلتا ہے۔ فائر کرنے والے اسے کوئی مافوق الفطرت وجود سمجھتے ہیں۔ اس ناول کے کئی برس بعد ہالی وڈ میں Alien نامی فلم بنی تھی جس میں ایلین کا خون سبز رنگ کا دکھایا گیا تھا۔ بعدازاں امریکی ٹی وی سیریل X-Files میں بھی کئی مقامات پر یہی بات دہرائی گئی۔ یقیناً یہ ایک اتفاق ہوسکتا ہے مگر اگر یہ اتفاق بھی ہے تو دل چسپ ہے۔ X-Files کا تخلیق کار ''کرس کارٹر'' ایک انتہائی ذہین انسان ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ کرس کارٹر کی تحریر اور ابن صفی کے ناولوں میں کئی مقامات پر تکنیک کے اعتبار سے خاصی مماثلت پائی جاتی ہے۔

کلوننگ جدید دنیا کی ایک خطرناک ٹیکنالوجی ہے جس کی مدد سے ایک جیسے انسان تخلیق کیے جاسکتے ہیں۔اس سے ملتا جلتا تصور ابن صفی نے جاسوسی دنیا کے ناول ''جنگل کی آگ'' میں ۱۹۶۰ء میں ایک ایسی مشین کو پیش کرکے کیا تھا جس کے ایک جانب تین لاغر انسانوں کو ڈالا جاتا ہے اور دوسری جانب سے ایک طاقتور گوریلا تخلیق پاتا تھا۔

ابن صفی نے عمران سیریز کے ناول ''زلزلے کا سفر'' کے پیش رس میں اپنے ناولوں میں پیش کی جانے والی سائنسی ایجادات کے بارے میں لکھا تھا:

> دھویں کا حصار بالآخر ٹوٹ گیا۔ دھوئیں کے حصار کے اندر کیا تھا؟ کتنی بڑی تباہی کا سامان پروان چڑھ رہا تھا۔ ہوسکتا ہے آپ اسے بھی طلسم ہوش رُبائی پرواز تخیل سمجھ کر کچھ دیر مجھ پر ہنس لیں۔لیکن دس سال کے اندر اندر آپ ایسے ہی کسی تباہ کن حربے کے وجود سے ضرور آگاہ ہوجائیں گے۔ یہ ساری ایجادات جو اس وقت آپ کے معمولات زندگی میں داخل ہوکر رہ گئی ہیں بہت پہلے تخیل پرست آرٹسٹوں کی ''پینک'' ہی سمجھی گئی ہوں گی۔لیکن آج آپ انھیں خود برت رہے ہیں۔تیس سال قبل جب ہالی وڈ نے چاند کے سفر پر فلمیں بنائی تھیں تو امریکا کے سنجیدہ افراد نے ان کا بے تحاشا مذاق اڑایا تھا۔لیکن آج سے سے پہلے امریکا ہی کو یہ فخر حاصل ہوا ہے کہ اس کے باسی چاند پر سچ مچ چہل قدمی کرآئے ہیں۔

عمران سیریز کے ناول ''شوگر بینک'' کا ''پیش رس'' اس لحاظ سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں ابن صفی نے سائنسی ایجادات کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی تھی۔ لکھتے ہیں:

> آج جبکہ ایک مردہ آدمی کی آنکھیں کسی نابینا کو روشنی بخش سکتی ہیں تو اسے بھی ناممکن نہ سمجھنا چاہیے کہ ایک ذہن اپنے تمام تر تجربات سمیت کسی دوسرے جسم میں منتقل کیا جاسکے۔ سات آٹھ سال پہلے کی بات ہے میں نے ''طوفان کا اغوا'' نامی ناول میں فولادی پیش کیا تھا۔ابھی حال ہی میں روس سے خبر آئی ہے کہ وہاں ''فولادی'' تخلیق کرلیا گیا۔ وہ نہ صرف ٹریفک کنٹرول کرتا ہے بلکہ خلاف ورزیوں پر چالان بھی کردیتا ہے اور اسے کنٹرول کرنے کا طریقہ بھی وہی ہے جو میں نے لکھا تھا۔حاشاؤ کلا۔ میں روس والوں پر چوری کا الزام نہیں عائد کرنا چاہتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی خیال بیک وقت ایک سائنٹسٹ اور کہانی کار کے ذہن میں جنم لے سکتا ہے۔ کہانی کار قلمی تصویر بناتا ہے اور سائنٹسٹ اسے جیتی جاگتی دنیا میں مادی شکل دے دیتا ہے۔

ابن صفی کی تخیلاتی سائنسی ایجادات کا ذکر این ای ڈی یونی ورسٹی کی سابق اسسٹنٹ پروفیسر اپنے ایک ریسرچ پیپر میں بھی کیا ہے جو بزم سائنسی ادب کراچی کی ایک ماہانہ نشست میں پیش کیا گیا تھا۔ اس ریسرچ پیپر میں نائلہ حنا خان نے بطور تمہید لکھا کہ ''انسان ہمیشہ سے آسمان کی طرف رخ کرکے، پرندوں کی طرح پرواز کرنے کا خواب دیکھتا آیا ہے۔کبھی سیمرغ پر سوار ہوکر تو کبھی الف لیلوی اڑن قالین پر بیٹھ کر۔ لیونارڈو ڈاونسی کی پرانی ڈرائنگز کے مشاہدے سے معلوم ہوچکا ہے کہ وہ بھی فضا میں انسانی پرواز کے خواب کی

تعبیر پانے کی جستجو میں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ کامیابی رائٹ برادران کے حصے میں آئی اور بیسویں صدی عیسوی میں کہیں جا کر ہوائی جہاز ایجاد ہوا۔

آج انسانی شعور کی بلوغت کا دور ہے۔ لیکن انسانی شعور اور لاشعور کو اس منزل تک پہنچنے میں صدیوں کا سفر طے کرنا پڑا ہے اور اس سفر کے دوران حضرت انسان نے محض اپنے تخیل کے زور پر طرح طرح کی ایجادات و اختراعات کر ڈالیں۔ یہ ایجادات ہمیشہ پہلے انسانوں، کہانیوں اور خواب کی شکل یا آرٹ کے نادر نمونوں، ڈرائنگ وغیرہ کی صورت میں صرف ایک خیال، تصور، آئیڈیا، خواب یا شاہ کار فن ہی رہیں جو آخر کار ترقی کرتے کرتے ایجاد کی حیثیت سے ظہور پذیر ہوئیں۔''

نائلہ حنا خان نے اپنے اس مضمون میں الیکٹروگس، فے گراز، کلوننگ اور فولادمی نامی ایجادات کا ذکر کیا جن کا تذکرہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ: ''ابن صفی کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں دنیا کے مختلف علاقوں اور ملکوں کی سیر کروائی کہ جہاں انھوں نے کبھی خود قدم نہ رکھا تھا۔ اس کے باوجود، جب بعدازاں ابن صفی کے قارئین نے وہ جگہیں خود اپنے آنکھوں سے دیکھیں تو منظر ویسا ہی پایا جیسا ابن صفی نے اپنے ناولوں میں بیان کیا تھا۔ یہ ان کے تخیل کی پرواز کا کرشمہ تھا، جو آج ''مائنڈ پاور'' کے ماہرین کے لیے کسی عجوبے سے کم نہیں۔ مثلاً ''ایڈلاوا'' نامی ناول میں اٹلی کی جھیل ''کومو'' (Como) کا تذکرہ ہے، جو حقیقتاً ویسی ہی ہے جیسی ان کے ناول میں بتایا گیا۔''

بھارت سے شائع ہونے والے رسالے ''سائنس کی دنیا'' کے سابق مدیر محمد خلیل نے بالکل درست لکھا ہے کہ ''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ابن صفی نے عام قاری کو ادب میں ایک نئی سمت اور تازہ افکار سے متعارف کروایا ہے جس کا سہرا صرف اور صرف ابن صفی کے سر ہے۔ انھوں نے توہمات سے دور ہٹ کر عوام کو سائنسی طریقے سے سوچنے پر مجبور کیا اور اپنی ایک علاحدہ شناخت قائم کی جس کی گرویدہ سماج کے ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ اگر ہم ابن صفی کے ناولوں کا سرسری جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں میں سسپنس، ایڈونچر، مزاح، ہر طرح کی تحریروں کے انداز کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کے ناولوں میں سائنسی فکشن کا انداز بھی بے حد اہم ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ابن صفی ہی وہ ادیب ہیں جنھوں نے اردو میں جاسوسی، سائنس فکشن کی ایک نئی طرح کی ابتدا کی ہے۔ ابن صفی کی کہانیوں کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ان میں بھوت پریتوں اور راکھشسوں کے مصنوعی خیال اور توہم پرستی کو رد کیا گیا ہے اور ہر واقعے کی سائنسی تشریح پیش کی جاتی رہی ہے۔''

ابن صفی نے اپنے سائنس فکشن کے بارے میں لکھا ہے کہ ''سائنس فکشن لکھنا آسان کام نہیں ہے، پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے ذہین پڑھنے والوں کو کسی حد تک مطمئن کر سکوں۔ محیر العقول اور بعید از قیاس واقعات کا یکجا کر کے کہانی کی شکل دے دینا آسان ہے لیکن ان کا جواز پیش کرنا ہی حقیقتاً اس طلسمی ہوشربا کو سائنس فکشن میں تبدیل کرنا کہلاتا ہے اور تھوڑے وقت میں یہ ایک مشکل کام ہے۔''

شاید تخیل کی یہی قوت ابن صفی کی کامیابی کا راز ہے جس کی وجہ سے ان کے مداحین اور قارئین کی تعداد دن بہ دن بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر فاروق عادل ٭

ابنِ صفی کی فکر، کردار اور مسائل واثرات

ابن صفی کو بدقسمت ادیب قرار دیا جاتا ہے۔ وہ بدقسمت ہیں لیکن اس وجہ سے نہیں جو زبان زد عام ہے یعنی انھیں ادیب مانا نہیں گیا۔ ان کی تحریروں کو وہ توجہ نہیں ملی جس کے وہ حق دار تھے، وغیرہ۔ ان کی بدقسمتی کا اصل سبب اور ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں کا مزاج اور فکر توجہ سے محروم رہ گئے۔

یہ حادثہ ہوا کیسے؟ ممکن ہے کہ اس کی جڑیں کہیں زیادہ گہری ہوں لیکن میرے ذہن میں ۸۰ کی دہائی پھانس بن کر چبھی ہوئی ہے۔ انجمن طلبہ جامعہ کراچی کا سالانہ مجلّہ ''الجامعہ'' اردو ادب کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے مدیروں نے پاکستان ہی نہیں پاکستان سے باہر جا کر بھی اکابرین اردو سے مکالمے کر کے اردو ادب کے مسائل اجاگر کیے۔ ایسے مکالموں میں ایک مکالمہ ممتاز شاعر، ادیب اور صحافی حضرت احمد ندیم قاسمی کا بھی تھا۔ ان سے ابن صفی کے ناولوں اور تحریروں کے بارے میں سوال کیا گیا تو وہ لحظہ خاموش ہوئے، مسکرائے اور کہا، ممکن ہے کہ میں اس کے سامنے کچھ نہ کہوں لیکن سچ یہ ہے کہ میں اسے ادیب نہیں مانتا۔

شاید اسی قسم کا طرز عمل رہا ہو گا کہ ابن صفی سے محبت کرنے والے حلقے نے انھیں ادیب ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ چند برس قبل راشد اشرف نے ابن صفی کے بارے میں مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کر شائع کیا۔ مجموعے میں کئی مضامین قابل توجہ ہیں۔ ہمارے طلسماتی افسانہ نگار انتظار حسین نے اپنے ایک کالم میں اس کتاب پر اظہار خیال کیا اور کتاب کے بعض مندرجات کے حوالے سے انکشاف کیا کہ انھیں تو مجنوں گورکھ پوری اردو جیسی عظیم المرتبت شخصیت بھی پڑھا کرتی تھی۔ اتنا کہہ کر انھوں نے سوال اٹھایا کہ جن ناولوں سے مجنوں گورکھ پوری جیسا ادیب، شاعر اور نقاد حظ اٹھاتا ہو، وہ کیسے ادیب نہیں ہو گا؟ نہیں معلوم انتظار حسین نے اس مضمون کی سرخی کیا باندھی ہو گی لیکن انٹرنیٹ پر جہاں یہ مضمون دست یاب ہے، وہاں درج ہے:

ابن صفی کا لوہا جیسے ماننا چاہیے تھا، نہیں مانا گیا۔

انتظار صاحب کے مضامین کی سرخی کا یہ انداز نہیں لیکن یہ واقعہ تو اپنی جگہ حقیقت ہے کہ انتظار صاحب کے ذہن میں یہ کھٹک بہرحال موجود تھی کہ ابن صفی کو تسلیم نہیں کیا گیا یا جیسا انھیں تسلیم کرنے کا حق تھا، ویسے تسلیم نہیں کیا گیا۔ ایسا نہ ہوتا تو کیوں وہ مجنوں گورکھ پوری کا حوالہ تلاش کرتے اور اپنی گفتگو کی تان اسی المیے پر توڑتے کہ انھیں یاروں نے مان کر نہیں دیا۔

یہاں پہنچ کر یہ مضمون ہمیں دو زیادتیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ پہلی تو یہی کلاسیکی زیادتی کی طرف یعنی اردو والوں نے ابن

٭ سابق مشیر، صدرِ پاکستان۔ برقی پتا: farooq.adilbhuta@gmail.com

صفی کو مان کر نہیں دیا۔ دوسری زیادتی کا مرتکب حلقہ محبان ابن صفی ہوا ہے جس نے انھیں ادیب اور ان کی تحریروں کو ادب ثابت کرنے کی دھن میں ان تحریروں کے حسن، ان کی کردار نگاری اور خود اس ادیب کی فکر اور مزاج کو بھی نظر انداز کر دیا۔

اس بیان پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ ایسا تو ہرگز نہیں۔ ان کے کرداروں اور اسلوب تو توجہ دی گئی ہے، ثبوت کے طور پر کئی مضامین حتیٰ کہ تحقیقی مقالے پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں ان کے مردانہ کیا نسوانی کرداروں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ خاص طور پر ڈاکٹر خالد جاوید کا کام جنھوں نے ابن صفی پر ایسے خلوص کے ساتھ توجہ دی جیسی توجہ حسن عسکری مرحوم نے مولانا اشرف علی تھانوی علیہ رحمہ پر دیا کرتے تھے۔ یہ سب ہوا ہے اور اس کام کی گہرائی اور گیرائی پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔ اس کھلی حقیقت کے باوجود ایک خاص پہلو کی طرف سے اشارہ ضروری محسوس ہوتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں میں کلب کی سرگرمیاں، مرد و زن کا اختلاط اور شراب و شباب کی علتیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ علتیں ایک اعتبار سے ناگزیر بھی ہیں کہ جرم اور جاسوسی کی دنیا کا بیشتر کاروبار ایسے ہی مقامات پر پھلتا پھولتا ہے اور اس کے مختلف کردار عادتاً یا ضرورتاً ان مشغلوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ گویا یہ لہولعب کی دنیا ہے جس کی غلاظت سے بچاؤ شاذ ہی ممکن ہو لیکن یہ ابن صفی ہی کا کمال ہے کہ بدی میں کانوں تک ڈوبی ہوئی اس دنیا کے بنیادی کردار ان سب عوارض سے اس طرح دامن بچائے رکھتے ہیں کہ مکھن سے بال کی طرح نکال لیے جانے والا محاورہ یاد آجاتا ہے۔

کرنل فریدی کو تو جانے دیجیے کہ یہ حضرت تو سنجیدگی اور متانت کا پہاڑ ہیں۔ ایسے لوگوں کے کردار پر چھینٹے ڈالنے کے خواہش مندوں کو ہمیشہ شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان کے مقابلے میں عمران کا کردار زیادہ خطرناک ہے۔ چلبلا، شریر، ہنسوڑ، اس پر طرہ یہ کہ نوجوان جس پر حسینائیں مکھیوں کی طرح گرتی ہیں۔ یہ صاحب خود بھی پر کشش ہیں۔ دل نشیں ادائیں انھیں مزید پر کشش بناتی ہیں، گویا جوانی کے کے بحر بے کراں میں اترنے ہی نہیں بلکہ ڈوبنے کا سارا سامان موجود ہے لیکن یہ صاحب بھی تپلی گلی سے پھسل کر یوں باہر نکل آتے ہیں جیسے ہر قسم کے گناہوں سے پاک کوئی نومولود بچہ۔ علی عمران خاص طور پر ایسا ہی کردار ہے جس کی خواہش علامہ اقبال نے کی اور اپنی شاعری میں اسے شاہین قرار دیا۔

مثال کے طور پر عمران کی ایک مستقل عاشق جولیانا فٹز واٹر ہیں جو ہمارے اس ہیرو کو اپنے دام محبت میں پھنسانے کا کوئی موقع ضائع نہیں جانے دیتیں۔ یہ سلسلہ صرف جولیانا فٹز واٹر تک کہاں محدود ہے۔ حسیناؤں کا ایک جھرمٹ ہے جن کے عشوہ و ادا سے یہ نوجوان ہمیشہ اور نہایت آسانی کے ساتھ بچ نکلتا ہے۔ ابن صفی کا ایک کردار اپنے ڈیل ڈول اور طاقت سے دشمنوں پر لرزہ طاری کر دینے والا جوزف ہے جس کا تعلق نوآبادی حکمرانوں کی باقیات سے ہے یا وہ عمران کی محبت میں ترک وطن کر کے اس کی آرزوؤں کے وطن یعنی میں آبسا ہے۔

کیا اقبال کا شاہین ابن صفی کے پیشِ نظر رہا ہوگا؟ اس سلسلے میں کوئی حتمی بات کہنے کی ایک صورت یہ ہے ہمیں ان کا اپنا کوئی بیان میسر آجائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان کے کرداروں کی تحلیل نفسی کر کے یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ ان کی پیدائش اور پرورش و پرداخت کیسے دماغ میں ہوئی۔ اس مسئلے کا تیسرا حل یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ ان کرداروں کا وہ کون سا پہلو ہے جو

مستقل ہے اور کسی بھی فریب کا شکار ہو کر اپنا راستہ نہیں چھوڑتا۔

کرنل فریدی ہوں یا عمران، ہر دو کی افتادِ طبع یقیناً مختلف ہے لیکن ان دونوں کرداروں کی بنیادی خوبی، راست فکری، حب وطن اور اپنی عصمت کا تحفظ ہے۔ ان کرداروں کو دیکھ کر اقبال کی ایک مشہور دعا کے الفاظ ذہن میں گونجنے لگتے ہیں:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی
خدا کرے کہ جوانی تری رہے بے داغ

کیا ابن صفی اور ان کرداروں کا بڑے سے بڑا مخالف بھی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ ان کرداروں کو اقبال کی یہ دعا نہیں لگی؟

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ابن صفی فکری اعتبار سے اقبال کے قبیلے سے تعلق رکھتے تھے یا نہیں لیکن اس دعوے کی تردید آسان نہیں ہے کہ ان کے ان دونوں کرداروں کا تصور اقبال کے اسی تصور سے لیا گیا ہے جس کی لفظی صورت گری انھوں نے شاہین کہہ کر فرمائی۔ محبان ابن صفی اگر ان کے کرداروں کا مطالعہ اقبال کے شاہین کو پیشِ نظر رکھ کریں تو یقین ہے کہ وہ ان ناولوں میں نئی معنویت دریافت کر پائیں گے بلکہ ان تحریروں سے ان کی لطف اندوزی کا درجہ بھی بڑھ جائے گا۔ ابن صفی کے کرداروں کا یہ پہلو انھیں نہ اپنے عہد کے دیگر جاسوسی ناول نگاروں سے ممتاز کرتا ہے بلکہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے ان کے ادب کو روائتی ادب کی صف سے نکال کر اس بڑے ادب کی صف میں جا کھڑا کرتا ہے جس کا لکھنے والا محض لکھنے والا نہیں بلکہ کوئی مقصد بھی اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ماضی قریب میں اس کی ایک اچھی مثال نسیم حجازی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

ابن صفی کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں ایسی ایجادات کے تصور پیش کیے ہیں جیسے پرانے زمانے میں الف لیلہ کے قصوں اور داستان امیر حمزہ میں پیش کیے گئے تھے۔ ان داستانوں کی پیروی میں دنیا کی کئی زبانوں کے ناولوں اور افسانوں میں بھی ایسے تصورات پیش کیے گئے جو بعد میں حقیقت بنے۔ ممتاز محقق ڈاکٹر عقیل عباس جعفری نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں ابن صفی کے پیش کیے ہوئے بہت سے تصورات اور بعد میں ہو بہ ہو اسی قسم کی ایجادات کی ایک طویل فہرست مرتب کی ہے۔ اس فہرست کا مطالعہ قاری کو حیرت میں ڈال دیتا ہے کہ اللہ نے ابن صفی کو کیسی خلاقانہ بصیرت سے نوازا تھا۔ اندازہ ہے کہ اس فہرست کے مطالعے کے بعد اگر ایسی ہی ایک اور فہرست مرتب کرنے کی کوشش کی جائے تو شاید اس سے بھی زیادہ طویل فہرست مرتب ہو جائے۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران لڑکپن میں پڑھے ہوئے ان کے کسی ناول کا واقعہ ذہن آ گیا جس میں عمران اپنی ہاتھ کی گھڑی سے پیغامات نشر کیا کرتے تھے۔ یہ گھڑی نوے کی دہائی کے اواخر میں مقبول ہونے والی ایک ایجاد پیجر کی یاد تازہ کرتی ہے جسے لوگ اپنی بیلٹ سے لٹکائے پھرتے تھے۔ اب تو خیر ایسی گھڑیاں بی مارکیٹ میں موجود ہیں۔ ان ہی دنوں ابن صفی کے ایک ناول جہنم کی رقاصہ کی ورق گردانی کرتے ہوئے موجودہ زمانے کی ایک ایجاد پیلٹ گن کی یاد تازہ ہوگئی جس کے استعمال سے قابض بھارتی فوجوں نے مقبوضہ کشمیر میں ہزاروں نوجوانوں کو صرف مضروب ہی نہیں کیا بلکہ بینائی سے بھی محروم کر دیا۔ دیکھئے کہ ابن صفی کی پیلٹ گن کا تصور کتنا مکمل ہے:

عمران نے ڈبے کو میز پر رکھ کر اسے کھولا: یہ دیکھو، اس بٹن کو دبانے سے ایک چھوٹا سا ٹریگر باہر نکل آتا ہے اور یہ دیکھو چھوٹی

چھوٹی بیٹریاں، ٹریگر دباتے ہی یہ بیٹریاں مشین سے کنکٹ ہو جاتی ہیں۔ مشین چل پڑتی ہے اور اس سوراخ سے سنگریزوں کی بوچھاڑ نکلنے لگتی ہے۔ یہ خانہ دیکھو، اس میں زہریلے سنگریزوں کی خاصی مقدار موجود ہے۔

ابن صفی کی ذہنی ایجادات مشینوں کے دائرے سے نکل انسانی حکمت عملی کے دائرے میں بھی داخل ہو جاتی ہیں جو بعد کے زمانوں میں اختیار کی گئیں، ماضی میں عملی دنیا میں جن کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ ان کا کوئی ناول ایسا نہیں ہے جس میں ایسی مثالیں نہ ملتی ہوں۔ جہنم کی رقاصہ نامی ناول ہی میں مسٹر علی عمران دوران سفر ایک مشتبہ شخص کو قتل اور ایک کو زخمی کر کے گاڑی کو کہیں چھپا دیتا ہے۔ ستر کی دہائی کے ناولوں کی اس تیکنیک کا استعمال ہمیں نائین الیون کے بعد کے پاکستان میں عام دکھائی دیتا ہے۔

کرنل فریدی ہوں یا علی عمران، ابن صفی کے ناولوں میں ڈوب کر پڑھنے کے بجائے اگر ذرا تنقیدی نگاہ سے ان دونوں کرداروں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو بعض اوقات یہ دونوں کردار ریاست اور ریاست کے ذمے داروں سے بھی زیادہ طاقت ور دکھائی دیتے ہیں۔ مختلف آپریشنوں کے دوران صاف دکھائی دیتا ہے کہ ریاستی عہدے داران کے سامنے بے بس ہیں کیوں کہ ہمارے یہ دونوں ہیرو کسی احتساب کے خوف کے بغیر عمائدین سلطنت کی سرکوبی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی پندرہ بیس برس پہلے وار ※ نامی فلم کا ہیرو بھی ابن صفی کے کسی کردار سے متاثر ہوا ہوگا جس نے کسی سیاست دان کو یہ طے کر کے قتل کر دیا کہ وہ ڈیم بنانے کا مخالف ہے، نہ کوئی ثبوت نہ کوئی عدالت اور نہ کوئی صفائی۔ چوں کہ ہیرو ایسا سمجھتا ہے، اس لیے وہ مجرم ہے۔ کوئی پچاس برس قبل وطن دشمن قرار دے کر مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا جو تصور ابن صفی نے پیش کیا تھا، وہ مشینی ایجادات کی طرح حکمت عملی کی ایجادات میں بھی نمایاں مقام حاصل کرنے میں کام یاب رہا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ابن صفی کا شاہین اقبال کے شاہین سے ذرا مختلف شناخت بناتا ہے۔ اقبال کا شاہین خالد بن ولید کی طرح حکم کا پابند ہے اور سزا بھی خوش دلی سے قبول کر لیتا ہے جب کہ ابن صفی کے شاہین کی اڑان ذرا اونچی ہے اور وہ کسی بھی شک و شبے سے پاک ہے۔ البتہ اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ اپنے محبوب مصنف کے ہیرو میں ہم اپنے گرد و پیش کے مناظر آسانی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔

عشرت معین سیما ٭

ابنِ صفی اردو سری ادب کا شہنشاہ

دنیا کی دیگر زبانوں کے ادب کی طرح اردو ادب میں بھی رومانوی ادب، ترقی پسند ادب، نسائی ادب، بچوں کا ادب، تاریخی ادب، مزاحیہ ادب، جاسوسی ادب اور ماحولیاتی و سائنسی ادب جیسی اصطلاحات موجود ہیں جن کے استعمال کے بعد ادب کو کئی خانوں میں تقسیم کر کے مختلف دل چسپی رکھنے والے قارئین کے لیے مطالعے کا ذوق پروان چڑھایا جاتا ہے۔لیکن ابن صفی سری ادب کا ایک ایسا حوالہ ہیں جو نہ صرف جاسوسی ادب بلکہ رومانوی اور جدید ادب کے امتزاج کے ساتھ کئی عشروں سے اپنے قارئین کی تعداد میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں۔ اپریل ۱۹۲۸ء میں الٰہ آباد ہندوستان میں پیدا ہونے والے سری ادب کے شہنشاہ ابن صفی اپنے قلمی نام طغرل فرغان، سنکی سولجر، عقرب بہارستانی، اور پرکاش سکسینہ کے نام سے بھی کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔لیکن جولائی ۱۹۸۰ء میں جب کراچی پاکستان میں اُن کی وفات ہوئی تو وہ صرف سری ادب کے بے تاج شہنشاہ کا لقب یعنی ''ابنِ صفی'' کا نام لیے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

سری ادب میں سنسنی خیزی اور جرم کا ارتکاب ہونا لازمی جُز ہے۔لیکن یورپ اور مغربی سری ادب میں اپنی مقبولیت کی بنا پر اسے جاسوسی اور سنسنی خیزی کے الگ الگ خانوں میں رکھا گیا ہے، مثال کے طور پر ایک جاسوسی کہانی میں، جرم شروع میں ہی مکمل ہو چکا ہوتا ہے۔ یہاں کہانی کا آغاز واقعات کی ترتیب کو لے کر ایک کمشنر کے ذریعے بعد ازاں دریافت کیا جاتا ہے۔ جبکہ ایک تھرلر یا سنسنی خیز ادب میں جرم ابھی بھی جاری ہے یا کہانی میں بعد میں سامنے آتا ہے۔لیکن ابن صفی اردو زبان کے وہ پہلے جاسوسی ناول نگار ہیں جنھوں نے جاسوسی ناول کو کئی علاقائی اور عہد کے مسائل سے سے جوڑا اور سنسنی کو قائم رکھتے ہوئے جاسوسی ادب کے شائقین کو مطالعے کی جانب ایک مستحکم سمت دکھلائی۔

ابن صفی نے اپنے ناول کو اپنے کردار، واقعات اور منظر کشی کے ذریعے اس مقام تک پہنچایا کہ وہ محض تفریحی ادب میں شمار نہ ہو اور نہ عوامی سطح پر عمومیت کا شکار ہو بلکہ انھوں نے اپنے خاص اسلوب سے اسے قارئین سے لے کر ادیبوں کی توجہ کا ایسا مرکز بنا دیا ہے کہ جس نے تفریح و تفنن کے پیرائے میں حالات و زمانے کے اس منظر نامے پر نظر رکھی ہے جس پر عمومی طور پر ہمارے معاشرے میں گفتگو نہیں کی جاتی اور نہ ہی اُن موضوعات و مسائل کے حوالے سے سماجی و نفسیاتی پہلوؤں کو اُجاگر کر کے اُن کے حل اور تدارک کی جانب توجہ دلائی جاتی ہے۔

ابن صفی نے جب سری ادب اردو زبان میں پیش کیا تو اُس زمانے کے ادب عالیہ سے وابستہ کئی ادبا نے ابن صفی کی اس کاوش

٭ جرمنی۔ برقی پتا:ishrat.moin@gmx.de

اور اردو میں جاسوسی ادب کی شمولیت کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔اُن کی نظر میں ابن صفی کی تحریروں کی سادگی اور ابن صفی کی شخصیت کی سادہ لوحی اس زمانے کے پیش کردہ ادب اور ادیب کے معیار پر پوری نہیں اُترتی نہیں تھی۔لیکن دوسری جانب کئی ادب کے مداحوں نے جاسوسی یا سری ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اسی طرز پر لکھنے کی کوشش بھی کی۔ یہ بات غور طلب ہے کہ ایک طرف تو وہ لوگ اردو میں جاسوسی یا سری ادب کی مسلسل نفی بھی کرتے رہے اور مطالعے کی ترغیب میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے رہے لیکن دوسری جانب اس ادب کی اہمیت وافادیت سے بھی انکاری نہیں رہے اور خود ہی اس پر طبع آزمائی کرتے رہے۔

ایسے ہی لوگوں کے متعلق ابن صفی اپنی ایک کتاب کے انتساب میں کہتے ہیں کہ ''اُن لوگوں کے نام جو میری کتابوں کو چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں اور اسے دوسروں کے لیے نقصان دہ قرار دیتے ہیں۔''

کھوجی ہونا اور جاسوسی کرنا چوں کہ باقاعدہ طور پر انسانوں کا ایک قدیم پیشہ رہا ہے اور ملکی سطح سے لے کر عام زندگی میں پیچیدہ مسئلوں کے حل کے لیے سراغ رساں اور جاسوس اپنی خدمات بعوض معاوضہ یا انعامات انجام دیتے رہے ہیں لہٰذا اس پیشے کے حوالے سے بہت سی کہانیاں اور قصے یوں بھی زبانی وتحریری طور پر انسانی معاشرے کے لیے ہمیشہ سے دل چسپی کا باعث رہے ہیں۔عرب داستانوں سے لے کر یورپی ادب کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ادب اور انسانی تاریخ وتمدن کے ساتھ ساتھ سری ادب کی اہمیت اور عوام الناس کی اس میں دل چسپی بہت پرانی ہے۔ چاہے وہ داستانِ امیر حمزہ ہو یا کہ یونانی اساطیر کی دیو مالائی داستانیں، جاسوسی اور سنسنی خیزی اِن داستانوں کا لازمی حصہ رہی ہے۔ خاص طور پر اگر بیسویں صدی کے آغاز میں لکھے گئے ناولوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر جاسوسی ناول لوگوں کی دل چسپی کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ اسی زمانے میں قیسی رام پوری وغیرہ نے بھی کئی جاسوسی ناول تحریر کیے جو آج بھی تاریخی ادب میں حوالے کے طور پر اپنی ایک مستحکم حیثیت رکھتے ہیں۔

ہندی ادب میں تین پتوکی، زندے کی لاش جیسے ناولوں کے ذریعے گزشتہ صدی میں جاسوسی ادب کا آغاز ہوگیا تھا لیکن اردو میں جاسوسی ناول نگاری کا باضابطہ آغاز مرزا رسوا کے ناولوں سے ہوا جس میں ''خونی جورو''، ''بہرام کی رہائی'' اور خونی شہزادہ اہم ناول ہیں۔لیکن یہ تمام ناول اپنے عہد کے عکاس ہونے کے بجائے تاریخی داستانوں پر لکھے گئے تھے۔اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ باقاعدہ طور پر اردو زبان میں اپنے عہد کے عکاس جاسوسی ناولوں کا آغاز ابن صفی ہی نے کیا اور وہ ہی اس کے موجد اور امام قرار پائے۔ ابن صفی نے چھبیس سال کی کم عمری میں جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے شہرت پائی اور بعد ازاں اپنی دوسو پینتالیس جاسوسی نگارشات کے ذریعے اردو ادب کا خزانہ وسیع کیا۔جس میں ایک سو چھبیس "جاسوسی دنیا" سریز اور ایک سو بیس "عمران سریز" ہیں اور ان میں سے کم از کم ستر ناولوں کو سائنس فکشن میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

جاسوسی ادب میں اب تک اردو کا کوئی اور ناول نگار ایسا نہیں ہے جسے مقبولیت کے حوالے سے ابن صفی کے مقابل رکھا جاسکے۔ اگرچہ بعد ازاں سری ادب کے حوالے سے کئی ادیب آسمان ادب پر جگمگائے جن میں عارف مارہروی، سراج انور، ایچ اقبال، اظہار اثر اور اکرم الہٰ آبادی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں لیکن اُن میں سے کوئی بھی عالمی سطح پر وہ مقام اور پزیرائی حاصل نہ کرسکا جو ابن صفی کو نصیب ہوئی۔ ابن صفی نے ناول نگاری میں یہ مقبولیت اپنے انفرادی اسلوب نگارش اور ناول کی بہترین فنی تکنیک کو اپنا کر حاصل کی ہے

اُن کے ناول کی کہانی سری ادب کے لازمی جز یعنی سنسنی خیزی، پراسراریت اور مستحکم مواد سے پُر ہے وہ اپنے جاسوسی ناول میں قاری کے لیے ہر مقام پر تجسس کو قائم رکھتے ہوئے کہانی آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ قاری کو ابتدا ہی سے ایک مجرم کی حرکات وسکنات پر نظریں جمانے پر مجبور کر دیتے ہے اور ایک تجسس کو بڑھاوا دیتے ہوئے قاری کے ذہن کو ایک کردار کے گرد بطور مجرم نمایاں کرتے ہوئے پرت در پرت کہانی کا سلسلہ قائم رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریروں میں یہ تجسس قاری کو کچھ دل چسپ بھول بھلیوں میں لے آتا ہے اور وہ ابتدا سے جس کردار کو مجرم سمجھ رہا ہوتا ہے وہ دراصل اختتام میں مجرم نہیں ہوتا اور کہانی میں ایک ایسا شخص مجرم نکل آتا ہے جسے قاری شروع سے ہی مقتول کا خیر خواہ یا دوست سمجھ رہا ہوتا ہے۔ یہاں کہانی اپنے انجام پر یوں پلٹتی ہے کہ قاری تحیر کی اس فضا کو کافی دیر تک اپنے ذہن میں تازہ محسوس کرتا ہے جو ایک کامیاب ناول نگاری کی علامت ہے۔

لیکن ابن صفی کے کچھ ناولوں میں کہانی اس کے مترادف بھی چلتی ہے اور قاری آخری وقت تک کسی ایک کردار کو مجرم محسوس کرنے سے محروم رہتا ہے اور اپنا اندازہ کسی بھی ایک سمت کرنے کی کوشش بھی نہیں کر پاتا اور مجرم کا اندازہ ہی نہیں لگا پاتا۔ لیکن یہاں وہ قاری جھنجھلاہٹ یا ابہام کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اس نفسیاتی پیچیدگی کا بھی ناول میں حظ اٹھاتا ہے۔

ادب میں زبان کی سلاست اور شیرینی اگر چہ زیادہ تر شعری صنف کے لیے مختص سمجھی جاتی ہے لیکن اس بات سے انکار نہیں ہے کہ یہ بہترین نثر کا بھی وصف ہے۔ اگر چہ ابن صفی نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں بھی قدم رکھا تھا اور شاعری میں عبدالحق نامی استاد کی شاگردی میں اسرار ناروی کے نام سے بھی اپنا نام بھی پیدا کیا تھا، لیکن جاسوسی ادب کے وہ تمام لوازمات اُن کی شاعری پر غالب رہے جو ابن صفی نے اُسی زمانے سے اپنے ناولوں اور اُن کے کرداروں میں رقم کرنا شروع کر دیے تھے۔ اُن کے قلم وفکر میں نثر کا رنگ زیادہ نمایاں رہا اور یہاں اُن کی نثر میں شاعرانہ اسلوب کی کبھی بھی وہ جھلک نہیں دکھائی دی جو اُن پر شعری نثر نگار کی چھاپ لگا دے۔ اُن کے تراشے گئے کردار اور اُن کے ذریعے ادا کیے گئے جملے و مکالمے ابن صفی کی نثر کو ایک آفاقی معنویت دیتے ہیں۔ وہ اپنی تحاریر میں ایک مبلغ کا کردار ادا کیے بغیر اپنے کرداروں کے ذریعے ہی قاری کی سماجی و ذہنی اصلاح کرتے دیکھائی دیتے ہیں۔ دیگر جاسوسی ادب کے مصنّفین کی طرح وہ کسی بھی جنسی وشہوانی لذت کو اپنی تحریر میں شامل نہیں کرتے اور نہ ہی اسے منفی دل چسپی کا سامان نہیں بناتے ہیں بلکہ وہ قاری کو اپنے ناولوں کے کردار کی مدد سے سماج کی اخلاقی اقدار سے روشناس کرواتے ہیں۔ اُن کے تراشے گئے معروف کردار فریدی، حمید، عمران جیسے کردار مغربی تہذیب کے آزاد اور منفی اثرات اور روایات سے انکاری ہیں۔

ان کے تراشیدہ لازوال کرداروں میں کرنل فریدی اور عمران کہیں بھی شراب نوشی یا کسی جنسی آسودگی کے عمل سے گزرنے کے آرزومند نہیں دکھائی دیتے، کیپٹن حمید اگر چہ صنفِ مخالف میں دل چسپی رکھتا ہے لیکن اپنی حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھتا۔ جب کہ اکثر جاسوسی ادب میں اس قسم کے مرکزی کرداروں کو غیر ضروری طور پر قحبہ خانوں میں شراب نوشی کرتے اور کسی عورت کے ساتھ جنسی کارروائی یا کشش میں ضرور مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ ابن صفی نے اپنے جاسوسی ادب سے ان تمام خرافات کو نکال کر یہ ثابت کیا ہے کہ وہ مشرقی اقدار و روایات کے پاسبان بھی ہیں اور ادب کو اپنے خطے کی روایات سے جوڑنا خوب جانتے ہیں، اسی لیے ان کے ناولوں کے ہیرو اخلاقی اقدار کے بھی پابند ہوتے ہیں۔

ابن صفی کا اسلوب نگارش اُن کے فن کردار نگاری میں نمایاں ہے۔ انھوں نے فریدی، حمید اور عمران جیسے لازوال کردار تخلیق

کر کے دیگر اُن کرداروں کو بھی زندہ رکھا ہے جو بظاہر ثانوی درجے کے تھے۔ مثال کے طور پر اُن کے ناولوں کا معروف کردار کرنل فریدی ایک سنجیدہ انسان ہے اور جس کا مقصد انسانیت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنے پیشے سے وفاداری اور قانون کی بالادستی بھی ہے جس پر نہ وہ خود عمل پیرا ہے بلکہ وہ معاشرے میں بھی اس کے اطلاق پر جان و دل سے کوشاں ہے۔

ابن صفی کا دوسرا اہم کردار کیپٹن حمید ہے جو اپنی بزلہ سنجی اور لطیف حس مزاح کے لیے مشہور ہے وہ اپنی شگفتہ حرکتوں اور باتوں سے قاری کو مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے وہ کرنل فریدی کے کام میں وہ اُن کا معاون ہے۔ ابن صفی نے اپنی عمران سیریز میں عمران کے نام سے ایک ایسا کردار تخلیق کیا جو اپنی ظاہری اور باطنی طور پر دوہری شخصیت کی وجہ سے ایک پراسرار کردار بھی ہے۔ عمران ایک ایسا جاسوس ہے جو بحیثیت ''ایکس ٹو'' کام کرتا ہے اور اس کی دہشت دوسرے ممالک کے انڈر گراؤنڈ جرائم پیشہ تنظیموں پر حاوی ہے۔ ایکس ٹو کے کردار میں عمران کبھی نہایت سنجیدہ دکھائی دیتا ہے اور کبھی کبھی اتنا احمق اور مزاحیہ کہ قاری اس کے کردار کے دوسرے رخ کو بھول جاتے ہیں۔ عمران اسی حماقت کے فلسفے کے ساتھ اپنے مشن پر کام کرتا ہے اسی حماقت اور مزاق میں اپنے مشن کے مقاصد بھی پورا کر لیتا ہے۔ عمران کا کردار ایک خوش مزاج اور نرم دل انسان کا بھی ہے اور دوسری جانب انتہائی حد تک سفاک اور بھیانک کردار بھی اس کے اندر پوشیدہ ہے جو بوقتِ ضرورت سامنے آ کر قاری کو حیران کر دیتا ہے۔ اُس کے کردار کے یہ دونوں وصف درحقیقت فریدی اور حمید دونوں کے کردار کا مجموعہ ہیں۔

ابن صفی کے پیش کردہ کرداروں میں منفی کرداروں کی بھی بہت اہمیت رہی ہے۔ یہ منفی کردار بھی اپنے وصف کے اعتبار سے لازوال کردار ہیں جنھیں عمران سیریز کا قاری کبھی نہیں بھلا سکتا۔ ان کرداروں میں تھریسیا، سنگہی، الفانسے، جیرالڈ شاستری، جابر، علامہ دہشتناک، کبڑا، جیسے کردار اہم کردار ہیں جو ابن صفی کے قارئین کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں ضرور محفوظ ہونگے۔

ابن صفی کے تراشے گئے کردار تھریسیا اور سنگہی بھی اُن کے ناول کے اہم کردار ہیں۔ اس کے علاوہ ابن صفی کے کرداروں میں ایک کردار قاسم بھی ہے جو قدآور اور جسیم شخصیت کا مالک ہے لیکن وہ ہر وقت اپنی بیوی سے نالاں دکھائی دیتا ہے اور ہر وقت زندگی سے اکتاہٹ کا شکار معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور کردار جو ذہانت سے بھرپور ہے وہ انور کا کردار ہے۔ اس کے علاوہ فیاض، جوزف، صفدر، چوہان، جعفری، جولیا، جیمسن، ظفر الملک، تنویر، سلیمان، رشیدہ وغیرہ جیسے کرداروں نے بھی اپنی شمولیت سے ان کے ناولوں کو ایک منفرد مقام عطا کیا ہے۔

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں عمدہ اوصاف کے حامل کرداروں اور خطرناک مجرم کرداروں کا ہی سنگم نہیں پیش کیا بلکہ انھوں نے اپنے تخیل پرواز کو بلند کرتے ہوئے جدید اور سائنسی بنیادوں پر بھی کئی ایسی چیزیں متعارف کروائیں کہ جن کے بارے میں محض قیاس اور خیال ہی محدود رکھا گیا تھا اور اسے عملی دنیا میں ناقابل عمل قرار دے دیا گیا تھا۔ کہیں کہیں تو ابن صفی کے اس تخیل کو ہنسی میں بھی اُڑایا گیا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ ابن صفی کے تخیل کا احاطہ بصیرت اُن کے ناول میں وسیع ہی نہیں بلکہ ممکنات میں سے بھی تھا۔ مثال کے طور پر ابن صفی نے اپنے ناول میں الیکٹرو گیس جیسی ایک نئی چیزیں متعارف کرائی جو ہر چیز جلا کر بھسم کر دیتی ہے، لیزر گن یا الیکٹرو گیس جیسی چیز ابن صفی کے ناولوں میں اس وقت دکھائی دیتی ہے جب ان کا مکمل وجود نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ سب چیزیں اپنے تجرباتی مراحل میں تھیں اور ابن صفی نے اُن کے متعلق مکمل معلومات لے کر سائنسی مفروضات کو حقیقت کا

روپ دے کر مناظر اور ماحول کی صورت گری کی تھی۔

ابن صفی نے اپنے تخیل پرواز سے زیرولینڈ نامی ایک ایسے ملک کا تصور پیش کیا جو بہت ترقی یافتہ ہے اور دنیا کے کسی بھی نقشے میں موجود نہیں ہے۔ اس ملک کے باشندے اپنی ترقی اور نئی ایجادات کے ذریعے پوری دنیا پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس ملک میں سائنسی ترقی کا یہ حال ہے کہ یہاں ایسے پرندے پائے جاتے ہیں جن کی آنکھوں میں کیمرہ لگا دیا گیا ہے اور اس ملک کے لوگ ایسی اڑن طشتریاں استعمال کرتے ہیں جسے دوسرے ممالک کے لوگ اپنی سرحدی حفاظتی اسکرین کے ریڈار پر دیکھ نہیں سکتے بلکہ کبھی نظر آنے والی اڑن طشتری کو دھوکے میں غیر زمینی یا خلائی مخلوق سمجھ لیتے ہیں۔ زیرولینڈ کے ملکی نگہبان ایسے آلات رکھتے ہیں جو اُن کی جانب آنے والی حملہ آور گولیوں کا نشانہ بدل سکتے ہیں۔ یہ تمام تخیل ایک ایسی جدید مملکت کا تصور پیش کرتا ہے جو اپنے عوام کے لیے تحفظ اور ترقی کا نشان ہے۔ ابن صفی اپنے ناولوں میں ایسی مملکت کا تصور اپنے قارئین کو دیتے ہوئے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ انسان آج اپنی ایجادات سے ترقی کے منازل طے تو کر رہا ہے، لیکن وہ اپنے اقدار و روایات کے حوالے سے انتہائی پستی میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ دیگر سیاروں اور چاند پر قدم رکھنے والا انسان اپنی زمین اور اپنے سماج میں انسانی زندگی کو وہ امن و استحکام دینے میں ناکام ہے جو اس کا حق ہے۔ اُس کے اندر دولت و آسائش کی ہوس اور لالچ اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ اپنی ہی کائنات اور اپنی ہی زمین کے ساتھ ساتھ اپنے وطن اور ہم وطنوں کا دشمن بن بیٹھا ہے۔ ابن صفی نے اپنی کہانیوں میں اس درد کو نمایاں ہی نہیں کیا بلکہ اس زخم پر مرہم رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اپنے خطے کی روایات، حب الوطنی، انسانی ہمدردی اور ظلم کے خلاف سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کا سبق اُن کے ناولوں میں ایک پیغام بن کر قارئین کے لیے پیش کیا ہے۔

ابن صفی اپنے لازوال کرداروں کو جس قدر خوب صورتی اور چابکدستی سے سنوارتے ہیں اور جو چست اور برجستہ جملے و مکالمے اُن کے ذریعے ادا کرواتے ہیں وہ یقینی طور پر انسانی معاشرے میں عام ابلاغی جملے و الفاظ ہیں۔ اس حوالے سے اُن کی تحریر میں عام ابلاغی اردو سیکھنے والے قارئین کی بھی ایک وسیع تعداد موجود ہیں۔ اگرچہ ناول کے ذریعے محاورات، حکایات اور اصطلاحات کا استعمال عام بات ہے لیکن ابن صفی کے یہاں جملوں اور مکالموں کی برجستگی نے زبان کے اس لغوی و سماجی پہلو کو بھی اپنے قارئین کے سامنے کھول کر پیش کیا ہے۔ خاص طور پر نوجوان طبقہ اُن کے ناولوں کے ذریعے اردو زبان کی چاشنی اور لفظی کیفیت سے ضرور آشنا ہوا ہے بلکہ اسے عام ابلاغی زبان میں استعمال بھی کرتا ہوا دکھائی دیا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آج کے کچھ ادیبوں نے ابن صفی کے ناول کے مطالعے سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا اور اُن کے ناولوں کے مطالعے کے بعد لفظوں کے معنی و ترکیب سے لے کر بہترین مکالمہ و جملہ سازی کر کے آج کے اچھے ادیبوں میں اپنا شمار کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

ابن صفی اپنی منفرد کہانی، اپنے خاص اسلوب نگارش، بیانیہ کی لفظی تراکیب، انوکھی کردار سازی اور برجستہ اور چست مکالموں کے ذریعے ناول کی بہترین بُنت کے ذریعے سری ادب کی بنیاد رکھ گئے ہیں اور اس صنف ادب کے بے تاج شہنشاہ مانے جاتے ہیں۔ اردو ادب کے قارئین اور ناقدین کی نظریں ایک عرصہ دراز سے اس امر کی متلاشی ہیں کہ اردو سری ادب میں اس شہنشاہت کے سلسلے کو فروغ دینے والا اگلا امین کون ہوگا۔

ادریس شاہ جہان پوری ٭

ابنِ صفی ''گوشۂ ادب'' کے آئینے میں

(ابن صفی، بی اے کی حیات وتخلیقات کے مختلف پہلوؤں پر مصنّفین اور ناقدین نے اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ کوئی گوشہ شاید ہی تشنہ رہا ہو۔ چاہے وہ کردار نگاری ہو یا پھر منظر نگاری، متنوع کہانیوں کے تانے بانے، زبان کی شیرینی ہو یا ان کے لافانی کردار (جس میں ہیروز اور ولن دونوں شامل ہیں) لہٰذا کسی نئے پہلو کی تلاش میں نگاہ، جاسوسی دنیا، الٰہ آباد کے پہلے ایڈیشنز میں شائع ''گوشۂ احباب'' تک جا پہنچی جس میں قارئین کے خطوط مختصر شکل میں یا ان کے اقتباسات شائع کیے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ غالباً ابتدائی سو ناولوں تک جاری رہا تھا۔ گوشۂ احباب کا مقصد یہ تھا کہ قارئین ایک دوسرے کی آرا سے واقف ہوسکیں۔ زیرِ نظر مضمون قارئین کے ان ہی خطوط کے حوالہ جات پر مبنی ہے مضمون نگار)

اردو ادب میں ''جاسوس گر''، ''جاسوسی ادب کا باوا آدم'' اور ''جاسوسی ادب کا بے تاج بادشاہ'' کے نام سے مشہور اور اپنے نام ہی کی طرح ''پراسرار'' اسرار احمد المعروف ابن صفؔی تہہ دار شخصیت کے مالک تھے اور اپنی ان ہی صفات کی وجہ سے انھوں نے مختلف ناموں سے مختلف اوقات میں شاعری، طنز ومزاح، انشائیہ، اور مضمون نگاری جیسی مختلف اصناف ادب میں اسرار ناروی، طغرل فرغان، سنکی سولجر اور عقرب بہارستانی جیسے الگ الگ ناموں سے طبع آزمائی لیکن ان کی بے چین طبیعت ان اصناف میں خود اپنی ہی تخلیقات سے مطمئن نہ ہوسکی اور انھوں نے فحش نگاری میں سدسکندری بن کر سری ادب کے خشک اور بنجر ریگزار میں اپنی تخلیقات کے گھوڑے دوڑانے کی ٹھانی اور دوسری اصناف کے علاوہ اس میدان میں بھی نئے سنگ ہائے میل قائم کیے۔ اس کے بعد پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سری ادب میں وہ نہ صرف منفرد زندہ جاوید کرداروں کے خالق تھے بلکہ ادب کی اس صنف کو انھوں نے منظر نگاری، مکالمہ نگاری، زبان و بیان کی شیرینی اور پلاٹ کی انفرادیت سے مالا مال کیا اور ایسی مثالیں قائم کیں جو جاسوسی ناولوں میں اُس وقت بھی مفقود تھیں اور آج بھی نایاب ہیں۔ سری ادب کے علاوہ، انھوں مہم جوئی، نفسیات، اساطیر جیسے موضوعات پر بھی غیر جاسوسی کہانیاں اور ناول لکھے اور ان میدانوں میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ یوں لکھنے کو تو رائیڈر ہیگرڈ، الیگزاینڈر ڈوما، برام اسٹوکر وغیرہ نے بھی بے شمار مہماتی ناول لکھے ہیں مگر اپنے تنوع، ہمہ جہتی اور سماجی پہلوؤں کے اظہار کی وجہ سے ابن صفی ان سب سے منفرد نظر آتے

٭ شاہ جہان پور، ہندوستان۔ برقی پتا: iahmadk@gmail.com

ہیں۔مثال کے طور پر یہاں رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کا ذکر بے جا نہ ہوگا جس کا ترجمہ مظہرالحق علوی نے ''خوابوں کے شکاری'' کے نام سے کیا تھا۔اس ناول کا موضوع مہم جوئی ہے لیکن اپنے خشک اور سپاٹ بیانیہ نیز طوالت کی وجہ سے یہ اختتام تک پہنچتے پہنچتے قاری پر اپنی گرفت کھو بیٹھتا ہے۔ جب کہ ابن صفی کے مہماتی اور اساطیری ناولوں میں اختتام تک قاری کی دل چسپی برقرار رہتی ہے۔حالاں کہ ان کی تحاریر میں حال سے بحث کی گئی ہے مگر ان میں مستقبل کی ایجادات اور مسائل کے واضح اشارے موجود ہیں۔

ابن صفی کے عہد ساز قلم نے خوب صورت شاعرانہ نثر کے ذریعے نہ صرف قارئین کو اردو ناول پڑھنے کی طرف راغب کیا بلکہ ان کی ذہن سازی بھی کی۔اردو کو اس وقت نئی نئی اصلاحات اور الفاظ سے مالا مال کیا جب اردو ادب ماضی کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے موئے قلم سے معاشرے میں پھیلائی جانے والی گندگی کا صفایا کیا اور اس طرح قارئین کو مطالعے کے لحاظ سے ایک صاف ستھرے ذوق کا مالک بھی بنایا۔ابن صفی نے اپنے ہم عصر مصنّفین کے خلاف جو غیر فطری رومانی قصے، کہانیوں کے ذریعے نئی نسل کو گمراہ کر رہے تھے، اپنی تخلیقات کے ذریعے ایک محاذ کھڑا کیا اور ان کے مقابلے میں اردو میں سری ناول نگاری کے روایتی انداز سے الگ ایک نئی راہ نکالی۔ان کہانیوں کے پاک وصاف ماحول، ناصحانہ انداز، الفاظ کی حسین تراش خراش، نازک بندشیں، پلاٹ کی گہرائی اور گیرائی، طنز و مزاح کا حسین امتزاج، دل چسپ انداز بیان اور عام فہم زبان نے خاص و عام دونوں کو اپنی طرف راغب کیا۔ وہ جس اصلاحی مشن کے ساتھ میدان میں آئے تھے، اس پر آخر تک قائم رہے۔اس راہ میں انھوں نے اس بات کی قطعاً پرواہ نہ کی کہ ناقدین ان کے ناولوں کو کس نگاہ سے دیکھیں گے۔ انھوں نے صرف عوام الناس پر توجہ مرکوز کی تاکہ ان کی صحیح رہنمائی کی جا سکے اور تعجب تو یہ ہے کہ اس کے لیے انھوں نے اسی صنف یعنی جاسوسی ناول نگاری کو اپنایا جس پر پہلے ہی سے نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا لیبل چسپاں تھا۔یہی سبب تھا کہ خواص کے مقابلے عوام ان کے ناولوں کے کہیں زیادہ گرویدہ تھے۔ان ہی خدمات کے پیشِ نظر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ان کی تخلیقات کو اردو پر ایک احسان عظیم قرار دیا۔ ان کے حسین مرقعوں میں انداز بیان اور زبان کی خوب صورتی نے عوام کے ذہنوں پر بہت مضبوطی سے گرفت کی تھی۔

لنکن کے ہیڈ لیمپس بجھے ہوئے تھے لیکن عقبی سرخ روشنی اندیکھے خطرات کے لیے جاگ رہی تھی۔ (حوالہ: چمکیلا غبار)

فریدی نے اس کی آواز میں ایک عجیب طرح کی کشش محسوس کی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے دور کہیں ویرانے میں دفعتاً گھنٹیاں سی بج اٹھی ہوں۔ (حوالہ: احمقوں کا چکر، جنوری ۱۹۵۳ء جون ۱۹۵۹ء)

خشک پہاڑوں کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ چاروں طرف ہری بھری پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نیچے وادی میں چھوٹی سی پہاڑی ندی ننھے ننھے قطرے اچھالتی ہوئی تیز رفتاری سے بہہ رہی تھی۔ سناٹے میں پانی کی آواز ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے خوابناک دھندلکوں میں ستار کی مدھم سی جھنکار۔ (حوالہ: پہاڑوں کی ملکہ، فروری ۱۹۵۳ء)

وہ (انور) زندگی کو ایک جوئے سے زیادہ وقعت نہیں دیتا تھا۔ ہار یا جیت۔ اس کے علاوہ کوئی اور تیسری چیز نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی اس عظیم جدوجہد میں وہ پِس کر رہ بھی گیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ دنیا بدستور اپنے راستے پر چلتی رہے گی۔ اس کے بعد کوئی دوسری گوشت پوست کی مشین اس کی جگہ لے لے گی۔ پھر پریشانی کس بات کی۔ (حوالہ: تجوری کا گیت، اپریل ۱۹۵۳ء)

مے پول کی وسیع رقص گاہ روشنی کے طوفان میں ہچکولے لے رہی تھی۔ نئے سال کا یہ پہلا عظیم الشان رقص تھا۔فرش پر مثبت اور منفی قوتیں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر رمبا ناچ رہی تھیں۔(حوالہ: آتشی پرندہ، مئی ۱۹۵۳ء)

مطلع ابرآلود ہونے کی وجہ سے چاندنی ہلکی تھی اور جنگل کے سناٹے سے اس کی ہم آہنگی بڑی دلکش لگ رہی تھی۔حمید سوچ رہا تھا کہ اگر رفیق سفر تنہائی نہ ہوتی تو اس وقت کیڈی کے پہیوں کے نیچی کی ناہموار زمین نہ جانے کتنے جہانوں کی سیر کرادیتی۔(حوالہ: لاشوں کا آبشار، جولائی ۱۹۵۴ء)

ابن صفی کے جاسوسی ناولوں اور دیگر غیر جاسوسی ناولوں و کہانیوں میں بکھرے ہوئے اس طرح کے بےشمار چھوٹے چھوٹے جملے اپنے اندر ایک وسیع و عریض جہان معنی چھپائے ہوئے ہیں جنھوں نے قاری کو بے اختیار اپنی طرف کھنچنے پر مجبور کردیا تھا۔انھوں نے کبھی اپنی تخلیقات میں فحش گوئی سے کام نہیں لیا۔کہیں ضرورت ہوئی بھی تو اس کو بھی مخملیں جامے میں پیش کیا:

''کیا کہہ رہا ہے؟'' پولیس سرجن نے پوچھا۔

''مفلر کی والدہ محترمہ کی شان میں گستاخی کی ہے نافرجام نے۔''

''ارے تو کیا اسپینی میں بھی؟''

''جی ہاں!'' عمران ٹھنڈی سانس لے کر بولا ''دنیا کی ہر زبان مادری ہی زبان کہلاتی ہے۔''

(حوالہ: عقابوں کے حملے، جنوری ۱۹۷۳ء)

اس بار تو ان تین لڑکیوں نے سارے سردار گڑھ میں تہلکہ مچا دیا تھا جو پتھر کے دور کا لباس پہن کر رقص کیا کرتی تھیں۔ یہ تینوں لڑکیاں نسلاً سفید فام تھیں اور اتنی بے جھجک تھیں کہ ایک اشارے پر پتھر کے دور سے پہلے کے زمانے میں جست لگا سکتی تھیں۔

(حوالہ: عقابوں کے حملے، جنوری ۱۹۷۳ء)

فرینکلن نے زیرولینڈ کی ایک ماں بھی پیدا کی اور اس کو ناگفتہ بہ حالات سے گزارتا ہوا بولا۔

(حوالہ: ٹھنڈا سورج، مارچ ۱۹۷۹ء)

کیا ان خوب صورت جملوں کو جاسوسی ناولوں کی زبان کہا جاسکتا ہے جنھوں نے ابن صفی کو مقبولیت کے بام عروج پر پہنچا دیا تھا؟ ایسے جاسوسی ناول جن میں سراغرسانی، تحیر، ایڈونچر، سنسنی اور رومانویت کے ساتھ ساتھ فکر انگیز خیالات، طنز و مزاح سے پر جملے اور زبان کی مٹھاس بھی موجود ہو اور جن کو پڑھ کر بقول ابن صفی ''لذیذ رس گلوں میں شیرینی کے ساتھ ہلکے سے نمک کا بھی مزہ آئے۔'' (حوالہ: ''سیاہ پوش لٹیرا'' اکتوبر ۱۹۵۴ء)۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ابن صفی ایک شاعر کا ذہن لے کر پیدا ہوئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں غزلوں، نظموں اور گیتوں کی غنائیت کے خزانے جا بجا بکھرے پڑے ہیں۔

ان کے پرستاروں میں عام قارئین کے علاوہ ایشیا کی عظیم نامور ہستیاں بھی شامل تھیں۔سابق صدر پاکستان، ایوب خاں، سابق گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین، نامور سائنسداں ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نام قابل ذکر ہیں۔عبدالقدیر خاں نے ابن صفی کو ایک خط میں پاکستان کا آرتھر کونین ڈائل اور موپاساں قرار دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اس وقت ابن صفی پاکستان میں اتنے ہی مشہور تھے جتنی ہیری پاٹر

کی مصنفہ جے کے رالنگ رہی ہیں یا آج بھی آرتھر کونین ڈائل یا موپاساں مشہور ہیں۔تمام لوگ مہینہ کے خاتمہ پر بازاروں،عوامی لائبریریوں کے چکر لگاتے تھے کہ سب سے پہلے وہی وہ کتاب حاصل کریں۔ میں خودبھی بہت بے چینی سے نئی کتاب کی آمد کا انتظار کرتا تھا اورمیری مرحومہ والدہ بھی بیحد شوق سے پڑھتی تھیں...کاش وہ یورپ یا امریکا میں مصنف ہوتے تو اربوں ڈالر کے مالک ہوکر اس دنیا سے رخصت ہوتے۔‘‘(حوالہ: کہتی ہے تجھ کوخلقِ خدا غائبانہ کیا،مصنف راشداشرف)

ان کے پرستاروں میں ایک مشہور نام معروف مصنفہ عفت موہانی کا بھی آتا ہے اورخود ابن صفی بھی ان کے بڑے قدردان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے ایک ناول’’پیاسا سمندر‘‘کو ان کے معنون کی تھا۔ان کے علاوہ مشہورشاعرہ اورلیکچرر ممتاز کالج، حیدرآباد، شفیق فاطمہ شعریٰ؛ صدر شعبۂ ماس کمیونی کیشن، وفاقی اردو یونی ورسٹی ڈاکٹر اوجِ کمال؛الیاس فرحت،جاسوسی ناول نگار؛عبدالقدیر جالنوی، جاسوسی ناول نگار؛ اور ڈاکٹر سریندر کمار ورما، جاسوسی ناول نگار؛ ڈاکٹر ذکیہ عابد، پرنسپل، دکن میڈیکل کالج، حیدرآباد؛ عنایت علی، مصنف اقبال اور اورنگ آباد؛افسانہ نگارقمر جمالی، حیدرآباد؛ ڈاکٹر میمونہ دلوی (اہلیہ عبدالستار دلوی، ماہرلسانیات) وغیرہ بھی شامل رہے ہیں۔ان کی مقبولیت غیرممالک میں بھی کم نہ تھی۔ جرمنی کی ہائیڈل برگ یونی ورسٹی میں شعبہ اردو کی سربراہ ڈاکٹر کرسٹینا اویسٹر ہیلڈ ان کے ناولوں کی بہت بڑی مداح رہی ہیں۔عوام الناس میں ان کے پرستار نہ صرف ہر ماہ بڑی بے چینی سے ان کے ناولوں کا انتظار کیا کرتے تھے بلکہ ہزار مصروفیتوں کے باوجود پہلی فرصت میں ان سے لطف اندوز بھی ہونا چاہتے تھے۔اس کا اظہار وہ اپنے خطوط میں بھی کرتے تھے:

شمشیر کریمی، ڈومریا محلہ ریل پار، آسنسول کو جب تک’’طوفان کا اغوا‘‘ نہیں ملا تھا وہ اپنی زندگی میں کسی شے کی کمی محسوس کررہے تھے۔ پڑھ کر بے اختیار پکار اٹھے کہ ابن صفی کا قلم پورے شباب پر ہے۔(حوالہ: رائفل کا نغمہ، اکتوبر ۱۹۵۷ء)

نجم الدین فاروقی، بھوپال سے رقم طراز ہیں،’’میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوا جب کتاب ڈاکیہ لے کر آیا۔ اس وقت میری خوشی کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا جیسے عید کا بچے بے چینی سے انتظار کرتے ہیں اور عید آجاتی ہے تو وہ کیسے خوش ہوتے ہیں۔ بجنسہٖ یہی عالم میرا بھی تھا۔ چندہ سات روپئے آٹھ آنے کردیا گیا۔عظیم نواز! بخدا یہ کچھ بھی زیادہ نہیں اگر سات روپئے آٹھ آنے کے بجائے پندرہ روپئے بھی ہوتے تو بھی کم تھا۔آپ کے قلم کی عظمت کا کیا ٹھکانا۔ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو آپ کی مدح میں تحریر کروں...آپ کے ہاتھ کو اورآپ کے قلم کو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ چوم لوں۔ وہ نب جو لکھتے لکھتے گھس جائے تو مجھے ضرور بھیج دیجیے گا، آٹھواں عجوبہ ہوگی۔(حوالہ: پہلا شعلہ، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

عون محمد، عشری خورد ضلع سارن کہتے ہیں کہ جس دن جاسوسی دنیا اسٹالوں پر آتا ہے، اتنی بھیڑ رہتی ہے جیسے امتحان کا نتیجہ نکلنے والا ہو۔(حوالہ: پاگل خانے کا قیدی، اپریل ۱۹۵۶ء)

غلام شفیع، بینڈ والا، نواپور، مغربی خاندیش کو خاص نمبر بہت پسند آیا۔ (ان کا کہنا ہے کہ) اگر اللہ دین کا دیو انھیں مل جائے تو اس سے یہی خواہش کریں گے کہ روز جاسوسی دنیا پڑھنے کو ملا کرے...(حوالہ: رائفل کا نغمہ، اکتوبر ۱۹۵۷ء)

اے اینڈ یو طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی۔۵ کے سکنڈ ایر اسٹوڈنٹ، سوڈھی دیوندر سنگھ اپنے آپ کو جاسوسی دنیا کا عاشق قرار

دیتے ہوئے رقم طراز ہیں...''اندھیرے کا شہنشاہ'' بہت پسند آیا۔ حالاں کہ ہمارے سالانہ امتحان شروع ہیں اور کل صبح میٹریا میڈیکا (جو کہ سب سے زیادہ مشکل خیال کیا جاتا ہے) کا پرچہ ہے مگر پھر بھی ''اندھیرے کا شہنشاہ'' جب تک ختم نہ کرلیا چین نہ آیا اور امتحان کا ڈر بھی اتنی دیر دل میں نہ رہا...(حوالہ: پراسرار وصیت، جون ۱۹۵۵ء)

پربھنی سے مرزا امجد علی بیگ،''ڈیڑھ متوالے'' پڑھتے ہی ابن صفی زندہ باد پکار اٹھے اور ایک دن کی چھٹی لے کرناول ختم کرڈالا۔(حوالہ: بیچارہ ربیچاری، جنوری ۱۹۶۴ء)

شبیر احمد، شولاپور نے اپنی پہلی تنخواہ سے ''ڈیڑھ متوالے'' خریدی، پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ لکھتے ہیں ہم لوگوں کو اصلی نقلی کی پہچان ہے...(حوالہ: بیچارہ ربیچاری، جنوری ۱۹۶۴ء)

گو ابن صفی کی حیات میں ان کو وہ اعزاز نہیں دیا گیا اور نہ ہی ادب کے ٹھیکیداروں اور مافیا نے انھیں ادب عالیہ میں اعلیٰ مقام پر فائز ہونے دیا جس کے صحیح معنوں میں وہ مستحق تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی اس شکایت نہیں کی۔ ان کا قلب و ذہن مطمئن تھا کہ ان کی تخلیقات کو پڑھا تو جاتا ہے، دہرایا اور تہرایا تو جاتا ہے۔(یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے)۔ ان کی تصنیفات کو بڑے بڑے ڈرائنگ روموں میں الماریوں کی زینت نہیں بنایا جاتا۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ لوگ ''ادب'' میں میرے مقام کی بات شروع کردیتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کی نظروں میں میرا کوئی نہ کوئی مقام ضرور ہے ورنہ آپ کو اس کی فکر ہرگز نہ ہوتی۔ (حوالہ: پیش رس، تیسری ناگن، ۱۰رنومبر ۱۹۶۹ء)

زیڈ حسن، برمترا پور (وبائی ہیجان کو) پانچ مرتبہ پڑھ چکے ہیں۔ (ان کا کہنا ہے کہ) ادب کے ساتھ ساتھ ملک اور قوم کی خدمت کا سہرا بھی جاسوسی دنیا کے ہی سر بندھتا ہے۔(حوالہ: اونچا شکار، جولائی ۱۹۵۸ء)

جناب عزیز اعظم، ۴۶۲ گورا چان روڈ کلکتہ نمبر ۱۴ لکھتے ہیں کہ جاسوسی دنیا کی محبت میں انھوں نے جاسوسی دنیا کی تمام تصنیفات کو نقل کرکے اپنے پاس محفوظ کرلیا ہے اور یہ ساری محنت ابن صفی کے حیرت انگیز قلم کا کارنامہ ہے۔ (حوالہ: تاریک سائے، ستمبر ۱۹۵۵ء)

ابن صفی کی اسی مقبولیت نے تین سالہ طویل بیماری کے دوران، ان کی صحتیابی کے لیے لاکھوں ہاتھوں کو دعا کے لیے خدا کے حضور پھیلانے پر مجبور کردیا تھا:

دعاؤں کے لیے ہاتھ اٹھے، کنواریوں نے اپنے آنچل پھیلائے، ماؤں نے اپنی ممتا کے دامن پھیلائے، بوڑھے گالوں پر آنسوؤں کی لکیروں نے آسمان کی طرف دیکھ کر کچھ مانگا....لاکھوں کروڑوں دھڑکتے ہوئے دلوں نے.....بارگاہ احدیت میں اپنی دعا پیش کی... مندروں میں گھنٹے بجے... اور کلیساؤں میں، گردواروں میں آسمانی باپ اور ست سری اکال کے ماننے والے اس کے لیے دعائیں کرتے رہے... اور اچانک کسی معجزے کی طرح ہر زبان پر ایک ہی آواز گونجنے لگی۔''ابن صفی اچھے ہوگئے۔'' (حوالہ: ڈیڑھ متوالے، دسمبر ۱۹۶۳ء)

اور جب وہ صحت یاب ہوئے تو ان کے لاکھوں قارئین کی بے پناہ خوشی کی کوئی حد نہ تھی:

بھگوان داس نارنگ دہلی، ابن صفی کی صحتیابی کے اعلان سے بہت خوش ہیں۔ (انکا کہنا ہے کہ) اس اعلان نے حسد کرنے والوں کے اندر ایک کیل ٹھونک دی ہے۔ سب کو مبارک باد دیتے ہیں۔ (حوالہ: ڈیڑھ متوالے، دسمبر ۱۹۶۳ء)

محمد ابراہیم خاں بمبئی، ابن صفی کی صحت یابی پر ان کو مبارک باد دیتے ہیں اور (لکھتے ہیں کہ) ''جن لوگوں نے کمینگی کا ثبوت دیا ان کو عباس حسینی نے نیچا دکھایا اور پھر سے اپنے چاہنے والوں کا سر بلند کیا۔ جاسوسی دنیا زندہ باد۔'' (حوالہ: ڈیڑھ متوالے، دسمبر ۱۹۶۳ء)

حافظ خلیل سنگاریڈی اپنے کو اور قارئین کو مبارک باد دیتے ہیں جنھوں نے تین سال تک دعا کی ہے۔ (لکھتے ہیں کہ) ''صفی بھیا کے دشمنوں کو منہ کی کھانی پڑی جو غلط افواہیں پھیلاتے تھے اور غلط کتابیں چھاپتے تھے۔ (حوالہ: ڈیڑھ متوالے، دسمبر ۱۹۶۳ء)

اسٹار بک ڈپو، گریڈیہہ (لکھتے ہیں کہ) ابن صفی کی تصنیف دیکھ کر عجیب سی کیفیت ہوگئی۔ سورج نکل آیا، اب تمام چراغ بجھ گئے۔ برساتی مینڈکوں کی تو موت ہی ہوگئی۔ (حوالہ: بیچارہ/ بیچاری، جنوری ۱۹۶۴ء)

اردو زبان کی ترقی کے خود ساختہ دعویدار ادیبوں اور دانشوروں کے ذریعے پیدا ناموافق حالات کے باوجود آخر دم تک ابن صفی اردو دنیا کے لیے مشعل راہ بنے رہے اور اپنی متنوع تخلیقات اور افکار سے ہر طبقے کے اذہان وقلوب کو مسخر کرتے رہے۔ ان کی مقبولیت اتنی زیادہ تھی (اور آج بھی ہے) کہ قارئین نے اپنے خطوط میں ان کو مختلف خطابات سے نوازا تھا:

اردو کی مشہور مصنفہ عفت موہانی ایم اے، حیدرآباد ''موت کی چٹان'' کو ایک شاہکار قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ابن صفی کی تعریف کے لیے حقیقی تاثرات کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ (حوالہ: نیلی لکیر، اگست ۱۹۵۵ء)

عفت موہانی ابن صفی کو ''اقلیم ادب کا تاجدار'' اور ''بیسویں صدی کے جینئس'' جیسے خطابات سے یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ابن صفی کے کارناموں کے آگے کانن ڈائیل، برمنگھم، ویلنٹمائن ویلمز، چیٹرٹن، ایڈگر ویلس، اور دوسرے بہت سے مصنف پیچھے نظر آتے ہیں۔ (حوالہ: ہولناک ویرانے، جنوری ۱۹۵۶ء)

حیدرآباد سے عفت موہانی، ایک طویل فلسفیانہ خط میں ''شعلوں کا ناچ'' پسند کرتے ہوئے ابن صفی کی عظمت فن کو خراج عقیدت پیش کرتی ہیں اور مطالبہ کرتی ہیں کہ ابن صفی کو ''سر'' کا خطاب دیا جائے۔ (حوالہ: گیارہواں زینہ، جون ۱۹۵۶ء)

ڈھاکہ سے عبدالغنی، ابن صفی کو ''مصنف اعظم'' کا خطاب دیتے ہوئے ''لاشوں کا سوداگر'' پر مبارک باد دیتے ہیں۔
(حوالہ: ہولناک ویرانے، جنوری ۱۹۵۶ء)

ارشاد احمد بھنڈی بازار، فلیٹ نمبر ۱۲ بمبئی سے ''لاشوں کا سوداگر'' جیسے عظیم کارنامے پر ابن صفی کو ''گریٹ'' کا خطاب دیتے ہیں۔ (حوالہ: ہولناک ویرانے، جنوری ۱۹۵۶ء)

علی روشن دادر مین روڈ، بمبئی نمبر ۱۲ ''شعلوں کا ناچ'' جیسے عظیم کارنامے پر ابن صفی کو ''ادیب اعظم'' کا خطاب دیتے ہیں۔
(حوالہ: گیارہواں زینہ، جون ۱۹۵۶ء)

سید غالب۔ کلیم ہوٹل، نامپلی اور ذوالفقار علی بیگ، نامپلی سے ''لاشوں کا سوداگر'' پر مبارک باد دیتے ہوئے ابن صفی کو ایک

کامیاب طنز نگار، سائنس داں، سراغرساں اور ناول نگار قرار دیتے ہیں۔ (حوالہ: ہولناک ویرانے، جنوری ۱۹۵۶ء)

ای سی تبسم، بنارس کینٹ نے ابن صفی کی تعلیمی قابلیت کو ان کی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے کہیں زیادہ آنکا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔ ''آپ ہیں تو بی اے مگر آپ کا قلم اور اس کے کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ ایم ایس سی اور ڈی ایس سی والوں کے بھی کان کترتے ہیں۔ (حوالہ: کچلی ہوئی لاش، اپریل ۱۹۵۵ء)

جناب غفار انجم آٹھواں درجہ، اینہ اسلام پور ''نیلی لکیر'' کے لیے مبارک باد دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ابن صفی کے لیے ''شاہکار'' ایک کمتر لفظ ہے...(حوالہ: تاریک سائے، ستمبر ۱۹۵۵ء)

ادیبہء بنگال صالحہ بیگم مخفی صاحبہ، ۴۱ جام نگر روڈ سرکس کلکتہ نمبر ۱۷ کا خیال ہے کہ ابن صفی کا اگر دنیا میں کوئی مقابلہ کرسکتا ہے تو وہ رینالڈز ہے...(حوالہ: تاریک سائے، ستمبر ۱۹۵۵ء)

کلکتہ سے شہر یار علی نے تحریر کیا ہے کہ...اب تک جاسوسی دنیا کے کل شمارے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بے شک ہندوستان کے سب سے بڑے جاسوسی ناول نگار ہیں۔ آپ کے قلم میں ایک ایسی حیرت انگیز طاقت ہے جس سے اردو ادب روز بروز ترقی کر رہا ہے لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے بہت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان سے جو دوسرے جاسوسی ماہنامے نکل رہے ہیں ان میں بالکل فریدی اور حمید جیسے کردار پائے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے نام بھی فریدی اور حمید جیسے ہوتے ہیں۔ آپ کی قابلیت کا یہ کھلا ثبوت ہے کہ دوسرے مصنف نقل کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں...(حوالہ: جنگل کی آگ، مارچ ۱۹۵۵ء)

عبدالمجید خان، درجہ دوازدہم، اسلامیہ انٹر کالج، فیروزآباد، انگریزی میں ایک خوب صورت خط کے ذریعہ لاطینی محاوروں کے ساتھ ابن صفی کو ایک عظیم شخصیت قرار دیتے ہیں۔...(حوالہ: ''گیارہواں زینہ۔'' جون ۱۹۵۶ء)

ابن صفی نے اپنے کرداروں کو وہ حیات جاودانی بخشی ہے جو اردو ادب کے کچھ ہی کرداروں کے حصے میں آئی ہے۔ ان کے کردار بیحد متحرک، فعال ومنفرد اور جداگانہ شخصیت کے حامل ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے قارئین کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ یہ کردار بے پناہ صلاحیتوں کے مالک ہیں اور کہیں کہیں تو بہت ہی مافوق الفطرت نظر آتے ہیں لیکن ابن صفی نے ان کو اتنے خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے کہ قارئین ان کو حقیقی سمجھنے پر مجبور ہیں:

> بشیر صاحب، نیو ایکس ٹنشن خلاصی پالم بنگلورسٹی سے لکھتے ہیں۔ ''میں حسب معمول ۱۵؍مارچ کو آپ کے جاسوسی دنیا کا انتظار کرنے لگا اور آخر شام تک انتظار کرتے کرتے تھک گیا، آخر جاسوسی دنیا کو نہ آنا تھا نہ آیا اور اسی طرح وہ دوسرے تیسرے دن بھی نہ آیا اور آخر ۲۷؍مارچ کو چار بجے کے قریب جاسوسی دنیا آیا۔ میں ریلوے بک اسٹال کے قریب ہی بیٹھ کر پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ واقعی میں ایک چیلنج کے ساتھ کہتا ہوں کہ ابن صفی کے قلم سے کوئی اور بازی نہیں لے جاسکتا۔ جاسوسی دنیا میں ایک ایسی کشش ہے کہ ہاتھ میں لینے کے بعد ختم کیے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ آپ کی یہ'' کچلی ہوئی لاش''، '' جنگل کی آگ'' سے بھی بازی لے گئی۔ خدا آپ کو دن دوگنی رات

چوگنی ترقی دے۔ آپ کی اس کامیابی کے لیے آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور حمید صاحب کو بھی میری طرف سے سلام عرض کر دینا۔ زیادہ کیا لکھوں۔ آپ کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں...(حوالہ:''اندھیرے کا شہنشاہ''مئی ۱۹۵۵ء)

تہذیب بیگم، گوئیاں تالاب، رامپور کو''لاشوں کا سوداگر'' بہت پسند آیا۔ ان کا خیال ہے کہ فریدی اور حمید حقیقت بن گئے ہیں۔ (حوالہ:''ہولناک ویرانے''،جنوری ۱۹۵۶ء)

سید عبدالحق رضوی، بی کام، سنگا ریڈی، حیدرآباد دکن کا خیال ہے کہ ابن صفی کے جادو نگار قلم نے فریدی اور حمید کو شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کی طرح زندہ جاوید بنا دیا ہے۔(حوالہ:''ہولناک ویرانے''،جنوری ۱۹۵۶ء)

رضیہ سلطانہ عارفی (مقام درج نہیں) کے مطابق''سوچتی ہوں کہ آپ کے ناولوں کی کیا تعریف کروں۔ مجھے آپ کا انداز تحریر بیحد پسند ہے۔ آپ کا طرز بیان اتنا اچھا کہ مطالعہ کے وقت میں خود کو فریدی سمجھنے لگتی ہوں۔ کبھی تو حمید سے مل کر فریدی کو خوب تنگ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ حمید کا کریکٹر مجھے بیحد پسند ہے۔ آپ اس کے کردار کو اتنی عمدگی سے ادا کرتے ہیں کہ ہمیں شک گزرتا ہے کہیں آپ ہی تو حمید نہیں ہیں۔ ان کی چوہیا ہمیں بہت پسند آئی۔(حوالہ:''جنگل کی آگ، مارچ ۱۹۵۵ء)

نجم الدین فاروقی، بھوپال سے رقم طراز ہیں...''سائے کی لاش'' میں تو آپ نے کمال کر دیا۔ کتنا بھیانک ایڈونچر تھا۔ فریدی کی موت و حیات کی کشمکش نے مجھے اور دیگر احباب کو کافی مضمحل کر دیا لیکن جب یہ پڑھا کہ وہ خطرہ سے باہر ہے تو بڑی مسرت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ ہمارا کوئی عزیز ایک دم شفایاب ہوگیا...(حوالہ:''پہلا شعلہ''،اکتوبر ۱۹۵۶ء)

ابن صفی ایک طویل عرصے تک اپنے پرستاروں کے لیے پراسرار بنے رہے اور ان کے شاہکار ایک کے بعد ایک بازار میں دھوم مچاتے رہے لیکن شائقین کے بیحد اصرار کے باوجود انھوں نے اپنی تصویر شائع کروانے سے گریز کیا۔ آخر جب اصرار حد سے بڑھ گیا تو ان کو اپنی تصویر شائع کروانا پڑی جس کو دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ ابن صفی نے اپنے کئی ناولوں میں تحریر کیا ہے کہ زیادہ تر افراد جنھوں نے فریدی کو دیکھا نہیں تھا، اس کے محیر العقول کارنامے سن کر اس کو کوئی بوڑھا آدمی سمجھتے تھے۔ یہی حال جاسوسی دنیا کے قارئین کا بھی تھا جنھوں نے اپنے خیالوں میں فریدی کو ایک جیتا جاگتا کردار بنا کر بٹھایا ہوا تھا اور اسی طرز پر انھوں نے ابن صفی کو بھی کوئی بزرگ سمجھ کے اپنے ذہن میں بسا رکھا تھا:

کے ودیا ساگر، سپروائزر، کواپریٹو نظام آباد ابن صفی کی جدت طرازی اور انوکھے پن کے قائل ہیں۔ اس بات پر تعجب کرتے ہیں کہ اتنی شہرت کے باوجود ابن صفی پبلسٹی سے گریز کرتے ہیں۔(حوالہ:''اونچا شکار'' جولائی ۱۹۵۸ء)

عبدالخالق حاجی محمد عالم کمہار باڑہ، مالیگاؤں، ناسک کا کہنا ہے کہ جوبلی نمبر ان کی توقعات سے بڑھ کر نکلا۔ سرورق بہت عمدہ ہے۔ ابن صفی کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ کوئی بزرگ ہوں گے مگر تصویر نے چونکا دیا۔(حوالہ:''گیارھواں زینہ'' جون ۱۹۵۶ء)

محمد خورشید انور بتیا پوکھر روڈ کلکتہ، ابن صفی کی تصویر دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔(حوالہ:''گیارھواں زینہ'' جون ۱۹۵۶ء)

مقبول عام ادب یا پاپولر لٹریچر کو کم تر سمجھنے کی عام روش بہت پہلے ہی سے موجود تھی۔ جس کے سبب جاسوسی ناول اور کہانیوں کو بھی

درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ یہی عام خیال ابن صفی کے ناولوں کے بارے میں بھی تھا کہ ان کو بھی پڑھ کر بچے اور نوجوان گمراہ ہو سکتے ہیں، اس لیے زیادہ تر خاندانوں میں بزرگ حضرات نے جاسوسی دنیا اور نکہت پڑھنے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ابن صفی کے ناولوں کے مطالعے پر سزائیں تجویز کرنے والے یہی بزرگ اپنی خلوتوں میں ان ناولوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پکڑے بھی جاتے تھے۔ یہ ابن صفی کی تخلیقات کے اعلیٰ معیار کا بین ثبوت ہے:

جناب سراج الحق، رحمت نگر، لطف اللہ بخشی بازار، شہر گورکھپور سے لکھتے ہیں کہ جاسوسی دنیا کی بے پناہ مقبولیت افسانہ بن گئی ہے۔ یہاں تک کہ ''بزرگ'' لڑکوں سے چھین کر جاسوسی دنیا پڑھتے ہوئے پائے گئے ہیں۔... (حوالہ: ''تاریک سائے''، ستمبر ۱۹۵۵ء)

انوار احمد، اخلاق مرزا، سلطانہ اور جہان بیگم وغیرہ مرادآباد سے ابن صفی کی بیدار مغزی اور فنی کمالات کی مدح کرتے ہوئے یہ بتاتی ہیں کہ بوڑھے اور بوڑھیاں بھی ابن صفی کی تصانیف، کمال ذوق وشوق سے پڑھتی ہیں۔ (حوالہ: ''پاگل خانے کا قیدی۔'' اپریل ۱۹۵۶ء)

عبدالقدوس صاحب، نظام آباد سے جاسوسی دنیا کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جاسوسی دنیا میں بہت ساری خوبیاں ہیں اور اس کے پڑھنے سے ذہن پر برا اثر پڑنے کے بجائے اچھا اثر پڑتا ہے۔ (حوالہ: ''دل چسپ حادثہ۔'' فروری ۱۹۶۰ء)

محمد خواجہ معین الدین گونڈیا سے لکھتے ہیں کہ ''اشاروں کے شکار'' بہترین ناول ہے۔...گھٹیا قسم کے مذاق کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ (حوالہ: ''ستاروں کی موت'' نومبر ۱۹۶۴ء)

ایسے دور میں جب ہر طرف طرح طرح کے ناولوں کی بھرمار ہو، ابن صفی نے جاسوسی دنیا، الٰہ آباد کو اپنی وسیع النوع معلومات، سائنسی انکشافات فطرت کی رنگیں بیانی، انسان کے ظلم وستم اور حیوانیت کی داستانوں، باطل پر حق کی فتح کی کہانیوں، قانون کی پاسداری اور علمبرداری کے افسانوں اور کرداروں کی بوقلمونی سے شہرت کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا تھا جہاں اس وقت انگریزی مصنّفین کے ناول جلوہ فگن تھے۔

اے ایس تبسم (مقام کا نام درج نہیں) اپنے خط میں رقم طراز ہیں کہ ''خطرناک دشمن'' کی کیا تعریف کروں۔ کتاب ختم کی اور منہ سے یہ جملہ نکلا لانگ لو صفی! اور ہر کتاب میں ایک نئی دنیا، ایک نیا بحر، ایک نیا انداز اور ایک نئی بات ملتی ہے۔ آپ کا دماغ غضب کا ہے۔ آپ کی شخصیت فریدی سے کم پراسرار نہیں ہے۔ دماغ کیا ہے معلومات کا سرچشمہ ہے جو کبھی نہیں سوکھتا ہے اور خدا کرے کبھی نہ سوکھے۔ آپ کی واقعات نگاری، کردار نگاری، واقعاتی تسلسل اور طنز وظرافت نے آپ کو بیسویں صدی کی ایک نامور اور ناقابل فراموش ہستی بنا دیا ہے۔ آپ کی تصنیف، آپ کے ناولوں کا شہرہ، ہند تو کیا شاید ایشیا کے کونے کونے میں ہے...(حوالہ: ''جنگل کی آگ، مارچ ۱۹۵۵ء)

سید امیر احمد انجم بجنوری کا خیال ہے کہ ابن صفی نے جاسوسی ناولوں کا معیار بلند کر دیا۔ سادہ اور مختصر الفاظ میں بڑی اور گہری باتیں کہنا ابن صفی کا حصہ ہے۔ (حوالہ: ''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

نافع رضوی ایم اے (مقام کا نام درج نہیں) کے مطابق یوں تو ہندوستان میں اس وقت ان گنت جاسوسی ماہنامے نکل رہے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کو ہم جاسوسی دنیا کے ہم پایہ کہہ سکیں۔ ابن صفی کا طرز نگارش کسی اور مصنف کو نصیب نہیں۔ میرے خیال میں وہ وقت دور نہیں جب کہ ابن صفی کا نام دنیا کے ہر عظیم مصنف کے ساتھ لیا جاسکے گا۔ (حوالہ: ''چیختے دریچے''، جنوری ۱۹۵۵ء)

سندھیال پراویژن جنرل اسٹور، کے۔ بازار، دھرم شالہ لکھتے ہیں کہ ابن صفی کا تخیل انوکھے شاہکار پیش کرتا ہے۔ الفاظ اس ڈھنگ سے پروئے جاتے ہیں جیسے موتیوں کی مالا۔ امریکن پاکٹ بکس سے کسی طرح جاسوسی دنیا کم نہیں۔ (حوالہ: ''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

مشیر حیدر سبزی باغ پٹنہ ۴ سے لکھتے ہیں کہ خوب صورت سرورق کے ساتھ کہانی (شعلوں کا ناچ) کمزور تھی......جاسوسی دنیا امریکن پاکٹ بکس سے کسی طرح کم نہیں۔ (حوالہ: ''گیارہواں زینہ۔'' جون ۱۹۵۶ء)

سید محمد اعظم سوماجی گوڑہ حیدرآباد جوبلی نمبر دیکھ کر یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ یہ اردو کی کتاب ہے یا امریکن پاکٹ بک!...

(حوالہ: ''گیارہواں زینہ۔'' جون ۱۹۵۶ء)

اظہر برادران، سول لائنس، مرادآباد کا خیال ہے کہ اردو کی جاسوسی دنیا، انگریزی کے بہترین ناولوں کو مات کر دیتی ہے۔

(حوالہ: ''سازش کا جال''، اکتوبر ۱۹۵۵ء)

سی ایم کالج دربھنگہ کے لا پارٹ فرسٹ کے طالب علم ایم اے حسین ابن صفی کو عظیم فن کار کے القاب سے نوازتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔... میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اردو میں ڈیٹکٹو ناول مفقود ہیں لیکن آپ کا جاسوسی دنیا پڑھنے ے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوں آپ کی ہر ماہانہ اشاعت ایک شاہکار کی شکل میں آتی ہے۔.... (حوالہ: ''پراسرار وصیت، جون ۱۹۵۵ء)

ڈاکٹر فخر الحسن، شہلا محبوب، مس نسیم محبوب وغیرہ بنارس سے تحریر کرتی ہیں کہ اگر بن جانسن ہوتا تو ابن صفی کے لیے بھی ویسی ہی نظم لکھتا جیسی اس نے شیکسپئر کے لیے لکھی تھی۔ رومان، سسپنس، طنز و مزاح، ظرافت، کرداروں کی انفرادیت، حب الوطنی اور تحیر ابن صفی کے یہاں شباب پر ہے، شیکسپئر جیسا ڈراماٹسٹ، ورڈسورتھ جیسا نیچرل شاعر اور ابن صفی جیسا جاسوسی ناول نگار دنیا اب پیدا نہیں کر سکے گی۔ (حوالہ: ''ہولناک ویرانے''، جنوری ۱۹۵۶ء)

وائی پی مارک، چیف ایڈوائزر یوتھ گروپ، راؤڑقلعہ اڑیسہ لکھتے ہیں کہ ان کے دوست جاسوسی دنیا پڑھنا خبط سمجھتے تھے مگر ''طوفان کا اغوا'' پڑھ کر انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب وہ ہر ماہ پابندی سے پڑھیں گے اس لیے کہ یہ واحد ماہنامہ ہے جو ادبی، سیاسی، سماجی اور سائنسی مسائل پر روشنی ڈالتا ہے۔ (حوالہ: ''رائفل کا نغمہ'' اکتوبر ۱۹۵۷ء)

ابن صفی نے اپنی تخلیقات سے ایک طویل عرصے تک نہ صرف قارئین کے ذہن کی آبیاری کی اور ان کے ذوق مطالعہ کو جلا بخشی (جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے) بلکہ اپنے سنجیدہ مگر شیریں لب و لہجے، بے ساختہ مزاح اور نکتہ آفرینی سے جاسوسی ناول نہ پڑھنے والوں کو بھی سری ادب کی طرف متوجہ کیا۔ یہی نہیں، ان ناولوں کی وجہ سے غیر اردو داں حضرات نے اردو پڑھنا بھی سیکھی۔ ناول

''تیسری ناگن'' کے پیش رس (۱۰ رنومبر ۱۹۶۹ء) میں رقم طراز ہیں کہ آپ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی یا بنگالی بھائی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اردو پڑھ رہا ہوں۔ پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کہاں تک لیا جائے۔ اب بتائیے میں ''ادب'' کی خدمت کروں یا میرے لیے ''اردو'' ہی کی خدمت مناسب ہوگی۔ ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور سوسائٹی کی بھی اور میری اس خدمت کا اندازہ نہ تو بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور نہ وقتی مصلحتوں کے تحت کوئی دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ہر حال میں قانون کا احترام کرنا سکھاتا ہوں۔

گوبند سنگھ، ڈاک خانہ ہوجائی، ضلع نوگام، آسام سے اپنے آپ کو جاسوسی دنیا کا ہر دم بھلا چاہنے والا قرار دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ مجھے جاسوسی ناولوں سے نفرت سی تھی لیکن آج وہ نفرت محبت میں بدل چکی ہے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کے دماغی خزانے کو اور برکت دے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ کبھی کبھی مجھے اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ آپ کا سر اور دماغ ہمارے سے کئی حصہ بڑا ہوگا اس لیے آپ کا فوٹو دیکھنے کے لیے بیتاب ہوں۔ (حوالہ: ''کچلی ہوئی لاش''، اپریل ۱۹۵۵ء)

انگریزی زبان میں ایدار سنگھ، امرتسر سے لکھتے ہیں کہ انھوں نے جاسوسی دنیا ہندی (جو ابن صفی ہی کے ناولوں کا ترجمہ ہوتا ہے) پڑھ کر اردو پڑھنا شروع کیا۔ (حوالہ: ''پاگل خانے کا قیدی۔''اپریل ۱۹۵۶ء)

سید علی اصغر جعفری جوبلی نمبر کو ایک ہنگامہ خیز شاہکار قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے کئی ایسے لوگوں کا ذکر لکھا ہے جو اردو نہ جانتے ہوئے جاسوسی دنیا پڑھوا کر سنتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایک گجراتی خاتون اِندر کا ذکر بھی کیا ہے۔ (حوالہ: ''گیارہواں زینہ۔'' جون ۱۹۵۶ء)

حاجی شیخ مفتوں یزدی، نوائے یاتمین جاسوسی دنیا کے اتنے گرویدہ ہیں کہ اسے فارسی میں منتقل کرنا چاہتے ہیں۔ (حوالہ: ''سازش کا جال''، اکتوبر ۱۹۵۵ء)

جس زمانے میں ابن صفی نے جاسوسی ناول لکھنا شروع کیے تھے، اس زمانے کے نقاد اور ثقہ حضرات سریات کو سرے سے ہی ادب سے خارج کرتے تھے جب کہ غیر ملکی ادب میں سریات کو ایک خاص درجہ حاصل تھا اور جاسوسی ناول نگاروں کو مختلف خطابات سے نوازا گیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو کے جاسوسی ناولوں میں صاف ستھری کہانیوں کا فقدان تھا اور ادب عالیہ کے دعویدار شاید اسی وجہ سے ان کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ ابن صفی نے اسی چیلنج کو قبول کرتے ہوئے جاسوسی ناولوں میں صاف ستھرے ماحول پر مبنی کہانیاں پیش کرنا شروع کی تھیں اور ان کے منفرد انداز تحریر، مخصوص کردار نگاری، اور متنوع پلاٹس اور شیریں زبانی نے ان کو اس زمانے کے جاسوسی ادیبوں سے الگ کھڑا کر دیا تھا۔ انھی وجوہ سے ان کے قارئین نے ابتدا ہی سے ان کی تخلیقات کو ادب کے زمرے میں شامل کر دیا تھا۔ ناقدین نے اپنے نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی گوارا نہیں کی تھی جب کہ بقول خالد جاوید ''ابن صفی کی تحریروں کو غیر ادبی ماننا دیانت داری کے خلاف ہے۔''

خالد جاوید، ماہنامہ شاعر ممبئی، جلد ۶۳، ۱۱ رنومبر ۱۹۹۲، بحوالہ ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، پہلا ایڈیشن، جون ۲۰۱۳

رفیق عالم، میٹرک سینٹ اپ گیٹ، ایچ ای اسکول، گیا سے لکھتے ہیں کہ... اس میں شک نہیں کہ اس دور حاضر میں آپ جاسوسی

دنیا کو رائج کر کے اردو ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہے ہیں اور آپ ہمہ گیر شہرت کے حامل بنتے جا رہے ہیں۔ ہمیں آپ جیسے ادیبوں پر فخر حاصل ہے جس نے اردو ادب میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ (حوالہ: ''جنگل کی آگ، مارچ ۱۹۵۵ء)

ایس ایم قدوس عالم، زین العابدین، خورشیدی بیگم، شمس جہاں تبسم نے گولڈن پیلس۔ بھاگلپور سٹی سے تحریر کیا ہے کہ... حقیقت میں ابن صفی نے'' سائے کی لاش'' میں یہ بات ثابت کر دی ہے کہ وہ حقیقت میں نئی راہیں پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ ایک ہی راستہ پر چلنا ان کا شیوہ نہیں اور ان کے قلم کی عظمتوں کی کہانی آج کے اردو ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے...(حوالہ: ''پہلا شعلہ''، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

کلیم الظفر ، بنارس سے جاسوسی دنیا کی ترقی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ابن صفی زندہ باد! بڑے انتظار کے بعد'' سائے کی لاش'' ملی۔ ابن صفی کے قلم کی طاقت دیکھ کر میں حیران ہو گیا... میں ابن صفی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انھوں ے اردو ادب کے ایک گوشے کو اپنے لازوال ناولوں سے پر کر دیا۔ (حوالہ: ''پہلا شعلہ''، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

حبیبہ بیگم، تال شہر، پترا کے خط کے مطابق... آپ جاسوسی دنیا کے ذریعے اردو کی جو قابل فخر اور بلند پایہ خدمت انجام دے رہے ہیں اس کے لیے اردو ادب اور اردو کے پروانے آپ کے بہت بہت ممنون و مشکور ہیں... (حوالہ: ''پراسرار وصیت، جون ۱۹۵۵ء)

محترمی صفی صاحب! سلام مسنون۔ میرا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے کہ جاسوسی دنیا نے تمام دوسرے جاسوسی پرچوں کو ایک نئی راہ دکھائی۔ جاسوسی دنیا کا اردو ادب پر بھی بڑا احسان ہے کہ سب سے پہلے یہ پرچہ نہ صرف شائع ہوا بلکہ تمام دوسرے پرچوں پر چھا گیا.....

آپ کا مخلص

قیصر سبحانی، سیتاران پیٹھ، حیدرآباد دکن۔

(حوالہ: ''پراسرار وصیت، جون ۱۹۵۵ء)

سمیع اللہ خاں، سکندرآباد دکن کا خیال ہے کہ ابن صفی نے جاسوسی ادب کو زندہ کر دیا ہے۔ ابن صفی کی سچی تعریف کے لیے قلم اور دماغ میں اتنی طاقت کہاں کہ حق تعریف ادا کر سکے... (حوالہ: ''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

نسیم احمد صدیقی، لین نمبر ۴ ہلدوانی کا خیال ہے کہ ابن صفی جاسوسی ادب کا وہ شہنشاہ ہے جس نے اپنے قلم کا جاہ وجلال اردو ادب کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ (حوالہ: ''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

رانی بنور سے قلندر خان پٹھان، مسٹر تقی اللہ پٹھان وغیرہ جاسوسی دنیا کے کارناموں کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ابن صفی جیسا مصنف ملا ہے۔ (حوالہ: ''ہولناک ویرانے''، جنوری ۱۹۵۶ء)

مصطفیٰ رضوی نے کمرہ چندوارہ، مظفر پور سے تحریر کیا ہے کہ.... جاسوسی دنیا اردو ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔

(حوالہ: ''پراسرار وصیت، جون ۱۹۵۵ء)

اعظم پریم بسیرا، ماچی گوڑہ حیدرآباد دکن کے مطابق ابن صفی کی فصیح زبان اور دل چسپ واقعات اردو دنیا میں جواب نہیں رکھتے۔کوئی بھی مصنف ان کی برابری نہیں کرسکتا۔(حوالہ:''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

اپنے خط میں پیارے لعل تکو، فرسٹ ایر، امر سنگھ کالج، سری نگر، کشمیر سے لکھتے ہیں:''مجھے تو اب جاسوسی دنیا سے عشق ہوگیا ہے...آپ کے قلم میں حیرت انگیز قوت ہے جو سب کو عش عش کرنے پر مجبور کرتی ہے۔واقعی آپ جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔(حوالہ''پراسرار وصیت''، جون ۱۹۵۵ء)

''حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔'' ابن صفی نے اپنی تخلیقات کے سلسلے میں یہ الفاظ تو شاید بہت بعد میں تحریر کیے تھے، مگر ان کے پرستاروں نے اس کا اعتراف بہت پہلے ہی کرلیا تھا:

سرپور، کاغذنگر سے اے جی ساون نے ابن صفی کو عظیم تخلیق کار اور مفکر اعظم قرار دیتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ ''سائے کی لاش'' کی تعریف تحریر میں لانے کی میرے قلم میں طاقت نہیں۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے ازحد مسرت ہوتی ہے کہ محترم ابن صفی کی قلم کی ہر جنبش کائنات کے لیے ہمیشہ نیا تخیل، نیا ڈھنگ اور نئی ایجادات پیش کرتا رہا ہے اور پھر ہر ماہ ایک ناول لکھنے کا جو فخر ابن صفی کو حاصل ہے وہ شاید سارے عالم میں آج تک کسی کو حاصل نہ ہوسکا جس کی وجہ سے اس دور میں دم توڑتی ہوئی اردو کا سر بھی فخر سے ساری زبانوں میں اُٹھ گیا ہے...(حوالہ:''پہلا شعلہ''، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

فیض آباد سے سید محمد ایم اے کے مطابق....آپ کی مزاح نگاری، شگفتہ اندازتحریر اور پراسرار واقعات کی ترتیب قابل قدر ہے۔مگر مجھے اس سے زیادہ جو چیز پسند ہے وہ یہ کہ آپ کی تصنیفات میں حالات حاضرہ پر بڑی چابکدستی سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ''موت کی آندھی''، انسانیت دوستی اور''برف کے بھوت'' امن کی تحریک کے پیغامبر ہیں۔اسی طرح ملک میں ناجائز درآمد کے سلسلے میں ''نیلی روشنی'' اور''پرہول سناٹا'' قابل ذکر ہیں۔ بلیک میلنگ کے واقعات پر''فریدی اور لیونارڈ'' ایک شاندار کارنامہ ہے۔آپ مبارک باد کے مستحق ہیں کہ اس طرح ملک کو تفریحی لٹریچر کے ذریعہ درست راستے کی طرف لے جارہے ہیں۔

(حوالہ:''چیختے دریچے''، جنوری ۱۹۵۵ء)

علی احمد اثر حمیدی اور ممبران دارالفلاح لائبریری، آسنسول؛ اے ایچ آزاد، اسٹیشن ماسٹر لیہو وغیرہ کا کہنا ہے کہ ابن صفی کے دل چسپ اندازتحریر، مناظر فطرت کی عکاسی، سائنس کے کمالات اور کردارنگاری نے اردو ادب میں قابل فخر اضافہ کیا ہے۔بے شک وہ ایشیا کے واحد ادیب ہیں جنھیں اتنی قدرت حاصل ہے۔(حوالہ:''پاگل خانے کا قیدی۔''اپریل ۱۹۵۶ء)

صفی بھائی!....''جنگل کی آگ'' نظر سے گزرا۔اس کو ہر شمارہ سے بہتر پایا۔خدا جانے آپ کا مطالعہ کتنا وسیع ہے۔میں ہمیشہ اللہ سے آپ کے قلم کی روزافزوں ترقی کے لیے دست بدعا رہتا ہوں۔

سید ضیاءالدین احمد۔درجہ دہم، سنٹرل کریمیہ ہائی اسکول، جمشید پور، بہار

(حوالہ:''کچلی ہوئی لاش''، اپریل ۱۹۵۵ء)

برج راج کرشن ٹی ڈی بنگلور سے لکھتے ہیں کہ ''لاش کا بلاوہ'' ایک بلند پایہ کارنامہ ہے جو انسانیت کے علم کو بلند کرتا ہے۔آپ

انسانیت کے دشمنوں کی دھجیاں اڑاتے ہیں...(حوالہ: ''رائفل کا نغمہ'' اکتوبر ۱۹۵۷ء)

سنگھ لائبریری، سلطان پور کے ممبران اجا گر سنگھ، محمد ہاشم وغیرہ کا خیال ہے کہ ابن صفی نے (لاش کا بلاوہ میں) سرمایہ داروں کی ننگی تصویر پیش کر کے ان کے منہ پر وہ طمانچہ مارا ہے کہ وہ یاد کرتے ہوں گے۔(حوالہ: ''رائفل کا نغمہ'' اکتوبر ۱۹۵۷ء)

ٹی محمد بشیر، گوڈاؤن اسٹریٹ مدراس نے ''ستاروں کی موت'' میں فلمی دنیا کا صحیح نقشہ دیکھا...ابن صفی کے ناول شیکسپئر کے ڈراموں کی طرح سدا بہار ہیں۔(حوالہ: ''جونک کی واپسی'' ۱۹۶۵ء)

نذیر احمد یوسفی رحمانیہ اسٹریٹ آسنسول اور ان کے تمام دوستوں کو ''طوفان کا اغوا'' بے حد پسند آیا۔اس کہانی میں انھوں قوموں کی ترقی کے راز کا نکتہ پایا اور اتحاد کا سبق سیکھا۔(حوالہ: ''رائفل کا نغمہ'' اکتوبر ۱۹۵۷ء)

ابن صفی کے علاوہ شاید ہی کسی دوسرے مصنف کو یہ اعزاز حاصل ہو کہ جس کے ناولوں کی بلیک ہوتی ہو، لوگ رات میں میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے بیٹھ کر ان سے لطف اندوز ہوتے ہوں اور چندہ کر کے خریدتے ہوں، مہنگائی کی وجہ سے ناولوں کی قیمت بڑھنے پر قارئین کی پیشانی پر شکن تک نہ آتی ہو، ان کو مہنگی سے مہنگی قیمتوں پر خریدنے کو تیار رہتے ہوں اور جن کے ناولوں کی اشاعت کئی لاکھ تک جا پہنچی ہو۔ان ناولوں کی مقبولیت کا ثبوت وہ ہزاروں، لاکھوں خطوط ہوا کرتے تھے جو قارئین جاسوسی دنیا کے دفتر کو ارسال کیا کرتے تھے:

میرٹھ کالج اور وکٹوریہ کالج میرٹھ کے لیاقت علی، رضوان حسین، محمد اسمٰعیل، فضل الرحمٰن، کل بھوشن نے اپنے خط میں تحریر کیا ہے کہ اس ماہ کا جاسوسی دنیا دیکھا۔ یہ بتانے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا کہ اسے دیکھ کر ہمیں کتنی خوشی ہوتی ہے۔کچھ باتیں ایسی ہیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ وہ یہ کہ آخر آپ جاسوسی دنیا میں نظم وغیرہ کیوں ٹھونستے ہیں۔اب تک ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی خوشی ہوتی تھی کہ آپ کے ماہنامہ میں صرف مطلب کی بات یعنی ناول ہوتا ہے اور کچھ نہیں۔مگر اب دوسری بات دیکھ کر نہایت کوفت ہوتی ہے۔ہمیں صرف ابن صفی کی قلم کی تصنیف چاہیے اور کچھ نہیں۔(حوالہ: ''جنگل کی آگ، مارچ ۱۹۵۵ء)

ٹی پی محمد اشفاق، پوسٹ بکس نمبر ۲ بنگارا پیٹ کے خیال میں...آپ جس طرح پر اسرار واقعات کو ترتیب دے کر سراغ نکالتے ہیں، ایسا میں نے آج تک کسی اور ادیب کی تصنیف میں نہیں دیکھا۔سراغ رسانی کے ساتھ ساتھ مزاح نگاری، شگفتہ اندز تحریر بھی قابل قدر ہے...(حوالہ: ''پر اسرار وصیت، جون ۱۹۵۵ء)

محترم! بھائی...میں پورے اعتماد سے کہتی ہوں کی جاسوسی میدان کی دوڑ میں آپ بہت تیز گام ہیں۔کاش! آپ یونہی سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں اور منزل کبھی نہ ملے۔آپ کی مخلص بہن ثریا جبیں، جھریا (بہار)

(حوالہ: ''چیختے دریچے''، جنوری ۱۹۵۵ء)

حکیم الرفیع، گلی گوندنی والی، دہلی نمبر ۷، نصیر الحسن چشتی، نظر باغ لکھنؤ، زاہد رضا خانصاحب گولہ گنج، صابر حسین خواجہ، نمبر ا کنٹونمنٹ روڈ لکھنؤ کا خیال ہے کہ ''موت کی چٹان'' یہ ثابت کرتا ہے کہ ابن صفی کا قلم اپنے میدان میں واحد و یکتا ہے اور اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا...(حوالہ: ''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

نثار عزمی جلگاؤں کا خیال ہے کہ ابن صفی کا ذہن ایک فوارہ ہے جس سے ہمیشہ موتی بکھیرنے والی دھارائیں نکلا کرتی ہے۔ابن صفی کے انداز کی رنگینی و دل چسپی عظیم اور بے مثال ہے۔(حوالہ:''نیلی لکیر''، اگست ۱۹۵۵ء)

ڈاکٹر محمد یونس احمدی، مسجد احمدیہ بھاگلپور لکھتے ہیں کہ ابن صفی کے کارنامے کسی انسانی دماغ کی تخلیق نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اٹامک یا الیکٹرک برین کام کر رہا ہے۔ نیا انداز، نئی اسٹائل، نیا کیرکٹر پیش کرنا ابن صفی کا طرۂ امتیاز ہے۔

(حوالہ:''ہولناک ویرانے''، جنوری ۱۹۵۶ء)

ایم حسین اور حکیم فخر احمد خاں سروج، مالوہ ابن صفی کو''نیلی لکیر'' پر مبارک باد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ لطیف مذاق، منظر کشی، نکتہ سنجی، دقیقہ رسی اور اعلیٰ سائنسی معلومات صرف ابن صفی کا ہی حصہ ہے۔(حوالہ:''تاریک سائے''، ستمبر ۱۹۵۵ء)

محمد احمد صدیق کانپور سے عید کے تہنیتی پیغام کے ساتھ''شعلوں کے ناچ'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ اتنا عظیم ناول ہے کہ دنیا کوئی ہستی اس کی توصیح اور سچی تعریف کا حق ادا یہ نہیں کر سکتی۔(حوالہ:''گیارہواں زینہ۔'' جون ۱۹۵۶ء)

مہ جبیں صاحبہ رائے بریلی نے ابن صفی کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔جس کے مطلع کا پہلا مصرع ہے:''نوید آمدِ فصل بہار، روح پرور سے۔''دعائیہ اشعار کا آغاز یوں ہوتا ہے:

ہر اک اہل چمن ابن صفی جس گل کو کہتا ہے
ریاض ہند مہکا ہے اسی کی بوے خوشتر سے

(حوالہ:''رائفل کا نغمہ''اکتوبر ۱۹۵۷ء)

اک طرف اگر قارئین، ابن صفی کی عظیم تخلیقات کی وجہ سے ان کے گرویدہ تھے تو دوسری جانب خود ابن صفی بھی ان کی توقعات پر پورا اترنے کی بھرپور کوشش کیا کرتے تھے جس کا اظہار ناول''مونچھ مونڈنے والی''، اگست ۱۹۵۴ء میں شائع ان کے اس خط سے ہوتا ہے:

''لاشوں کے آبشار'' کی پسندیدگی کے سلسلے میں آپ سب کے خلوص اور محبت سے بھرے ہوئے خطوط اس وقت میرے سامنے ہیں اور میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ آپ کی قدردانی و حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ میں فرداً فرداً آپ سب کو لکھتا لیکن پھر یہ خیال آجاتا ہے کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ جس کو عزیز رکھتے ہیں وہ آپ تک نہ پہنچا سکوں گا۔اس لیے آپ کے اُسی محبوب''جاسوسی دنیا'' کے ذریعے آپ سب سے مل رہا ہوں۔

آپ یقین کیجیے جب تک ابن صفی کے ہاتھ میں جنبش رہے گی وہ اپنی پوری اور تمام صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آتا رہے گا۔ میرے قلم کی تمام نزاکتیں، اس کا حسن، اس کی رعنائی، اس کی شوخیاں صرف جاسوسی دنیا کے لیے وقف ہیں اور اس وعدہ کے ساتھ کہ آپ ہر بار بہتر سے بہتر کارنامے پڑھتے رہیں گے۔آئندہ خاص نمبر''برف کے بھوت'' پیش کر رہا ہوں اور آپ میں سے بہتیرے

بھائیوں کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اس میں فریدی اور حمید کے علاوہ آپ کے پرانے محبوب کردار غزالہ اور شہناز نئے روپ میں دکھائی دیں گے۔ میں نے مستحکم ارادہ کیا ہے کہ ''موت کی آندھی''، ''خوفناک ہنگامہ''، اور ''لاشوں کا آبشار'' کی طرح ''برف کے بھوت'' کو بھی ایک چیلنج اور ایک دعوے کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ سکوں اور آپ یہ محسوس کر سکیں کہ اپنے اس ایشیا کی سرزمین سے جنم لینے والی کہانیاں، امریکا اور یورپ کے ناولوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ سربلند ہیں۔ ایک بار پھر آپ سب کی ہمت افزائیوں کا شکریہ۔

آپ کا اپنا
ابن صفی

پس نوشت

اس مضمون کو سپردِ قلم کرنے کے بعد حیدر آباد سے میرے ایک رفیق اور عثمانیہ یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے سابق صدر ڈاکٹر عقیل ہاشمی صاحب نے ابن صفی کی مقبولیت سے متعلق اپنے تجربات ارسال کیے۔ اس خط سے چند اقتباسات قارئین کے لیے خالی از دل چسپی نہ ہوں گے:

''...ان کی جادو نگار تحریر کا یہ عالم تھا کہ عام سطح ذہنی کے فرد سے لے کر اعلیٰ انٹلکچوئل صحافی اور سیاست داں حتیٰ کہ مذہبی و دینی مزاج کے حامل حضرات تک صاف ستھرا، شستہ ادب پڑھنے کی غرض سے ابن صفی کے ناولوں میں رغبت پاتے۔ چناں چہ پروفیسر حسن عسکری، ابوالخیر کشفی سے پوچھا کرتے تھے کہ ابن صفی کا نیا ناول کب آ رہا ہے۔ یہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ پاکستان کے اس وقت کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور خود صدر مملکت محمد ایوب خاں کو ان کی کتابوں کا انتظار رہتا تھا۔ اس مرحلے پر میرے ذہن میں چند ایک ایسے چشم دید سچے واقعات محفوظ ہیں جس سے ابن صفی کی مقبولیت، انفرادیت اور ان کی ہمہ گیر ساحرانہ تخلیقیت کے فسوں کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ غالباً ۱۹۵۴ء کی بات ہے جب میں ابن صفی کی طلسماتی تحریروں کا اسیر ہوا۔ اس وقت میں حیدر آباد کے سٹی کالج میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ گھر کا ماحول خاصا دینی و علمی تھا اور زیادہ تر مذہبی کتابوں اور قرآن، حدیث کی بازگشت رہتی تھی۔ والد ماجد کبھی کیمیائے سعادت اور کبھی فتوح الغیب کے مطالعے میں مصروف رہتے تھے۔ والدہ محترمہ ''بہشتی زیور'' جیسی کتب اور اے آر خاتون کی کتابوں کی دلدادہ تھیں۔ گھر میں ''نظام المشائخ''، ''منادی'' کے علاوہ ''کھلونا''، ''آستانہ'' جیسے رسائل آتے تھے۔ ایک دن بڑے بھائی، حیدری گشتی کتب خانہ سے ''جاسوسی دنیا'' لائے اور قدرے چھپ کر مطالعہ شروع کیا۔ مجھے تجسس ہوا اور ان سے اس کتاب کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے ٹالتے ہوئے کہا تم اپنے نصاب پر توجہ دو لیکن جب میں نے دیکھا ہمارے محلے کی کریانے کی دکان پر دو صاحبان عبدالرحیم اور ایشور راؤ اسی جاسوسی دنیا کو مشترکہ طور پر اس طرح پڑھ رہے ہیں کہ ان میں ایک صاحب تو فریدی کا اور دوسرے صاحب حمید کے مکالمے ادا کر رہے ہیں، تو میرا شوق اور تجسّس مزید بڑھ گیا۔ میں نے بھائی صاحب سے ''جاسوسی'' دنیا مانگ لی۔ اس وقت حیدری گشتی کتب خانہ سے ممبروں کو ایک روپیا ڈپازٹ اور چار آنے ماہانہ کے کرائے پر محض ایک دن کے لیے ایک

کتاب دی جاتی تھی۔ بھائی صاحب اس کے مستقل ممبر تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میرے مطالعے ''جاسوسی دنیا'' کی شروعات، خاص نمبر ''سائے کی لاش'' سے ہوئی تھی۔ بھائی صاحب نے پڑھنے کے بعد مجھے وہ کتاب دیدی۔ میں اسے اسکول کی کتابوں کے درمیان چھپا کر لے گیا اور مقررہ پیریڈ سے فرار اختیار کرتے ہوئے ابن صفی کی تحریر میں کھوگیا لیکن اسکول کے ختم ہونے تک بھی کتاب پوری نہ ہوسکی۔ اس لیے میں اس کو پوری کرنے کی غرض سے قریب میں واقع ہائی کورٹ کے چمن میں جا بیٹھا۔ ابھی میں آخری صفحات پڑھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب بائیسکل پر سوار نمودار ہوئے اور آتے ہی انھوں نے میرے ہاتھ سے کتاب اچک لی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ صاحب'' جاسوسی دنیا'' کا عنوان دیکھ کر مجھ پر برس پڑے اور نہایت سخت و درشت لہجے میں کہا کہ ''کبھی نصابی کتب بھی اس طرح چمن میں بیٹھ کر پڑھی ہیں؟ خدا معلوم کیا جادو ہے ان کتابوں میں جس کو دیکھو انھیں دیوانہ وار پڑھتا نظر آتا ہے!'' میرے لبوں پر ایک جملہ مچل کر رہ گیا، کاش آپ بھی اسے پڑھ لیتے۔ مگران کے رعب کی وجہ سے اس جملے کو ادا نہ کرسکا۔ وہ صاحب مجھے ڈانٹنے کے بعد اپنے راستے لگے۔

ایک دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ والد ماجد کی ایک محترم بزرگ سے یاد اللہ تھی جو عالم دین، متشرع، متدین، مسجد کے خطیب، اور نہایت ذی وجاہت شخصیت کے مالک تھے۔ والد صاحب اکثر ان سے ملنے موصوف کے گھر جایا کرتے تھے۔ ایک دن صبح کی سیر کے دوران کسی اسکوٹر کی ٹکر سے مولانا کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ پلاسٹر چڑھنے کے بعد مولانا کے معمولات یکسر بدل گئے۔ طبیعت میں یکسوئی نہ رہی، اکتاہٹ، جھنجھلاہٹ نے اپنا رنگ جمایا۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے۔ عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ اسی دوران ایک شاگرد نے مولانا کی مزاج پرسی کے بعد ڈرتے ڈرتے ''جاسوسی دنیا'' کا ایک شمارہ یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ ذکر و اشغال کی مصروفیات سے کچھ وقت نکل آئے تو تفریحاً ہی سہی اس کتاب کا مطالعہ کرلیں تاکہ وقت اچھا کٹ سکے۔ مولانا نے غصے سے شاگرد کی طرف دیکھا، کتاب پر اچٹتی نظر ڈالی اور عنوان دیکھ کر سخت لہجے میں فرمایا۔ ''کیا اس مرحلے پر میری آخرت خراب کرانا چاہتے ہو۔'' شاگرد استاد کے خوف و احترام میں بلا چوں چرا کتاب وہیں چھوڑ کر رخصت ہوگیا۔ شاگرد کے جانے کے بعد ان بزرگ نے قیلولہ کے وقت ''جاسوسی دنیا'' کا مطالعہ شروع کیا اور پھر وہ ابن صفی کی جادو نگار تحریر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگئے۔ بہت دنوں بعد وہی شاگرد قدرے خجل شرمندہ پھر عیادت کو پہنچے اور مزاج پرسی کی۔ مولانا نے قدرے برہمی سے فرمایا۔ ''مزاج کو تو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس مصنف نے اور ناول بھی لکھے ہیں۔'' شاگرد نے حوصلے سے کام لیا اور ابن صفی کے شاہکار ناولوں کا سلسلہ قائم کردیا۔ اس کے بعد مولانا نے ''جاسوسی دنیا'' کے لیے خود کو وقف کردیا۔''

برائے خاص ادریس شاہ جہان پوری
ڈاکٹر عقیل ہاشمی

فاروق احمد ❁

اولڈ کلفٹن کی کوٹھی، برنس روڈ کا فلیٹ اور گارڈن ویسٹ والا بنگلہ

فریئر ہال سے آگے کلفٹن کے پل سے اتر کر سیدھا چلتے جایئے، تین تلوار کا سگنل عبور کیجیے، کے پی ٹی انڈر پاس سے گزر کر نکلیے تو روڈ تین شاخہ ہو جاتی ہے۔ ایک زمزمہ دوسری ۰۷ کلفٹن اور تیسری موہٹہ پیلس کی طرف۔ اس تیسری سڑک پر دوسری کوٹھی تھی کرنل فریدی کی۔ ہو بہو وہی نقشہ جو ہمارے ذہن میں ابھرتا تھا۔ ۲، اولڈ کلفٹن روڈ کی تختی والا یہ کھلا گیٹ اور اس سے نظر آنے والا برآمدہ، طویل وعریض لان اور چہار دیواری کے ساتھ ساتھ لاتعداد گھنے درختوں کی چھاؤں شام کے دھندلکوں اور رات کی سنسان تاریکی، یہ سب مل کر اکسایا کیے تھے کہ کبھی گیٹ کے اندر بھی قدم رکھا جائے۔ لیکن شاید اس طلسم کے ٹوٹ جانے کا ڈر باز رکھتا تھا جو ذہن کے کسی گوشے میں ایستادہ تھا۔

شرلاک ہومز کی طرح کرنل فریدی کی بھی ایک دنیا تھی۔ شرلاک کی دنیا تو پہلی جنگِ عظیم کے دوران تحلیل ہو گئی تھی مگر فریدی کی دنیا کا دھندلا سا جلتا بجھتا سا، مٹتا ابھرتا سے عکس ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء تک نظر آتا رہا۔ البتہ عمران کی دنیا زندہ رہی اور آج بھی اس کا دھندلا سا خاکہ ہمارے چاروں طرف موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابن صفی کو یہ شہرت دوام کیونکر نصیب ہوئی۔ یوں کہہ لیجیے کہ ابن صفی جیسا مقام کسی اور کو عوام الناس نے کیوں نہ دیا۔ سوال یہ ہے کہ ابن صفی جیسے کردار کوئی اور کیوں تخلیق نہ کر سکا۔ سوال یہ ہے کہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کو کیوں اس قدر پذیرائی ملی۔ سوال یہ ہے کہ عمران سیریز اور جاسوسی دنیا میں سے اوّل الذکر ہی کیوں آج نصف صدی بعد ابن صفی کا استعارہ ٹھہری۔ سوال یہ ہے کہ ابن صفی کی تحریر میں ایسا کیا جادو تھا جو دوسروں کے پاس نہ تھا۔ سوال تو یہ بھی ہے کہ کیا اگر ابن صفی، عباس حسینی کے ادارے سے وابستہ نہ ہوتے اور ان کے ناولوں کو اشاعت وتقسیم کاری کا ایک مضبوط و مربوط و منظم مارکیٹنگ نیٹ ورک نہ مہیا ہوتا تو کیا بطور ''برانڈ'' وہ اتنے ہی مقبول ہو پاتے اور کیا ان کے ناول ہندوستان کے طول وعرض تک پہنچ پاتے۔ مختصراً یہ کہ وہ جملہ اسباب کیا تھے کہ ان کے ناول معاشرے کے ہر طبقے میں یکساں مقبول رہے اور آج بھی ہیں۔

ہر دور کی ہیرو شپ کا اپنا پیمانہ ہوتا ہے، آئیڈیل ہوتے ہیں، اپنے ہیرو ہوتے ہیں جو اس دور کے نوجوانوں کو بھاتے ہیں۔ انیس سو اسی کی دہائی کا اینگری ینگ مین انیس سو پچاس کے کنگ آف ٹریجڈی سے جگہ نہیں بدل سکتا۔ لیکن وہی اینگری ینگ مین نوے کی دہائی میں ٹھس ہو گیا اور زمانہ آیا اینٹی ہیرو یا ایک ایسے ہیرو کا جو ہیرو اور ولن کے درمیان کی کوئی چیز تھا۔ ''ہیرو شپ'' کا معیار بدلا سو بدلا ہیرو کی صورت و شخصیت، اور رہن سہن کا معیار بھی ہر دور میں بدلتا رہا۔ اگر پڑھنے والا ناول کے کردار میں خود کو تلاش کر لے تو اس

❁ اٹلانٹس پبلی کیشنز، پلاٹ نمبر ۱۶۔ بی، (اندرون ایسٹرن اسٹوڈیوز)، سائٹ، کراچی۔ برقی پتا: farooqahmedsiddiq@gmail.com

کردار سے خود کو ریلیٹ کرتا ہے۔ ابن صفی کا فریدی اس دور کا ہیرو تھا۔ ایک ایسا ہیرو جیسا ہر شخص خود کو خوابوں خیالوں میں دیکھنا چاہتا تھا۔ ہیرو کی یہ شبیہ ہالی ووڈ کی فلموں سے مستعار تھی اور ہندوستان کی ایلیٹ کلاس کے رہن سہن سے بھی۔ خود ابن صفی کے مطابق ان کے ذہن میں فریدی کو جو خاکہ تھا، پچاس کی دہائی کی ٹیلیویژن کی پیری میسن سیریز کا ہیرو ریمنڈ براس پر پورا اترتا تھا۔ فریدی لوگوں کا ہیرو تھا اور اس کے جیسے رہن سہن کی وہ صرف تمنا ہی کر سکتے تھے۔ لیکن ابن صفی نے عمران کی صورت میں ان کو ان کی زندگی سے زیادہ نزدیک تر ایک اور ہیرو مہیا کر دیا۔ یہ نیا ہیرو فریدی سے زیادہ مقبول ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ یہ عام لوگوں کی زبان بولتا تھا۔ انھی کی طرح ابے تبے کر کے بات کرتا تھا۔ انھی کی طرح ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہا کرتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو دو دنیاؤں کے سنگم پر زندہ تھے۔ وہ رہتے تو عمران کی دنیا میں تھے لیکن فریدی کی دنیا ان کا خواب تھی۔

وہ مارک ٹوئین ہو یا ابنِ صفی۔ کونن ڈائل یا آئن فلیمنگ ہوں، اگاتھا کرسٹی یا ابن صفی ہوں، ان لوگوں کی تصویر کشی کی جن سے وہ مخاطب تھے۔ ایسوں ہی کو اپنے اپنے عہد میں بے پناہ مقبولیت اسی لیے نصیب ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف ذہنوں کو اسی سر تال یا رِدھم میں سکون بخشا جو بے سکونی کا ذمے دار تھا۔ ان مسائل کا تذکرہ کیا جو رائج تھے۔ شرلاک ہومز نے قاتلوں اور مجرموں کو پکڑا جو حقیقی زندگی میں پکڑے نہیں جاتے تھے۔ جیمز بانڈ اور عمران نے غیر ملکی جاسوسوں کی بیخ کنی کی جو ابھرتی ہوئی وطن پرستی کے رجحان کا تقاضا تھا۔ فریدی کی دنیا کے ولن قتل، چور، لٹیرے، اور نوسر باز اور بلیک میلر تھے، غیر ممالک کے جاسوس نہیں تھے لیکن بدلتی ہوئی عالمی صورتحال میں لوگ ایسی کہانیوں کی طرف مائل ہو رہے تھے جس میں ہیرو سماجی جرائم کی بیخ کنی والا سراغ رساں نہ ہو بلکہ غیر ملکی جاسوسوں کی سرکوبی کرنے والا کوئی تیز طرار جاسوس ہو۔ بین الاقوامی فکشن اس کا غماز تھا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسی سر تال یا رِدھم میں سکون بخشا جو بے سکونی کا ذمے دار تھا تو مراد یہی ہوتی ہے کہ جس دور کا جیسا ولن تھا، بطور تریاق اسی کی مناسبت سے ہیرو لایا گیا۔ ابن صفی کا دور نیشنلزم اور وطن پرستی کے عروج کا دور تھا۔ ساٹھ برس پہلے کا آرتھر کونن ڈائل کا دور طبقاتی کشمکش اور اس سے ابھرنے والی نفرتوں کے جرائم میں ڈھلنے کا دور تھا۔

اگر بات صرف سکون بخشنے کی ہوتی تو شاید ابن صفی اور مارک ٹوئین کے ناول نشہ آور ادویات کے زمرے میں گنے جاتے۔ تو کیا آرٹ اور فن کی ہر صنف نشہ آور ہے جو سکون بخشتی ہے۔ پرانی بات نہیں جب منٹو کو ادبِ عالیہ کی ''سماج سدھار فورس'' فحش نگار قرار دے کر قابلِ دست اندازئ پولیس گردانا کرتی تھی۔ اگر کسی کو عبداللہ حسین اور قرۃ العین حیدر کو پڑھ کر اچھا لگتا ہے تو کیا اداس نسلیں اور آگ کا دریا کو نشہ آور کہا جائے۔ پرانی بات نہیں جب مارک ٹوئین کی کتابوں کو گلیوں میں ایسی ہی چارج شیٹ لگا کر عملاً گھسیٹا گیا تھا۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ابن صفی نے یقیناً کچھ تو ایسا کیا تھا کہ لوگ ان کی تحریروں کے دیوانے تھے۔ اگر ابن صفی کے ناول بے طرح چاہے جاتے تھے تو کوئی شک نہیں کہ ''انھوں نے نہ صرف ذہنوں کو اسی سر تال یا رِدھم میں سکون بخشا جو بے سکونی کا ذمے دار تھا۔'' وہ بے سکونی کیا تھی یہ آگے چل کر ہم دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ آگے چلنے سے پہلے تھوڑا پیچھے چلے چلیں اور ذرا سی نظر سری ادب کی تاریخ پر بھی ڈال آئیں۔

سری ادب کی تاریخ تو بہت پرانی ہے لیکن مقبولیت زیادہ پرانی نہیں۔ سائنس فکشن کی طرح جاسوسی فکشن بھی صنعتی انقلاب کا

شاخسانہ تھا۔ کہتے ہیں جاسوسی یا ٹوہ گری دنیا کا دوسرا قدیم ترین پیشہ ہے۔ وہ اساطیر و رزمیہ قصے جن میں قبیلے کا سورما اپنے حریف قبیلے کے ذخیرۂ اناج کا سراغ ڈھونڈھ لاتا ہے اور پھر قبیلے کے جنگجو ہلاّ بول کے اسے چھین لاتے ہیں، سری ادب میں اسی طرح شمار کیے جا سکتے ہیں جیسے طلسم ہوش ربا کے جادوئی حربے، نارنج ترنج کے قصوں کو سائنس فکشن کا پیش رو سمجھا جائے۔

جاسوسی یا سری ادب جس سے ہم آشنا ہیں اس کا آغاز اس وقت ہوا جب جاسوسی نے باقاعدہ ایک ادارے اور پروفیشن کی صورت اختیار کی۔ ایڈگر ایلن پو کا انسپکٹر آگسٹے ڈیوپن اسی وقت وجود پا سکا جب حقیقی دنیا میں پولیس کا محکمہ وجود میں آیا۔ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں برطانیہ میں ریاستی نظام کے تحت پولیس کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا گیا۔ اس سے پہلے جرائم روکنے کے لیے علاقے کے معززین کو ذمے داری سونپی جاتی تھی کہ وہ اپنی فورس بھرتی کریں اور تنخواہیں ادا کریں۔ برطانوی پارلیمان کے چارٹر کے تحت حکومتی محکمے کی حیثیت سے پولیس نظام کو باقاعدہ حیثیت ۱۸۲۹ء میں عطا ہوئی۔ اس تاریخ سے پہلے اگر سری ادب نامی کوئی صنف وجود رکھتی تھی تو اس کا کوئی دستاویزی ثبوت موجود نہیں۔ کیا یہ محض اتفاق ٹھہرا کہ سری ادب میں انسپکٹر کا کردار پہلی بار اس وقت متعارف ہوا جب پولیس کے محکمے میں انسپکٹر کا عہدہ متعارف ہوا۔

لہٰذا سری ادب ایک بڑی معاشرتی اور سماجی تبدیلی کے مشرق سے طلوع ہوا۔ سری ادب کی مقبولیت اور پولیس کے ایک باقاعدہ نظام کی ضرورت کے اسباب کم و بیش ایک ہی جیسے ہیں اور ان دونوں کا گہوارہ بھی۔ صنعتی انقلاب نے بہت کچھ بدل کے رکھ دیا تھا لیکن سماج کے بنیادی ڈھانچے یعنی خاندانی نظام کو صنعتی انقلاب سے ناقابلِ تلافی زک پہنچی۔ صدیوں بلکہ ہزارہا سال سے مستحکم ذرائع پیداوار پر استوار سماجی نظام تتر بتر ہو گیا۔ صنعتی انقلاب نے کھیت کے اطراف صدیوں سے آباد لوگوں کو بہتر زندگی کی تلاش میں صنعتوں کے اطراف آباد بستیوں کی طرف کھینچ لیا جہاں ایک نئی بود و باش ان کی منتظر تھی۔

اس منتقلی کے ضمنی المیوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھیے اور مضمرات پر غور کیجیے اور ان مضمرات کے جملۂ ہائے اصناف ادب پر جو اثرات پڑے ان پر نظر کیجیے۔ شہری زندگی کی بود و باش میں سے ایک عنصر تھا خواتین کی تنہائی اور فراغت۔ جوائنٹ فیملی کی جگہ میاں بیوی یونٹ نے لے لی تھی جہاں شوہر منہ اندھیرے فیکٹری کو روانہ ہو جاتا تھا اور طویل وقت کاٹنے کی ضرورت نے ناول کی طلب کو جنم دیا۔ طوالت سے دامن بچاتے ہوئے آگے بڑھیں تو بس یہ جان لیجیے کہ یہی مطالعے کے دور کا، ناول ہی کا سہی، نقطۂ آغاز تھا۔ معاشرے کے ڈیموگرافکس کی تبدیلی نے خواتین کا وہ طبقہ پیدا کر دیا تھا جس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ پامیلا اسی دور کا ناول تھا اور رابن سن کروسو بھی۔

اٹھارویں صدی کے وسط کی دنیا ایسی ہی تھی۔ شہری زندگی کے مسائل اور جوائنٹ فیملی نظام کے گاؤں میں رہ گیا تھا۔ شہروں میں یہ سہولت میسر نہ تھی۔ سماجی تحفظ کا یہ قدرتی نظام شہروں میں دستیاب نہ تھا۔ غنڈے موالی، لٹیرے کہاں نہیں ہوتے لیکن فاقہ کشی، بیروزگاری، اور ان علتوں سے پیدا ہوئے نفسیاتی مسائل نے صنعتی شہروں میں جرائم کا طومار باندھ دیا۔ حالات سے تنگ آ کر یا آسان روزی کی تلاش نے عام لوگوں کو جرائم کی طرف راغب ہو گئے۔ جرائم کے قصے اخبارات میں شائع ہونے لگے۔

بظاہر یہ قصے بسلسلہ عبرت شائع کیے جاتے تھے۔ ایک یا دو جیل گزٹ بھی شائع کیے گئے۔ ان میں بھی سزا یافتہ مجرموں کی آپ

بیتیاں اور قصے چھاپے جاتے تا کہ دیگر کو عبرت ہو اور جو اس راہ پر چلنے کی سوچ رہے ہوں وہ ''برائی کے برے انجام'' کو دیکھتے ہوئے باز رہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مقصد کسی حد تک حاصل بھی ہوا ہو لیکن پھر وہ کچھ ہوا جس نے ادب میں ایک نئی صنف سری ادب کی طرح ڈالی۔ لوگوں نے ان قصوں کو دل چسپی سے پڑھنا شروع کیا اور ان اخبارات کی فروخت کئی گنا بڑھ گئی جو جرائم کی رپورٹنگ کیا کرتے تھے۔ لوگوں میں جرائم کے نت نئے واقعات پڑھنے کی طلب بڑھی لیکن ظاہر ہے کہ ایسے واقعات لاتعداد تو تھے نہیں۔ نتیجتاً اخبار والوں نے قارئین کی تفریحِ طبع کے لیے فرضی قصے گھڑ کر چھاپنا شروع کر دیے۔ فرضی قصوں میں مرچ مسالہ حقیقی قصوں کی نسبت کہیں زیادہ ہوا کرتا تھا اس لیے وہ اور زیادہ پسند کیے جانے لگے۔ کاروباری مفاد اس نئے ذوق پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

یہ کرائم فکشن کی ابتدائی شکل تھی۔ جرم کی کہانیاں۔ وہ کرائم فکشن جو مسٹری فکشن، ڈٹیکٹیو فکشن، اسپائی فکشن اور انویسٹگیٹیو فکشن کی ماں تھا۔ جرم کی کہانیوں سے جرم و سزا تک پہنچتے نصف صدی لگی۔ یعنی انیسویں صدی کی چوتھائی دہائی میں ایڈگر ایلن پو کی جرم و سزا کے ژونرا پر استوار پہلی کہانی The Murder in the Rue Morgue منظر عام پر آئی جس کو آج تک سری ادب کی اولین کہانی ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مشہور ہے کہ اس کا مرکزی خیال اس خاتون کی ایک کہانی سے ماخوذ تھا جن کے گھر میں وہ کم عمری میں کچھ عرصے شاید ملازمت کرتا رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہو لیکن ایڈگر ایلن پو کو بلا شرکتِ غیرے ''سری کہانی کا باپ'' تسلیم کیا جاتا ہے۔

لیکن فطرتِ انسانی کا وہ کون سا ''شور'' تھا جس کی تسکین کا سامان سری افسانے کے پُرشور رِدھم سے ہونے لگا تھا۔ اس شور کا نام تھا تجسس۔ یہ تجسس ہی تو تھا جو جیل گزٹ میں چھپنے والی جرم بیتیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا۔ ذرا دیکھیں تو سہی فلاں کیوں اس حال کو پہنچا۔ ذرا جانیں تو سہی فلاں نے فلاں جرم کیوں کیا۔ ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ کہانیاں عام لوگوں کی کہانیاں تھیں۔ جن کی زندگی ویسی ہی تھی جیسی ان کہانیوں کو پسند کرنے والوں کی۔ یہ ایک بڑی تبدیلی تھی جس کا آغاز ڈینیل ڈیفو کے ناول رابن سن کروسو سے ہو چکا تھا۔ رابن سن کروسو ۱۷۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ رابن سن کروسو کی اصل اہمیت اس کی کردار نگاری تھی۔ یہ ایک عام تاجر اور سیاح کی کہانی تھی نا کہ کسی دیوتا، اوتار، شاہ زادے یا طبقہ امرا کے فرد کی۔ سیموئیل رچرڈسن کے ناول ''پامیلا'' جو ۱۷۴۰ء میں شائع ہوا کی وجۂ شہرت و مقبولیت بھی یہی بیان کی جاتی ہے کہ وہ کسی شاہ زادی کی نہیں بلکہ ایک نوکرانی کی کہانی تھی۔

اسے ادب کے سلطانئ جمہور کے آتے زمانے سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جرم و سزا کی کہانیاں اس سے ایک قدم زیادہ جمہوری یا عوامی تھیں۔ وہ اس طرح کہ عام طور پر وہی لوگ جرم کرتے پکڑے جاتے تھے جو معاشرے کے پسماندہ ترین طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ایسوں کی ہی داستانیں جیل گزٹ یا اخباروں کے ذریعے سامنے آیا کرتی تھیں۔ بااثر مجرم دے دلا کر چھوٹ جاتے تھے۔ اور اگر کبھی انھیں سزا ہو جاتی تھی تو جیل حکام اور دیگر پر پیسا لٹا کر اپنی داستاں چھپنے نہیں دیا کرتے تھے۔ لہٰذا پڑھنے والوں کو مجرم کی کہانی میں اپنا اور اپنی تلخ زندگی کا عکس نظر آنے لگا تھا۔ اور یہی عکس سری ادب کی مقبولیت کا سبب ٹھہرا۔ بعد ازاں نئی جہتیں کھلتی گئیں اور پھر ایڈگر ایلن پو نے جرم کی اس کہانی میں تفتیش کا عنصر شامل کر کے پڑھنے والوں کے لیے نئے آسمان کھول دیے۔ نہ صرف پڑھنے والوں کے لیے بلکہ لکھنے والوں کے لیے بھی۔

ایڈگر ایلن پو کے بعد کئیوں نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن پو سے آرتھر کونن ڈائل تک اگلے پچاس برس کے دوران کوئی

نام پڑھنے والوں کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کروا سکا۔ سری ادب کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ بہت سے عالیانِ ادب بشمول وکی کولنز، جوزف کونراڈ یہاں تک کہ چارلس ڈکنز نے بھی *The Mystery of Edwin Drood* جیسی مرڈر مسٹری لکھ چھوڑی گو کہ موت نے مہلت نہ دی کہ وہ یہ ناول مکمل کر سکے۔ بالآخر ڈائل نے شرلاک ہومز کے قصے لکھ کر پو کے کام کو آگے بڑھایا۔ ڈائل کا ہومز کم وبیش ہر زاویئے سے پو کے ڈیوپن کا پرتو نظر آتا ہے۔ جھلک تو ابن صفی کے فریدی میں بھی شرلاک کی نظر آتی ہے لیکن فریدی اور ہومز کے ادوار کے بیچ زمین کی گردش کو پیمانہ بنایا جائے تو پچاس ساٹھ برس کا فرق تھا۔ لیکن درحقیقت فریدی کا جہاں اور تھا ہومز کا جہاں اور۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ہومز کا جہاں پہلی جنگ عظیم کے دوران تحلیل ہو چکا تھا۔ البتہ برصغیر ہند تک یہ خبر کافی دیر سے پہنچی۔ نئی دنیا جیمز بانڈ کی دنیا تھی اور برصغیر میں علی عمران المعروف ایکسٹو کی۔

سری ادب میں یہ تبدیلی بین الاقوامی سیاسی منظر نامے کا عکس تھی۔ سراغ رساں اور تفتیش کار سے جاسوس اور اینٹی جاسوس تک سری ادب کا سفر پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے دوران متحارب ملکوں کے جاسوسوں کی سرگرمیوں، کارناموں، معرکہ آرا کامیابیوں اور گرفتاریوں کی خبروں کی تعداد اور ان خبروں میں عوام کی دل چسپی سے عبارت ہے۔ اس نئی دنیا میں سراغ رساں ہومز کی سرد کمروں میں آتشدان کے سامنے پائپ سلگاتے کی جانے والی زبانی تفتیش سے زیادہ سنسنی خیز اور دل چسپ جاسوس ایجنٹ جیمز بانڈ کا ایکشن تھا۔ لیکن جس وقت ابن صفی نے لکھنا شروع کیا اس وقت ہندوستانی قاری کا مزاج کرائم فکشن سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ اسپائی فکشن کی لہریں ساحل سے ابھی کچھ فاصلے پر تھیں۔ ابن صفی میدان میں اترے اس وقت تک صرف کرائم فکشن کے انگریزی تراجم ہی پر کام ہو رہا تھا۔ احمد حسین خان، تیرتھ رام فیروز پوری، فیروز الدین مراد، امتیاز علی تاجؔ اور دیگر ترجمہ نگار کرائم فکشن سے ہٹ کر مغرب کے اسپائی فکشن کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اردو اور ہندی میں سری ادب پر جتنا بھی مواد موجود تھا ان کا محور جرم وسزا کے انگریزی ادب سے مستعار قصے اور ناول تھے۔ لیکن ابن صفی وہ پہلے لکھاری تھے جنھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ سری ادب کا مستقبل اسپائی یا جاسوسی فکشن سے وابستہ ہے۔ یعنی پڑھنے والوں کی دل چسپی کا محور بلا شرکت غیرے کرائم یعنی جرم وسزا فکشن نہیں رہنے والا۔ جاسوسی یا اسپائی فکشن تیزی کے ساتھ اپنی جگہ بنا رہا ہے۔ اس تبدیلی کا جواب ابنِ صفی نے اپنا پہلا ناول لکھنے کے تین سال بعد عمران سیریز کی صورت میں دیا۔

ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا اولین ناول جولائی ۱۹۵۲ء میں الہٰ آباد سے شائع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے کردار انسپکٹر فریدی اور سرجنٹ حمید شہرت ومقبولیت کی بلندیوں کو پہنچ گئے۔ پڑھنے کے شوقین طبقے نے ان ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کسی ماہانہ رسالے کی طرح ہر ماہ باقاعدگی سے مقررہ تاریخ کو بک اسٹالوں پر آجانے والے جاسوسی دنیا کے ناولوں کی تعداد سات تک پہنچی تو ناشر کے لیے بھی ممکن نہ رہا کہ ناول کی اشاعت میں تاخیر ہو جائے۔

ابنِ صفی کیونکر دیکھتے ہی دیکھتے شہرت ومقبولیت کی بلندیوں کو پہنچ گئے۔ آج ستر برس بعد پلٹ کر دیکھیں تو اس کی ایک سے زائد تاویلیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ا۔ ابن صفی نے جب لکھنا شروع کیا تو سری ادب میں طبع زادیت کا خانہ خالی تھا۔ گو کہ انگریزی کرائم فکشن کے تراجم کی بھرمار تھی لیکن گنتی کے چند ہی ترجمہ نگار ایسے تھے جن کی زبان اور بیان شستہ کہی جا سکتی تھی۔ پیش کش کا معیار بلا امتیاز نہایت ہی گھٹیا ہوا کرتا

تھا۔ کتابت، کاغذ، طباعت تینوں ہی ناول پر ''گھٹیا'' کا لیبل لگوانے میں ایک دوسرے سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ مترجمین کے اپنے علمی معیار اور پس منظر پر بھی سوالیہ نشان اٹھتے ہیں لیکن چلیے اس بحث میں نہیں پڑتے۔ بس یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیا کچھ تھا جو ابنِ صفی کو اوروں سے ممتاز کرتا تھا اور جو بعد میں آنے والوں کو بھی ابن صفی کے قد کاٹھ تک نہیں پہنچنے دیتا۔

ابن صفی سے قبل انھی ترجمہ شدہ انگریزی جاسوسی ناولوں کا چلن تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے کردار بھی انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔ کرداروں کے نام اور ماحول مقامی قالب میں ڈالنے کا رواج کم تھا۔ ابن صفی سے پچیس سال پہلے ظفر عمر نے البتہ نیلی کوٹھی اور اس سلسلے کے دو ناولوں میں انسپکٹر خان کا کردار متعارف کروایا تھا۔ یہ ناول ہاتھوں ہاتھ لیے گئے تھے اور کہتے ہیں اس کی آمدنی سے ظفر عمر صاحب نے ایک کوٹھی تعمیر کی تھی جس کا نام اپنے ناول کے نام پر نیلی کوٹھی ہی رکھا تھا۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں احمد حسین خان نے اپنے ناول ''شاہین چور'' میں پہلی بار انسپکٹر محمود کے کردار کو لاہور پولیس کے ایک سراغ رساں کے روپ میں پیش کیا تھا۔ قرائن سے پتا چلتا ہے کہ ہومز، پیری میسن، سائمن ٹمپلر، آرسین لیوپن کے کرداروں اور ماریس لیبلانک، وکٹر گن، پیٹر شینی کے تراجم نے جاسوسی ناولوں کے قارئین کا بڑا حلقہ پیدا کر دیا تھا اور ایک اچھے کاروباری کی طرح جس کا ادراک ادارۂ جاسوسی دنیا حسن منزل الٰہ آباد کے کرتا دھرتاؤں نے کر لیا تھا۔ عباس حسینی کو اس ادارے کے مالک تھے ان کے والد میکملن اینڈ کمپنی کے عہدیدار تھے اور یہ انھی کا مشورہ تھا کہ اردو میں جاسوسی ناولوں کا ایک باقاعدہ سلسلہ شروع کیا جائے۔ جہاں دیدہ لوگوں کی نظریں دور تک دیکھ لیتی ہیں۔ اسی طرح وہ لوگ بھی یہ دیکھ چکے تھے کہ جاسوسی ناولوں میں مقامی جاسوس کیریکٹرز کو متعارف کرنا ایک اچھا کاروباری فیصلہ ثابت ہوسکتا ہے۔ مقامی کرداروں کی اہمیت کیا ہوتی ہے اس بابت ایک ہندی فلم کا وہ سین یاد آتا ہے جب ایک نوجوان تین سال سے غیر ملکی پہلوانوں کو بلا کر دہلی میں ایک مقابلہ منعقد کرنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے لیکن ایک فیصد ٹکٹ بھی نہیں فروخت کر پاتا۔ اس موقع پر اس کا تجربہ کار باپ اسے بتاتا ہے کہ جس دن تم کسی مقامی فائٹر کو اس مقابلے میں اتارنے میں کامیاب ہو گئے یہ سارا پنڈال بھر جائے گا۔ ابن صفی نے بھی مقامی ''فائٹرز'' کو جاسوسی ناولوں میں متعارف کروایا اور قارئین کو اپنے ناولوں سے جوڑنے کا پہلا مرحلہ عبور کر لیا۔ دلیر مجرم اور اس کے بعد آنے والے ناولوں نے جو مقبولیت پائی وہ بے مثال تھی۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس لیے کہ اگر صرف یہی وجۂ مقبولیت ٹھہری تو ابن صفی کے بعد ان کی ڈگر پر چلنے والوں کو ویسی ہی کامیابی کیوں نہ حاصل ہوئی۔ لیکن ویسی ہی کامیابی تو دور کی بات، مقبولیت میں کوئی ان کی گرد کو بھی نہ چھو سکا۔ ایک یا ڈیڑھ برس بعد ہی اکرم الٰہ آبادی اپنے خان اور بالے کو میدان میں اتارا، مسعود جاوید نے اپنے مقامی ''پہلوان'' اتارے، اظہار اثر نے اپنے ہیرو متعارف کروائے۔ ان کے علاوہ بھی ان گنت مصنّفین نے سری ادب کی فضاؤں میں اڑان بھری لیکن ہوا انھیں اڑا لے گئی۔ مقصد کہنے کا یہ ہے کہ اگر صرف مقامی سراغ رساں ہونا ہی کامیابی کی ضمانت ہوتا تو اوروں کے کردار بھی اسی قدر مقامی تھے جتنے کہ احمد کمال فریدی اور ساجد حمید۔

۲۔ یہاں ہمیں ابن صفی کے ادبی مقام کا احساس ہونا شروع ہوتا ہے۔ دیکھیے ہر ایک کی عزت مقدم احترام لازم۔ لیکن جب آپ ابن صفی کے ہم عصر جاسوسی نگاروں کی تحریر کا مقابلہ ابن صفی کی تحریر سے کرتے ہیں تو واضح نظر آتا ہے کہ ابن صفی کے ہاں زبان کی شستگی، معاشرتی حفظِ مراتب، تہذیب و شائستگی دیگر کی نسبت کہیں بڑھ کے پائی جاتی ہے۔ یہ وہی احساس ہے جو آپ کو ایک وضع

دار، مہذب، شائستہ، بااخلاق انسان سے مل کر اور اس کی صحبت میں وقت گزار کر ہوتا ہے۔ آپ ابن صفی کے سارے ناول پڑھ ڈالیے لیکن تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے چھوٹتا نہ پایئے۔ ابن صفی کے ناول شستہ طنز و مزاح میں ڈوبے ہوئے ہیں لیکن کہیں آپ گاڑی کو پٹڑی سے اترتا نہ پائیں گے۔ رائج الوقت مزاح جس میں جنسی استعارے بھی شامل ہوا کرتے ہیں آپ کو اس طرح لطیف پیرائے میں پروئے ہوئے ملیں گے کہ پنہاں پیغام آپ کے مزاج پر نہ تو گراں گزرے گا اور نہ ہی طبیعت کو مکدر ہوتا پائیں گے۔ ابن صفی کے کردار بلا کے فقرے باز لیکن ہلکا پن نام کو نہیں۔ یہ لطافت آپ کو صرف یوسفؔی کے ہاں ملتی ہے یا شاعری میں جونؔ کے ہاں۔ (عقیدت کے الزام کی امان پاؤں تو کہہ گزروں کہ ابن صفی کے پائے کا مزاح نگار آج تک نہیں گزرا)۔ سری ادب میں پیرائے کی یہ لطافت نہ ابن صفی سے پہلے نہ ابن صفی کے معاصرین میں اور نہ ابن صفی کے بعد کسی کے ہاں ملتی ہے۔ جاسوسی ناول نگاری سے ہٹ کر بھی دیکھئے تو بڑے بڑے مسافر اور کمیٹنڈ ''مزاقیے'' بھی غڑاپ شڑاپ پھکڑ پن اور چھچھور پن کی کیچڑ میں پھسلتے نظر آتے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی ایک مثال دکھا دیجیے جہاں ابن صفی کے پاؤں پر ایسی کوئی چھینٹ بھی آئی ہو۔ دو سو پینتالیس ناول لکھنا اور یوں صاف بچ نکل آنا از خود دلیل ہے کہ لکھنے والے کی کاٹھی کتنی مضبوط ہے۔ لیکن یہ کاٹھی ہے کیا۔

۳۔ یہ ابن صفی کی وہ تیسری صفت ہے جو نایاب ہی نہیں شاید اب عنقا بھی۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ کتنے فکشن رائٹرز نے طلسم ہوش ربا پڑھ رکھی ہے۔ کتنے ہیں جو میاں آزاد کی ہوشیاری اور خوجی میاں کی قرولی کے امین ہیں۔ کتنے ہیں جو رائیڈر ہیگرڈ کے ناولوں کو روح میں اتار چکے ہیں۔ کتنے فکشن رائٹرز ہیں جو لکھنے سے پہلے باقاعدہ تحقیق کیا کرتے تھے۔ کیا کوئی گنوا سکتا ہے کہ کتنے جاسوسی ناول نگار گزرے ہیں جو صاحبِ دیوان اور افسانہ نگار بھی رہے۔ آخری کے سوا باقی سوالوں کا جواب ہے کہ شاید کوئی نہیں۔ آخری سوال کے پہلے حصے کا جواب ہے کہ صرف اور صرف ابن صفی۔ اور دوسرے حصے کا جواب ہے ابن صفی اور اشتیاق احمد۔ اور یہ کوئی عجب اتفاق نہیں کہ سری ادب میں یہی دو نام ہیں جنھوں نے شہرتِ دوام حاصل کی اور مقبولیت کی انتہا کو پہنچے۔ ابن صفی اور اشتیاق احمد دونوں ہی اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار تھے۔ دونوں ہی افسانہ نگاری سے سری ادب کی طرف آئے۔ کیا ہم ان ''جملہ ہائے اتفاقات'' سے یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سری ادب میں معراج پانے کے لیے افسانہ نگاری ''کھل جا سم سم'' جیسا کوئی منتر ہے۔ لیکن افسانہ نگاری میں ایسا کیا ہے کہ جب وہ جاسوسی کہانی میں در آتی ہے تو اسے نفاست اور لطافت عطا کر دیتی ہے۔ شاید بات صرف اتنی سی ہے کہ شعر و سخن اور ذوقِ افسانہ نگاری لکھاری کی تحریر کے پیرائے کو دلکشی اور لطافت عطا کر دیتی ہے۔ ابنِ صفی افسانہ نگار تھے اور شاعر بھی۔ لفظوں سے تصویر کشید کرنا بھی جانتے تھے اور افسانے میں زمانے کو پرونا بھی۔ یہی سبب ہے کہ ابن صفی کی تحریر اور بالخصوص ناول کو پڑھنے والا پلاٹ کے سسپنس و سنسنی کے ساتھ واقعاتی سجاوٹ اور بیانیے کی تام جھام سے بھی اسی طرح لطف اندوز ہوتا ہے۔ جرم و سزا کے بوجھل اور افسردہ کرنے والے ماحول کے بیچوں بیچ ''جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم۔'' ابنِ صفی کی حسِ مزاح اور ان کی شستہ مگر نشتر خیز فقرے بازی، بیانیے کی ادبی چاشنی اور مصورانہ منظر کشی پڑھنے والے کو یہ بھلا دیتی ہے کہ وہ جاسوسی ناول سے لطف اندوز ہو رہا ہے یا کسی افسانوی شہ پارے سے۔ ابن صفی کو ابن صفی بنانے میں قاری کی اس کیفیت کا مرکزی کردار ہے۔

۴۔ اب آیئے ایک اور خاصیت کی طرف۔ ابن صفی لکھنے سے پہلے مکمل ہوم ورک کیا کرتے تھے۔ جب وہ کوئی بڑا ناول لکھنے کا

ارادہ کرتے تھے بالخصوص اس وقت جہاں ان کو اپنے کرداروں کو کسی غیر ملک بھیجنا ہوتا تھا تو اس سے پہلے ان کی میز پر نشان زدہ نقشوں اور انگریزی رسائل کا انبار ہوا کرتا تھا۔ ان کی پہنچ وہاں تک تھی جہاں کسی کا گماں بھی نہ پہنچ پایا۔ ان کی معلومات کہاں تک تھیں اس کا ادراک آج بھی چند ہی کو ہے۔ آج سے ستر برس پرانی دنیا کا تصور کیجیے جب نہ گوگل تھا اور نہ وکی پیڈیا۔ معلومات کا ایک ہی ماخذ تھا۔ لائبریریاں اور بیرونی رسائل جن تک رسائی ایسی آسان نہ تھی۔ لائبریریوں تک جانا پڑتا تھا۔ مطلوبہ معلومات ایک کلک پر نہیں بڑی جھک جھک کے بعد مہیا ہو پاتی تھیں۔ پاپولر سائنس، نیشنل جیوگرافک، اور اسپورٹس یا سامانِ جنگ کے رسائل تو بے شمار مل جایا کرتے تھے لیکن بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کی بابت معلومات عام دستیاب نہ تھیں اور ان تک پہنچنا ناممکن نہیں تو بیحد مشکل ضرور تھا اور سہل پسندوں کے بس کا روگ تو ہرگز نہ تھا۔ ایسی معلومات تک اگر کوئی پہنچ جائے تو اسے معمولی آئی کیو کا آدمی بھی ہرگز سمجھا نہیں جانا چاہیئے۔ بہتیروں کا اس کا علم ہی نہیں کہ عمران سیریز کی ایکسٹو نامی تنظیم ایک حقیقی تنظیم تھی جو امریکی جاسوسی ادارے ''او۔ ایس۔ ایس'' کی ایک ذیلی تنظیم تھی۔ ''او۔ایس۔ ایس'' یوں جانیے سی آئی اے کا ابتدائی ورژن تھا۔ آج آپ گوگل پر ایکس ٹو لکھیں تو پوری تفصیل سامنے آ جاتی ہے لیکن سنہ ۱۹۵۴ء میں اس شخص کو داد دیجیے جس نے یہ ایکس ٹو کا حدود اربعہ کھود نکالا۔ اور سر دھنیے کہ حقیقی دنیا کی ایکسٹو تنظیم کا دائرہ کار بھی وہی تھا جو عمران سیریز میں ایکسٹو کا تھا یعنی کاؤنٹر انٹیلیجنس۔ دیگر ممالک کے جاسوسوں کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا۔ اب اگر کسی کو گلہ ہے کہ ابن صفی نمبر ون کیونکر تو بتا دیجیے کہ کیا کوئی اور تھا جو اس قدر عمیق ریسرچ کا قائل تھا۔ یہ امتیاز ابن صفی ہی کو حاصل تھا کہ انھوں نے اپنے ناولوں میں جاسوسی کے ریاستی محکمے کو متعارف کروانے سے پہلے اس کے بارے مکمل معلومات بہم پہنچائیں۔ پھر کس میں دم تھا جو ابن صفی کو امر ہونے سے روک پاتا۔

۵۔ ابن صفی اگر زمانہ شناس نہ ہوتے تو شاید جاسوسی دنیا سے آگے نہ سوچ پاتے۔ ابن صفی وقت کی نبض کو سوچ کے دھاگے سے پڑھنے کا ہنر نہ رکھتے تو شاید عمران سیریز لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کر پاتے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جاسوسی دنیا کی فقید المثال کامیابی کے باوجود انھوں نے بس یونہی ایک نئی سیریز کی بنیاد رکھ دی تو شاید آپ نے ابن صفی کے مقام کو صحیح طور سے پہچانا نہیں۔ دراصل جاسوسی دنیا کا آغاز اس وقت ہوا جب سری ادب کا مرکز سراغ رسانی اور جرم وسزا سے ہٹ کر جاسوسی کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ ہومز کے ماڈل پر استوار فریدی کی مہارت کا محور جرم وسزا تھا اور فریدی نے اپنے ''ناولی'' کیریئر کا آغاز بطور سراغ رساں کیا تھا۔ کوئی شک نہیں کہ مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ لیکن فریدی کا خالق آگے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ جرم وسزا کی خبریں اخبارات کے صفحہ اول پر جنگی کارروائیوں اور جاسوسوں کی سرگرمیوں کے لیے جگہ خالی کر کے اندرونی صفحات پر منتقل ہو رہی ہیں۔ سری ادب کے لیے اس میں یہ پیغام پنہاں تھا کہ لوگ اب جرم وسزا سے زیادہ جاسوسی فکشن پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہ احساس کہ جرم وسزا پر مبنی جاسوسی دنیا کے علاوہ ''جاسوسی'' پر مبنی متبادل بھی ہونا چاہیئے ابنِ صفی کو روزِ اول سے ہی تھا لیکن شاید پاکستان الٰہ آباد سے کراچی منتقلی کے بعد اس کی شدت میں اضافہ ہو چلا تھا۔ آگے چل کر فریدی بھی محکمہ سراغ رسانی کے دائرہ کار سے باہر نکل کر غیر ملکی جاسوسوں سے نبرد آزما ہوتا نظر آتا ہے۔ ابن صفی کے عہد کے سری ادیب بشمول ابن صفی تا دیر اس فرق کو سمجھ نہ پائے کہ سراغ رسانی اور جاسوسی کا دائرہ کار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

ابنِ صفی کی عمران سیریز:

فریدی اور عمران کے درمیان ہمیں ابن صفی کے ایک ''ادھ پکے'' یا ہاف ککڈ تجربے کا پتا بھی ملتا ہے۔ فریدی کی شخصیت اور تراش خراش اور جو دیوتائی ہالہ ابن صفی نے فریدی کے گرد بن دیا تھا اس کو نبھاتے ان کا اپنا دم پھول جاتا تھا۔ اس کا اظہار ابن صفی نے بھی ذرا مختلف الفاظ میں کیا ہے۔ پھر یہ احساس بھی کہ فریدی جیسا رہن سہن گو کہ عام لوگ اپنانے کا خواب تو دیکھتے تھے لیکن یہ طرزِ زندگی خود ہی مائل بہ متروکیت تھا لہٰذا ایک ایسے کردار کی ضرورت ابن صفی نے محسوس کر لی تھی جس سے ان کے مڈل کلاس قارئین خود کو relate کر سکیں۔ انور اور رشیدہ کو متعارف کیا جانا ان دونوں خلاؤں کو پر کرنے کے واسطے تھا۔ جاسوسی دنیا کے بارہ تیرہ ناول لکھ کر ابن صفی نے انور رشیدہ سلسلے کو دراز کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اوپر تلے چار پانچ ناول ''انور سیریز'' کے آئے لیکن قارئین کے اصرار نے مصنف کو فریدی کی طرف واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انور رشیدہ بعد بھی وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے لیکن فریدی کے مددگار کے طور پر۔ تین سال بعد ابن صفی نے انور کے کردار کو مزید نکھار کر مزید بہتر کردار نگاری اور اسٹوری لائن کے ساتھ عمران کی صورت میں اس کامیابی سے پیش کیا کہ آج بھی لوگ ابن صفی کو عمران سیریز کے عنوان سے زیادہ یاد رکھے ہوئے ہیں جاسوسی دنیا سے کم۔ فریدی کی کوٹھی کے برعکس عمران کا فلیٹ عوام کے دل کے علاوہ طرز رہائش سے بھی قریب تھا۔

ابنِ صفی کا مطالعہ، مشاہدہ، سوجھ بوجھ، سیاسی وسماجی تبدیلیوں پر نظر اور لکھنے کے لیے ان کی ریسرچ، ایسی خاصیتیں نہیں تھیں جو عام ہوتیں۔ بطور شاعر اور افسانہ نگار اور بالخصوص بطور طنز نگار، سیٹائر نگار مناسب ترین لفظ ہے، ان کی حساسیت کا جب حادثاتی طور پر جاسوسی فکشن نگاری سے فیوژن ہوا تو وہ ابنِ صفی سامنے آیا جس کے نام کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل نہیں ہوتی۔ افسانہ نگاری سے جاسوسی ناول نگاری کی دوسری اور تادمِ تحریر آخری مثال بس ایک اشتیاق احمد ہی کی ملتی ہے۔ ابنِ صفی روزِ اول سے نہیں تو روز دوئم ہی اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ فریدی کی دنیا سکڑ رہی ہے اور دنیا کو ضرورت ہے تو ایک ایسے کردار کی جو پھیلتی ہوئی عوامی بود و باش کی لہروں اور تھپیڑوں کو روز شکست دے کر بھی اپنی وضع داری اور سچائی قائم رکھے۔ اس کردار کی تلاش و تخلیق میں ابن صفی کو دو سال لگے۔ غور کیجیے تو انور دراصل ایک عمران کا ایک تجرباتی خاکہ ہے۔ انور میں عمران جھلکتا ہے لیکن بس جھلکتا ہی ہے۔ عمران کی مانند تنہا اور بے گھر، ابتدا کا عمران بھی انور جیسا ہی بیرحم۔ روشی کو ٹانگ اڑا کر منہ کے بل گرا دینے والے عمران اور رشیدہ کے بال پکڑ کر منہ پر تھپڑ مارنے والے انور میں ایک دوسرے کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ پولیس افسروں کو بلیک میل کر کے موقع بہ موقع اشد ضرورت میں اپنے اخراجات کا انتظام کرنے والے کرائم رپورٹر انور اور جرائم پیشہ گروہوں میں بلیک میلر کے طور پر مشہور عمران۔ انسپکٹر فیاض سے اس کے غیر قانونی طور پر زیرِ قبضہ فلیٹ کی چابی لینے جو تگڑم لڑائی وہ بلیک میلنگ ہی کہلائے گی۔ ایک ہی خام مال کے دو برانڈ معلوم ہوتے ہیں جن میں سے ایک کو کمپنی نے ڈس کنٹنیو یا محدود کر کے اسی کا ایڈوانسڈ ورژن لانچ کر دیا ہو۔ روشی و عمران ایک طرف، رشیدہ و انور دوسری طرف۔ قصہ مختصر یہ کہ سنہ باون میں جاسوسی دنیا کی بعثت کے دو برس بعد عمران سیریز کا ظہور ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے جاسوسی دنیا کے خالق کی پہچان عمران سیریز بن گئی۔ آج بھی ابن صفی کا استعارہ عمران سیریز ہی ہے۔ شاید اس لیے کہ عمران کی کردار نگاری، رہن

سہن، بود و باش، میں ہر طبقے کے واسطے خود سے اپنی ذات سے ایسوسی ایٹ کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔لوگ فریدی میں بھی اپنی یا اپنی تشنہ وخوابیدہ تمناؤں کی شبیہہ تلاش کر لیتے تھے لیکن تک و دو زیادہ تھی۔فریدی کی زندگی ان کے لیے فینٹسی تھی ویسی ہی فینٹسی جیسی فیری ٹیلز کی شہزادیوں کے روپ میں کنواریوں کی ہوتی ہے۔لڑکیوں کے لیے فریدی خوابوں کا شہزادہ تھا۔لیکن کیا کیجیے کہ انھی لڑکیوں سے جب عمران کا سامنا ہوا تو وہ انھیں اپنے کلاس فیلو، اپنے ہمجولی جیسا لگا۔فریدی جیسا بھی تھا پہنچ سے دور تھا۔عمران جیسا بھی تھا اس سے ہمکلام ہوا جا سکتا تھا اور اس کے سر پر دھول بھی جمائی جا سکتی تھی۔

ابن صفی کا ابتدائی دور وہ تھا جب ایک نئی بود و باش ہمارے دروازوں پر دستک آزما تھی۔ یہ شہروں کی زندگی کے پھیلاوے اور صنعتی معیشت کے صلے میں سوسائٹی پر فرد کے انحصار کے انہدام کا دور تھا۔ یہ تبدیلی پوری صنعتی دنیا میں پرانے سماج کے سروں پر ناچ رہی تھی۔ ذرائع پیداوار اور آمدنی کے ذرائع فرد کے لیے کھل چکے تھے لیکن روایات کا تقاضا تھا کہ بندھے رہو، جو بزرگ کہتے ہیں کان دبا کر کیے جاؤ۔سوچیے پوری نسل کس روح فرسا تضاد سے دوچار تھی۔ دل کچھ کہتا تھا ابا میاں کچھ۔ایسے میں ایک ایسے کردار کی آمد جو ایسوں کے دل کی آواز نہ بنا ہوگا۔ اچھا تو نہیں معلوم ہوتا کہ یہاں ناول کا کوئی حصہ نقل کیا جائے لیکن عمران کیوں مقبولِ عام ہوا یہ سمجھنا مشکل ہوگا اگر ڈاکٹر دعا گو کا ابتدائیہ نہ پڑھ لیا جائے:

> لوگ اکثر سوچتے ہیں عمران کی شخصیت اس قدر غیر متوازن کیوں ہے۔وہ ہر معاملے کو ہنسی میں کیوں اڑا دیتا ہے۔والدین کا احترام اس طرح کیوں نہیں کرتا جیسا کرنا چاہیے۔اس کے پیچھے ایک طویل داستان ہے۔ماں اسے نماز روزے سے لگا دینا چاہتی تھی باپ نے ایک امریکی مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔باپ سخت گیر آدمی تھے۔ اپنے آگے کسی کی نہ چلنے دیتے۔جب تک گھر میں رہتے سناٹا چھایا رہتا۔لوگ اتنی آہستگی سے گفتگو کرتے کہ قریب ہی سے سنی جا سکتی۔تو عمران بچپن ہی سے دہری زندگی گزارنے کا عادی ہوتا گیا۔باہر کچھ ہوتا گھر میں کچھ۔ رحمان صاحب جیسے جیسے ترقی کرتے گئے سخت گیری بھی بڑھتی گئی۔آئی ایس ایس کرنے کے بعد لندن کے لیے رختِ سفر بندھ گیا۔ وہاں رحمان صاحب کے ایک انگریز دوست کے ہاں قیام ہوا۔ ان پابندیوں سے نجات ملی جن میں اب تک گزری تھی۔بس پھر کیا تھا کھل کھیلا۔شاید ہی کوئی خانہ چھوڑا گیا ہو۔انگریز میزبان پولیس افسر تھا۔اکثر کہتا تم بھی تو محکمہ سراغ رسانی کے آفیسر کی اولاد ہو، کچھ نہ کچھ جراثیم ورثے میں ملے ہی ہوں گے، کرمنالوجی کا بھی مطالعہ کرو۔ اکثر عملی مشق کے لیے ایک آدھ کیس بھی لا دیتے۔اس چکر میں پڑنے کے بعد ہر قسم کے آدمیوں سے ٹکراؤ ہوا اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔وقت کافی تھا۔ بہرحال وہ لندن سے سو فیصدی ''ناکارہ'' بن کر واپس آیا۔ رحمان صاحب کو علم ہی نہیں تھا کہ صاحبزادے سائنس کے ڈاکٹر ہونے کے علاوہ کرمنالوجی کے بھی ماہر بن کر

تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے اسے یونی ورسٹی میں بھڑانا چاہا۔لیکن عمران نے صاف انکار کر دیا۔
کہنے لگا لڑکے پڑھالوں گا بوڑھے مجھ سے نہیں پڑھائے جائیں گے۔رحمان صاحب کوتوقع نہیں تھی
کہ وہ اس بے تکلفانہ انداز میں نافرمانی کرے گا۔ بہت بھنائے، گرجے برسے بھی۔لیکن وہ تو
یوروپین اسٹائل کا قلندر بن کر واپس آیا تھا، ذرہ برابر پروانہ کی۔

فریدی کی اولڈ کلفٹن والی کوٹھی سے واپس کلفٹن برج کی طرف آیئے تو میوزیکل فاؤنٹین سے تین راستے نکلتے ہیں۔ایک وکٹوریہ روڈ کو، دوسرا آرٹس کونسل اور تیسرا گورنر ہاؤس کو جاتا ہے۔آرٹس کونسل سے ایک راستہ برنس روڈ نکلتا ہے اور اسی برنس روڈ پر جہاں فوڈ اسٹریٹ شروع ہوتی ہے کے کونے والی بلڈنگ کی دوسری منزل والا فلیٹ عمران کا ہے جہاں وہ سلیمان اور جوزف کے ساتھ رہائش پذیر تھا اور جس کی پہلی منزل پر مس پھٹا کیہ رہتی تھی۔ادھیڑ عمری کی دہلیز پار کرتی وہی مس پھٹا کیہ جس نے ایک بار عمران ہی کے ''چھیڑنے'' پر اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔ اسی پرانی بلڈنگ کے عین نیچے سیڑھیوں کے عین سامنے عمران کی ٹو سیٹر کھڑی رہا کرتی ہے۔ پرانی یوں کہ پارٹیشن کے بعد اس کے اصل رہائشی ہندوستان ہجرت کر گئے تھے اور ایسی بہتیری متروک عمارتوں پر بااثر لوگوں نے قبضے جما لیے تھے۔لیکن عمران کا یہ اصل فلیٹ اس کا اصل گھر نہ تھا۔ اس کا اصل گھر تھا گارڈن ویسٹ کی وہ کوٹھی جو عمران کے والد رحمان صاحب کی ملکیت تھا۔ دو گھر چھوڑ کے چھبیس سالہ زیڈ اے بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو کی کوٹھی تھی۔ رحمان صاحب کا طرزِ زندگی ویسا ہی ''نوابی'' تھا جیسا اس زمانے میں افسرانِ شاہی کا ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ نے پرانی پاکستانی فلمیں چھوٹے نواب، ارمان، دوراہا اور جب جب پھول کھلے دیکھی ہوں تو نوابی کا تھوڑا بہت اندازہ تو آپ کو ضرور ہو گا۔ یوں تو فریدی اور عمران دونوں ہی کا پسِ منظر ایلیٹ طبقے سے تھا اور دونوں ہی لندن کے بہترین علمی مراکز سے فارغ التحصیل تھے لیکن فریدی کا انداز ارسٹوکریٹک اور عمران کا عوامی تھا۔فریدی کے اطوار میں رکھ رکھاؤ،عمران کے انداز میں ایک یارانہ تھا۔فریدی کی زبان شستہ اور حفظ مراتب سے آراستہ،عمران کا لب ولہجہ زمان ومکاں کا مکیں۔ فریدی اصولوں کا پابند، عمران کام نکالنے کا چیمپیئن، البتہ کہیں نفاست سے پیراستہ اور کہیں عامیانہ پن سے ماخوذ۔ فریدی کی بے تکلفی کی حد حمید پر ختم۔عمران کا سلیمان، جوزف، صفدر، جولیا، سر سلطان میں ہر ایک سے بات کرنے کا علاحدہ سلیقہ یا بد سلیقگی۔فریدی کے جملے ''حمید کے بچے! دماغ کی چولیں پھر ڈھیلی ہوئیں'' سے عمران کی با آواز بلند ''ابے او سلیمان کے بچے'' کے مابین دونوں کا ایک جیسا ایلیٹ خاندانی پسِ منظر ہونے کے باوجود لہجے کا فرق۔کیا یہ فرق کراچی کی معاشرت میں ''سڑک چھاپ ازم'' کے در آنے کا مظہر تھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد امریکا نے برطانیہ سے نہ صرف سمندروں پر حکمرانی کا حق اپنے نام لکھوا لیا تھا بلکہ دنیا تیزی سے امریکی بود وباش اور انداز، لباس اور قلندرانہ پن کی جانب جھکتی چلی جارہی تھی۔ پاکستان میں یہ عنصر ہندوستان کی نسبت تیزی سے اپر اور مڈل کلاس پر چھا رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ امریکی فلموں کا سیلاب تھا جو بوجہ ہندوستان میں داخل نہ ہو سکا تھا۔کرنل فریدی کے برطانوی الیٹ جیسے رہن سہن اور کیپٹن حمید کے شرلاک جیسے برطانوی تمباکو والے پائپ کی نسبت عمران کی امریکی انداز کی چیونگم جگالی نئی نسل کو زیادہ اپیل کرتی تھی۔فریدی میں شرلاک ہومز کی جھلک نظر آتی ہے تو عمران میں سائمن ٹمپلر کی۔لیزلی چارٹرس کا سائمن ٹمپلر گو

کہ خود چیونگم سے شوق نہیں رکھتا لیکن اپنے انسپکٹر فیاض یعنی انسپکٹر کلاڈ اسٹیل کا موڈ راہِ راست پر لانے کے لیے حسبِ موقع اسے ضرور پیش کیا کرتا تھا۔

ابن صفی کے پاکستان آجانے کے بعد بھی فریدی کے ناولوں کے ماحول پر ہندوستان چھایا رہا۔شہروں کے ناموں میں کلکتہ اور مدراس کا تذکرہ ملتا رہا۔لیکن عمران کے ناول خالصتاً پاکستانی بلکہ کراچی کے ماحول میں رچے بسے تھے۔عمران سیریز میں آپ کو نارتھ ناظم آباد بحوالہ ساؤتھ کاظم آباد بھی نظر آتا ہے اور بندرگاہ کے قرب میں جیکسن کا علاقہ بھی۔ بیچ لگژری ہوٹل بعنوان بیچ ہوٹل اور بیچ ہوٹل روڈ اپنے اصل نام کے ساتھ۔گو کہ چڑیا گھر کے پچھواڑے لارنس روڈ کے سنگم پر اس میڈیکل اسٹور کو مٹے تو زمانہ بیتا جہاں تھریسیا مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر روپوش ہوئی تھی لیکن وہاں سے جب بھی گزریئے وہ منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جائے۔

لیکن اب کراچی کی سڑکوں پر بے فکری سے کار ڈرائیو کرتی جولیانا فٹزواٹر کہیں دکھائی نہیں دیتی۔فوجی وردی میں ملبوس سیاہ فام جوزف بھی عمران کے فلیٹ کی بالکنی میں مشروبِ مغرب سے خود ستائی کرتا نظر نہیں آتا۔فریدی کی دنیا کو تحلیل ہوئے تو کئی دہائیاں بیتیں اب تو لیکن عمران کا وہ کراچی بھی کہیں گم ہو گیا جس کے کینوس پر ابن صفی نے عمران سیریز کے رنگ بکھیرے تھے۔آج اگر آپ اولڈ کلفٹن پر فریدی کی کوٹھی کی یاترا کے لیے پہنچیں گے تو ۲، اولڈ کلفٹن کے مسمار شدہ پلاٹ پر آپ کو تختی نظر آئے گی کہ یہ جگہ ائرفورس کی ملکیت ہے۔جب آپ بے نیل ومرام وہاں سے برنس روڈ پر واقع اس عمارت کا رخ کریں گے جس کی دوسری منزل پر عمران کا فلیٹ ہوا کرتا تھا تو آپ کو اس ٹوٹی بالکنی کے پیچھے سیمنٹ کے بلاکوں سے چنے گئے دروازے کے سوا کچھ دکھائی نہ دے گا۔حالاں کہ دو گلی پرے شراب کی وہ دکان دوبارہ کھل چکی ہے جہاں چھ بوتلیں یومیہ فی ٹھرا ساڑھے نو سو کے حساب سے خریدی جا سکتی ہیں۔اس فلیٹ کا فرش ڈھے چکا ہے اور چھت بھی ندارد ہے۔بس لے دے کر ٹوٹی ہوئی دیواریں ہیں۔

رحمان صاحب کے گارڈن ویسٹ کے وسیع وعریض بنگلے کی جگہ ’’جدید سہولیات سے آراستہ‘‘ دو دو ڈربوں کے لگژری اپارٹمنٹس بن چکے ہیں۔

فریدی اور حمید،عمران، انور اور رشیدہ،صفدر اور بلیک زیرو، چوہان اور صدیقی، خاور اور سارجنٹ نیمو،ظفر الملک اور جمن عرف جیمسن سب زمانے کی نظر ہوئے۔

کچھ خوش گماں البتہ قائل ہیں کہ ان میں سے کوئی لندن تو کوئی جنیوا، کوئی دبئی اور کوئی ملایشیا میں ہے۔لیکن اولڈ کلفٹن کی کوٹھی، برنس روڈ کا فلیٹ اور گارڈن ویسٹ کا بنگلہ یہ سب دامِ خیال ہیں۔ایک طلسم تھا جو خوابوں میں تھا اور خیال جسے اڑائے لیے جاتے تھے۔ لیکن ہم اس کوٹھی، فلیٹ، اور بنگلے کو حقیقی ماننے پر مُصر ہیں۔

خرّم علی شفیق ❁

ابنِ صفی— اقبال سائنسز کی روشنی میں

ابنِ صفی کے بارے میں اب تک میری تین کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں، جو علامہ اقبال پر میری تحقیق کا تسلسل ہیں۔ اُن میں سے پہلی کتاب ''سائیکومینشن'' ۲۰۱۱ء کے اوائل میں شائع ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ ابنِ صفی پر پہلی مستقل کتاب تھی۔

اِس کتاب کا مقصد یہ تھا کہ ہم ابنِ صفی کو ''جاسوسی ناول نگار'' کے محدود زمرے سے نکال کر ''ناول نگار'' کے زمرے میں لائیں۔ اِس کتاب مِیں ابن صفی کے ناولوں سے چالیس ایسے اقتباسات پیش کیے گئے جن کا جاسوسی اور سراغرسانی سے کوئی تعلق نہیں ہے تاکہ قارئین کو کہیں بھی یہ احساس نہ ہونے پائے کہ وہ کسی ناول کے اقتباسات پڑھ رہے ہیں۔ اُس کی بجائے وہ یہی محسوس کریں کہ وہ مختصر افسانے پڑھ رہے ہیں لیکن ایسے افسانے جو ''مروّجہ ادبِ عالیہ'' کے برعکس اُمید کا پیغام دیتے ہیں۔ معاشرے کی برائیوں کا گہری نظر کے ساتھ تجزیہ کرنے کے باوجود مایوسی کو نہیں بلکہ عزم اور آرزو کو پروان چڑھاتے ہیں! پیش لفظ میں مَیں نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ ''کوئی بھی نقاد اِس مجموعے کو جاسوسی ادب ثابت نہیں کرسکتا بلکہ اِس سماجی تبصروں اور فکاہیہ ادب کے زُمرے ہی میں رکھنا پڑے گا۔''

مجموعے کے پہلے حصے، ''جمہور نامہ'' میں معاشرتی زندگی کے متعلق اقتباسات اور دوسرے حصے ''مزاح نامہ'' میں طنزیہ اور مزاحیہ اقتباسات پیش کیے گئے۔ ہر اقتباس سے پہلے مَیں نے اُس کے بارے میں ایک مفصل تعارفی نوٹ لکھا جس میں عام طور پر یہ دکھایا گیا کہ اُس اقتباس نے ابن صفی نے ہماری سماجی زندگی کے کسی پہلو کو جس نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے، وہ درحقیقت اُسی مکتبِ فکر کا نقطۂ نگاہ ہے جسے قائداعظم نے برصغیر کے مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ قرار دیا تھا، جس کے پیشرو سرسید احمد خاں تھے اور جسے ہم سیدھے سادے الفاظ میں علامہ کا مکتبِ فکر کہہ سکتے ہیں۔

اِس طرح مَیں یہ بات بھی سامنے لانا چاہتا تھا کہ سرسید، علی برادران، اقبال اور قائداعظم یا دوسرے الفاظ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے زندگی کے بارے میں جو نقطۂ پیش کیا تھا، وہ اُن بزرگوں کے بعد ہمارے معاشرے سے اُٹھ نہیں گیا۔ ۱۹۸۰ء میں اپنی وفات تک ابنِ صفی تقریباً ہر ماہ اُسی نقطۂ نگاہ سے معاشرتی زندگی کا تجزیہ پیش کرتے رہے تھے اور اِسے عوام کی بے پناہ حمایت بھی حاصل رہی تھی:

کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے؟
پھر چھلکنے لگے سبو، آؤ!

❁ ریسرچ کنسلٹنٹ، اقبال اکیڈمی، لاہور۔ برقی پتا: khurramsdesk@gmail.com

’’رانا پیلس‘‘ بھی بالکل اِسی انداز میں مرتب کیا گیا اور ۲۰۱۱ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ اِس کا مقصد ابنِ صفی کے ناولوں کے بعض جاسوسی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا تھا۔ مجموعے کے تین حصے تھے۔ ’’حیرت نامہ‘‘ میں تحیر کی کیفیت میں مبتلا کرنے والے اقتباسات، ’’کردارنامہ‘‘ میں وہ اقتباسات جن میں کوئی مستقل کردار پہلی دفعہ متعارف ہوا اور ’’سیاحت نامہ‘‘ میں ایسے اقتباسات پیش کیے گئے جن میں ابنِ صفی کے کردار کسی بیرونی ملک میں موجود ہوں۔

اِس مجموعے کے اقتباسات سے پہلے جو مفصل نوٹ تھے، اُن میں عام طور پر یہ دکھایا گیا کہ ابنِ صفی کے ناولوں کے یہ پہلو جو خالص جاسوسی نوعیت کے ہیں، ٹھوس علمی تحقیق کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ابنِ صفی کے کردار احمد کمال فریدی سے متعلق اقتباس کے تعارفی نوٹ میں مَیں نے واضح کیا ہے کہ یہ کردار لاشعوری یا شعوری طور پر قائداعظم محمد علی جناح کی شخصیت کا افسانوی رُوپ ہے اور ’’نہ صرف فریدی کے رکھ رکھاؤ میں نوجوان جناح کے ساتھ ایک گہری مماثلت ہے بلکہ اُس کا بنیادی اصول یعنی قانون کی حکمرانی بھی قائداعظم کے سیاسی فلسفے کی اساس ہے۔‘‘ جن ناولوں میں اُن کا مشہور کردار علی عمران اٹلی جاتا ہے، اُن میں سے ایک ناول کے اقتباس کے تعارفی نوٹ میں مَیں نے لکھا:

> اٹلی قدیم رومن تہذیب کا امین ہے، یہیں سے ۱۴۵۳ء کے بعد یورپ کی نشاۃ الثانیہ شروع ہوئی، پوپ کا گھر بھی یہیں ہونے کی وجہ سے اِسے عیسائی دنیا میں ایک خاص مقام بھی حاصل ہے اور یورپین یونین کا بانی بھی یہی ہے۔ اگر مشرق اور مغرب، یا عالمِ اِسلام اور مسیحی دنیا، پرانی رنجشوں کو بھُلا کر کسی نیک مقصد کے لیے اشتراکِ عمل کرنا چاہیں تو اُس کی ابتدا اٹلی ہی سے کیوں نہ ہو! البتہ ابن صفی کے یہاں اس سلسلے میں معذرت خواہانہ رویہ نہیں پایا جاتا بلکہ وہ اِس قسم کے اشتراکِ عمل میں اپنی اسلامی نظریاتی ریاست کو ایک مددگار کے طور پر ’’دینے والا ہاتھ‘‘ سمجھتے ہیں نہ کہ ’’لینے والا ہاتھ۔‘‘ اگلے ہی ناول میں عمران ایک اطالوی لڑکی سونیا کے ساتھ اٹلی کی برف پوش وادیوں میں دفن ایک تباہ کن حربے تک پہنچتا ہے جسے دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اٹلی کے حلیف نازی جرمنی کے جاسوسوں نے وہاں چھپایا تھا۔ سونیا اور عمران اِس بات پر متفق ہیں کہ حربے کو تباہ کر دیا جائے۔ موجودہ مغربی جرمنی کا جاسوس اُن کے پیچھے لگا ہوا ہے مگر جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے وہ حربہ تباہ کر دیا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ اُس کا مشن بھی یہی تھا کیوں کہ ’’مغربی جرمنی اب ساری دنیا میں امن چاہتا ہے اور غیر ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا خواہاں۔‘‘ چناں چہ دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابن صفی نے اٹلی ہی کو مرکز بنا کر عالمی امن میں یورپ کے ممکنہ کردار کا جائزہ لیا ہے اور اِس سلسلے میں مغربی جرمنی کا مثبت کردار بھی اُن کے ذہن کے افق پر اُبھرتا ہے۔

اِس سلسلے کا تیسرا اور آخری مجموعہ ''دانش منزل'' ۲۰۱۷ء میں شائع ہوا۔ یہ ابنِ صفی کی طویل داستانوں کا تعارف بھی ہے، اُن کے اقتباسات کا انتخاب بھی ہے اور اُس مثالی ریاست کو قائم کرنے کا نسخہ بھی ہے جسے علامہ اقبال نے مرغدین کا نام دیا تھا اور جس کے حصول کو ابنِ صفی نے اپنے پہلے ناول کے پیش لفظ میں اپنا اصل مقصد قرار دیا تھا۔ ''طویل داستان'' مَیں نے ابنِ صفی کی ہر ایسی کہانی کو قرار دیا ہے جو چار یا اس سے زیادہ شماروں پر مبنی تھی اور جس کے کُل صفحات کی تعداد پانچ سو کے قریب یا اُس سے زیادہ تھی۔ ایسی کہانیاں کُل نَو ہیں۔

اِسی مناسبت سے یہ مجموعہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر طویل داستان کے اقتباسات کا علاحدہ باب بنایا گیا ہے اور اُنھیں تاریخی ترتیب میں رکھا گیا ہے۔ اپنے تعارفی نوٹوں میں مَیں نے وہ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی واقعات بھی پیش کیے ہیں جن کے پس منظر میں یہ ناول تحریر کیے گئے تھے اور ابنِ صفی کے نظریۂ حیات کو واضح کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

ابن صفی کی کہانیوں میں مستقبل کے متعلق بھی بڑی درست پیشگوئیاں موجود ہیں اور مستقبل میں پیدا ہونے مسائل کے ایسے حل بھی پیش کیے گئے ہیں جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔ اِس کی مثالیں بھی مَیں نے اپنے تعارفی نوٹوں میں پیش کی ہیں۔

''دانش منزل'' کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اِس کے ابواب کے عنوانات علامہ اقبال کی ''مثنوی گلشنِ راز جدید'' میں پیش کیے ہوئے نو سوالات سے ماخوذ ہیں۔ میرے لحاظ سے ابنِ کی یہ نو داستانیں بالترتیب اُنہی نو سوالوں کے جوابات فراہم کرتی ہیں لیکن مَیں اسے ابنِ صفی کی کسی دانستہ کوشش کا نتیجہ نہیں سمجھتا بلکہ میرے نزدیک یہ اُس اجتماعی خودی کا کرشمہ ہے جس کے وجود کو ثابت کرنے میں علامہ اقبال نے اپنی تمام عمر صرف کی تھی (اور جس کے وجود سے ہم عموماً ابھی تک بیخبر ہیں)۔

مَیں نے ''دانش منزل'' میں ابنِ صفی کی نو داستانوں اور علامہ اقبال کے نو سوالوں کے باہمی ربط کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ صرف ابواب کے عنوانات کو اُن سوالات کی طرف ایک اشارہ بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ عنوانات ہیں: سوچ، علم، وصال، فراق، خودی، بے خودی، انا الحق اور عرفان۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مَیں ''اقبال سائنسز'' کی اصلاح کی وضاحت بھی پیش کردُوں۔ اِس سے میری مراد وہ علم ہے جو سوشل سائنسز کو علامہ اقبال کی نظر سے دیکھنے پر حاصل ہوتا ہے۔ میں نے متذکرہ بالا تینوں تصانیف میں ابنِ صفی کے ناولوں کو اِسی علم کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

انجینئر راشد اشرف ❁

ابنِ صفی — زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا

۲۷ رجولائی سنہ ۱۹۸۰ء کی صبح ابن صفی اپنے گھر سے قریبی واقع آفس کی جانب روانہ ہوتے نظر نہیں آئے۔ ۲۶/ جولائی کی صبح ان کے اہل خانہ ان کے پرستاروں کی موجودگی میں مٹی کا حق مٹی کے سپرد کر آئے تھے۔[۱] وہ ۲۵ /اور ۲۶/ جولائی کی درمیانی رات اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے! وہ ناظم آباد میں واقع اپنے مکان[۲] کو چھوڑ گئے اور اپنے نئے مکان کا پتا بھی کسی کو دے کر نہیں گئے!

اب تو یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے بہت دور بسائی ہیں بستیاں

۲۶/ جولائی کی صبح وہ ہاتھ تہِ خاک ہوئے جو ۲۸/ برس اپنے پڑھنے والوں کو نت نئے جہانوں کی سیر کراتے رہے۔ وہ ہاتھ جن کی جنبش میں ترنم تھا اور خاموشی میں شاعری۔ جن کی انگلیوں سے تخلیق کی گنگا بہا کرتی تھی۔ بقول سردار جعفری:

> انسان کے تسلسل میں حیاتیاتی عمل کارفرما ہے جو باپ سے بیٹے کی شکل اختیار کرتا ہے۔ لیکن انسانیت کا تسلسل ہاتھوں کی تخلیق کا رہین منت ہے۔ یہ تخلیق بظاہر بے جان ہوتی ہے لیکن جانداروں سے زیادہ جاندار ہوتی ہے۔ ہاتھوں کے بغیر نہ جنگ ممکن ہے نہ امن۔ محبت ممکن ہے نہ نفرت۔ یہی ہاتھ گلے میں حمائل ہوتے ہیں اور یہی ایک دوسرے کو چھوڑ کر دل کی دھڑکنیں تیز کر دیتے ہیں۔ ساز میں سوئے ہوئے نغمے انھی ہاتھوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہم آغوشی کے لیے یہی سب سے پہلے آگے بڑھتے ہیں اور رخصت کے وقت یہی سب کے بعد پیچھے ہٹتے ہیں۔ جس طرح ذہن اپنے آپ کو خیال میں تبدیل کر کے اس کو اپنے وجود سے الگ کر دیتا ہے اسی طرح ہاتھ اپنے آپ کو قلم اور تلوار، مشین اور اوزار میں تبدیل کر کے انھیں اپنے وجود سے الگ کر دیتے ہیں اور وہ چیزیں ہاتھوں سے بھی زیادہ طاقتور بن جاتی ہیں۔

لیکن سری ادب کے موجد ابن صفی کی موت کے ساتھ ان کا دور ختم نہیں ہوتا، شروع ہوتا ہے۔ بڑے ادیب کی زندگی اس کی آنکھیں بند ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

❁ مکان نمبر ایل۔ ۲، بلاک نمبر ا، ۱۳۔ ڈی، نزد زبیری فیملی پارک، مین روڈ، گلشنِ اقبال، کراچی۔

چشم خود بربست و چشم ما کُشاد

کم وبیش ۴۰ برس پیشتر ابن صفی کے فرزند احمد صفی نے کہا تھا کہ کبھی کبھی یہ غم حافظے کا سہارا لے کر لاشعور کی گہرائیوں سے نکلتا ہے اور آنکھوں کے راستے بہہ جاتا ہے۔ وہ اس جانکاہ سانحے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

۲۴ر جولائی کو ابو کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب ہوگئی تھی۔ معمول سے زیادہ اس لیے کہ اس بیماری کو تقریباً دس ماہ کا عرصہ ہوچکا تھا۔ ابو پر درد کا پہلا اور شدید حملہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۷۹ء کی رات کو ہوا تھا اور اس کے بعد صحت مسلسل خراب ہی رہی۔ نومبر ۱۹۷۹ء میں بیماری شدت اختیار کرگئی۔ ڈاکٹروں نے طویل معائنوں اور تکلیف دہ ٹیسٹوں کے بعد ایک خطرناک بیماری کا اندیشہ ظاہر کردیا۔ دسمبر ۱۹۷۹ء میں ابو کو کراچی کے جناح اسپتال میں داخل کردیا گیا۔ مزید معائنوں اور ٹیسٹوں نے لبلبہ میں کینسر کی تصدیق کردی۔ اس بات کو ابو سمیت تمام لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ اسپتال میں بہترین علاج اور توجہ سے ابو کی بیماری میں بظاہر کمی ہوگئی۔ اسپتال سے گھر آنے کے بعد علاج جاری رہا لیکن بیماری کی وجہ سے ان کے جسم میں متواتر خون کی کمی واقع ہونے لگی جمعرات ۲۴ر جولائی ۱۹۸۰ء کو ابو کو بخار آگیا جو اس وقت غیر معمولی بات نہیں تھی۔ لیکن رات ہوتے ہوتے بخار بہت تیز ہوگیا۔ دوسرے دن طبیعت میں خرابی کی وجہ سے میں دیر سے سوکر اٹھا۔ امی نے بتایا کہ رات بھر ابو کی طبیعت بہت خراب رہی۔ ابو کو اس وقت بھی خاصا بخار تھا۔ جمعہ کا دن تھا، چھٹی ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر کا ملنا بھی مشکل تھا۔ امی کے مشورے سے میں اور بھیا (ابرار صفی)[۳] رحمٰن بھائی کو لینے چلے گئے۔ ڈاکٹر رحمٰن[۴] آئے تو ابو کا بخار تیز ہوچکا تھا۔ ان کی سانس اس قدر تیز تیز چل رہی تھی کہ بولنا دشوار تھا۔ ڈاکٹر رحمٰن نے فوراً انجکشن منگوائے، جب انھوں نے انجکشن لگانے کے لیے ابو کی آستین سرکائی تو ابو نے منع کیا 'میرے بازو اب مزید مت چھیدو' رحمٰن بھائی نے پاؤں کی رگ میں انجکشن لگایا۔ انجکشن لگنے اور دوا ملنے کے بعد ابو کی طبیعت بہتر ہوگئی اور انھوں نے عادتاً طبیعت سنبھلتے ہی باتیں شروع کردیں۔ شام کے وقت افطار کے بعد عیادت کے لیے حسب معمول لوگوں نے آنا شروع کردیا۔ ابو کو کافی تیز بخار تھا اس کے باوجود آنے جانے والوں سے تھوڑی بہت بات چیت کررہے تھے۔ رحمٰن بھائی نے جاتے وقت بھیا سے کہا کہ اس وقت تو حالت قدرے بہتر ہے، انشاءاللہ صبح سب سے پہلے خون چڑھانے کا انتظام کریں گے۔ یہ ایک ایسی صبح کا ذکر تھا جو کبھی نہ آئی۔ اس رات مجھے بھی کافی تیز بخار تھا، میں ابو کے پاس سے اٹھ کر بڑے کمرے میں چلا گیا اور جاتے ہی سوگیا۔ رات کو ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ گھڑیاں دیر ہوئے ۲۶ر تاریخ کا

اعلان کر چکی تھیں۔ ابو نے سارے دن کے بعد اس وقت بیت الخلا جانے کو کہا۔ سارا دن اس قدر کمزوری رہی تھی کہ ہاتھ نہ اٹھتا تھا لیکن اس وقت خود اٹھے اور سہارا لے کر کمرے سے متصل باتھ روم گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو سانس نہایت تیزی سے چل رہا تھا۔ بھیا کو بلایا کہ پیٹھ سہلا دیں۔ امی نے فوراً بھیا کو جگایا۔ جب بھیا پیٹھ سہلا رہے تھے تو ابو نے کہا: 'ناحق تم لوگوں کو آدھی رات تنگ کر رہا ہوں، میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے... ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تھوڑی دیر میں اچانک تکلیف میں اضافہ ہوگیا۔ کراہنے کی آواز سن کر میں فوراً کمرے میں پہنچا، اس وقت تک ابو لیٹ چکے تھے۔ ان کی آنکھیں چھت میں گڑی تھیں اور سانس چلنے کی وجہ سے پورا پلنگ ہل رہا تھا۔ ہم سب پریشان ہوگئے، امی اور بہنیں گھبرا کر رونے اور دعائیں مانگنے لگیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ میں اور بھیا ابو کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگے۔ ابو کی حالت دیکھ کر سب کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بھیا روتے جاتے تھے اور ابو کو جھنجوڑتے جاتے تھے۔ افتخار (بھائی)[۵] فوراً گاڑی لے کر ڈاکٹر کی طرف دوڑ گیا۔ بھیا اور مجھ میں ابو کے پاس سے ہٹنے کی ہمت نہ تھی۔ امی اور بہنیں پاگلوں کی طرح ادھر سے اُدھر دوڑ رہی تھیں۔ اچانک ابو نے زور سے سانس لی اور ان کے چہرے کا کرب یکسر دور ہوگیا۔ وہ بالکل پرُسکون ہوگئے۔

میرے کرم فرما اور ابن صفی پر واحد 'آفیشل' ویب سائٹ کے نگراں کار جناب محمد حنیف نے مجھے احمد صفی صاحب کا مندرجہ بالا مضمون ارسال کرتے وقت تبصرہ کیا کہ ''جب بھی میں اسے پڑھتا ہوں، میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں۔''

ابن صفی کی موت پر ان کی کہانیوں کی مستقل فضائیں بھی مغموم و سوگوار لگتی ہیں۔ عمران کے قہقہہ بار فلیٹ پر اداسی چھائی ہوئی ہے۔ صفدر، جولیا، خاور، نعمانی، چوہان، ظفرالملک، جمن، سلیمان، جوزف اور یہاں تک کہ عمران جس نے کبھی مایوس ہونا نہ سیکھا تھا۔ سب کے سب غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی اداس تصویریں بنے بیٹھے ہیں۔ اُدھر کرنل فریدی کی کوٹھی پر بھی سوگوار فضا طاری ہے۔ کیپٹن حمید واقعی مغموم ہوگیا ہے اور اپنے خالی پائپ کو گھور رہا ہے۔ اور کرنل فریدی... وہ فریدی جس نے کبھی حمید کے اس اظہار خیال پر کہ اب آپ بوڑھے ہوگئے ہیں، کہا تھا، ''لغو خیال ہے میں کبھی بوڑھا نہیں ہوسکتا۔'' جس کی ڈکشنری میں مایوسی اور ناکامی جیسے الفاظ نہیں ملتے، وہ فریدی بھی آج افسردگی کے عالم میں اپنے بجھے ہوئے سگار کو یوں تک رہا ہے جیسے سگار کی آگ نہ ہو بلکہ ایک تابناک اور بھڑکتا ہوا شعلہ ہو جو یکا یک سرد ہوگیا ہے۔ غم انگیز پرچھائیوں نے فریدی کے چہرے کو جھریا دیا ہے۔ پہلی بار اس کے چہرے پر مایوسی کے آثار نظر آئے ہیں اور اس اندوہناک خیال سے اور زیادہ وحشت ہوتی ہے کہ کون آئے گا جو ان کے کرداروں میں روح پھونک سکے گا، ان میں جان ڈال کر فریدی کو واقعی فریدی اور عمران کو واقعی عمران بنا کر پیش کر سکے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں کرداروں کی ہمہ گیریت

اوران کی کردار سازی کے فن سے جتنا ابن صفی واقف تھے کسی دوسرے کا اس کی گرد تک کو پہنچنا بعید از قیاس ہے۔

اپنے چہیتے 'ابوٗ' کے گزر جانے کے بعد محض وہ ساتوں بہن بھائی ہی یتیم نہ ہوئے بلکہ گویا اردو زبان کا سری ادب بھی یتیم ہوگیا۔

مدتوں ذہن میں گونجوں گا سوالوں کی طرح — تجھ کو یاد آؤں گا گزرے ہوئے سالوں کی طرح

ڈوب جائے گا جو کسی روز خورشید انا — مجھ کو دوہراؤ گے محفل میں مثالوں کی طرح

ابن صفی ۲۶ رجولائی ۱۹۲۸ء کو الٰہ آباد کے ایک گاؤں نارا میں صفی اللہ اور نذیرا بی بی کے گھر پیدا ہوئے۔ زبان کے شاعر نوح ناروی رشتے میں ابن صفی کے ماموں لگتے تھے۔ ابن صفی کا اصل نام اَسرار احمد تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم نارا کے پرائمری اسکول میں حاصل کی۔ میٹرک ڈی اے وی اسکول، الٰہ آباد سے کیا جبکہ انٹرمیڈیٹ کی تعلیم الٰہ آباد کے ایونگ کرسچن کالج سے مکمل کی۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں الٰہ آباد یونی ورسٹی میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اسی اثنا میں برصغیر میں تقسیم کے ہنگامے شروع ہوگئے۔ ہنگامے فرو ہوئے تو تعلیم کا ایک سال ضائع ہو چکا تھا لہٰذا بی اے کی ڈگری آگرہ یونی ورسٹی سے یہ شرط پوری کرنے پر ملی کہ امیدوار کا عرصہ دو برس کا تدریسی تجربہ ہو۔ سن ۱۹۴۸ء میں عباس حسینی نے ماہنامہ نکہت کا آغاز کیا، شعبہ نثر کے نگران ابن سعید[۶] تھے جبکہ ابن صفی شعبہ شاعری کے نگران مقرر ہوئے۔ رفتہ رفتہ وہ مختلف قلمی ناموں سے طنز و مزاح اور مختصر کہانیاں لکھنے لگے۔ ان قلمی ناموں میں طغرل فرغان اور سنکی سولجر جیسے اچھوتے نام شامل تھے۔ جون ۱۹۴۸ء میں نکہت سے ان کی پہلی کہانی 'فرار' شائع ہوئی۔ ۱۹۵۱ء کے اواخر میں بے تکلف دوستوں کی ایک محفل میں کسی نے کہا تھا کہ اردو میں صرف فحش نگاری ہی مقبولیت حاصل کرسکتی ہے۔ ابن صفی نے اس بات سے اختلاف کیا اور کہا کہ کسی بھی لکھنے والے نے فحش نگاری کے اس سیلاب کو اپنی تحریر سے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ اس پر دوستوں کا موقف تھا کہ جب تک بازار میں اس کا متبادل دستیاب نہیں ہوگا، لوگ یہی کچھ پڑھتے رہیں گے۔ یہی وہ تاریخ ساز لمحہ تھا جب ابن صفی نے ایسا ادب تخلیق کرنے کی ٹھانی جو بہت جلد لاکھوں پڑھنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ عباس حسینی کے مشورے سے اس سلسلے کا نام جاسوسی دنیا قرار پایا اور ابن صفی کے قلمی نام سے انسپکٹر فریدی اور سرجنٹ حمید کے کرداروں پر مشتمل سلسلے کا آغاز ہوا جس کا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۲ء کے عرصے میں ابن صفی پہلے اسلامیہ اسکول اور بعد میں یادگار حسینی اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے رہے تھے۔ اگست ۱۹۵۲ء میں ابن صفی اپنی والدہ اور بہن کے ہمراہ پاکستان آگئے[۷] جہاں انھوں نے کراچی کے علاقے لالوکھیت کے سی ون ایریا[۸] میں ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء تک رہائش اختیار کی۔ ان کے والد صفی اللہ، ۱۹۴۷ء میں کراچی آچکے تھے۔ اگست ۱۹۵۵ء میں ابن صفی نے بھیانک آدمی کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا جسے راتوں رات مقبولیت حاصل ہوئی۔ بھیانک آدمی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۳۰ ؍حسن علی آفندی روڈ، کراچی سے شائع ہوا تھا۔ مذکورہ ناول کو ماہانہ جاسوسی دنیا نے نومبر ۱۹۵۵ء میں کراچی کے ساتھ ساتھ الٰہ آباد سے بیک وقت شائع کیا تھا۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ابن صفی نے اَسرار پبلی کیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے تحت جاسوسی دنیا کا پہلا ناول 'ٹھنڈی آگ' شائع کیا۔ ۱۹۵۸ء میں ابن صفی لالوکھیت سے کراچی کے علاقے ناظم آباد منتقل ہوگئے۔ جنوری ۱۹۵۹ء میں ابن صفی، اسرار پبلی کیشنز کو فردوس کالونی، کراچی۔ ۱۸ کے نئے پتے پر منتقل کر چکے

تھے اور یوں انھیں اپنی تخلیقات کو پروان چڑھانے کے لیے ایک آرام دہ ماحول میسر آ گیا۔ ناظم آباد کے اس گھر میں وہ ۱۹۸۰ء میں اپنے انتقال تک قیام پذیر رہے۔

ابن صفی ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے۔ ابن صفی کے الٰہ آباد یونی ورسٹی میں استاد ڈاکٹر اعجاز حسین[۹] نے اپنے ہونہار شاگردوں کے تذکرے ''ملک ادب کے شہزادے'' میں ان کا تذکرہ ایک شاعر کی حیثیت سے کیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز، ابن صفی سے ہمیشہ اس بات پر خفا رہے کہ اس نے اسرار ناروی کو قتل کر دیا تھا۔ ابن صفی کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

راہ طلب میں کون کسی کا اپنے بھی بیگانے ہیں　　چاند سے مکھڑے رشک غزالاں سب جانے پہچانے ہیں

مے خانے سے دار تلک اپنی ہی کہانی بکھری ہے　　رند بنے سرمستی میں کچھ اور بڑھے منصور ہوئے

بلآخر تھک ہار کے یارو ہم نے یہ تسلیم کیا　　اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

لکھنے کو لکھ رہے ہیں غضب کی کہانیاں　　لیکن نہ لکھ سکے کبھی اپنی ہی داستاں

دل فسردہ ہی سہی چہرے پہ تابانی ہو　　ورنہ خوداری احساس پر حرف آتا ہے

غم حیات کی دریا دلی نہ پوچھ اسرار　　یہ لہلہاتی بہاریں اسی سحاب کی ہیں

اور اس شعر کی داد تو ابن صفی شاید مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے:

گھٹ کے رہ جاتی ہے رسوائی تک
کیا کسی پردہ نشیں سے ملیے

ابن صفی کی شاعری میں اگر سادگی و پرکاری کی کیفیت کا اندازہ لگانا ہو تو پھر یہ اشعار ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں:

مرے لبوں پہ یہ مسکراہٹ!　　مگر جو سینے میں درد سا ہے
اسی جگہ کیوں بھٹک رہا ہوں　　اگر یہی گھر کا راستہ ہے

اور ان کے مندرجہ ذیل شعر کو ان کی ناگہانی وفات کے پس منظر میں دیکھیے تو دل دکھ سے بھر آتا ہے:

ابھی سے کیوں شام ہو رہی ہے
ابھی تو جینے کا حوصلہ ہے

ابن صفی کی ایک آزاد نظم دیکھیے:

محترم دوستو
وہ جو خاموش ہیں جانے کب بول اٹھیں
اس لیے چند چاندی کے چمچے منگاؤ
اور نگراں رہو
جیسے ہی لب کشا ہو کوئی
ایک چاندی کا چمچہ...
اب تمھیں کیا بتانا کہ تم
خود ہی دانا ہو صدیوں سے
چاندی کے اوصاف سے باخبر ہو
عقل و دانش کے پیکر ہو تم
دیدہ ور اور طباع ہو
تیغ اٹھاؤ گے تو تیغ ہی پر اسے
روک لے گا کوئی
دیدہ ور دوستو
صرف چاندی کا چمچہ
تمھارے مسائل کا حل ہے، اسے یاد رکھنا

شاعر لکھنوی نے ابن صفی کو بحیثیت شاعر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

شاید عام ذہنوں میں یہ تاثر ہو کہ ابن صفی کی شاعری کا معیار غالباً وہ نہ ہوگا جو ان کے جاسوسی ذہن کا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ ان کے پٹری بدل لینے کو اسی کا نتیجہ سمجھتے ہوں۔ لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ ان کی نظموں کی رنگا رنگی، غزلوں کی جذباتی اور فنی آرائش اس تاثر کی نفی کرتی ہے بلکہ ہمیں اس بات کا یقین کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ ان کی جاسوسی تحریروں کی کشش، خوب صورتی اور سحر انگیزی میں ان کے شاعرانہ مزاج کی کارفرمائی بڑی حد تک موجود ہے۔ اگر وہ شعر و ادب کی راہ سے ہو کر اس منزل پر نہ آتے تو شاید ان کی تحریروں میں سحریت اور اثر انگیزی کی وہ گھلاوٹ کبھی نظر نہ آتی۔ شعر سب سے بڑا جادو ہے اور غزل سب سے بڑی جادوگر۔ ان کی جاسوسی تحریریں پڑھنے

والوں پر جو سحر کاری کرتی ہیں وہ ان کے غزل شناس مزاج ہی کی مرہون منت ہے اور اسی لیے ان میں پڑھنے والوں پر جادو کر دینے کی غیر معمولی صلاحیت ملتی ہے۔ ایک جاسوسی ناول نگار اور ناول نویس کی حیثیت سے وہ میرے ایک شناسا کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن ان کی غزلوں اور نظموں کے عمیق مطالعے کے بعد مجھے یہ تمنا ہے کہ کاش وہ میرے دوست ہوتے۔ جہاں تک غزل میں فنی رکھ رکھاؤ، خیال کی ترتیب وتہذیب، الفاظ کے دروبست اور معانی کی بزم آرائی کا تعلق ہے، اسرار ناروی کے یہاں یہ خصوصیات اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ موجود ملتی ہیں۔

شاعری میں ابن صفی کے منفرد اسلوب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایونگ کرسچین کالج، الہ آباد میں ابن صفی کے استاد پروفیسر انوار الحق نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ ''اسرار جو شاعری کے میدان میں ابھرنے والا تھا، جاسوسی ناول نگار کیسے بن گیا؟''۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابن صفی کے تخلیق کردہ ۲۴۵ ر ادب پاروں کا جائزہ لینے سے ہمیں ان میں ابن صفی کا ادبی وشاعرانہ تخیل بطریق احسن نظر آتا ہے۔

جون ۱۹۶۰ء میں ابن صفی جاسوسی دنیا کا ۸۸ رواں ناول پرنس وحشی اور عمران سیریز کا ۴۱ رواں ناول بے آواز سیارہ لکھ چکے تھے کہ ان پر شیزوفرینیا نامی بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء تک وہ مکمل طور پر صاحب فراش رہے۔ اس دوران بازار میں طرح طرح کے جعلی صفیوں کی بھرمار ہوگئی۔ ان میں نجمہ صفی (جس کے بارے میں خود صفی صاحب نے کہا تھا کہ میرے نام سے ملتے جلتے قافیے والی ایک صاحبہ بہت عرصے سے غلط فہمی پھیلا رہی ہیں جبکہ میرے والد صاحب بھی ان کے جغرافیے پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں)، این صفی، ابّن صفی، ایس قریشی، ابن صقی اور اس قبیل کے بہت سے دوسرے شامل تھے۔

ابن صفی کی بیماری کے متعلق ان کے فرزند احمد صفی اپنے مضمون 'ابن صفی۔ چند حقائق' میں بیان کرتے ہیں کہ:

> اس بیماری میں ڈیپریشن اور اختلاج بنیادی اثرات ہوتے ہیں۔ ایک ماہر نفسیات نے نیویارک میں اس پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ بہت سے تخلیق کار اس درجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ ان کے ذہن کی کارکردگی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ بہت تیزی سے بہت عمدہ تخلیقات کے ڈھیر لگا دیتے ہیں (جیسا کہ ابن صفی کے قارئین نے دیکھا کہ ایک مہینے میں چار چار ناول تیار ہوجاتے تھے)۔ اس درجہ پر پہنچنے کے بعد ذہن اچانک اپنے آپ کو بند کرلیتا ہے اور نہ صرف تخلیقی صلاحیتیں مفقود ہوجاتی ہیں بلکہ ایک مسلسل ڈیپریشن اور اختلاجی کیفیت اس پر طاری ہوجاتی ہے جس کے زیر اثر وہ کچھ بھی کرگزر سکتا ہے۔ انھی ماہر نفسیات کے مطابق جس طرح یہ بیماری آتی ہے اسی طرح اچانک پیچھا بھی چھوڑ سکتی ہے۔ اور ابن صفی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں حکیم اقبال حسین کے علاج کے دوران وہ اچانک نارمل ہوگئے۔

ابن صفی نارمل کیا ہوئے، ان کے نقالوں کی تو گویا موت واقع ہوگئی۔ وہ جاسوسی ادب کے میدان میں واپس آئے تو اس شان سے کہ عمران سیریز کا ناول ڈیڑھ متوالے لکھا جو ایک انتہائی دل چسپ ناول ہے۔ ناول کیا ہے، لکھا لکھایا اسکرپٹ ہے کہ فلم بنانے کے لیے لوکیشنز منتخب کی جائیں اور بلا تامل فلم بندی کا آغاز ہوجائے۔ ابن صفی کے کئی ناولز پر جاسوسی، نفسیاتی، مہماتی اور آرٹ فلمیں بنائی جاسکتی ہیں کہ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے انھوں نے اپنی تحریروں میں نہ چھیڑا ہو۔ ان میں محدود پیمانے پر موروثی ہوس، موت کی آندھی، گیا ہواں زینہ، وبائی ہیجان، پتھر کی چیخ، گارڈ کا اغوا، شاہی نقارہ، سائے کی لاش جیسے شاہکاروں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ابن صفی کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی۔ بنیادی طور پر چوں کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر تھے اسی لیے ان کے ناولوں کے نام بھی ان کے ادبی و شاعرانہ ذوق کے عکاس ہوتے تھے: ٹھنڈی آگ، سہمی ہوئی لڑکی، تاریک سائے، سبز لہو، لاش گاتی رہی، آوارہ شہزادہ، چاندنی کا دھواں، چمکیلا غبار، چیختے دریچے، ٹھنڈا سورج، خوشبو کا حملہ وغیرہ وغیرہ۔

ابن صفی نجی زندگی میں ایک دردمندانہ دل رکھنے والے انسان تھے۔ ان کے برادر نسبتی جناب مبین احسن مرحوم سے روایت ہے کہ ’’ایک مرتبہ اسرار بھائی (ابن صفی) نے میرے محکمے کے ایک ملازم کی ترقی کے بارے میں مجھ سے کہا اور ان صاحب کی ترقی اتفاقاً میرے ہی دستخط سے ہوئی، یہ الگ بات ہے کہ یہ صاحب انھی (ابن صفی) کے لیے مارِ آستین ثابت ہوئے۔‘‘ مرزا حیدر عباس بیان کرتے ہیں کہ ’’ایک آدمی نے ابن صفی کے ساتھ فراڈ کیا۔ ابن صفی نے مقدمہ کردیا۔ اس آدمی کو سزا ہوگئی۔ جب معلوم ہوا کہ اس کے بیوی بچوں کا کوئی سہارا نہیں ہے تو انھیں اپنے پاس سے وظیفہ دینا شروع کردیا۔‘‘

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں مستقل کرداروں سے قطع نظر چند ایسے کردار تخلیق کیے جو ذہنوں سے چپک کر رہ جاتے ہیں اور خیر و شر کے جیتے جاگتے نمونے بن کر سامنے آتے ہیں، ایسا ہی ایک کردار ان کے ناول ’’لاشوں کا آبشار‘‘ (۱۵ر جون ۱۹۵۴ء) کا مسٹر کیو بھی ہے جو کسی شخص کی ناجائز اولاد ہوتا ہے۔ درجنوں انسانوں کے قاتل کی حیثیت سے وہ عدالت میں اپنا بیان دیتا ہے اور جو کچھ ابن صفی اپنے اس کردار کی زبانی کہہ گئے ہیں وہ قابل غور ہے۔ ایک ایسا نازک و حساس موضوع ہے جس پر قلم اٹھانے کی جرأت بڑے بڑوں کو نہ ہوئی۔ مذکورہ ناول کے اختتام پر مسٹر کیو قانون کی حراست میں ہوتا ہے اور بھری عدالت میں چند لمحے وہاں موجود مجمع کو گھورتا ہے اور پھر گرج کر کہتا ہے:

> ’میں ایک شخص کی ناجائز اولاد ہوں۔ مجھے بتاؤ میں کیا کرتا؟ مجھے جواب دو۔ اگر کوئی مادر زاد لنگڑا ہو تو لوگوں کو اس سے ہمدردی ہوتی ہے۔ مادر زاد اندھے ہندوؤں میں سورداس اور مسلمانوں میں حافظ جی کہلاتے ہیں۔ لیکن میں... میں کیا بذات خود ایک بہت بڑی مجبوری نہیں تھا؟... کیا میں ایک بیما ری کی طرح پیدا نہیں ہوا تھا؟... اگر میں شاستر پڑھ لیتا تب بھی ناجائز ہی رہتا... اگر قران بھی حفظ کرلیتا تو لوگ مجھے حافظ کہتے ہوئے ہچکچاتے... آخر کیوں... کیا میں بھی ایک لنگڑے اور اندھے کی طرح اپنی پیدائش کے معاملے میں بے بس نہیں تھا؟... میں تمھارے خدا سے پوچھتا ہوں کہ اس

نے ناجائز کو کیوں اپنے بندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے؟... وہ جس کا میں نطفہ ہوں، اگر تائب ہو کر مولوی یا پنڈت ہو گیا ہو تو لوگ اس کے قدم چوم رہے ہوں گے اور وہ بہشت یا سورگ کی آس لگائے بیٹھا ہوگا... لیکن میں... میں کس طرح خود کو بدل سکتا ہوں... میں ناجائز ہوں، کوئی عادت نہیں کہ بدل جاؤں... میں ماضی۔ حال اور مستقبل، تینوں سے محروم ہوں۔ حال میں اس لیے کامیاب رہا کہ میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر واقعی کوئی دوسری زندگی بھی ہے تو میں اس سے بھی مایوس ہوں اس لیے کیوں کہ بعض مذہب ناجائز کو بہرحال جہنمی قرار دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ ناجائز ہر حال میں مرنے سے قبل خود کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے... چلیے ناجائز کو راہ مستقیم سے بھی محروم کر دیا گیا... پھر آخر کیا کرے... کہاں جائے... بتاؤ نا! بولو... جواب دو۔

لگ بھگ اٹھائیس برس تک جاسوسی ناول نگاری کے راستے کو گلزار بنا دینے والے ابن صفی نے اپنی تحریروں کے ذریعے اپنے قاری کو کیا پیغام دیا، اس کا ذکر اک ذرا توقف کے بعد، پہلے یہ دیکھیے کہ ابن صفی اپنی ابتدائی عمر میں کن نظریات سے متاثر رہے تھے۔ اپنے مضمون بقلم خود میں ابن صفی لکھتے ہیں:

> میٹرک میں پہنچتے ہی بے بی کمیونسٹوں کا ساتھ ہو گیا۔ یہ ایسے 'بچہ لوگ' تھے جنھوں نے کبھی پارٹی آفس کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ کھدر پہنتے تھے' بال بڑھاتے تھے اور گڈری بازار سے آٹھ آٹھ آنے کی پرانی عینکیں خرید لاتے تھے اور کمیونسٹ کہلائے جانے کے شوق میں اچھی بھلی آنکھوں کا تیا پانچہ کر بیٹھتے تھے۔ بہرحال ان کا ساتھ ہوتے ہی ظالم سماج اور سرمایہ داری میری شاعری میں گھس آئے تھے۔ ان دنوں محلے کے بنیے کو سرمایہ دار سمجھتا تھا اور اپنی برادری ظالم سماج معلوم ہوتی تھی۔ کیوں کہ برادری سے باہر شادی کرنے پر سخت ترین پابندیاں عائد تھیں۔ لہٰذا اپنے ہی خاندان کے کچھ بزرگ سماج کے ٹھیکیدار ٹھہرے تھے اور دل ہی دل میں ان پر غرّا کر ظالم سماج کے خلاف شاعری کیا کرتا تھا اور جب محلے کا بنیا کسی قرض خواہ سے اُلجھ پڑتا تو سرمایہ داری کی شامت آجاتی۔ ایسی دل دہلا دینے والی نظم لکھتا کہ بعد میں اس بنیے پر رحم بھی آنے لگتا۔ دوسری عالمگیر جنگ شباب پر تھی اور میں اس الجھن میں پڑا رہتا تھا کہ آخر عالمی امن کا داعی روس کیوں نازی جرمنی کا ساتھ دے رہا ہے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اچانک روس اور جرمنی بھی ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے اور میرے کھدر پوش ساتھیوں نے ہٹلر کو گالیاں دینی شروع کر دیں... میں نے چپ چاپ اپنا کھدر کا سوٹ اتار کر ایک طرف رکھا' بال ترشوائے اور آدمی کی جون میں آ گیا۔[(۱۰)]

ابن صفی ۱۹۴۷ء میں یونی ورسٹی پہنچے تو ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ ابن صفی، ڈاکٹر اعجاز سے بہت کچھ

سیکھنا چاہتے تھے لیکن اسی دوران ۱۹۴۷ء کے فسادات شروع ہو چکے تھے۔ یونی ورسٹی میں بھی خنجر زنی کی ایک واردات ہوگئی اور بزرگوں نے ابن صفی کا یونی ورسٹی جانا بند کرا دیا۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ یہی ڈاکٹر اعجاز حسین آگے چل کر ابن صفی کے مداح بنے اور انھوں نے 'اردو میں جاسوسی ناول' کے باب میں لکھا:

> ہنوز طلسم ہوشربا کے خیال سے دامن چھوٹ نہیں سکا۔ تہہ میں وہی روایتی تخیل اور کسی حد تک مافوق الفطرت باتوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ غور کرنے سے طلسم ہوشربا اور آج کے جاسوسی ناولوں میں ایک گونا مماثلت ملتی ہے جیسے اس میں خیر وشر کی لڑائی میں قلت کثرت پر فتح پائی جاتی ہے ویسا ہی آج جاسوسی ناولوں میں نیک و بد کی لڑائی نظر آئے گی۔ جیسے اس زمانے میں امیر حمزہ کے ساتھ عمرو عیار جز لاینفک ہو گیا تھا ویسے ہی آج بھی خفیہ پولیس آفیسر کے ساتھ ایک ہمزاد نظر آتا ہے جیسے جاسوسی ناول میں فریدی کے ساتھ حمید سائے کی طرح ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔

اوپر دی گئی مثالوں کی مدد سے ہمارے سامنے ایک ایسے ابن صفی کا تصور ذہن میں آتا ہے جو اپنی تحریروں سے ان نظریات کا پرچار کرتا رہا جن سے وہ اوائل عمری میں متاثر رہا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ پچیس برسوں میں لکھے گئے تمام ناولوں میں ابن صفی کی جانب سے اپنے قاری کے لیے جو پیغام سب سے زیادہ طاقتور اور پر اثر نظر آتا ہے وہ ہے قانون کا احترام۔ اس بات کو ابن صفی اپنے ایک ناول کے پیشرس میں کھلے الفاظ میں بیان بھی کر چکے ہیں۔ اب آیئے اس بات کی جانب کہ ابن صفی کا نظریہ آخر تھا کیا؟ اس سلسلے میں سب سے اہم بات احمد صفی نے راقم سے ایک گفتگو کے دوران کہی۔ ان کے مطابق:

> ابو نے اپنے نظریات کو کبھی اپنے قاری پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ حالات و واقعات کا اپنے انداز میں تجزیہ کرنے کے بعد اسے اپنے قاری کے سامنے رکھ دیتے تھے اور فیصلے کا اختیار اسے سونپ دیا کرتے تھے۔ ان کا یہی انداز فکر اور طریقہ کار گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ بھی تھا۔ وہ ہمیں کسی بھی بات سے روکتے نہیں تھے بلکہ اس کے دونوں پہلو سامنے رکھ دیتے تھے اور ان کا انداز ایسا دل نشیں ہوتا تھا کہ ہم خود بخود درست سمت میں سوچنے اور فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔

ناول کے اہم اجزائے ترکیبی میں مکالمہ نگاری کا ایک اہم مقام ہے۔ اچھے مکالمے کی خوبی یہ ہے کہ اس سے کردار کی شخصیت کا صحیح پرتو ابھر کر سامنے آئے۔ ابن صفی کے ناولوں میں مکالمہ اپنی پوری قوت سے ابھر کر سامنے آتا ہے اور ان کا قاری نام جانے بغیر یہ سمجھ جاتا ہے کہ ان کے کس کردار کا مکالمہ ہے۔ یہ وصف چوٹی کے لکھنے والوں کے حصے میں بھی شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ ذیل میں درج چند دیگر مثالوں کی مدد سے نظریہ ابن صفی کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں جاسوسی دنیا کے ناول زہریلا سیارہ (جاسوسی دنیا ناول نمبر ۱۱۷، یکم فروری ۱۹۷۵ء) میں کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے مابین ہوئی گفتگو ملاحظہ ہو:

''آخر یہ جرائم کیوں اتنے بڑھ گئے ہیں؟''

''جھلاّہٹ کی بنا پر۔'' فریدی بولا۔

''میں نہیں سمجھا جناب۔''

''آبادی بڑھ گئی ہے۔ وسائل بھی محدود ہیں اور چند ہاتھوں پر ان کا قبضہ ہے۔''

''جھلاّہٹ والی بات تو رہ ہی گئی۔''

''اسی طرف آرہا ہوں... دولت مندوں کو مزید دولتمند بننے کی آزادی ہے اور عوام کو قناعت پسندی کا سبق پڑھایا جارہا ہے۔''

''ایسی صورت میں اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے۔''

''چارہ ہی چارہ ہے۔ اگر خود غرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے۔ ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوصِ نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاّہٹ رفع ہو جائے گی۔ ضرورت ہے کہ انھیں قناعت کا سبق پڑھانے کی بجائے ان کی 'خودی' کو ابھارا جائے جیسے بعض دوسرے ملکوں میں ہوا ہے۔''

''آپ تو انقلابی معلوم ہوتے ہیں۔''

''حدود اللہ میں رہ کر یقیناً انقلابی ہوں۔ اللہ کبھی اس پر برہم نہیں ہوسکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مدّنظر رکھ کر اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کر لے۔''

ابن صفی اپنے ذاتی نظریے میں صرف اور صرف اللہ کی ''ڈکٹیٹر شپ'' کے قائل تھے جیسا کہ انھوں نے اپنی ایک کتاب کے پیشرس میں کہا تھا کہ ''میں معاشرے میں اللہ کی ڈکٹیٹر شپ چاہتا ہوں۔ تم انفرادی طور پر اپنی حالت سدھارتے جاؤ، پھر دیکھو کتنی جلدی ایسا معاشرہ بن جاتا ہے جس پر اللہ کی حاکمیت ہو...'' ...ناول 'پاگلوں کی انجمن' (عمران سیریز، ناول نمبر ۵۸، یکم جون ۱۹۷۰ء) سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> تمھارا ظاہر کچھ بھی ہو لیکن مسلمان ہونا چاہیے۔ کچھ نیکیاں سچے دل سے اپنا کر دیکھو۔ آہستہ آہستہ تم خود ہی کسی جبر و کراہ کے بغیر اپنا ظاہر بھی اللہ کے احکامات کے مطابق بنالو گے۔ قرآن کو پڑھو، اسی پر عمل کرو، اسے علم الکلام کا اکھاڑا نہ بناؤ۔

اسی طرح ایک سوال کے جواب میں کہ ''آپ سیاست کے کس ازم کے قائل ہیں''، ان کا کہنا تھا:

> میں تو اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قائل ہوں، اس میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ جتنے پگ کا نشہ ہو، ویسا ہی بیان داغ دیا۔ آپ بھی کسی ازم میں پڑنے کے بجائے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ سارے ازم محض وقتی حالات کی پیداوار ہیں اور کسی ایک ازم کی دشواری زمانے میں دوسرے ازم کی پیدائش کا سبب بنتی رہتی ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی بھی ازم حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اسلامی نظام حیات آج بھی قابل عمل ہے لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ایماندار بننا پڑے گا اور یہ بے حد مشکل کام ہے۔ پس میرا سیاسی رجحان اللہ کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام اور میرا فن سکھاتا ہے قانون کا احترام۔

اسی مذہبی پس منظر میں دیکھیے تو ابن صفی کی شخصیت کا ایک اور دلنواز پہلو سامنے آتا ہے۔ پروفیسر مجنوں گورکھپوری سنہ ۱۹۷۲ء میں ابن صفی پر لکھے اپنے ایک مضمون 'اردو میں جاسوسی افسانہ (الف لیلہ ڈائجسٹ، ۱۹۷۲ء) میں ایک جگہ تحریر کرتے ہیں:

> ایک جگہ ابن صفی نے صلواتیں کا لفظ استعمال کیا ہے جو طباعت میں ''ص'' سے ہے مگر ذیلی حاشیے میں مصنف نے یہ نوٹ لگایا ہے کہ یہ کاتب کی غلطی ہے اور وہ خود ''س'' سے سلواتیں لکھتے ہیں اور اس کو جائز سمجھتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ایسا کیوں لکھتے ہیں۔ ''صلواتیں'' گالیوں کے معنوں میں نثر و نظم کے اساتذہ استعمال کرتے آئے ہیں لیکن انھوں نے ہمیشہ اس لفظ کو ''س'' سے لکھا ہے۔

مجنوں صاحب کے مذکورہ مضمون کے حاشیے میں ایچ اقبال صاحب کا ایک نوٹ [۱۱] ملاحظہ ہو جو انھوں نے پروفیسر صاحب کے ابن صفی پر متذکرہ اعتراض کے جواب میں تحریر کیا:

> میں نے ابن صفی صاحب سے اس موضوع پر گفتگو کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ ''صلوات'' کا ربط خاص ''صلوات بر محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' سے ہے اس لیے وہ احتراماً اس لفظ کو برا بھلا کہنے کے معنوں میں استعمال نہیں کرتے اور جب اس کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے تو اسے ''س'' سے لکھتے ہیں۔

عالمی افق کی ہمہ وقت بدلتی صورتحال پر ابن صفی کی ہمیشہ گہری نظر رہی۔ ترقی پسند تحریک ہو یا پھر وطن عزیز کے لیے ایٹمی پراسسنگ پلانٹ کا حصول، ان کی تحریروں میں جابجا ان معاملات کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے دیرینہ دوست اور شاعر و ادیب، جناب شاہد منصور مرحوم نے اسی موضوع پر اپنے ایک مضمون [۱۲] میں قدرے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ہمارے ملک پر بھی ایک ایسا وقت آن پڑا تھا کہ یار لوگوں نے سبز پاکستان کو سرخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس گمبھیر وقت کا سامنا کرنے میں بھی ابن صفی صف اول میں سینہ سپر تھے۔ انھوں نے پے در پے اپنے کئی ناولوں میں نہ صرف اس مسئلے کو اٹھایا بلکہ ان ریشہ دوانیوں کا بھی بڑی چابکدستی سے پردہ فاش کیا جو سفارتی ہتھکنڈوں سے ثقافتی سرگرمیوں کے پردے میں کی جارہی تھیں۔ یہاں میں (شاہد منصور) آپ کی خدمت میں ابن صفی کی ایک دھماکہ خیز غزل پیش کر رہا ہوں جو ان کی کتاب 'پاگلوں کی انجمن' [سنہ اشاعت: ۱۹۷۰ء۔ راقم] میں استاد محبوب نرالے عالم کی زبانی پیش کی گئی تھی۔ ذرا اس کے پرمعنی طنز اور اس کی تشبیہوں اور استعاروں پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ ابن صفی کا سینہ کیسے دینی جوش سے پر تھا اور اپنے قلم کو ہتھیار بنا کر کس طرح انھوں نے اپنے عہد کی خوفناک زہرناکی کا مقابلہ کیا:
>
> اک دن جلال جبہ و دستار دیکھنا　　　ارباب مکر و فن کو سر دار دیکھنا
> سنتے رہیں کسی بھی دریدہ دہن کی بات　　　ہم بھی کھلے تو جوش گفتار دیکھنا

قرآں میں ڈھونڈتے ہیں مساوات احمریں یارو! نیا یہ فتنہ اغیار دیکھنا
ورد زباں ہیں خیر سے آیات پاک بھی ہے اہرمن یہ خرقہ و پندار دیکھنا
کل تک جو بت کدے کی اڑاتا تھا دھجیاں اس کے گلے میں حلقہ زنار دیکھنا
لائی گئی ہے لال پری سبزہ زار میں ہوتے ہیں کتنے لوگ گناہ گار دیکھنا
فرصت ملے جو لال حویلی کے درس سے اک بوریہ نشیں کے بھی افکار دیکھنا

ابن صفی ایک اعلیٰ درجے کے مزاح نگار تھے۔ مزاح لکھنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اسٹیفن لیکاک مزاح کی تعریف کچھ اس طرح سے بیان کرتا ہے۔ ''یہ زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا نام ہے جس کا فن کارانہ اظہار ہو جائے۔''

ابن صفی نے اس فن کارانہ اظہار میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ جاسوسی دنیا کا کردار قاسم اور استاد محبوب نرالے عالم اس کی چند بہترین مثالیں ہیں۔ قاسم کا کردار ایک دبیل اور عقل سے پیدل کردار ہے جو کیپٹن حمید کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے اور مختلف موقعوں پر حمید اور کرنل فریدی کے لیے جہاں مشکلات پیدا کرتا ہے وہاں کئی مہمات میں ان کے لیے سہولت کار کا کام بھی انجام دیتا ہے۔ ابن صفی اپنے ناولوں میں ایسی پرلطف صورتحال پیدا کرتے تھے کہ ان کے قارئین بے چینی سے کہانی میں ان کرداروں کی آمد کے منتظر رہا کرتے تھے۔ سچویشنل کامیڈی [Situational comedy] کی ایک بہترین مثال عمران سیریز کا ناول 'چار لکیریں' (۱۲ر جولائی ۱۹۵۸ء) ہے جس کا ابتدائی جملہ پڑھ کر بے اختیار حلق سے قہقہہ ابل پڑتا ہے۔ کہانی میں کچھ یوں ہوتا ہے کہ کیپٹن فیاض اپنے ایک جاگیردار دوست کے یہاں بسلسلہ پارٹی مدعو کیے گئے۔ وہ جاگیردار صاحب عمران کے ساتھ اکٹھے آکسفورڈ میں پڑھتے رہے تھے۔ پارٹی کے انعقاد کے سلسلے میں دعوت ناموں کا انتظام تھا۔ کیپٹن فیاض کی جو شامت آئی تو اس نے عمران کے دعوت نامے پر مسٹر اینڈ مسز عمران لکھ دیا۔ کچھ تو تفریح کی خاطر اور کچھ یہ سوچ کر بھی کہ شاید عمران روشی (عمران سیریز کا ایک یادگار کردار، ایک طرحدار عورت) کو بھی ساتھ لیتا آئے گا جس کی خوش مزاجی کیپٹن فیاض کو بے حد پسند تھی۔ اب ناول کا ابتدائی جملہ ملاحظہ ہو:

> اس وقت کیپٹن فیاض کی کھوپڑی ہوا میں اڑ گئی جب اس نے عمران کے ہمراہ شہر کی ایک طوائف دیکھی۔

بقیہ صورتحال کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ معززین و شرفا کی اس تقریب میں عمران صاحب جس طوائف کو اپنے ہمراہ قیام کے لیے لے گئے تھے، اس کی وجہ سے وہاں کیا کیا نہ حماقتیں پھیلی ہوں گی۔

اسی طرح عمران سیریز کے ایک ناول ''بحری یتیم خانہ'' (۱۴ر مارچ ۱۹۷۰ء) کی ابتدا ایک نائٹ کلب میں کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کے ساتھ ہوتی ہے (یہاں ابن صفی اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں چوٹ کرتے نظر آتے ہیں)۔ عمران صاحب وہاں موجود تھے۔ استاد دلفگار ٹھمری شروع کرتے ہیں اور 'ندیا کاہے مارے بول' کی جو تکرار شروع کرتے ہیں تو عمران سات منٹ کے انتظار کے بعد استاد کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے... ''حضور! اب آپ کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی، آپ مجھے اپنی ندیا کا پتا بتائیں، ابھی

دوڑ کر پوچھ آتا ہوں کہ نندیا کاہے مارے بول... استاد کی تنک مزاجی مشہور تھی۔انھوں نے پہلے تو عمران کو حیرت سے دیکھا، پھر سر منڈل پھینک کر عمران کا گریبان پکڑنے کی کوشش کی۔ ہنگامہ ہوگیا۔کسی نے پوچھا کہ یہ کیا بے ہودگی ہے تو عمران صاحب غصیلے لہجے میں بولے،''ان کی نندیا میری بھی رشتے دار ہیں۔میں ان کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ پبلک مقامات پر ان کی توہین کرتے پھریں۔'' اتنے میں مینجر بھی آپہنچا، اس نے عمران کی شکل دیکھی تو بری طرح گڑ بڑا گیا۔''کیا بات ہے جناب عالی'' وہ گڑگڑایا... عمران نے استاد لفگار کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا،''باجا بجا کر میری عزیزہ کی توہین کررہے ہیں جناب...'' ...ادھر استاد دھاڑے،''ارے یہ بہرام خان حرام خان کا کوئی گرگا ہے حرامی...'' ... ''آپ غلط کہہ رہے ہیں جناب۔'' عمران ادب سے بولا،''میں آپ کی نندیا کا سالا ہوں۔''

ابن صفی کے ناولوں کے پیشرس بھی اپنی جگہ کلاسیکی درجہ رکھتے ہیں۔اکثر و بیشتر تو وہ اپنے قارئین سے نوک جھونک کے موڈ ہیں رہا کرتے تھے۔بعض پڑھنے والے ان کو کس کس طرح کے سوالات کرکے بور کیا کرتے تھے اور وہ ان کو ایسے جوابات دیا کرتے تھے کہ بیچا اور نامناسب تنقید کرنے والے کٹ کر رہ جائیں۔جاسوسی دنیا کے ایک ناول ''دھواں اٹھ رہا تھا''(۵/اکتوبر ۱۹۵۹ء) کے پیشرس میں ٹنڈو آدم کے ایک ٹیلیفون آپریٹر ابن صفی کے سابقہ ناول کو محض بکواس قرار دیتے ہیں، ان کی دانست میں ناول کے نام سے اس کے پلاٹ کا کوئی میل نہ تھا۔ابن صفی لکھتے ہیں کہ ٹیلیفون آپریٹر صاحب نے آتشی بادل کا اشتہار دیکھ کر اس کے بارے میں کچھ اس قسم کی کہانی خود بنائی ہوگی کہ آگ برساتا ہوا ایک بادل ہے جو تمام شہر پر مسلط ہوگیا ہے، عمارتیں دھڑا دھڑ جل رہی ہیں، پھر عمران اخیر میں اپنی پناہ گاہ سے قہقہے لگاتا ہوا برآمد ہوتا ہے اور اس سائنسدان کا ٹیٹوا دباتا ہے جو ایک مشین کے ذریعے آتشی بادل بنا بنا کر فضا کو سپلائی کررہا تھا۔

آخیر میں ابن صفی اپنے مخصوص انداز میں ایک ایسی بات لکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اچھل پڑے... ''یار ٹنڈو آدمی صاحب! خود ہی لکھ کر پڑھ کیا کرو۔''

غور فرمایا آپ نے 'ٹنڈو آدمی' کی نادر ترکیب پر۔

اسی طرح چاٹگام سے ایک صاحب ابن صفی کو کتابیں لکھنا ترک کرکے ترکاری بیچنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ابن صفی اان صاحب کو ایک طویل سنجیدہ جواب دیتے ہیں لیکن اخیر میں چٹکی لینے سے باز نہیں آتے:''بھئی اپنا نام تو صاف لکھا کریں۔پہلی نظر میں 'بدھو داس 'معلوم ہوتا ہے۔غور کرو تو 'رولس رائس' پڑھا جاتا ہے۔ذرا ترچھا کرکے دیکھو تو 'چلو واپس' گھسیٹا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ اہم ہے کہ ابن صفی کہنے کو تو تمام عمران کا نام استعمال کرکے جعلی لکھنے والوں سے نالاں نظر آئے لیکن ایسے لوگوں کا تذکرہ کرتے وقت ان کی روایتی خوش مزاجی و بذلہ سنجی غالب رہی۔مثال کے طور پر عمران سیریز کے ناول ڈیڑھ متوالے(۱۹۶۳ء) کے پیشرس میں وہ اپنے پڑھنے والوں سے عرصہ تین برس بعد یوں مخاطب ہیں:''رہی مختلف قسم کے ابنوں اور صفیوں کی بات تو یہ بیچارے سارے قافیے استعمال کرچکے ہیں لہذا اب مجھے کسی 'ابن خصی' کا انتظار ہے، میری دانست میں تو اب یہی

قافیہ بچا ہے۔''

ایک دوسری جگہ اسی ضمن میں شکوے کا دلنشیں و بذلہ سنج انداز ملاحظہ ہو، کہتے ہیں:

مجھے ان کماؤ پوتوں پر ذرا غصہ نہیں آتا۔ بس صرف اتنی سی بات گراں گزرتی ہے کہ لکھنے والے اپنے باپ کا نام بتانے کے بجائے میرے ہی باپ کا نام بتانے لگتے ہیں۔ وہ بھی اس انداز میں کہ میں ہی معلوم ہوں اور وہ ایک آدھ نکتے کے فرق سے کتابیں خریدنے والوں کو دھوکہ دے سکیں۔ ویسے آیئے آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں... وہ یہ کہ باپ کا نام بتائے بغیر کوئی جاسوسی ناول نویس کامیاب ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر شرط یہ ہے کہ نام میرے ہی باپ کا بتایا جائے۔

ابن صفی کے ناولوں سے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں کہ جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اگر کہیں غلطی سے وہ 'مروجہ ادب' کے میدان میں باضابطہ قدم رکھ دیتے تو بڑے بڑوں کی چھٹی ہوجاتی اور اس لحاظ سے چار حروف لکھ کر اہل کمال ہوجانے والوں کو ابن صفی کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انھوں نے ان کو کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا:

(۱)

اگر خودغرضی اور جاہ پسندی سے منہ موڑ لیا جائے، ایک نئے انداز کی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالنے کے بجائے خلوص نیت سے وہی کیا جائے جو کہا جاتا رہا ہے تو عوام کی جھلاہٹ رفع ہوجائے گی۔ ضرورت ہے کہ انھیں قناعت کا سبق پڑھانے کی بجائے ان کی خودی کو اُبھارا جائے جیسے بعض دوسرے ملکوں میں ہوا ہے۔ اللہ کبھی اس پر برہم نہیں ہوسکتا کہ کوئی قوم اپنے حالات کو مدنظر رکھ کر اپنے وسائل کی تقسیم کا مناسب انتظام کرلے۔

(۲)

ان کا طرز حکومت جمہوری کہلاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مغز چند آدمیوں کے حصے میں آئے اور ہڈیاں عوام کے سامنے ڈال دی جائیں۔ یہ اپنے مسائل طاقت ہی سے حل کرتے ہیں مگر اسے اشتراک باہمی کا نام دیتے ہیں۔ اس کے حاکم خود کو عوام کا نمائندہ کہتے ہیں۔ عوام ہی انھیں حکومت کے لیے منتخب کرتے ہیں لیکن یہ ان کی مالی قوت ہی ہوتی ہے جو انھیں اقتدار کی کرسی پر پہنچاتی ہے لیکن وہ اسے عوام کی قوت اور رائے عامہ کہتے ہیں۔ حالاں کہ رائے عامہ مالی قوت ہی سے خریدی جاتی ہے۔ انھیں منتخب ہونے کے لیے اپنے مخالفوں کے خلاف بڑے بڑے محاذ قائم کرنے پڑتے ہیں۔ ایک خطرناک جنگ شروع ہوتی ہے اور اس جنگ کو رائے عامہ ہموار کرنا کہا جاتا ہے۔ اس میں بھی طاقت ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ آخر ایک آدمی مخالفوں کو کچلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

(۳)

ہماری زمین کے سینے میں کیا نہیں ہے، مگر ہم مفلس ہیں... کاہل ہیں... ہمیں باتیں بنانی آتی ہیں۔ ہم تقریر کرسکتے ہیں، ایک دوسرے پر اپنی ذہنی برتری کا رعب ڈال سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتیں ضائع کرسکتے ہیں۔ لیکن ہم سے تعمیری کام نہیں ہوسکتے۔

(۴)

میں جانتا ہوں کہ حکومتوں سے سرزد ہونے والے جرائم، جرائم نہیں حکمت عملی کہلاتے ہیں۔ جرم تو صرف وہ ہے جو افرادی حیثیت سے کیا جائے۔

(۵)

تربیت ضروری چیز ہے۔ یہ کیا کہ ایک معمولی کلرک کو کلرکی کا امتحان دینا پڑے۔ ایک پولیس کانسٹیبل، رنگروٹی کا دور گزارے بغیر کام سے نہ لگایا جائے لیکن ترکاریوں کے آڑھتی، بے مروت جاگیردار اور گاوٗدی قسم کے تاجر براہ راست اسمبلیوں میں جابیٹھیں اور قانون سازی فرمانے لگیں اور ان ہی میں سے کچھ کابینہ کے ارکان بن جائیں، سوچنے کی بات ہے کہ نچلی سطح پر امتحانات اور ٹریننگ کا چکر چلتا رہے اور اوپر جس کا دل چاہے، پہنچ جائے۔ بس جیب بھاری ہونی چاہیے، نہ کوئی امتحان اور نہ کوئی ٹریننگ۔

(۶)

میرا ابھی اسی پر ایمان ہے کہ یہ ساری دنیا کے خلاف صیہونی سازش ہے۔ یہودی خود کو بقیہ نسلوں سے برتر سمجھتے ہیں اور ساری دنیا پر اپنا قبضہ چاہتے ہیں۔ منشیات سے قبل انھوں نے جنسیت کی وبا پھیلائی تھی۔ فرائڈ کو پڑھا ہے تم نے؟...... جنسیت کے گرد ایسی دیو مالائی فضا بکھیری ہے اس نے کہ اس کے دَور کے نوجوان پاگل ہوگئے تھے۔ اُدھر ایک جرمن ماہر معاشیات اخلاقیات کو اضافی قدر قرار دے چکا تھا۔ جوانی بہک جانے کے بہانے چاہتی ہے۔ اسے سائنٹفک طور پر اس دھرّے پر ڈالا گیا۔ وہ زمانہ یاد کرو جب انگلینڈ میں ڈی۔ ایچ۔ لارنس کا جینا دوبھر کردیا گیا تھا۔ حالاں کہ وہ ایک مفکر ناول نویس تھا۔ کچھ باتیں معمولی طور پر کھل کر کہہ دی تھیں ان میں اس کا فن اظہار کا ذریعہ تھا۔ جن میں لذت اندوزی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس بیچارے پر مقدمہ چلا۔ کتابیں ضبط ہوئیں۔ آج اسی انگلینڈ کو دیکھو کہ میرے ہی ملک [اٹلی] کے ایک چھچھورے ناول نویس ابرٹو موراویا کے ترجموں سے وہاں کے بازار پٹے پڑے ہیں۔ اب منشیات کی وبا آئی ہے۔ مایوسی پھیلانے

والے لٹریچر کے ذریعے پہلے ان کے گرد قنوطیت کی دیواریں کھڑی کی گئیں۔ پھر مفلوج کر دینے والی منشیات کا چکر چلا دیا گیا۔

(۷)

یہی آدمیت کی معراج ہے کہ آدمی پر دکھ اور سکھ کا کوئی اثر نہ ہو۔ خوشی اور رنج دونوں اس کے لیے بے معنی الفاظ ہو کر رہ جائیں۔ اگر دنیا یونان کے قدیم فلسفیوں کے نقش قدم پر چلی ہوتی تو آج نہ کوئی تپ دق میں مبتلا ہوتا اور نہ خوشی کی زیادتی کی وجہ سے کسی کا ہارٹ فیل ہوتا... کسی جذبے کا ہم پر جو اثر ہوتا ہے وہ داخلی نہیں بلکہ صدہا سال کے خارجی تجربات کا نتیجہ ہے۔

(۸)

رَحم دل آدمی دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے۔ یہ لفظ رَحم دلی دراصل چالاک بزدلوں کا تراشا ہوا ہے۔ جس کام کی ہمت نہیں پڑتی اسے رحم دلی کے خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور جس کام کے کر گزرنے کی سکت ہوتی ہے اسے دوسرے خوب صورت نام دیے جاتے ہیں۔ خواہ اس میں بربریت کی حد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ بیسویں صدی ہے ہرمین۔ جب اس کے نام پر خون بہایا جاتا ہے جو تم سے متفق نہ ہو نہایت اطمینان سے اس کی گردن اڑا کر اعلان کر دو کہ یہ اس عالم کے لیے بہت ضروری تھا۔ آدمیوں کی طرح سوچنا سیکھو ہرمین! فرشتہ بن کر آدمیوں میں رہنا مشکل ہے۔

(۹)

حمید: اکثر محبت کرنے محبوب کی موت نہیں برداشت کر سکتے۔

’کہانیاں ہیں فرزند۔ جب ایک ماں جوان بیٹے کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتی ہے تو یہ سب کچھ قطعی بکواس ہے‘۔ فریدی نے کہا۔

’بہتیرے واقعات ہیں‘۔

’موت کے واقعات نہ ہوں گے۔ وہ صرف جدائی کے قصے ہوتے ہیں۔ اگر تمھاری محبوبہ تم سے جدا ہو کر کسی اور کے پہلو میں پہنچ جائے تو تم یقیناً خودکشی کر لو گے۔ لیکن وہ محبت نہیں ہوگی۔ وہ ٹھیس لگے گی تمھاری مردانگی کو۔ تمھاری انا مجروح ہوگی۔ اور غیرت خودکشی پر آمادہ کر دے گی‘۔‘‘

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ فن کردار نگاری جو کسی بھی کہانی، افسانے یا ناول کا بنیادی وصف ہوتا ہے، ابن صفی کے قلم کی بدولت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوام حاصل کر چکا ہے۔ ارفع و اعلیٰ ادب کے ’’رہنماؤں‘‘ کو پتا ہی نہ چلا کہ ۲۶؍ جولائی ۱۹۸۰ء کے دن اُن کے درمیان سے کس بلا کا کردار نگار اٹھ گیا۔ ادب کے ان رہنماؤں کی نظر میں جرم و سزا کی کوئی وقعت ہی نہیں۔ یہ لوگ نہیں جانتے کہ جرائم

کس طرح سماج کو تنزلی کی جانب دھکیلتے ہیں۔ جرائم اور سماج کی مثال آندھی اور جھونپڑیوں کی سی ہے، ازل ہی سے جرائم انسانی زندگی اور سماج پر آندھیوں کی طرح جھپٹتے آئے اور ان کے تدارک کے لیے اچھے سے اچھا ادب پیدا کرنا ادیبوں کا فرض ہے۔ اسے تیسرے درجے کا ادب قرار دے کر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا ناانصافی ہے۔ انگریزی ادب میں جاسوسی کردار نگاری کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ ایڈگر ایلن پو (۱۸۰۹ء۔ ۱۸۴۹ء)، زیڈگ از والٹیئر (۱۶۹۴ء۔۱۷۷۸ء)، تھری مسکیٹرز از الیگزینڈر ڈوما (۱۸۰۲ء۔۱۸۷۰ء)، ہیومن کومیڈی از بالزاک (۱۷۹۹ء۔۱۸۵۰ء)، مون اسٹون از وکی کولنز (۱۸۲۴ء۔۱۸۸۹ء)، بلیک ہاؤس از چارلس ڈکنز (۱۸۱۲ء۔۱۸۷۰ء)، گن فار سیل از گراہم گرین وغیرہ وغیرہ۔

اردو ادب کی کئی نامور شخصیات ابن صفی کے فن کو سراہتی نظر آتی ہیں۔ جون ایلیا سے روایت ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک بار کہا تھا کہ اس شخص (ابن صفی) کا اردو پر بہت بڑا احسان ہے۔ ان کے علاوہ جن اشخاص نے ابن صفی کی برملا تعریف کی ہے ان میں پروفیسر حسن عسکری، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ابراہیم جلیس، سرشار صدیقی، شاعر لکھنوی، رئیس امروہوی، جون ایلیا، امجد اسلام امجد، کالم نگار حسن نثار، شاعر و فلمی کہانی نویس جاوید اختر، عبید اللہ بیگ (مشہور ٹی وی پروگرام کسوٹی کے میزبان)، منیر حسین (مشہور کرکٹ کمنٹیٹر)، معراج رسول (جاسوسی و سسپنس ڈائجسٹ)، پروفیسر گوپی چند نارنگ، بشریٰ رحمٰن، قاضی اختر جونا گڑھی، ڈاکٹر خالد جاوید، دہلی، شاہد منصور، صحافی و ادیب مشتاق احمد قریشی، پروفیسر انوار الحق، حریت کے کالم نگار و مشہور ادیب وصحافی نصر اللہ خان وغیرہ وغیرہ۔ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ میں ڈاکٹر سلیم اختر نے ابن صفی کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح اردو کے ممتاز افسانہ نگار سید محمد اشرف نے 'ذہن جدید' کے ادب پیما میں اردو کے دس بڑے لکھنے والوں میں ابن صفی کا نام لیا ہے۔

یہاں محترم رئیس امروہوی کا ابن صفی کے انتقال کے بعد مندرجہ ذیل بیان گویا اعترافی بیان سمجھا جانا چاہیے۔ ابن صفی پر اپنے مضمون 'جوئے خوں بہتی ہے'[۱۳] میں رئیس صاحب لکھتے ہیں:

> جب تک ابن صفی زندہ تھے، ہم سمجھتے تھے کہ ہم ان سے بے نیاز ہیں لیکن اب ہمیں اپنی محرومی اور نیازمندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کس بے شرمی اور سنگ دلی سے اپنے ایک باکمال ہم عصر کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ یہاں 'ہم' سے مراد عام قاری نہیں کہ وہ تو ابن صفی کا عاشق تھا۔ 'ہم' سے مراد وہ لوگ ہیں جو ناول، افسانے اور داستان سرائی کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔

سنہ ۲۰۱۲ء میں راقم کے نام ایک خط میں پاکستان کے ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان مرحوم نے یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ بھی ابن صفی کے پڑھنے والوں میں شامل تھے۔

جامعہ ملیہ نئی دہلی کے استاد اور مصنف ڈاکٹر خالد جاوید نے ایک بار کہا تھا:

ابن صفی اردو میں ایک روایت کا نام ہیں مگر یہ روایت ان کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔ ہماری تنقید نے ان کے ساتھ سگا یا سوتیلا، کسی قسم کا برتاؤ نہیں کیا۔ یہ اسی قسم کی صورتحال ہے جیسے اعلیٰ قسم کا فلم بین طبقہ اور سنیما کے ناقدین نصیر الدین شاہ کے ساتھ دلیپ کمار کا نام لیتے ہوئے ہونٹ دبا لیتے ہیں یا موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھنے والا طبقہ اشرافیہ بھیم سین جوشی کے ساتھ محمد رفیع کے بارے میں کچھ کہنے میں ہتک محسوس کرتا ہے۔ تو کیا 'پاپولر' کو صرف اس لیے نکال باہر کیا جائے کہ عوام نے اسے پسند کیوں کیا۔ ترقی پسند حضرات کو اس پر اور بھی زیادہ غور وخوص کرنے کی ضرورت ہے۔

کاش کہ کوئی اس بارے میں سوچے کہ شہر کراچی کی، جہاں ابن صفی تمام عمر قیام پذیر رہے اور اب اسی کی مٹی میں سو رہے ہیں، کوئی سڑک، فلائی اوور یا کسی عمارت کا نام ان کے نام پر رکھ دیا جائے۔ اسی طرح جامعات میں ابن صفی کے فن وشخصیت کے مختلف پہلوؤں پر بلا تاخیر تحقیقی کام شروع ہونا چاہیے کہ اس سے فن جاسوسی ناول نگاری کے خدوخال ابھر کر سامنے آئیں گے۔ اس سلسلے میں یہ خبر ابن صفی کے پرستاروں کے لیے یقیناً اہم ہوگی کہ پروفیسر شبنم امان نے ابن صفی پر کراچی سے اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرلیا ہے۔ مذکورہ پی ایچ ڈی، ابن صفی پر پاکستان سے کی جانے والی پہلی پی ایچ ڈی ہے۔

ابن صفی کی ادبی حیثیت کا تعین نہ ہوسکا۔ ابن صفی اور جاسوسی ادب سے ادب کے ٹھکیداروں کی الرجی ختم نہ ہوسکی۔ جدید جاسوسی ادب کی تاریخ ابن صفی کو کبھی فراموش نہ کرسکے گی اور اگر اس گناہ کی مرتکب ہوئی تو اس کا حشر بھی ان نقالوں کا سا ہوگا جو ابن صفی کے نام کے قافیے سے ملتے جلتے نام رکھ کر پڑھنے والوں کو دھوکا دیتے رہے ہیں۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی اطاعت سے مسلسل روگردانی کرتی ہے تو آخر کار غیرت الٰہی جوش میں آجاتی ہے اور طرح طرح کے عذاب نازل ہوتے ہیں لیکن جس قوم کو سب سے بڑھ کر عبرتناک سزا دینا مطلوب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو مسخ کردیتا ہے اور ایسے لوگ اپنی شناخت گم کردیتے ہیں۔ اردو ادب کے ان نام نہاد ٹھکیداروں کا چہرہ بھی مسخ ہوگیا ہے۔ ان کی شناخت گم ہوگئی ہے۔! جہاں قول، فعل کو اپنے پیچھے ہانپتا ہوا چھوڑ آئے، وہاں حرف اپنی حرمت وتاثیر کھو دیتا ہے۔

ابن صفی ایک ایسا بت تھے جسے توڑنے کی، مایوس و پژمردہ کرنے کی، نیچا دکھانے کی اور اس کی نقالی میں قارئین کو گمراہ کرنے کی بڑے بڑے بت شکنوں نے تمام عمر سعی کی تھی۔ مگر جب ایسے لوگوں کے ہتھوڑے اور تیشے اس بت کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ستانے لگتے تھے، وہ ٹکڑے ازسرنو اکٹھا ہوکر اس خوب صورت بت کی صورت اختیار کرلیتے تھے جس کا نام ابن صفی ہے اور جو اپنے تنقیص نگاروں کو مخاطب کر کے اپنی نرم، شیریں اور مدھم آواز میں کہتا ہے:

فہم وفراست خواب کی باتیں، جاگتی دنیا پاگل ہے
عقل کا سورج ماند ہوا ہے، ذروں کی بن آئی

ابن صفی نے جس مسلک کج کلاہی کی سمت ایک دفعہ اپنا قبلہ راست کرلیا، پھر اسے تاعمر نہیں بدلا اور اپنے اسی عہد وفا میں علاج

گردش لیل ونہار ڈھونڈا۔ اور یہ انھوں نے اس زمانے میں کیا جب اردو زبان کے سری ادب کو تازہ خون کی اشد ضرورت تھی۔ کتنے ایسے ہیں جو قریباً نصف صدی تک ایک ہی وضع پر قائم رہے ہوں؟ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ابن صفی کے چنے ہوئے راستے سے ادب کے رہنماؤں کو اختلاف رہا ہے لیکن اپنی تحریروں کے ذریعے اردو زبان کے پھیلاؤ، قانون کا احترام اور پڑھنے والوں کی ذہنی وفکری تربیت جیسے کام جس پامردی واستقامت سے انھوں نے کیے، وہ لائق تحسین وتکریم ہیں۔ ابن صفی اس طرح جیے، جس طرح جینا چاہیے اور یوں شتابی سے رخصت ہوئے جس طرح وہ رخصت ہونا چاہتے تھے:

جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف ودع کی صورت
للہ الحمد! با انجام دل دل زدگاں
کلمہ شکر بنام لب شیریں دہناں

ابن صفی کے ادبی مقام کا تعین کرنا ہماری سب سے بڑی اخلاقی ذمے داری ہے۔

حواشی:

۱۔ فرزند ابن صفی، ابرار صفی، شکاگو میں قیام پذیر ہیں۔
۲۔ ابن صفی، پاپوش نگر کے قبرستان میں مدفون ہیں۔
۳۔ ناظم آباد کا مذکورہ گھر جون ۲۰۱۷ء میں مسمار کر دیا گیا تھا۔ اب اس کی جگہ اپارٹمنٹ بن گئے ہیں۔
۴۔ مکمل نام ڈاکٹر رحمٰن ماسا۔ مستقل قیام امریکا کی ریاست فلوریڈا میں ہے۔
۵۔ ابن صفی کے سب سے چھوٹے فرزند، افتخار صفی، مستقل قیام امریکا میں ہے۔
۶۔ اصل نام (پروفیسر) مجاور حسین رضوی، حیات ہیں اور الٰہ آباد میں قیام پذیر ہیں۔ ان کے فرزند سعید حیدر سے راقم کی گفتگو ۱۵رمئی ۲۰۲۲ء کو ہوئی تھی۔ ان کے مطابق، ان کے والد کی درست تاریخ پیدائش ۵راکتوبر ۱۹۳۰ء ہے۔ راقم کے کرم فرما جناب اسرار گاندھی (الٰہ آباد) ایک برقی پیغام میں لکھتے ہیں:

> عباس حسینی کا 'نکہت' پبلی کیشنز اپنے عروج پر تھا۔ جاسوسی دنیا کے علاوہ رومانی دنیا بھی پوری آب وتاب کے ساتھ نکل رہا تھا۔ انھی دنوں نہ جانے کیسے مجاور حسین رضوی کو یہ خیال گزرا کہ نکہت پبلی کیشنز کی تمام کامیابیاں انھی کی ذات سے ہیں۔ اس بات کو سن کر عباس حسینی بہت دل گرفتہ ہوئے۔ ادھر مجاور صاحب نے 'میری دنیا' کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ قائم کرلیا۔ پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ 'میری دنیا' بند ہوگیا اور مجاور صاحب خاصی پریشانیوں میں گھر گئے۔ عباس صاحب پھر عباس صاحب تھے۔ انسانوں سے پیار کرنے والے 'بھیا' تھے۔ انھوں نے مجاور صاحب کو دوبارہ نکہت میں شامل کرلیا۔ (عباس صاحب چند باتیں از اسرار گاندھی، الٰہ آباد، اکتوبر ۲۰۱۲ء)

۷۔ ابن صفی پانی کے جہاز سے بمبئی سے کراچی پہنچے تھے۔ یہ اگست ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ ابن صفی کی سگی بہن ریحانہ لطیف (بلاغت خاتون) ہجرت کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

پلیٹ فارم پر جہاں تک نظر جاتی اسرار ناروی کے چاہنے والے نظر آتے تھے جن میں بھائی جان کے احباب وشاگرد دونوں ہی شامل تھے۔ پاکستان آنے سے قبل بھائی جان یادگار حسینی اسکول میں ٹیچر تھے۔ لمبا سفر وہ بھی ہجرت۔ سامان بے تحاشا تھا۔ قلی سامان کی طرف لپکے لیکن بھائی جان کے شاگردوں نے سامان کو ہاتھ بھی نہ لگانے دیا۔ منع کرنے کے باوجود خود ہی سارا سامان ٹرین پر چڑھایا۔ وہاں پر موجود لوگ اس قدر پر جوش روانگی دیکھ کر سمجھے کہ ہم لوگ حج کرنے جارہے ہیں۔ اس زمانے میں ہندوستان کے کسی بھی گوشے سے حاجی براستہ الٰہ آباد بمبئی جاتے تھے۔ ٹرین کے ذریعے ہم نے بمبئی تک سفر کیا اس کے بعد کراچی پہنچنے کے لیے سمندری سفر شروع کیا۔

[بحوالہ: میرے بھائی جان۔ ریحانہ لطیف۔ نئے افق ڈائجسٹ۔ اگست ۱۹۸۶ء]

۸۔ راقم نے ۱۹۵۶ میں شائع ہوئے عمران سیریز کے ناول بھیانک آدمی پر درج پتے کی مدد سے مذکورہ مکان ڈھونڈھ نکالا تھا۔ مذکورہ مکان آج بھی تقریباً اپنی اصلی شکل میں قائم ہے

۹۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ الٰہ آباد کے محلہ راجا پور میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے شاگردوں میں ممتاز حسین، وقار عظیم، جلیل قدوائی، مجتبیٰ حسین، مصطفیٰ زیدی، بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی وفات فروری ۱۹۷۵ء میں مظفر پور (بہار) میں ہوئی اور تدفین الٰہ آباد میں کی گئی۔ ۱۹۶۵ء میں کاروان پبلشر، الٰہ آباد سے شائع ہوئی ڈاکٹر اعجاز حسین کی خودنوشت 'میری دنیا' ادبی حلقوں میں خاصی مشہور ہوئی تھی۔ راقم الحروف نے مذکورہ کتاب کو ۲۰۲۱ء میں 'زندہ کتابیں' سے شائع کیا تھا۔

۱۰۔ بقلم خود۔ الف لیلہ ڈائجسٹ، کراچی۔ جولائی ۱۹۷۲ء

۱۱۔ الف لیلہ ڈائجسٹ، ابن صفی نمبر، جولائی ۱۹۷۲ء

۱۲۔ نئے افق ڈائجسٹ، اگست ۱۹۹۳ء

۱۳۔ نئے افق ڈائجسٹ، سنہ اشاعت نامعلوم

فخر الدین کیفی ٭

ابنِ صفی — دنیائے اردو ادب کا منفرد مصنف

ابن صفی سے ہمارا رشتہ مصنف اور قاری والا ہی تھا۔لیکن اب... ٹھہریے پہلے یہ بتادیں یہ رشتہ کب اور کیسے قائم ہوا۔یہ اسکول کے زمانے کی بات ہے شاید ۱۹۵۷ء یا ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ہم اپنے ماموں کے گھر گئے ہوئے تھے۔اس زمانے میں ہمیں ناول وغیرہ پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔بس اسکول لائبریری سے انگریزی کی ''اسٹوری بکس'' ملتی تھیں۔ان میں سے ہمیں اینڈ بلائیٹن (Enid Blyton) ایسی بھائیں کہ پھر عرصے تک کسی اور مصنف کو ہاتھ نہیں لگایا۔ماموں کے گھر کوئی مصروفیت نہ تھی۔

اکتاہٹ کا شکار ہوکر وہاں موجود کتابوں کی طرف دیکھنا پڑا۔ایک کتاب ''نیلے پرندے'' نے ہماری توجہ مبذول کرالی تو لے کر بیٹھ گئے۔اردو میں پڑھنے کی رفتار بہت کم تھی اس لیے تقریباً دو گھنٹوں میں پڑھی۔کتاب ایسی بھائی کہ پھر ابن صفی کے اسیر ہو گئے۔ دوسری کتاب ''پاگل خانے کا قیدی'' تھی۔ پھر چل سو چل۔ایک آنہ روز والی لائبریری سے تعارف ہوا اور روزانہ ہی دوپہر کسی نہ کسی کتاب کی نظر ہونے لگی۔ پھر چار آنے روز کے ساتھ ساتھ ہر پندرھویں دن نئی کتاب بھی خریدنے لگے۔ایک دن فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں میں ابن صفی کی کتابیں دیکھیں تو مزا آ گیا۔جتنی ہاتھ لگی خرید لائے۔

اس زمانے میں توجہ صرف ابن صفی کے نام پر رہی کوئی تجسس نہ تھا کہ مصنف کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کرتے۔

ایک دن ''ہیروں کا فریب'' خرید لائے تو معلوم ہوا کہ نقلی ہے۔ پھر اصلی کتاب ملنے پر آگاہی ہوئی کہ کئی لوگ ابن صفی سے ملتا جلتا نام استعمال کر رہے ہیں۔زیر، زبر، پیش کے ساتھ نقطوں (یا نکتوں) کا استعمال بھی دھوکہ دہی میں اتنا ہوا کہ ابن صفی کو کتاب کے لیے ٹریڈ مارک (Trade Mark) بنوانا پڑا جو شاید دنیائے ادب میں ایک منفرد قدم تھا۔ یہ کتابوں کو چربہ سازی سے بچانے کی ابتدا تھی جو بالآخر ابن صفی صاحب کی تصویر تک پہنچ گئی لیکن چربہ سازی کو نہ روک سکی اور بازار میں بیسیوں ابن صفی، بن صفی، این صفی، ابّن صفی اور ابن صیفی کی بھرمار اتنی ہوگئی کہ سنا ہے یہ ابن صفی صاحب کی بیماری کا سبب بن گئی اور قارئین تقریباً تین سال تک نئی کتابوں سے محروم رہے (تین برسوں میں ہر ماہ دو کتاب کے حساب سے ہم تقریباً ۷۲ کتابوں سے محروم کر دیے گئے)۔

اس تعارف کے بعد اپنے ابتدائی کلمات کی طرف چلتے ہیں کہ ابن صفی سے ہمارا رشتہ مصنف اور قاری والا ہی تھا۔لیکن اب... جی اب عقیدت والا ہے۔عقیدت کے رشتے سے پہلے استاد اور شاگرد کا رشتہ بھی ہو گیا۔عقیدت مندی اور شاگردی والے دونوں رشتے ابن صفی صاحب کی بعد از وفات قائم ہوئے۔قاری والا رشتہ ان کی زندگی میں ہی قائم ہو گیا تھا لیکن بہت مضبوط... مطلب یہ کہ قاری

٭ حیدرآباد۔فون: ۰۳۳۳-۲۱۰۷۱۳۸

تو کسی ایک کتاب کے پڑھنے سے بھی ہوسکتا ہے لیکن یہاں تو ان کی تمام تصانیف کے ایسے قاری تھے کہ ہر کتاب کم از کم دس بار پڑھی۔(کچھ کتابیں ایسی بھی جو محاورتاً نہیں حقیقتاً کہہ سکتے ہیں ’’بیسیوں بار پڑھی ہیں)۔لیکن اس معاملے میں بھی ہم نمبر دو ہو گئے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سندھی بولنے والے ڈاکٹر سے دوران گفتگو معلوم ہوا کہ انھوں نے اردو ابن صفی کی وجہ سے سیکھی اور ہر کتاب اتنی بار پڑھی کہ کسی کتاب سے کوئی جملہ کہیں وہ کتاب کا نام بتا دیں گے... ہم نے آزمایا اور درست پایا۔اس دن یہ بھی علم ہوا کہ ابن صفی نے یہ بالکل درست لکھا تھا کہ مجھے اس وقت حقیقی خوشی ہوتی ہے جب کسی بنگالی بھائی کا خط ملتا ہے کہ میں نے اردو آپ کی کتاب کی وجہ سے سیکھی۔

استاد اور شاگردی کا رشتہ اس وقت قائم ہوا جب ہم نے ریٹائرمنٹ کے بعد لکھنے لکھانے کا شغل اپنا لیا۔اس وقت محسوس ہوا کہ ہمارے قلم میں روانی (یہ خودنمائی نہیں) ابن صفی صاحب کی مرہون منت ہے۔کیوں کہ کالم وغیرہ لکھتے ہوئے عموماً ابن صفی سے رہنمائی مل جاتی ہے۔رفتہ رفتہ یہ رشتہ عقیدت میں بدل گیا جس کا احساس اس وقت ہوا جب جناب احمد صفی صاحب (فرزند ابن صفی) سے فیس بک پر واقفیت ہوئی۔اس وقت نہیں معلوم تھا کہ احمد بھائی فرزند ابن صفی ہیں۔ایک دوست کی بدولت یہ علم ہوا تو ہمیں ایک خاص کشش کا احساس ہوا۔اور اتفاق سے ادھر سے بھی کچھ ایسی ہی پزیرائی ہوئی اور احمد بھائی نے ہمیں کیفی بھائی کے درجے پر فائز کر دیا۔اس تعلق کے بعد ابن صفی صاحب کے بارے میں علم ہوا کہ ان کو بھارت میں وہ مقام مل رہا ہے جو پاکستان میں نہیں مل سکا۔اس ہی دوران جناب خرم شفیق سے بھی غائبانہ تعارف ہوا جنھوں نے ابن صفی کی تصانیف کے اقتباسات پر مبنی ’’سائیکو مینشن‘‘ ہمیں ارسال کی۔اس کے علاوہ انھوں نے ’’رانا پیلس‘‘ بھی تحریر کی لیکن وہ ہمیں اب تک نہ مل سکی...

ہم نے ایک دو کالموں میں ابن صفی کے ریفرنس بھی دیے اور انھیں کئی مضامین میں کوٹ (Quote) بھی کیا لیکن تشفی نہ ہوئی یا یہ کہیئے ’’حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا‘‘ اس لیے دو ایک مضامین ابن صفی پر لکھے جو روز نامہ ’نوائے وقت‘‘ میں شائع ہوئے... ایک مضمون ابن صفی پر لکھی گئی ’’ابن صفی کون؟‘‘ میں بھی شامل ہوا۔

جناب خرم شفیق صاحب کی کاوشوں سے ایک تحریک ہوئی اور ہم نے ایک مضمون میں قارئین کو مشورہ بھی دیا کہ ابن صفی پر مقالہ لکھنے کی کافی گنجائش ہے۔ان کی منظر نگاری پر لکھا جاسکتا ہے۔وہ منظر نگاری مختصر الفاظ میں بھی اتنی پُر اثر انداز میں کرتے ہیں کہ کئی کئی صفحات پر مشتمل منظر نگاریاں ماند پڑ جاتی ہے۔یہ ابن صفی کا خاصہ ہے کہ بڑے سے بڑے مسئلے کو سو/ ڈیڑھ سو صفحات میں نمٹا دیتے ہیں جس کے لیے کئی ادیب ہزار پانچ سو سے کم صفحات نہیں استعمال کرتے۔

دوسرا موضوع ابن صفی کے منفی کردار بھی بن سکتا ہے۔ابن صفی نے جہاں فریدی، حمید یا عمران جیسے مرکزی کردار تخلیق کیے وہیں ان تینوں مرکزی کرداروں کے حوالے سے ثانوی کردار بھی تخلیق کیے... مثلاً۔جاسوسی دنیا میں قاسم، شہناز، کنول۔ملازم نصیر، ڈی آئی جی صاحب یا عمران سیریز میں جوزف، صفدر، جولیانا، کیپٹن فیاض وغیرہ... یہ فقط چند ہیں ورنہ یہ بھی اتنے ہیں کہ ان کا تعارف تو کُجا، صرف نام لکھنے کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے... یہ سب ہی ذہن سے چپک کر رہ جانے والے کردار ہیں لیکن ان کے منفی کرداروں کا کیا کہنا۔جن کے لیے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ریسرچ کرنے والوں کے لیے بہترین مواد بن سکتے ہیں۔

ہم نے پہلے ہی اعتراف کر لیا ہے کہ ہم سے اب تحقیقی کام نہیں ہوتا اس لیے یہ چاہتے ہیں یہ کام کوئی اور اپنے ذمے لے

لے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ منفی کرداروں کا سرسری جائزہ لے تو رہے ہیں لیکن یقین نہیں کہ حق اد ہو جائے۔ بہر حال ایسے کرداروں میں تھریسیا اور سنگ ہی تو سرفہرست ہیں۔ لیکن فنچ یا ڈاکٹر ڈریڈ بھی کم نہیں۔ لیونارڈ اور جیرالڈ شاستری کا بھی تجزیہ کیا جا سکتا ہے... ڈاکٹر ٹسڈل کی بے چارگی ہو یا ڈاکٹر نارنگ کی سفا کیت، بہترین موضوع بن سکتے ہیں... ایسے منفی کردار بھی ہیں جو قابل رحم بھی ہیں... جیسے لاش کا بلاوہ کے دو کردار... یا سائے کی لاش کی مجرمہ لیڈی تنویر... بہر حال ایسے منفی کردار بھی صرف ابن صفی ہی تخلیق کر سکتے تھے جن سے بیک وقت ہمدردی بھی ہوتی تھی لیکن انکا انجام بھی بد تر ہی چاہا جاتا تھا۔

مقالہ لکھنے والوں کو تقریباً دو سو سے زئد ایسے منفی کردار ملیں گے جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ مجرمانہ ذہنیت کی وجوہات بھی زیر بحث آسکتی ہیں۔

ابن صفی نے کوئی خانہ خالی نہیں چھوڑا... ہر معاملے میں پرفیکشنسٹ ہی رہے... مرکزی کردار ایسے کہ قاری نے اپنے ذہن میں انکا خاکہ بنا لیا۔ اس کا منفی پہلو یہ رہا کہ ان کرداروں کو فلمانے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہم نے بالی ووڈ، بالی ووڈ اور لالی ووڈ کے بہترین اداکاروں کو فریدی، حمید اور عمران کے روپ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی بھی معیار پر پورا تو کیا تھوڑا بھی نہ اتر سکا... افسوس یہ کہ اگر ان ناولوں کے مرکزی کرداروں کو کوئی اور نام دے کر فلمایا گیا تب بھی ناظرین قبول نہیں کریں گے... یہ ناول اور کردار کچھ اس ہی طرح سے یک جان ہو گئے ہیں کہ ان ناولوں سے فریدی، حمید یا عمران کو کوئی اور نام دیکر دوبارہ لکھا جائے تو بھی شاید لوگ اسے بھی پسند نہ کر پائیں گے اور یہ ہی خوبی ابن صفی کو منفرد بناتی ہے... شاید یہ وجہ ہے کہ مصنّفین عمران کے نام والے کردار پر ناول لکھ کر خوب کما رہے ہیں۔

دنیا کے بہترین مصنّفین نے بھی کردار تخلیق کیے لیکن وہ کردار انفرادیت قائم نہ رکھ سکے۔ ان کرداروں کو کئی اداکاروں نے نبھایا اور کامیابی سے۔ مثال میں ہم دینا کے مشہور ترین مصنف آئین فلیمنگ کے کردار جیمس بانڈ 007 کو پیش کرتے ہیں جسے ایک سے زائد ایکٹروں پر فلمایا گیا اور ہر کردار جیمس بانڈ سے زیادہ شون کانری، راجر مور یا ٹموتھی ڈالٹن ہی رہا۔ ہر ایکٹر جیمس بانڈ کی بجائے ایکٹر ہی رہا۔

ہم دعوے سے کہتے ہیں دنیا کا کوئی ایکٹر فریدی یا عمران کا رول نہیں کر سکتا۔ عمران کے چہرے پر برسنے والی حماقت میں اس کی وجاہت اور مردانہ حسن کو برقرار رکھنا اور پھر وقت پڑنے پر اس طرح بدلنا کہ اس کے اپنے ساتھی جو اس کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ کانپ جاتے ہیں۔ فریدی کی مردانہ وجاہت اور خوب صورت چہرے پر نیم غنودہ آنکھیں۔ کوئی بھی اداکار پیش نہیں کر سکتا... کوئی ایکٹر ایسا نہیں جو فریدی یا عمران کا رول کرے اور لوگ اس ایکٹر کو بھول جائیں... یہ ہی ابن صفی کے کرداروں کی لافانیت ہے...

ابن صفی نے ایک فلم دھماکہ بنائی لیکن عمران کی جگہ ظفر الملک کو دے دی... یقین سے کہتے ہیں اگر کردار عمران ہوتا تو فلم فلاپ نہیں ہوتی لیکن مشکل تھی کہ کردار کون کرتا؟

ابن صفی کا کمال ہے کردار ہی نہیں ایکسٹو کی آواز کو بھی منفرد بنا دیا۔ ایکسٹو کا کوئی خاکہ نہیں صرف آواز ہے لیکن فلم میں ایکسٹو کی آواز بھی ناظرین نے قبول نہیں کی حالاں کہ یہ آواز خود ابن صفی نے اپنی آواز میں پیش کی تھی۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ ابن صفی کے ناولوں کو فلمانا کتنا مشکل ہے... کرداروں کے نام بدل کر فلما تو سکتے ہیں۔ کہانی کی وجہ سے فلم کامیاب بھی ہوسکتی ہے لیکن عمران اور فریدی کے چاہنے والوں کو اس طرح اپنی طرف نہ لا سکے گی جس طرح وہ عمران یا فریدی کے نام پر آتے...

شاہد الیاس شامی ٭

ابنِ صفی

تجسّس کا لفظ انسانی کیفیت میں ایسا ہے جس میں دل کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی ہیں اور انسان لمحہ بہ لمحہ یہ سوچتا ہے کہ اب کیا ہوگا اور جب کیا ہوگا اور اگر آپ کوئی ایسی کہانی، واقعہ، افسانہ یا ناول پڑھنے بیٹھیں اور لکھنے والا کوئی ایسا جادوگر ہو جو آپ کو کتاب ختم ہونے تک اپنی جگہ سے نہ اٹھنے دے اور آپ اس کہانی کے اثر سے کئی دن تک نہ نکلیں تو یہ ایک بہت بڑی جادوگری ہے اور جاسوسی کہانیوں کی دنیا میں ایسے جادوگر کا نام اسرار احمد ہے جو دنیا بھر میں ابنِ صفی کے نام سے پہچانے گئے اور دنیا بھر میں جب بھی جہاں بھی اردو پڑھنے والے جاسوسی کہانیوں کی بات کریں گے تو جاسوسی کہانیوں کے خالق کے طور پر ابنِ صفی کو یاد کریں گے۔

اسرار احمد عرف ابنِ صفی ۲۶ر جولائی ۱۹۲۸ء کو الٰہ آباد کے قریب نارا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بیچلر آف آرٹس کی ڈگری حاصل کی۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آگئے اور ایک اسکول میں بحیثیت استاد کام کرتے ہوئے ناول لکھنا شروع کیے۔ انھوں نے ''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'' کے ناولوں سے دنیا بھر میں شہرت پائی۔

ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب میں آٹھویں جماعت میں تھا تو میں نے اسے محلے کی لائبریری میں ایسا لوگوں کا ہجوم دیکھا جیسے کوئی جھگڑا ہوگیا ہو۔ اس لائبریری کا نام تنویر لائبریری تھا۔ میں وہاں پہنچ کے یہ تماشا دیکھنے لگا تو پتا چلا لوگ ابنِ صفی کے ''عمران سیریز'' کے ناول کے بارے میں معلومات کر رہے ہیں۔ نوجوان، لائبریرین جو بزرگ تھے، ان سے بحث کر رہے تھے کہ آپ نے تو کہا تھا یہ ناول آج صبح آجائے گا مگر ہم تو صبح سے کئی چکر لگا چکے ہی اور جب وہ بزرگ انھیں سمجھا رہے تھے کہ ناول تو آگیا مگر آتے ہی مارکیٹ میں اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ اب کل دوبارہ چھپ کر آئے گا۔ لوگ ان کے ناول کی پیشگی رقم جمع کروا کے چلے جاتے تھے اور جب ناول پڑھنا شروع کرتے تھے تو یہ تھی ان کے قلم کی جادوگری تھی۔

قلم کے اس جادوگر نے جاسوسی کہانیوں کو ایک ایسا انداز دیا کہ رہتی دنیا تک لوگ جب بھی جاسوسی کہانیوں کا ذکر کریں گے تو ابنِ صفی کی عمران سیریز کا ذکر ضرور ہوگا۔ ۱۹۴۸ء میں عباس حسینی نے ماہ نامہ ''نکہت'' کا آغاز کیا تو شعبۂ نثر میں ابنِ سعید کو نگراں مقرر کیا گیا اور شعبۂ شاعری کا نگراں ابنِ صفی کو مقرر کیا گیا۔ ماہ نامہ ''نکہت'' میں ہی ان کی پہلی کہانی ''فرار'' شائع ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف قلمی ناموں سے طنز و مزاح اور کئی مختصر کہانیاں لکھیں، اس کے بعد عباس حسینی کے مشورے سے ابنِ صفی کے قلمی نام سے

٭ ترکی

جاسوسی دنیا کا سلسلہ شروع کیا، انسپکٹر فریدی جو مرکزی کردار پر مشتمل تھا، اور اس کا پہلا ناول ''دلیر مجرم'' مارچ ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ اگست ۱۹۵۲ء میں ابنِ صفی اپنی والدہ اور بہن کے ہمراہ پاکستان آگئے اور کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں رہائش اختیار کی۔ اگست ۱۹۵۵ء میں ابنِ صفی نے ''خوف ناک عمارت'' کے عنوان سے عمران سیریز کا پہلا ناول لکھا اور علی عمران کے کردار کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ نومبر ۱۹۵۵ء میں ''بھیانک آدمی'' نامی ناول کو کراچی اور الٰہ آباد میں شائع کروایا۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ابنِ صفی نے اسرار پبلی کیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جس کے تحت جاسوسی دنیا کا پہلا ناول ''ٹھنڈی آگ'' شائع ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں ابنِ صفی میں لیاقت آباد سے ناظم آباد آگئے جہاں انھوں نے باقی زندگی گزاری۔

ابنِ صفی نے ۲۰۰ سے زیادہ ناولوں کے جو کردار تخلیق کیے، وہ ان کی اپنی دریافت ہیں۔ ابنِ صفی کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ابنِ صفی کے ہر ناول کی اصل سے زیادہ نقل چھاپی جاتی تھی اور جعلی ناشران کے نام سے لاکھوں روپے کماتے تھے۔ ابنِ صفی کو جاسوسی کہانیوں کا سب سے بڑا لکھاری مانا جاتا ہے اور آئندہ بھی سو برس تک دوسرا ابنِ صفی آنا ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

ابنِ صفی کے ادبی قد کی بلندی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے فن کو بابائے اردو مولوی عبدالحق، پروفیسر مجنوں گورکھ پوری اور کالم نگار حسن نثار جیسی شخصیات نے سراہا۔ صرف مشرق ہی نہیں، مغرب میں بھی اردو زبان کی جرمن اسکالر خاتون کرسٹینا نے بھی ابنِ صفی کے کام کو سراہا۔

جاسوسی دنیا کا یہ شہنشاہ ۲۶/ جولائی ۱۹۸۰ء کو کینسر کے مرض میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوگیا۔ اپنے قلم سے لاکھوں لوگوں کو پُرمقصد تحریریں دینے والے ابنِ صفی کو ادب کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

میر حسین علی امام ❁

ابنِ صفی — نام ہی کافی ہے

ماہ نامہ ''قومی زبان'' کی مدیرہ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی متحرک فعال شخصیت کی مالک ہیں۔ اقبال، غالب کے عمدہ نمبر نکالنے کے بعد مولوی عبدالحق پر کانفرنس اور پھر اس میں پڑھے گئے مقالات کا خصوصی نمبر شائع کیا۔ اکبر الٰہ آبادی کے صد سالہ موقعے پر خصوصی گوشہ اور خواجہ معین الدین ڈراما نویس کی پچاس سالہ برسی پر خصوصی گوشہ مدیروں کا۔

ادارے کی مطبوعات، ''قومی زبان'' کے شمارے اور خاص نمبر، مختلف ادبی تقاریب اس بات کے غماز ہیں کہ انجمن ترقیٔ اردو کی موجودہ انتظامیہ درست سمت میں آگے بڑھ رہی ہے۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ ''قومی زبان'' کا ''ابنِ صفی نمبر'' آرہا ہے اور آپ سے بھی ابنِ صفی پر مضمون کی درخواست کی ہے۔ یادوں کا ایک مسکراتا البم کھل گیا۔ میں نے کہا، ''پچیّس سال بعد ادبی رسائل کو ابنِ صفی کی یاد آئی، مسکرا کر کہا آئی تو سہی، بس آپ لکھ دیجیے۔'' تو تعمیل حکم ہے۔

یہ ۷۳-۱۹۷۲ء کی بات ہے، ہم الاعظم اسکوئر میں رہتے تھے۔ ابنِ صفی صاحب بھی وہیں رہتے تھے۔ اس وقت الاعظم اسکوائر میں، شریف آباد میں اہلِ علم، ادیب، شعرا بھی رہا کرتے تھے اور ۱۹۸۰ء میں باقاعدہ کسی نہ کسی کے گھر ادبی تقریب یا بیٹھک ہو جاتی تھی پروفیسر آذر حفیظ بی۔۷۳ میں رہتے تھے ہم سی۔۳۰، میں، ابنِ صفی صاحب سی۔۳۵ میں، اختر شادانی ڈی۔۱۰ میں۔ شریف آباد میں عارف شفیق، رفیق بریلوی، شبیر ابن عادل، عبدالرؤف عروج، صدیقہ ارمان، عارف رانا، امیر امام صاحب، خواجہ معین الدین، عزیز کارٹونسٹ وغیرہ رہائش پذیر تھے۔

ابنِ صفی صاحب بہت ایک لیجنڈ تھے۔ محلے میں سب کو علم تھا کہ ابنِ صفی کو معمولی شخص نہیں ہیں مگر سب ان کا احترام کرتے تھے۔ وہ آفس جاتے ہوئے نظر آتے یا شام میں یا رات میں گیلری میں ٹہل لگاتے نظر آتے۔ خاموش طبع، بقول اختر شادانی یہ اوریجنل جینئیس آدمی ہے۔ اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ہم بچوں کے لیے وہ ایک علامت تھی۔ ہم عقیدت سے دیکھتے تھے، نہ مل سکتے تھے اور نہ کوئی ہمیں ملواتا۔ جب بڑے ہوئے تو آذر حفیظ، عارف شفیق کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ گیلری میں باتیں کرنے کا موقع ملا۔ عارف شفیق نے ایک دو مرتبہ کسی رسالے کے انٹرویو کے لیے وقت مانگا تھا۔

ابنِ صفی سے ایک تعارف یہ بھی تھا کہ ہمارے اتاترک اسکول کے ایک ساتھی عادل جمال اختر، کے یہ ماموں تھے۔ کبھی کبھی

❁ مکان نمبر ۱۵۹، سی پی برار سوسائٹی، بلاک ۷ اور ۸، کراچی۔ فون: ۲۵۸۶۶۸۹-۰۳۳۶

عادل ان کے گھر آتا تو ہم خوش ہو لیتے کہ اتنے بڑے اور مشہور آدمی کا بھانجا ہمارا دوست ہے۔ عادل جمال اختر ابنِ صفی کے بھانجے اور کراچی یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر منظور الدین احمد کے بھتیجے تھے، ڈاکٹر بن کر امریکا چلے گئے۔

ابنِ صفی کا نام ہی کافی ہے۔ ان پر کیا لکھا جائے اور کیا بات کی جائے۔ راشد اشرف نے ان پر گراں قدر کام کیا اور دو کتابیں مرتب کی ہیں، ویب سائٹس بنائی ہے۔ ان کی کتابوں کو دوبارہ شائع کروانا شروع کیا۔ ابنِ صفی کی بازیافت کی۔ نئی نسل کے لیے ابنِ صفی کی یہ دریافت ان کے علمی و ادبی پہلو کو مزید تابندہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

جب ہم بچے تھے اور اردو میں کچے تھے تو اُستانی کے کہنے پر ہماری امی نے بدر آنٹی کے پاس بھیجا۔ وہ بہت اچھی تھیں اور ہمیں پڑھاتی تھیں بس ''نونہال''، ''تعلیم و تربیت''، ''بچوں کی دنیا'' اور ابنِ حسن نگار کی ''ٹارزن کی کہانیاں'' لا کر دیتیں اور کہتیں انھیں پڑھو اور پڑھ کر سناؤ۔ ''نونہال'' مشکل تھا، دیر سے سمجھ میں آتا، ''تعلیم و تربیت'' آسان تھا۔ قصے کہانیاں ہوتیں جو بعد میں علمی لگنے لگیں۔ بچوں کی دنیا میں ننھے کے کارنامے پسند آئے اور ہماری اردو اچھی ہونے لگی اور ایک دن ہماری استانی نے ایک مضمون پر لکھ دیا ''شاباش!'' ہم نے کہا، یہ ''شاباش'' کیا ہوتا، کہنے لگیں ''good۔'' ہم نے کہا good لکھیے میری امی کو ''شاباش'' نہیں معلوم۔ استانی نے کہا تمھاری امی کو کیوں نہیں معلوم، میں نے جواب دیا، ''جب مجھے نہیں معلوم کہ امی کو کیسے معلوم ہوگا کہانیاں رسائل میں پڑھتا ہوں امی تھوڑی پڑھی ہیں۔'' استانی نے گڈ بھی لکھ دیا اور اور شاباش بھی رہنے دیا۔ امی خوش ہوگئیں کہ بچے نے شاباش لی اور good بھی!

یہ کہانی پڑھنے کا پہلا مرحلہ تھا چھٹی، ساتویں میں آئے تو مقبول جہانگیر کی داستانِ امیر حمزہ پر پہنچے، عمرو عیار کی چالاکیاں پسند آنے لگیں اور امیر حمزہ کے لشکر کے ہاتھی، گھوڑے، تیر، تلوار اچھے لگنے لگے۔ ہم سب خالہ، ماموں کے بچے ملا کر آٹھ دس ہو جاتے تھے۔ ادبی کہانیوں پر گپ شپ رہتی تھی۔ آٹھویں نویں جماعت میں آنے تک ہم سب ترقی کر کے ابنِ صفی کے ناولوں تک پہنچ گئے یہ صرف میری اکیلے کی کہانی نہیں ہے۔ ۱۹۷۰ء کے دہائی کے ہر طالب علم کی کہانی ہے۔ وہ بچوں کے رسائل سے آغاز کرتا، امیر حمزہ کی داستان پڑھتا، پھر عمران، حمیدی فریدی کی کہانیوں میں اپنے آپ کو ہیرو، وطن پرست، ذہن اور چالاک جاسوس سمجھنے لگتا۔ کیا بچپن تھا۔ کیا لڑکپن تھا۔

ابنِ صفی ہر نوجوان اور ہر پختہ عمر قاری کا پسندیدہ نام تھا۔ حمیدی فریدی کی سیریز اور عمران سیریز اُن کے مقبول ترین ناولوں کے سلسلے تھے جو اس زمانے میں تقریباً سب شوق سے پڑھتے تھے۔ میرے والدین کبھی ہمیں ہنستے ہوئے، کبھی بحث کرتے ہوئے، کبھی قہقہے لگاتے دیکھتے تو کہتے ہم بھی اپنی جوانی میں پڑھتے تھے۔ والدہ ماموں کی شرارتیں، بتاتے لگتیں اور والد چچا، تایا کی۔ یعنی ابنِ صفی ہم سے پہلی یعنی ۱۹۶۰ء کی نسل کے بھی پسندیدہ قلم کار تھے۔

ابنِ صفی اردو ادب میں جاسوسی ادب کے سرخیل رہے۔ آپ نے اردو میں جاسوسی ناول نگاری کو ایک فن کے طور پر متعارف کرایا اور اسے انتہائی بلندیوں پر لے گئے۔ ابنِ صفی دیکھ کر بہت سے ادیبوں نے لکھنا شروع کیا اور آپ کی چالیس سالہ ادبی زندگی میں کئی ادیب آئے۔ کئی لکھاری آئے اور عمران سیریز، حمیدی فریدی سیریز لکھنے کی کوشش کی۔ حمیدی فریدی سیریز لکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لیے اکثریت قلم کاروں نے عمران کو پکڑ لیا اور عمران کے حوالے سے جو ناول لکھے ان میں بے ہودگی، پھکڑپن، لااُبالی پن

وغیرہ کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ ابنِ صفی کا عمران ایک طلسماتی کردار تھا۔ وہ شرارتوں سے بھرپور تھا لیکن ابنِ صفی کے قلم سے کبھی کوئی ناشائستہ، لغو، عامیانہ جملہ نہیں نکلتا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ وہ کردار ابھی تک زندہ ہے۔ طنز نگار کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ کردار کو زندہ رکھے اور اس کی زبان کی نشست و برخاست کا بھی خیال رکھے۔ ابنِ صفی جیسا کردار نگار، طنز نگار جسے منظر نگاری میں ملکہ حاصل ہو، بات سے بات پیدا کرنے والا، بات سے بات تک پہنچنے والا، جاسوسی ادب ادب کی گرہ کھولنے والا، جاسوسی تہ خانوں میں پہنچانے والا، اپنے کرداروں کے ساتھ مختلف فرضی ممالک کی سیر کروانے والا، فرضی کردار تخلیق کرنے والا، کرداروں کو زندہ جاوید بنانے والا اردو جاسوسی ادب میں کم نظر آتا ہے۔

ابنِ صفی اردو کا سب سے مقبول قلم کار تھا۔ ہزار ہا کتب کی ماہانہ اشاعت اور ترویج کا انتظام انھی کا خاصا تھا۔ فردوس کالونی بھی سب کو یاد ہوگئی۔ ابنِ صفی اپنے نام کے ساتھ بی اے لکھتے۔ بہت بڑا نام تھا ان کا، بی اے کی ڈگری بھی بہت بڑی محسوس ہوتی تھی۔ بے شک اُس زمانے میں بی اے آج کے پی ایچ ڈی پر بھاری تھا۔ ابنِ صفی اردو دنیا کا وہ واحد ادیب ہے جس نے لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا۔ ان کے جیتے ان کو پڑھنے کا نشہ لگا دیا۔ انھوں نے ریڈر شپ یعنی قارئین کا ایک بڑا طبقہ پیدا کیا۔ اردو افسانے میں منٹو، کرشن چندر، عصمت بیدی اور ندیم کے افسانوں نے بھی قارئین کا ایک بڑا حلقہ پیدا کیا ناولوں میں پریم چند اور عزیز احمد نے لیکن عوامی سطح پر، عام قاری تک اردو کو، ابنِ صفی نے پہنچایا۔ کتاب بین ابنِ صفی نے بنایا اور یہی ان کی کامیابی اور عظمت ہے۔ آج جب ہم علم دوست، کتاب دوست کے نام سے باتیں کرتے ہیں، مذاکرے کرتے ہیں تو سب سے پہلا سوال یہی ہوتا کہ قاری کہاں گیا؟ کتب خانے کیا ہوئے؟ کتاب نظر نہیں آتی، نظر آتی تو پبلشرز کی الماری میں۔ ایسے میں راشد اشرف آیا اُس نے ابنِ صفی کی کتب کے سستے ایڈیشن مارکیٹ میں متعارف کروائے، ہم نے دیکھا کہ قاری پھر لپکے، میڈیا، سوشل میڈیا سب کو ابنِ صفی یاد آئے اور پھر راشد اشرف کی سنجیدہ کتابیں بھی آئیں تو سب کو احساس ہوا کہ ہم نے کسی گوہرِ آبدار کو صرف ''جاسوسی ادب'' کے ساتھ مختص کر کے ادب کو بچایا یا ضائع کیا؟

ابنِ صفی نے ''دلیر مجرم'' کے نام سے اپنی پہلی کتاب لکھی تھی۔ انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمیدی کے کرداروں کے ساتھ۔ حمیدی کو ایک شوخ، نوجوان دیکھایا گیا جو حسین لڑکیوں کو دیکھ کر خوش ہوتا اور دوستی کا متمنی رہتا، جب کہ فریدی کو ایک امانت دار، بُردبار، وضع دار انسان جو ملک وقوم کے لیے ہمیشہ چاق چوبند اور چوکنا رہتا جو سنجیدہ، اعلیٰ اوصاف کا حامل تھا۔ ابنِ صفی کے ان دو کرداروں نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ یہ انسانی نفسیات کے دو اہم کردار ہیں۔ ہر انسان میں ایک بچپن کھلنڈرا پن، مستی کرنے کی عمر، شوق جوانی ہوتی ہے وہ حمیدی کے کردار سے ابنِ صفی نے پوری کی اور اپنے نوعمر، نوخیز قارئین کے لیے حمیدی کے کردار میں شوخیاں، مستیاں، کلب، خواتین سے ملواتے جس سے قدر دان اپنی پسندیدہ دنیا میں پہنچ کر خوش ہو جاتے تھے۔ جبکہ سنجیدہ بردبار انسپکٹر فریدی، سنجیدہ طبقے، اڈھیر عمر کے لوگوں کا موضوع بن گیا۔ اس کی فکر و دانش، اُس کے جملے بڑی اور پکی عمر اور صاحبان علم ونظر کو پسند آتے تھے۔ یہی ابنِ صفی کی کامیابی ہے کہ انھوں نے مختلف عمروں اور مزاج کے دو کردار تخلیق کیے اور ہر عمر کے قاری کو اپنے قلم کے سحر سے مسحور کیا۔ حمیدی فریدی سیریز میں انھوں نے ایک ''بلیک فورس'' بھی تشکیل دی جو وزارت داخلہ کے تحت کام آتی تھی اور انسپکٹر فریدی کو جواب دہ

ہوتی تھی جو زیرو۔ون تھا اور پھر اس کے ماتحت زیرو ٹو تھیری وغیرہ۔

یہ سب تصوراتی، تخیلاتی دنیا ہزار ہا سال کی داستانوں کا تہذیبی سلسلہ تھا جو انسانوں کو داستان سننے، پڑھنے پر آمادہ کرتا تھا اُس کو انھوں نے جاسوسی ادب جاسوسی کہانیوں اور اپنے کرداروں کے ذریعے اجاگر کیا۔ کہانی کی کہانی، ناول کا ناول، کہانی، پلاٹ سب مربوط اور منظم ملتے ہیں۔ قاری ان میں کھو جاتا ہے۔ جاسوسی پن، راز کی تہہ میں پہنچنا، بدکرداروں سے مقابلہ کرنا، لڑائی، کبھی زخمی ہونا، کبھی زخمی کرنا، کبھی مجرم کا بھاگ جانا اور کبھی غیر متوقع مجرم کو آسانی سے پکڑنا۔ مختلف ناولوں میں مختلف انداز سے کہانیاں لکھیں اور اس طرح لکھیں کہ ہر کہانی، ہر ناول مشہور ہوتا چلا گیا۔

ابنِ صفی کی جاسوسی دنیا کا سلسلہ اتنا مشہور ہوا کہ ہر ماہ پابندی سے آنے لگا۔ آپ سوچیں کہ آپ ایک افسانہ یا کہانی جو چند صفحات کی ہو، کتنے دنوں میں لکھیں گے؟ ہر ماہ ایک کتاب لکھنا، تصوراتی و تخیلاتی دنیا کی، جس میں تجسّس، تحیر، لڑائی، کے ساتھ ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہوئی، طنز و مزاح بھی ہوں، چٹکلے ہوں اور معلوماتی اقوال بھی ہوں۔ اس کو تواتر و تسلسل کے ساتھ لکھنا، زود نویسی ابنِ صفی کا خاصا تھی۔ اردو میں ایم اسلم نسیم حجازی بھی اتنی مقبولیت حاصل نہ کرسکے جتنی ابنِ صفی نے حاصل کی۔

ابنِ صفی نے پُراسراریت کی ایک دنیا بسائی۔ ''زیرو بند'' ایک سائنسی دنیا، سائنسی فکشن کو بھی اردو میں متعارف کرانے کا سہرا ابنِ صفی کے سر جاتا ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب میں سائنسی ادب، سائنسی فکشن پر ان سے پہلے یا ان کے بعد اس طرح کے مکمل ناول کسی اور قلم کار، افسانہ نگار، کہانی کار کے نہیں ملتے ہیں۔

ابنِ صفی کا دوسرا کردار ''عمران'' شوخ، چنچل، قومی جذبے سے سرشار نوجوانوں کا آئیڈیل ہے۔ حمیدی فریدی سیریز کی کامیابی کے بعد دوسرا کردار تخلیق کرنا اور اس کو بھی مقبول عام بنانا یہ بھی ابنِ صفی کا یہی خاصہ ہے آپ نے عمران سیریز یا عمران کے ساتھ ایک ٹیم تشکیل دی۔ ایک آٹھ رکنی تشکیل کردہ جاسوسوں کی ٹیم جس میں جولیانا فٹز واٹر، کیپٹن صفدر وغیرہ شامل تھے۔ یہ ٹیم ''ایکس ٹو'' کے تحت کام کرتی ہے۔ ایکس ون سکریٹری داخلہ سلطان ہوئے اور ''ایکس ٹو'' عمران ہوتا ہے لیکن ٹیم کو نہیں معلوم کہ عمران ایکس ٹو ہے۔ عمران کو وہ بھی اپنا ایک ٹیم کا ممبر سمجھتے بلکہ اس کی مسخرے پن کی اوٹ پٹانگ باتوں پر ہنستے ہیں، کبھی اُلجھتے، کبھی مانتے اور کبھی ماننے سے انکار کردیتے۔ عمران کا کردار ایک عام انسان کا کردار ہے جس کی وضع قطع ایسی نہیں ہے جیسے کوئی بڑا کلیدی عہدہ دیا جائے اور لوگ اس سے مرعوب ہوجائیں اور اطاعت قبول کرلیں، اس لیے ''ایکس ٹو'' ایک پُراسرار کردار تخلیق کیا گیا کہ جس کے کہنے پر عمل کیا جائے سیدھی انگلیوں سے کام ہو تو عمران حاضر، ٹیڑھے لوگوں کے لیے ایکس ٹو۔ عمران کی ایک دوست ہوتی ہے ''روشی''، جو جانتی کہ عمران ہی ایکس ٹو ہے۔

ابنِ صفی کی کیا بات کی جائے، ان کا نام ہی کافی ہے۔ ان کے دو اور اہم کرداروں کے بغیر بات ادھوری ہے۔ یہ دو منفی کردار ہیں، وِلن، اینٹی ہیرو کردار: ایک چچا سنگ، اور دوسرا ٹی ٹلری بی۔ چچا سنگ مجرم ہے اور پستول کی گولیوں سے بچنے کے ایک خاص طریقے کا مؤید، عمران نے اس کو نہایت چالاکی سے، غصہ دلا کر چھ، چھ کی چھ مرتبہ یعنی ۳۶ گولیاں ضائع کردیں۔ سنگ جی سے یہ آرٹ سیکھا اور پھر یہ آرٹ اسے مجرموں سے بچنے کا اہم طریقہ ثابت ہوا۔ یہ سنگ اور ٹی، ابنِ صفی جیسے اور یجنل، جینئیس قلم کار کی پہچان ہیں اور

اردو ادب کے جاسوسی ادب کو دنیا کے ممتاز جاسوسی ادب میں اعلیٰ مقام دلاتے ہیں۔اسی طرح ٹی کھری بی ایک منشیات فروش، اسمگلر لیڈی ہے جو خوب صورت، حسین ہے اور اپنے حُسن، خوب صورتی سے مختلف ممالک کے قیمتی راز معلوم کر لیتی ہے لیکن عمران کے آگے بے بس ہو جاتی ہے اور آخر میں عمران سے عشق کر بیٹھتی ہے۔عمران اس کی خوب صورتی اور چالاکی سے متاثر نہیں ہوتا۔ ہاں عمران کی پاکیزگی اور ڈیوٹی پر خرافات سے دور ہونے کی وجہ سے کردار سازی میں وزن پیدا ہوتا ہے۔

جاسوسی ادب کو بامِ عروج پر پہنچانے والے ابنِ صفی نے ''عمران سیریز'' یا ''جاسوسی دنیا'' کو اپنے نام سے بڑا نہیں کیا بلکہ اردو کے اس دور کے کئی تخلیق کاروں نے عمران، حمیدی فریدی پر لکھا۔ اکثریت نے عمران پر طبع آزمائی کی اور بعض نے نئے کردار بھی اختراع کیے۔ ایچ اقبال، حمید اقبال نے ''عمران سیریز'' بہت لکھی اور ایک نیا کردار میجر پرمود بھی اختراع کیا لیکن میجر پرمود عیاشی، رنگ رلیوں، شراب، شباب میں اکثر کھو جاتا تھا یا مصنف کا قلم بہک جاتا، اس لیے یہ مشہور نہیں ہو پایا اور پاکیزہ خیالات والے میجر پرمود سے دور ہو گئے، عمران ہی ہمیشہ کامیاب رہا۔

ایم اے راحت نے عمران سیریز لکھی اس میں انسپکٹر صوفی کا کردار ایجاد کیا اور پھر کچھ کتابیں انسپکٹر صوفی پر بھی لکھیں مگر انسپکٹر صوفی، سماع، قوالیاں، درگاہوں کا عاشق اعتدال سے ہٹ جانے والا عوام کے صوفی منش طبقے سے آگے شہرت نہیں پا سکا۔ پان کی گلوریاں، تسبیح، مجرموں کے پیچھے موٹر سائیکل پر تعاقب وغیرہ صوفی نے وہ ماحول نہیں بنایا کہ نوجوان نسل اسے پسند کرتی۔صرف محدود طبقے نے پسند کیا۔

مظہر کلیم نے البتہ عمران سیریز میں ابنِ صفی کے بعد مقبولیت حاصل کی ضخیم کتابیں لکھیں، انھوں نے انسپکٹر شکیل کا کردار تخلیق کیا بعد میں انسپکٹر شکیل کے بطور ہیرو ناول لکھے۔لیکن جیسا کہ میں نے بتلایا کہ عمران کی شوخی، چالاکی، ذہانت، حاضر جوابی کسی اور کردار میں نہیں آسکی اور وہ صرف اس لیے کہ ہر قلم ابنِ صفی کا قلم نہیں ہوتا اور ہر ذہن ابنِ صفی کی طرح نہیں لکھتا۔

ابنِ صفی کے کرداروں کی بات ہو اور بات عمران کے باورچی تک نہ پہنچے؟ عمران کا سلمان اور سلمان کی دال، میرے خیال میں پٹھان کی دال بھی کبھی اتنی مشہور نہیں ہوئی جتنی عمران کے باورچی سلمان کی دال اور اس دال پر عمران اور سلمان کی تکرار۔ یہ بڑے معنی خیز، ادبی، طنزیہ مکالمات ہوتے تھے معاشرتی نوک جھونک، اس طرح جولیا اور عمران کی نوک جھونک، روشی اور عمران کی نوک جھونک ہم کو بڑی ادبی چاشنی اور طنز و مزاح کے وافر نمونے فراہم کرتے ہیں۔

ابنِ صفی ہمارے بزرگوں کے بھی پسندیدہ ادیب رہے اور ہر گھر میں چھپ کر یا بہانگِ دُہل ان کی کتابیں لا کر ہر نسل میں کم از کم تین نسلوں تک پڑھی جاتی رہیں ہیں اس کے باوجود اردو ادب کے سنجیدہ ادیبوں نے اور ناقدین نے ان کو ادبی اہمیت کیوں نہ دی؟ اس کا جواب آسان ہے کہ صرف ادبی رسائل میں چھپنے والی تخلیقات گُم ہو جاتی ہیں۔ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہم اپنے افسانے یا طنز و مزاح لکھتے تھے اور ادبی رسائل کو مدیروں کو دیتے تھے تو ہمیں وہ کہتے دیگر رسائل میں بھی شائع کروائیں اور جب چند سال بعد دیگر رسائل میں وہ تخلیقات شائع ہو گئیں تو ادب کے نقادوں اور مدیروں نے دروازے کھول دیے۔ابنِ صفی، ابنِ صفی تھے، انھوں نے اسرار ناروی کے نام سے نظم، غزل، کہانیاں بھی لکھیں مگر پھر اپنا جداگانہ راستہ نکالا اور کامیابی سے اس راستے پر چل پڑے۔ان کو اپنے

قلم، تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ ''جاسوسی دنیا'' کی اشاعت الٰہ آباد سے علی عباس حسینی کے رسالے ''نکہت'' سے شروع ہوئی۔ علی عباس حسینی ''نکہت''، الٰہ آباد اپنی جگہ رہ گئے، ''جاسوسی دنیا'' اور ابنِ صفی پوری دنیا میں مشہور ہو گئے۔

ابنِ صفی ابنِ صفی تھے، ان کا نام ہی کافی ہے۔ وہ اردو کے جاسوسی ادب کی پہچان اور آبرو تھے۔

کہتے ہیں کہ نیک آدمی کا فیض اس کی زندگی میں بھی جاری رہتا اور اس کے بعد بھی۔ ابنِ صفی نے چالیس سال اپنی کتابیں شائع کیں، ادارہ بنایا، منتظم رہے۔ ۱۹۸۰ء میں جب ڈائجسٹی دنیا یعنی ڈائجسٹ کی دنیا آباد ہوئی تو مشتاق قریشی صاحب نے ابنِ صفی صاحب کو راضی کیا اور ابنِ صفی ڈائجسٹ کا اجرا عمل میں آیا جس میں ہر ماہ ایک کتاب ابنِ صفی کی شائع ہوا کرتی تھی۔ مشتاق قریشی اور ابنِ صفی میگزین سے بھی ہزراہا لوگوں کو روزگار بھی ملا۔ ابنِ صفی ۱۹۸۰ء کے بعد کی دونسلوں تک مقبول رہے۔ پھر راشد اشرف اور اٹلانٹس کا زمانہ آیا اور پھر ابنِ صفی کی بازیافت، دریافت ہوئی۔

ابنِ صفی نے ۱۹۶۰ء تا ۲۰۲۰ء تک کی دونسلوں اور چھ دہائیوں کو متاثر کیا ہے اور متاثر کر رہے ہیں۔ اب ان کی علمی و ادبی تخلیقات، ناول، کہانی، پلاٹ، کردار سازی، طنز و مزاح، شاعری پر تحقیق ہو رہی ہے۔ ادیب ادب تخلیق کرتا ہے اور امر ہو جاتا ہے۔ ابنِ صفی نے ادبِ عالیہ تخلیق کیا امر ہو گئے۔ انھوں نے اردو کو سیراب کیا۔ ان کے ناولوں میں جتنی جہتیں نکالیں، دریافت کریں ابنِ صفی آپ کو اتنے پسند آئیں گے اور آپ ہی کہیں گے کہ نام ہی کافی ہے اور بے شک اردو میں ابنِ صفی کا نام ہی کافی ہے۔

ڈاکٹر شبنم امان ❁

ابنِ صفی پیش رس کے آئینے میں

ابنِ صفی اُردو کے ایسے جاسوسی ناول نگار ہیں جس نے اس کی بنیادوں کو مستحکم کیا۔ ابنِ صفی سے قبل جاسوسی ناول فنی حسن و خوب صورت کے ساتھ تکنیکی، سائنسی، خصوصیات سے نا آشنا تھے۔ ابنِ صفی اُردو جاسوسی ناول نگاری کے موجد اور خاتم تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ابنِ صفی کئی حیثیتوں سے معروف تھے مگر جاسوسی ادب اور ابنِ صفی ایک دوسرے کا نعم البدل ہیں۔ برصغیر میں جاسوسی ادب کو مقبولِ عام بنانے کا سہرا بلاشبہ ابنِ صفی کو جاتا ہے۔ ابنِ صفی نے اُردو ناولوں کو ڈپٹی نذیر احمد کی طرح مقبول عام کردار عطا کیے۔ ابنِ صفی نے جاسوسی دُنیا کے ۱۲۶/اور عمران سیریز کے ۱۲۰/ (کل ۲۴۲) ناول لکھے۔ ان ناولوں میں متنوع موضوعات پر جرائم کا بازار سرگرم رکھا لیکن اسی جاسوسی ناول کو ذریعہ بنا کر سماج کی تطہیر کا فریضہ ادا کیا۔ ناولوں کو تفریحی ادب کے خانے میں ڈال کر ان کی حیثیت کو نظر انداز کیا گیا مگر ابنِ صفی نے کئی نسلوں کی آبیاری کی ہے۔ ابنِ صفی عوام کے لیے لکھ رہے تھے۔ ابنِ صفی نے اپنی ذہانت سے عوام کو ادب سے جوڑ دیا۔ اس عہد ساز ادیب نے اپنے قلم کی جولانی سے جہاں نت نئے موضوع اختراع کیے اسی طرح ابن صفی نے ادب میں نئی صنف بھی متعارف کرائی۔

ابن صفی کے خلاق اور کرشاتی ذہن نے اپنے نظریات اور خیالات، ناول کے تعارف اور قارئین سے براہِ راست گفتگو کے لیے عصر رواں میں ادب کے لیے نیا سانچہ ''پیش رس'' کے نام سے تخلیق کیا، تو اُنھیں اپنی اس رائے پر نظر ثانی کرنے کا تھوڑا سا حوصلہ اور ہمت ضرور میسر آجاتی۔

پیش رس کے معنی ہیں۔ موسم کا پہلا ''پکا ہوا پھل کسی کے سامنے پیش کرنا۔'' ابنِ صفی نے ناولوں کا تعارف بھی یوں کیا کہ قارئین ناول کے ذائقے سے آشنا ہوجائیں۔ ان کے ناولوں کی طرح پیش رس بھی مقبولیت کی بلندی پر تھے کیوں کہ ان پیش رس کے ذریعے ادیب اور قاری اٹوٹ رشتے میں بندھ گئے۔ نوک جھونک بھی تھی قارئین کی وابستگی بھی کبھی جھنجھلاہٹ بھی کبھی پیار بھی۔ اداریے کے لیے پیش رس کا درست استعمال ابنِ صفی سے شروع ہوتا ہے مگر ناولوں میں ''پیش رس'' کا لفظ اس سے پہلے بھی استعمال ہو چکا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں حافظ چمن رحیم دہلوی کے ناول ''ٹوٹا ہوا سکہ، شمیم و بہرام'' پر اُردو کے مشہور ادیب شاہد احمد دہلوی نے اسی ناول پر یہ تبصرہ درج کیا:

> ہندوستان میں علم و ادب کی قدر نہیں اس لیے کہ یہاں یورپ جیسے ناولسٹ پیدا نہیں ہوتے۔ جاسوسی

❁ اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری گرلز کالج، ناظم آباد، کراچی۔

> ناول اُردو میں تہی مایہ صنف ہے اور چمن دہلوی کا یہ ''پیش رس'' خوش مذاق حضرات کے لیے ضیافت طبع کے لیے خاصے کی چیز سمجھا جائے گا۔[۱]

اس کے علاوہ شاہد احمد دہلوی ۱۹۳۴ء میں جاسوسی ناول پہ تبصرہ کرتے ہوئے''پیش رس'' کی اصطلاح استعمال کر چکے تھے۔ خوش مذاق افراد اور قارئین پر اس صنف ''جاسوسی ادب'' میں پیش رس کی اہمیت واضح ہوئی۔

۱۹۵۲ء ابنِ صفی نے ادارہ نکہت کے تحت جاسوسی ناول نگاری کا آغاز کیا۔ جس کے روح رواں عباس حسینی تھے۔ دلیر مجرم کا تعارف ''پیش رس'' ابنِ صفی نے لکھا تھا جسے نامعلوم وجوہات کی بنا پر بعد کے ایڈیشن سے نکال دیا گیا۔ جاسوسی دُنیا کے پہلے ناول دلیر مجرم کا پیش رس کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ مذکورہ پیش رس میں جاسوسی ادب کی صورت حال پر عرق ریزی سے خیالات کا اظہار کیا۔ ابنِ صفی کے ''پیش رس'' کا تجزیہ کرتے ہوئے اس ناول (دلیر مجرم) پہ گفتگو کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اُردو اور انگریزی جاسوسی ناولوں کا موازنہ کیا گیا۔ اس اہم پیش رس کو بعد کے ناولوں سے کیوں نکالا گیا یہ تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ جاسوسی ادب کا بہترین ذوق رکھنے والے فاروق احمد نے اس کی جانب توجہ مبذول کرائی اور اس کی تفصیل راشد اشرف نے ابنِ صفی شخصیت اور فن کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کی دلیر مجرم کے پیش رس میں ابنِ صفی نے چند اہم باتوں کی نشاندہی کی ساتھ ہی اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اُردو میں جاسوسی ناولوں کا رجحان پہلے سے موجود ہے یہ اور بات ہے کہ یہ رجحان بہت زیادہ مقبول اور قابل ذکر نہیں تھا دوسرا اہم پہلو جس کی طرف ابنِ صفی نے اشارہ کیا۔

> ان ناولوں کی غیر مقبولیت کی سب بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے محیر العقول واقعات کی بنا پر وقتی طور سے قاری کے ذہن کو مسحور کر لیتے ہیں لیکن منطقی شعوری تسکین نہیں کرتے۔ ان کو طلسم ہوشربا کے بعد کی جگہ دی جاسکتی ہے۔[۲]

ابنِ صفی نے اس اہم نکتہ کی طرف توجہ دلائی کہ جاسوسی ناول اب سائنسی اور منطقی دلیل کے بغیر قارئین کو متوجہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اُردو کے جاسوسی ناول جو اس سے قبل لکھے تھے وہ حد سے زیادہ غیر فطری محیر العقول واقعات سے پُر ہوتے۔ ان میں منطقی ربط نہ ہونے کے برابر تھا۔ اب قاری باشعور ہے وہ ہر چیز کی دلیل کا طلبگار ہے اگر اسے ایجادات اور واقعات میں ربط نہ ملے تو وہ اُسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے اور عین جاسوسی ناولوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا کہ یہ جاسوسی ناول قارئین پر سحر طاری نہ کر سکے۔ اسی ناول کے پیش رس میں ابنِ صفی نے دوسرے اہم نکتہ پر بڑی خوب صورتی اور بلیغ انداز میں اشارہ کیا۔ آرسین لوپن کا کردار جب بہرام بن کر پورے ہندوستانیوں کے دلوں پر راج کررہا تھا۔ اس کی غیر منطقی حرکات نے ہندوستان میں ایک ہنگامہ کھڑا کررکھا ہے۔ یہ کردار چند ایسی صفات کا حامل تھا جو عین مافوق الفطرت خواص رکھتا تھا جو کبھی پولیس ہے تو کبھی کوتوال کی بیوی۔ بقول ابنِ صفی'' کائنات کے ذرے ذرے میں بہرام کا جلوہ نظر آتا ہے'' اس قسم کے ناول وقتی شہرت ومقبولیت تو حاصل کر لیتے ہیں مگر ان کی حیات زیادہ نہیں ہوتی۔ ستیہ پال آنند کی بات سو فیصد درست مانی جاسکتی ہے کہ (ایسے ناولوں کی عمر صبح سے شام ہوتی ہے) اس کے بعد ناول نگار نے اپنی تمام ادبی اور تخلیقی تجربے اور صلاحیتوں کے ساتھ اس امر کو بیان کیا:

انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ناولوں کے متعلق کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ اُن کو پڑھ کر وہی کیفیت ہوتی ہے جو ایک انگریز کو بہترین سوٹ پر گاندھی کیپ پہنے دیکھ کر ہوتی ہے۔ (۳)

انگریزی سوٹ پر گاندھی کیپ کا جواب نہیں۔ یہ اسی تلخ حقیقت کی طرف نشاندہی ہے کہ انگریزی ناولوں کی روح کو سمجھے بغیر ادیبوں نے شکم سیری کے لیے دھڑادھڑ انگریزی ناولوں کے ترجمے تو کیے مگر بغیر کسی اُصول اور ادبی نکتہ نظر کو ملحوظ رکھے۔ ان تراجم کا مقصد صرف تجارتی تھا۔ یہ ناول کم چوچو کا مربہ زیادہ تھے۔ جہاں الفاظ، محاورے، لباس، انداز سوچ سب ہندوستانی۔ پلاٹ انگریزی ان دورویوں کی ہم آہنگی نہ ہونے کے سبب ہزاروں ترجمے ردی ہوگئے۔ اسی پیش رس میں ابنِ صفی نے یہ سوال بھی اُٹھادیا کہ دنیا کے ادب میں کرائم فکشن اور سری ادب کو ایک مقام حاصل ہے۔ مگر اُردو کا دامن ابھی اس لٹریچر کی راہ تک رہا ہے۔ پیش رس کے آخر میں اس راز سے پردہ اُٹھاتے ہیں کہ جاسوسی دُنیا کے قیام کا اصل سبب کیا تھا۔ یہ محض صاحبِ کتاب ہونے یا یوں ہی سستی شہرت کی خاطر تخلیق کا باعث نہیں بلکہ اُردو کے جاسوسی ادب کی تہی دامنی کے اس عیب کو ختم کرکے اس کمی کو پورا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ ساتھ ہی قارئین کو سائنس فکشن کی عقلی، منطقی، سائنسی طریقے سے مطمئن کرنا بھی تھا۔ جو جاسوسی ناول کی اہم صفت ہے اور یہ کہ کسی معاشرے میں جرائم کے پروان چڑھنے کے اسباب کیا ہیں۔ جرم اور معاشرے کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تغیراتِ زمانہ اور انقلاب وقت کے ساتھ اگر ہم آہنگی نہ ہو تو پرانا نظام معاشرے میں توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اس طرح معاشرے میں جرائم کی شرح بڑھ جاتی ہیں۔ لہٰذا ناولوں میں جرم کے اس قبیح فعل کو پیش کرکے اس کے سدباب کی کوشش بھی جاسوسی ناولوں کی تخلیق کا سبب ہے۔ تاکہ عوام کے دلوں میں جرم سے نفرت پیدا کرکے ایک مہذب سوسائٹی کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ابنِ صفی نے جاسوسی ناول کے اس اہم پیش رس نے معاشرے سے لے کر جرم تک اور جاسوسی ناولوں کے ارتقاء کے ساتھ اس کی خامیوں کو بھی بھرپور انداز میں پیش کیا۔ ۱۹۵۲ء سے شائع ہونے والے جاسوسی ناولوں کے پیش رس کو ''پیش لفظ'' کے عنوان سے ابنِ صفی نے خود لکھا۔ راشد اشرف ابنِ صفی کے ناولوں کے پیش رس کی تفصیلات اس طرح بیان کرتے ہیں:

> واضح رہے کہ جاسوسی دُنیا الٰہ آباد کے ابتدائی شماروں میں ابنِ صفی پیش لفظ کے تحت خود ہی کتاب کا تعارف کروایا کرتے تھے۔ تعارف کے آخر میں 'ا۔ص' درج ہوتا تھا۔ ابن صفی کی کراچی منتقل کے بعد جاسوسی دُنیا الٰہ آباد سے شائع ہوتی رہی۔ جہاں عباس حسینی اس کا پیش لفظ لکھا کرتے تھے۔ عباس حسینی نے جاسوسی دُنیا کے ناول نمبر ۳۲، سیاہ پوش لٹیرا تک پیش لفظ اور اداریہ کے عنوانات کے تحت ناولوں کا تعارف کرایا۔ جبکہ اس سے اگلے ناول ''برف کے بھوت'' سے اُنہوں نے تعارف کا یہ سلسلہ مستقل طور پر ''اداریہ'' کے عنوان کے تحت لکھنا شروع کیا۔ اور آخر تک اسی پر قائم رہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ ایک ابتدائی ناول نمبر ۱۰/ احمقوں کا چکر کا پیش لفظ نقوش کے عنوان سے بھی لکھا گیا...... ۱۹۵۷ء میں ابنِ صفی نے اسرار پبلی کیشنز کے تحت جاسوسی دُنیا کا پہلا ناول ٹھنڈی آگ شائع کیا اور جاسوسی دُنیا کے ان ناولوں کے پیش رس ابنِ صفی نے علاحدہ سے

لکھے۔ پیش رس کا یہ سلسلہ عورت فروش کا قاتل سن اشاعت یکم مئی ۱۹۵۷ء کراچی سے شروع ہوا۔ جو جاسوسی دُنیا کا ناول نمبر ۳ / رہے۔ عمران سیریز الٰہ آباد سے بھی باقاعدگی سے شائع ہوتی رہی۔ جہاں جاسوسی دُنیا کی طرح عباس حسینی اس کا اداریہ بھی لکھتے رہے۔ ٹھنڈی آگ کے پیش رس پر ۶ / اکتوبر ۱۹۵۷ء کی تاریخ درج ہے۔ (۴)

راشد اشرف ابنِ صفی کی تحریروں اور تحقیق پہ سند کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ ابنِ صفی کا انسائیکلوپیڈیا سمجھے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے واضح کر دیا کہ ابنِ صفی کے ابتدائی ناولوں میں پیش رس کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ لفظ ''پیش رس'' ۱۹۵۷ء میں استعمال کیا گیا تھا اور بعد میں شائع شدہ ناولوں کے پیش رس بھی دوبارہ لکھے گئے۔ یہ پیش رس نہیں تھے بلکہ قارئین سے براہِ راست تعلق کے بعد ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ قاری سے قلم کا جو رشتہ ابنِ صفی نے قائم کیا وہ دمِ آخر تک قائم رہا۔ اُن کے لکھے گئے پیش رسوں نے اُن کے ناول کو وژن دیا اُن کے پیش رس کا کینوس وسیع ہے۔ اس وسیع تناظر میں تجزیہ کیا جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ یہ پیش رس نہ صرف ناول کا تعارف ہوتے تھے بلکہ ابنِ صفی کے افکار اور شخصیت اور ذاتی زندگی کی بھی جھلک نظر آتی ہے۔ پیش رس ایک ایسی ادبی اصطلاح ہے جو اپنے اندر معنی اور امکانات کی ایک وسیع دُنیا سموئے ہوئے ہے۔ یہ مسائل معاملات، گفتگو، حسن وقبح کے بحث کا آغاز جس طرح غالب مکتوب الیہ کے جواب بے تکلفی جامعیت، اختصار اور رمز کے پیرائے میں دیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح ابنِ صفی اپنے پیش رس میں قارئین کے جواب جدت، ندرت، رمز، غصہ، پیار، جھنجھلاہٹ سے اس طرح دیتے کہ اگر اُنھیں سلسلہ وار ترتیب دیا جائے تو اس عہد کی ایک زندہ تصویر نظر آتی ہے جس میں معاشرے اور ادب سے متعلق چھوٹے چھوٹے مسائل کی نشان دہی کی گئی۔ اُن کے خلاق ذہن نے ''کچھ اور چاہیے وسعتِ میرے بیان'' کے لیے مضامین کے انبار لگا کر قطرہ کو قلزم بنا دیا۔ اُن کے ناولوں سے پیش رس کو الگ کر دیا جائے تو ناولوں میں ادھورا پن محسوس ہوگا۔ ان کے پیش رس میں قانون، مذہب، ادب، بین الاقوامی سیاست تک محیط نظر آتے ہیں۔ سیاسی معاشی حالات کی عکاسی رمز وایما کے پردے میں حسن بیان کے ساتھ پیش کیا۔ خود ابنِ صفی کے ذاتی حالات بیماری بھی اس پیش رس میں آئینہ کی طرح نظر آتی ہے۔

ابنِ صفی کے پیش رس میں ذاتی حالات واقعات کی جھلک:

ابن صفی کے پیش رس کو مختلف عنوانات کے تحت جائزہ لیا جائے تو اُن کی زندگی کے بارے میں گوہرِ نایاب مل جاتے ہیں۔ اسے مربوط کر کے کئی موضوعات ایسے ملے جن میں کئی جہتوں سے بحث کی جاسکتی ہے۔ ظرافت کے رنگ میں مشتاق احمد یوسفی کی طرح خود پر بڑے لطیف انداز سے طنز کرتے ہوئے اور اُسے معاشرتی رویوں سے مربوط کیا۔ ابن صفی اپنی گھریلو زندگی کو کبھی کبھی پیش رس میں قارئین کے سامنے پیش کرتے رہے۔ قارئین ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لیے بے چین رہتے تھے مگر ابنِ صفی نے اس معاملے میں بڑی محتاط روش اختیار کی لیکن ایسا ہوا نہیں کہ کسی تخلیق نگار کا ذہنی رجحان اس کی تخلیق میں نہ نظر آئے۔ دیو پیکر درندہ کے پیش رس میں بڑی کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتیں اس کے حالات واقعات

سے متصل ہوتی ہیں۔ ادیب فن کار کی ذاتی زندگی پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں تو تخلیقی معیار کم تر برتر ہو سکتے ہیں۔ اپنے والد سے گہری وابستگی کے بعد کا ذکر بھی اسی پیش رس میں ملتا ہے۔

ذہن انسانی ہی ہے بعض الجھنیں بعض صدمے ایسے ہوتے ہیں جو اسے کسی کام کا نہیں رکھتے۔
میرے والد چھ سات ماہ سے علیل تھے۔ بالآخر ۲۷ر جون ۱۹۶۸ء کو معبودِ حقیقی سے جا ملے۔(۵)

پنے والد کے داغِ مفارقت اور اپنے دکھ کا اظہار مصنف نے جس کرب سے کیا وہ عین فطری عمل ہے یہ شدید صدمہ یقیناً ناول کی کہانیوں کے بُنت پر ضرور اثرانداز ہوئی ہوگئی۔ یہ قارئین کی شکایت کا جواب تھا اسی طرح بیماری کے بعد لکھے جانے والی صورتحال پر بھی قارئین نے بھرپور تبصرہ کیا کسی نے کہا آپ بوڑھے ہوگئے۔ کسی نے چٹخارہ کی طلب کی۔ ابنِ صفی کے لکھے ہوئے پیش رس سے یہ بات سند کے طور پر استعمال ہوئی ہے کہ آپ شیزوفرینیا جیسی بیماری میں مبتلا ہوئے تو حکیم احسن اقبال حسین کے علاج سے صحت یاب ہوئے، لکھتے ہیں:

آپ اس کتاب میں حکیم اقبال حسین کی کتاب ''بڑھاپا اور اس کا سدِ باب'' کا اشتہار بھی پڑھیں گے۔ میں نے بھی پڑھی ہے اور اس میں بیان کیے ہوئے بعض اُصولوں سے فائدہ بھی اُٹھایا ہے۔نہایت آسان اُصول ہیں آپ اُصول اپنالیں تو بڑھاپے میں بھی نوجوان کی سی توانائی محسوس کریں گے۔(۶)

شیزوفرینیا سے صحت یابی کے بعد ابنِ صفی کے پیش رسوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے ابنِ صفی کو ہر وقت معدے کا عارضہ رہتا تھا اور وہ ہمیشہ معمولی گیسٹرک سمجھ کر نظر انداز کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ یہ ہی بیماری اتنی بڑھی کہ آخر میں سرطان تشخیص ہوا اگر مصنف ابتداء میں ہی بیماری پر توجہ دے کر اس کا علاج کر لیتے اور بیماری کی تشخیص ابتدائی دور میں ہی ہوجاتی تو شاید کچھ اور زندگی مل جاتی تو یہ عظیم جاسوسی ناول نگار اُردو ادب اور جاسوسی دُنیا کو اس بلند تک لے جاتے جہاں پریم چند نے اُردو افسانے کو پہنچایا۔ جاسوسی دُنیا کے ناول نمبر ۱۰۷ تیسری ناگن کے پیش رس میں مصنف کی بذلہ سنجی نے معدے کی خرابی اور کراچی کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ معدے کی خرابی میں مبتلا ہونے کے باعث جاسوسی دُنیا اور عمران سیریز کے ناولوں کی اشاعت میں تاخیر ہوتی تھی۔ مگر ابنِ صفی معدے کی خرابی کو عادت بنانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں گویا ''مشکلیں اتنی پڑی مجھ پہ کہ آساں ہوگئیں۔'' اسی طرح ۱۹۷۳ء میں جاسوسی دُنیا کے ناول ٹھنڈا جہنم میں بھی بخار آنے کا واقعہ ریکارڈ ہے کہ ابن صفی اس ناول کی اشاعت سے قبل بخار کے شدید حملے میں مبتلا تھے۔ اسی دوران کہیں پڑھ لیا کہ سگریٹ کے نکوٹین سے ایک چوہا مر سکتا ہے۔ اس حقیقت کا علم ہوتے ہی اُنہوں نے سگریٹ نوشی ترک کرنے کا تہیہ کرلیا اور اسی پیش رس سے یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ ایک دن میں چالیس پچاس سگریٹ پی لیتے تھے مگر کمال یہ ہے کہ سگریٹ نوشی کے ایسے پختہ نشے کو اپنی مضبوط قوتِ ارادی کے باعث ترک کر دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی ایسے نشے سے پیچھا چھڑانے میں انسان کس ذہنی نفسیاتی کیفیت سے گزرتا ہے ابنِ صفی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر کبھی آپ کو سالہا سال پرانی سگریٹ نوشی ترک کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ میری ذہنی کیفیت کا

اندازہ بخوبی کر سکتے ہیں خدا کا شکر ہے کہ اس ذہنی انتشار کے دور سے گزر چکا ہوں۔[(۷)]

جاسوسی دُنیا کے بے شمار ناول ایسے جس میں معدے اور پیٹ کی خرابی کا ذکر کرتے ہیں۔ نیلم کی واپسی جاسوسی دُنیا کا ناول ۱۱۸ر ۱۹۷۶ء میں بھی وہ اسی تبخرِ معدہ کا ذکر کرتے ہوئے قارئین کو ناول کی تاخیر کے سبب سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے کہ تبخرِ معدہ اور پراگندہ ذہنی کے ساتھ ان کا دماغ قلم کا ساتھ دینے سے قاصر رہتا ہے۔ ان پیش رس سے پتا چلتا ہے ہے کہ آخری عہد کے تخلیق کردہ ناول معیار سے کم کیوں ہوگئے کہ اس مسلسل اور موذی مرض نے ان کے قلم کی روانی کو متاثر کیا۔ جسے قارئین نے بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ابنِ صفی قارئین کو یہ بتاتے رہے اور کوئی نہ سمجھ سکا۔ یہ تبخرِ معدہ اُنھیں آہستہ آہستہ دیمک کی طرح کھارہا تھا مگر وہ اس تکلیف دہ بیماری سے لڑ کر قارئین کے لیے نئی کہانیاں تراشتے رہے۔

مصنف اپنے معدے کی خرابی اور بیماری سے اس حد تک مانوس کہ اسے کراچی کے موسم کا سبب سمجھنے لگے مگر ۱۹۷۹ تک وہ اس حد تک نڈھال ہو چکے تھے کہ عمران سیریز کے ایک سوگیارویں ناول لرزتی لکیریں میں یہاں تک کہنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

اب لکھنے کی سکت نہیں طبیعت ٹھیک نہیں رہتی قارئین کو انتظار کی عادت ہوجانا چاہیے۔[(۸)]

لفظ لکھنے کی سکت نہیں مصنف کی بیماری کی شدت اور اس کرب کو ظاہر کررہا ہے جس سے وہ ہمیشہ دوچار رہے مگر اس حالت میں بھی وہ قلم کی مزدوری کرتے رہے۔ تاخیر سے سہی مگر ناولوں کی تخلیق اور کرب کی انگیٹھی میں بیٹھ کر قارئین کے لیے کہانی اور قہقہے بکھیرتے بکھیرتے اسی بیماری میں دُنیا سے رخصت ہوگئے۔

ابنِ صفی کے ناول کے پیش رس اُن کے ذاتی پسند ناپسند کا انڈیکس تھے۔ بڑی خوب صورتی سے کراچی کے موسم کو مشتاق احمد یوسفی کی طرح موردِ الزام نہ ٹھہراتے ہوئے بھی سب کچھ کہہ جاتے، لیجیے مزہ اُٹھایئے۔

> کراچی کے بادل اگر شہری کے دل میں گدگدی پیدا کرتے ہیں سرشاری اور سرخوشی لاتے ہیں تو دوسری طرف گیسٹرک ٹربل میں مبتلا کردیتے ہیں۔ یہاں کے موسم کا بھروسہ نہیں کہ دن میں دس بار دس طرح کی ہوائیں چلتی ہیں جس سے خون میں روانی پیدا ہوتی ہے۔[(۹)]

ابن صفی کا جمالیاتی ذوق بھی پیش رس سے پتا چلتا ہے وہ ہفتہ بلڈ پریشر پر ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ہفتہ حسن منانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کسی سبزی والے نے کہا بیگن لے لیں، تو ابن صفی نے برجستہ کہا جو چیز دیکھنے میں اچھی نہ لگے وہ کھانے میں کیسی لگے گی۔ وبائی ہیجان کے پیش رس کراچی کے موسم پر لطیف طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے اس بار آنچ اور انگاروں میں بیٹھ کر قہقہوں کی جنت تعمیر کرنے کی کوشش کی ہے۔[(۱۰)]

ناول کے پیش رس اور ادب کی موجودہ صورتحال پر طنز کی لطافت:

ادبی نقادوں کے لیے ابنِ صفی نے سب سے پہلے ''ادبی ٹھیکیدار'' کا لفظ استعمال کیا۔ ابنِ صفی کو ان کے عہد میں بری طرح نظر انداز کیا گیا۔ ہر بڑے ادیب مصنف اور شاعر کو ہم عصروں کے رویے سے کچھ نہ کچھ شکایت رہتی ہے مگر ابنِ صفی کی یہ شکایت بجا تھی۔

شاید ابنِ صفی کی عوامی مقبولیت ادبی ناقدین اور افسانہ نگاروں کو ناگوار محسوس ہونے لگی تھی اس لیے اُنھیں یکسر نظر انداز ہی نہیں بلکہ اُن پر بے جا تنقید بھی کرنے لگے اور کچھ مشورے بھی دینے لگے۔ ابنِ صفی اپنے ناول قارئین کی پسند و ناپسند کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھنے لگے۔ ان کے پیش رس قارئین سے صرف رابطے کا ذریعہ ہی نہیں تھے بلکہ قارئین کے مشورے پر ابنِ صفی کے جوابات ان کے ذہنی رجحانات کے آئینہ دار ہوا کرتے تھے۔ کچھ پڑھنے والوں نے ابنِ صفی کو خطوط کے ذریعے یہ مشورہ دیا کہ آپ سیدھے سادھے عام فہم اسلوب مار دھاڑ ایکشن ہنگامے جرم کی دُنیا کی ترویج کے بجائے اُردو زبان و ادب کی خدمت کریں۔ اس خط کے جواب میں مصنف نے واضح الفاظ میں قارئین کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اُن کی تحریریں عام فہم ہونے کے سبب ہی قارئین میں مقبول ہیں......فکر وفلسفہ پر مبنی کتابوں کی اشاعت تو چند سو کتابوں پر ہی مبنی ہے اور یہ کتابیں بس ان ہی حلقے کے ادیبوں میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہیں اور سراہنے والے نقاد بھی اپنے مرتب کردہ سانچوں پر پرکھ کر ان کی قدر و قیمت کا تعین کر دیتے ہیں اور ابنِ صفی کو سب سے زیادہ یہ ہی بات معترض رکھتی ہے۔ ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عجیب بات ہے کہ جب میرا کوئی ناول بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے تو مجھ سے ادب کی خدمت کرنے کی فرمائش ضرور کی جاتی ہے بھائی آپ مجھے تو صرف اُردو کی خدمت کرنے دیجیے۔ اس کے باوجود جو صرف ونحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہوں گی۔ (۱۱)

قارئین کے چند خطوط ایسے بھی دستیاب ہوئے جن سے پتا چلتا ہے کہ ابنِ صفی کے اکثر مداح جو ناول پڑھتے تھے اُن کی زبان اُردو نہیں تھی مگر ناول پڑھنے کے شوق میں اُنھوں نے اُردو سیکھی۔ ناول نگار کے نزدیک اُردو زبان کی خدمت اس سے بڑی نہیں ہوسکتی کہ غیر زبان کے لوگ اس جستجو اور شوق میں اُردو سیکھنے لگے۔ پیش رس میں بڑی ذہانت سے ادب کی خدمت اور زبان کی خدمت کے فرق کو بیان کر دیا کہ ادب کی خدمت الگ بات ہے سوسائٹی کی خدمت کے فرق کو بیان کر دیا کہ ادب کی خدمت الگ بات ہے سوسائٹی کی خدمت اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتی کہ زبان کی ترویج کی جائے اور ان کے ناول اور زبان کی ترقی میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔ اس کا اعتراف تو ابوالخیر کشفی جیسے نقاد بھی کر چکے ہیں۔ ابنِ صفی اس بات سے بے پرواہ نظر آتے ہیں کہ ادب میں ان کے مقام، حیثیت اور مرتبے کا تعین کیوں اور کس پیمانے پر کیا جا رہا ہے۔ ان کے نزدیک قارئین کی بڑی تعداد ہی اُن کے مقام کے تعین کے لیے کافی ہیں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب ابنِ صفی پہ اعتراضات جنم لینے لگے کہ جاسوسی ناولوں سے مجرمانہ ذہنیت کو تقویت ملتی ہے اور جرائم کی آبیاری میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ناول نگار ابنِ صفی نے اپنے پیش رس میں اعتراضات کا جواب دیا کہ مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ کہانیوں میں بھی جاسوس کو برداشت نہیں کرتے کہ پولیس تو پولیس ہے۔ جاسوس بے خبری میں مجرم کی گردن دبوچ لیتے ہیں۔ اس لیے وہ جاسوسی ناولوں کو پسند نہیں کرتے۔ تیسری ناگن کے پیش رس میں ابنِ صفی نے جاسوسی ناول پر جرم کی ترویج کرنے والے معترضین کو ایک لطیف طنز کے ذریعے مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ یہ بات مناسب نہیں۔ ابن صفی کا یہ دعویٰ درست ہے کہ ہر طرح کا لٹریچر تفریحی لٹریچر ہی ہوتا ہے جو تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح مہیا کرتا ہے۔ ناول نگار نے ادب کی موجودہ

صورت حال پر بھی طنز کرتے ہوئے اس اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ادب میں ان کا جو بھی مقام ہے اُنھیں وہیں رہنے دیا جائے۔ اعلیٰ ادب تخلیق کرنے کا مشورہ اُنھیں پسند نہیں آیا کیوں کہ اُنھیں یقین کامل تھا کچھ کتابیں الماریوں میں محفوظ ہوتی ہیں۔ کچھ کہانیاں حافظے میں تو بلاشبہ ان کے پیش رس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے ناول ہر طبقے کے لوگ یکساں طور سے پڑھتے ہیں اور یہ ہی بات اُن کے لیے باعثِ اطمینان اور قابلِ فخر ہے۔

ابنِ صفی کے پیش رس سے ناولوں کے تعارف کے لیے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے اس نے منفرد اور دل کش انداز سے پڑھنے والوں کو مسحور کیا بلکہ الفاظ کے انتخاب، روز مرہ کی زبان محاوروں کے برمحل استعمال موضوع کے تمام تقاضوں کو پورا کرکے اس مراسلاتی صنف کو مکالماتی بنا دیا۔ ان کے بعض پیش رس سے ان کی ادبی بصیرت کی داد دینا پڑتی ہے۔ ان کے دانشورانہ افکار اور خیالات نے ثابت کیا کہ ادب انسانی جبلت ہے۔ ادب کا تعلق زندگی اور معاشرت سے اتنا گہرا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔اپنے پیش رس میں لکھتے ہیں:

> ہمیشہ زندہ رہنے والے ادب میں ایک کہانی کا مزید اضافہ ہوا۔ یہ ادب ہمیشہ اس لیے زندہ رہتا ہے کہ اس کا تعلق براہِ راست Instinct of Curiosity سے ہے۔تجسس کی جبلت مرتے دم تک زندہ رہتی ہے۔ ادب کی زندگی یا موت کا پیمانہ آدمی ہے۔لہٰذا آدمی کی مختلف قسم کی صلاحیتوں کے لحاظ ساتھ ہی مختلف قسم کے ادب کا بھی تیا پانچہ ہوتا رہتا ہے۔(۱۲)

ناول کے پیش رس میں فحاشی اور عریانی کے فرق کو بیان کرتے ہوئے غالب کی شاعری کی بھی مثال دیتے ہوئے وضاحت کی کہ اس طرح تو غالب کا یہ شعر ''جس کے کاندھے پر تیری زلف پریشاں ہوگئیں'' کو بھی عریانی کی صف میں رکھتے ہوئے کہتے ہیں مگر موضوع کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے شاعر ادیب استعاروں کا سہارا لیتا ہے۔ اور اسپ خامہ کی باگیں ڈھیلی کرنی ہی پڑتی ہیں۔ ساتھ ہی ''بے چارہ ری'' کے پیش رس میں ناول نگار نے پروفیسر صاحبان پر لطیف طنز کرتے ہوئے کہا جو نقاد اور ادیب جاسوسی ادب کو ادب کی صنف ماننے پر تیار نہیں اور جاسوسی ناول کے تذکرے پر چہرے کے زاویے بدل لیتے ہیں۔ اُن کے تکیے کے نیچے میرے ناول ملیں گے اور چھپا چھپا کر یہ ناول پڑھتے ہیں۔ابنِ صفی کے نزدیک دانشوری ذہنی بٹیر بازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ دانشوری کا بے جا اظہار اکثر مسائل کا سبب بنتے ہیں۔ نیاز فتح پوری نے ابنِ صفی کو اُردو ادب کا ناسور قرار دیا۔ مجنوں گورکھپوری نے لکھا جب وقت کو ذبح کرنا ہو تو میں جاسوسی ناول پڑھتا ہوں، فیض احمد فیض نے کہہ ڈالا میں کسی ابنِ صفی کو نہیں جانتا۔ اکثر نقادوں نے ابنِ صفی کو بے مقصد ادیب کہہ کر ٹال دیا۔ ان سب کی رائے ابنِ صفی سُنتے رہے اور ہنستے رہے بلکہ اُسے نظر انداز کیا۔لیکن کبھی کبھی ان ادبی ٹھیکیداروں پر ظرافت اور لطافت سے لطیف طنز کرتے ہیں کہ میری ہی چند مکمل لکھی ہوئی سطر کو ذرا سلیس اُردو میں لکھ کر ادبی چودھریوں کو روانہ کیجیے جو سمجھتے ہیں کہ جاسوسی لٹریچر کے سبب جرائم کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ابنِ صفی نے رمزیہ پیرائے میں کہہ ڈالا ہمارے ادیبوں کا پرچہ سیٹ ہے کیا وہ نہیں جانتے کہ جرائم غلط فہمی کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ مایوسی کے سبب انسان جرم کی طرف راغب ہوتا ہے۔ ابنِ صفی کے اکثر نقادوں نے ناول ''متحرک دھاریاں'' کے پیش رس کا حوالہ خاص طور سے دیا جس میں ناول نگار نے بڑے زعم

اور طمطراق سے لکھا:

> میں کسی ایک عدد ایم اے، ایل ایل بی کے لیے نہیں لکھتا، مزدوروں سے لے کر پروفیسروں تک کے دل بہلانے پڑتے ہیں۔ (۱۳)

دراصل ابنِ صفی کے ناول کالی کہکشاں، سہ رنگی موت کو بعض قارئین نے ناپسند کیا اور اُنھیں آموں کی آڑھت کا مشورہ دیا۔ جس پر ابن صفی کو لکھنا پڑا کہ وہ کسی ایک شخص کی پسند کو مدنظر نہیں رکھ سکتے۔ ابنِ صفی صرف جاسوسی ناول نگار ہی نہیں تھے بلکہ زبان و بیان اور ادب کے تمام مسائل پر ان کی گہری نگاہ تھی وہ جانتے تھے کہ زبان میں اصطلاحات کا درست استعمال کا طریقہ کار کیا ہے۔ زبان کی وسعت اسی بات میں پنہاں ہے کہ دوسری زبان سے بھرپور استفادہ کیا جائے۔ کسی قاری نے اُردو ناول کے انگریزی نام پر اعتراض کیا تو ابنِ صفی نے اس کا جواب اس طرح دیا۔

> میں سوچ رہا ہوں کہ اُردو میں ریلوے اسٹیشن کو کیا کہوں مرزا غالب زندہ ہوتے تو راشن کارڈ کو کیا کہتے، سنیما ہال کا اُردو ترجمہ کیا ہوگا۔ انگریزی سے اتنا تعصب نہ برتئے کہ اس بے چاری نے جدید ترین علوم ہم تک پہنچائے ہیں، اُردو کو پروان چڑھانے میں اس کا بھی حصہ ہے۔ (۱۴)

ناول کے پیش رس کو پڑھ کر ابن صفی کی گہری ادبی بصیرت کے ساتھ زبان کی ترقی و ترویج اور ارتقائی سفر کو بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ابنِ صفی جدید علوم کو اپنانے میں سرسید کے خیالات کے حامی تھی کہ علم سیکھنے کے لیے دوسری زبان کے اصطلاحات کو اپنی زبان میں استعمال کرتا عیب نہیں بلکہ یہ زبان کی وسعت کا سبب ہے۔ فکر وفن اور ادبی بصیرت کے امتزاج نے پیش رس کی ادبی اہمیت کو بھی بڑھا دیا۔

ناول کے پیش رس اور کرداروں کا تعارف

ابن صفی کے پیش رس اُن کے کرداروں کا ابتدائیہ ہوتے تھے۔ پیش رس میں ہر نئے کردار کی توجیہہ پیش کرتے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے مستقل کرداروں کے فنی ارتقاء کا بھی ذکر کرتے۔ کرداروں کی شخصیت اس کی نفسیاتی توجیہہ بھی چند جملوں میں بیان کردیتے کہ قارئین ان کرداروں کو اسی تناظر میں پڑھتے اور پرکھتے تھے۔ جو مصنف نے پیش رس میں بیان کیا ہوا ہو۔ پیش رس میں کرداروں کو متعارف کراتے ہوئے ایک خاص تکنیک استعمال کی کہ کردار کا تعارف بھی ہو اور تجسس بھی باقی رہے۔ صرف ایک جملے ایک فقرے سے ہی اپنے منفی کرداروں کی اہمیت اُجاگر کردیتے کہ فلاں کردار سے ناول میں ناول نگار نے کیا کام لیا۔ مگر اندازِ بیاں ایسا رکھا کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔

پیش رس میں جاسوسی اور سائنس فکشن پر اظہارِ خیال

ابنِ صفی جانتے تھے کہ اُردو ادب کے قارئین ابھی جاسوسی اور سائنس فکشن کی تکنیک سے پوری طرح مانوس نہیں۔ اسرار وسراغ

رسائی کے ناولوں تک رسائی انگریزی ناولوں کے ترجمے کے ذریعے ہوئی۔ اس لیے ناول نگار اکثر اپنے پیش رس میں جاسوسی اور سائنس فکشن کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے رہے کہ ان دونوں ناولوں میں بنیادی فرق کیا ہے اور ذہنی جنگ اور دھما چوکڑی ایک ہی پلاٹ میں پیش کرنا مشکل ہے۔ ان کے پیش رس ان کے صناعی کے شاہکار ہیں اور اسی پیش رس کی بنا پر جعلی لکھنے والے پس منظر میں چلے گئے۔ وہ سراغ رسانی اور جرم وسزا کے موضوع پر بڑے مدلل انداز میں تبصرہ کرتے ہیں جس سے اُن کی جاسوسی ناولوں کی تکنیکی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناول نگار کے پیش رس کے مطابق سائنس فکشن اور جاسوسی فکشن کی سرحدیں ایک مقام کے بعد ملنے لگتی ہیں۔ انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسے حالات و واقعات ظہور پذیر ہونے لگتے ہیں جو عقل، فہم وفراست سے بالا تر ہوتے ہیں۔ اگر کہانی میں ان واقعات کو پیش کر کے اس کی وجوہات اور دلائل کو منطقی طور سے بیان کر دیا جائے تو یہ سائنس فکشن کہلاتا ہے۔ ابنِ صفی کے اکثر قارئین مار دھاڑ، سائنس فکشن، دھما چوکڑی اور ناول میں کلائمکس کا تقاضا کرتے تھے اور ناول نگار قارئین کی ان خواہشات کو مدِ نظر بھی رکھتے اور اُنھیں دلیل سے مطمئن بھی کرنے کی کوشش کرتے۔ مہینے میں دو ناول تخلیق کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اس لیے جواب دیتے ہیں۔

> میں یہ بات بڑی دیانت داری سے کہہ رہا ہوں کہ اتنے تھوڑے وقت میں سائنس فکشن پیش کرنا آسان کام نہیں۔ پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے ذہین پڑھنے والوں کو کسی حد تک مطمئن کر سکوں۔ محیر العقول اور بعید از قیاس واقعات یکجا کر کے کہانی کی شکل دے دینا آسان نہیں۔ لیکن اس کا جواز پیش کرنا ہی حقیقتاً اس طلسم ہوشربا کو سائنس فکشن میں تبدیل کرنا کہلاتا ہے اور تھوڑے وقت میں یہ مشکل کام ہے۔ اس میدان میں انگریزی کے سب سے مشہور اور کامیاب مصنف ایچ جی ویلز کی تصانیف میں بھی اگر منطقی اور سائنسی استدلال کے ٹکڑے حذف کر دیے جائیں تو وہ سرتاپا طلسم ہوش ربا بن جائیں گے۔ طلسم ہوش ربا بجائے خود ایک بڑی پیشین گوئی ہے۔ مثلاً فلاں جادوگر نے ایک گولہ مار کر پورا شہر تباہ کر دیا۔ اس وقت سمجھدار لوگ اس بنڈل بازی پر خوب ہنسے ہوں گے مگر کیا آج آپ ایسے ہی گولے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ہیروشیما پر ایک گولہ ہی تو پڑا تھا...... اس دور میں فضا میں طفیلی سیارے بھی چھوڑے جا رہے ہوں سب کچھ ممکن ہے، کہنے کا مطلب ہے کہ اگر کتاب پر دو ماہ کا وقت بھی مل سکا تو آپ کو دکھا دوں گا سائنس فکشن کسے کہتے ہیں۔ (۱۵)

سائنس فکشن کے بارے میں ابنِ صفی منتشر خیالی کا شکار رہے۔ ایک طرف وہ سائنس فکشن کی منطقی دلیل اور زیادہ وقت درکار ہونے کے لیے اسرار کرتے ہیں کہ محیر لعقول واقعات کی منطقی سائنسی توجیہہ ہی سائنس فکشن کو سائنس فکشن کہلانے کا سبب ہے۔ ستاروں کی موت کے پیش رس میں اپنے اس ناول کو ذہنی کارنامہ اور محنت کا ثمر کا شاخسانہ کہا۔ قارئین سمجھتے تھے کہ ''ستاروں کی موت'' سائنس فکشن ہوگا مگر ابنِ صفی کے بقول وہ حقیقی جاسوسی ناول لکھنے کے موڈ میں تھے۔

> میں واقعی لکھنے کے موڈ میں تھا اگر لکھنے کے موڈ میں نہ ہوتا تو سچ مچ سائنس فکشن ہی بن جاتا۔ یقین

کیجیے میں نے وہ سائنس فکشن جسے میں سائنس فکشن کہنے کو تیار نہیں ایسے ہی موڈ میں لکھے۔ ان پر زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ مکھی پر مکھی مارتے چلے جائیں اختتام تک پہنچتے پہنچتے ایک عدد سائنس فکشن تیار ہوجائے گا۔ ہوسکتا ہے کبھی بوریت کے عالم میں پھر ایک سائنس فکشن لکھ بیٹھوں۔ (۱۶)

جبکہ عمران سیریز کے ناول ''رائی کا بت'' میں لکھتے ہیں:

آج کل سائنس فکشن کا ہی زیادہ رواج ہے۔ کیا کیا جائے آپ کو اسی میں لطف آتا ہے۔ مرغی نے انڈہ دیا، زمین پر گرتے ہی شق ہوا اور اس میں سے ایک بچہ نکل آیا اور بچے نے آن واحد میں جوان ہوکر ککڑوں کوں اسٹارٹ کردی...... مرغی نے تفریحاً ایک ایٹم بم نگل لیا یہ ایٹمی پڑیا ایسی ہاتھ لگی کہ اس نے ''طلسم ہوش ربا'' نارنج و ترنج کے منہ بھی پھیر دیے۔ ہاں جناب اگر میں صحیح معنوں میں کوئی سائنس فکشن پیش کردوں تو آپ بور ہوکر کتاب سر پر مار لیں گے۔ (۱۷)

پیش رس کے تجزیے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں وہ سائنس فکشن کے بارے میں متضاد رائے رکھتے تھے۔ اسے کبھی مکھی پہ مکھی مارنا کہتے ہیں تو کبھی یہ کہتے نظر آتے ہیں ابھی اُردو ادب کے قارئین سائنس فکشن سے لطف اندوز نہیں ہوسکتے یا حقیقی سائنس فکشن لکھ دیا تو قارئین پر بوریت سوار ہوجائے گی۔ کبھی خود اپنے سائنس فکشن پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں، اللہ معاف کرے میں نے بھی مشینوں کے ذریعے بندروں سے بن مانس بنائے ہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ ابنِ صفی سائنس فکشن کی اصل خوبی سے واقف تھے۔ اُنھیں یقین تھا کہ ان کے تخیل کی ایجادات کبھی نہ کبھی ضرور تجربے میں ڈھل کر دُنیا کے سامنے آئے گا۔ زلزلے کا سفر میں لکھتے ہیں:

دھویں کے حصار کے اندر کیا تھا۔ کتنی بڑی تباہی کا سامان پروان چڑھ رہا تھا۔ آپ اسے طلسم ہوش ربا کی پرواز تخیل سمجھ لیں لیکن دس سال بعد آپ ایسے تباہ کن حربے کے وجود سے ضرور آگاہ ہوجائیں گے۔ یہ ساری ایجادات جو آج ہماری زندگی کا حصہ ہے بہت پہلے تخیل پرست آرٹسٹ کی پینک ہی سمجھی گئی ہوں گی لیکن آج اُنھیں خود برت رہے ہیں۔ تیس برس پہلے امریکا نے چاند پر پہنچنے کی فلم بنائی تھی۔ مگر آج اس کے باسی سب سے پہلے چاند پر چہل قدمی کر کے آئے۔ (۱۸)

ابنِ صفی نے ناولوں کے پیش رس میں ہی کئی سائنسی ایجادات کا ذکر کیا جو پہلے صرف داستانوں یا ناولوں میں بیان ہوئے مگر بعد میں مادی شکل میں سامنے آگئے۔ اسی طرح عمران سیریز کے ناول ''ہلاکت خیز'' میں اپنے ناول میں سائنسی ایجاد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ روس ایک ایسی ایٹمی شعاع بنانے میں کامیاب ہوگیا جو بین براعظمی میزائلوں کو فضا میں ہی تباہ کردے گا۔ ناول نگار کا دعویٰ ہے کہ زیرولینڈ میں یہ ایٹمی شعاع ایک ہفتہ قبل استعمال کی گئی لیکن میرے اس تخیل پر کون یقین کرے گا۔ کریڈٹ روس کو جائے گا۔ ابنِ صفی جانتے تھے کہ وقت کے بدلتے تقاضے اب سائنس فکشن کی راہ ہموار کررہے ہیں لیکن ابنِ صفی کا رجحان سائنس فکشن کی جانب زیادہ نہیں تھا۔ اس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ ناول میں ایجادات کا ذکر اسی طرح کرنا ضروری ہے کہ سائنسی دماغ کو مطمئن کیا جاسکے کیوں کہ سائنس فکشن کے ادیب رجحانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ابنِ صفی نے ناول ''طوفان کا اغوا'' میں

فولادی کا تصور پیش کیا۔روس میں فولادی تخلیق کرلیا گیا۔ نہ صرف وہ ٹریفک کنٹرول کرتا ہے بلکہ خلاف ورزی کرنے والوں کا چالان بھی کرتا ہے۔ ایچ جی ویلز نے تیس سال قبل پرواز کرنے والی مشین کا ذکر کیا۔اب وہی جہاز اسی شکل میں اُڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس لحاظ سے ابنِ صفی کے پیش رس سائنس فکشن اور جاسوسی فکشن کے تکنیک کو وضع کرنے میں بھی بڑے مددگار ثابت ہوئے۔

پیش رس نہ صرف کہانی، کردار اور ابنِ صفی کے افکار کی ترویج کا ذریعہ تھے بلکہ بڑی سراہت سے جاسوسی ناولوں کی تکنیک بھی بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ واقعات کے اہم نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کس صورت حال سے کہانی نے جنم لیا۔ابنِ صفی جاسوسی ناولوں کی تکنیک سے باخبر تھے اور کہانی لکھتے وقت اُن کی خواہش ہوتی تھی کہ عوام کو بھی آگاہ کرتے رہیں کہ اصل میں جاسوسی ناول کسے کہتے ہیں۔ تجوری کا راز، جاسوسی دُنیا کا چوتھا ناول تھا مگر مصنف نے لکھا کہ گزشتہ تین ناولوں سے بہت زیادہ تیز اور عمدہ ہے۔ ناول کا پلاٹ دل چسپ ہے اور محیر العقول واقعات کے ساتھ دل دہلانے والے مناظر اور جرات اور ہمت بھی ہے۔ پیش رس میں ہی اعلان کیا کہ قتل و غارت گری جو کہ جاسوسی ناول کا خاصہ ہیں مگر اس ناول کی سب سے بڑی خوبی کہ اس میں کوئی خون نہیں ہوا اور دل چسپی بھی برقرار رہی۔(۱۹)

ابنِ صفی جانتے تھے کہ ہندوستان میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے ترجمے بڑی تعداد میں ہوئے اور قارئین ان پر گزارے کے عادی تھے۔ لہٰذا قارئین سمجھتے تھے کہ بس اس تکنیک پر ناول لکھنا چاہیے۔ ابنِ صفی نے قارئین کو بتایا کہ اصل میں جاسوسی ناول کیا ہوتے ہیں۔

> انگریزی کی اسپائی اسٹوریز پر مبنی فلموں نے بعض پڑھنے والوں کا ٹیسٹ خراب کردیا اور مجھ سے بھی یہی چاہتے ہیں کہ میرا ہیرو بھی ہر حال میں فولاد کا پٹھا ہو، اوپر ہوائی جہاز، نیچے توپیں، دائیں بائیں سمندر، کبھی بموں سے بچتا ہوا کبھی توپوں سے اور توپ کے دھانے پر بھی ہیرو چھلانگ لگانے کی صلاحیت رکھتا ہو، معاف کیجیے میں باز آیا۔(۲۰)

ابنِ صفی نے جاسوسی ناول نگاری کا جو سفر ۱۹۵۲ء میں شروع کیا وہ گھٹنوں کے بل چلتے چلتے۔ ۱۹۷۸ء میں اس قابل ہوگیا تھا کہ ناول نگار بھی اب اس بات کو تسلیم کرتے ہیں۔ اب قارئین اتنے باشعور ہوگئے کہ بندروں کو بن مانس کا دور گزر گیا۔ اب قارئین کا شعور پختہ ہوگیا سائنس فکشن کا شعور بیدار ہوچکا ہے کہانی میں ہوائی قلعہ تعمیر کرنے سے بات نہیں بنتی۔ اِدھر اُدھر کی ہانک سے گزارا مشکل ہے لیکن ابنِ صفی نے پیش رس میں تسلیم کیا کہ جاسوسی ناول میں قارئین کی پسند کو بھی مدِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اور کچھ کہانیاں تو قارئین کی پسند کو مدِ نظر رکھ کر تخلیق کی بھی گئیں ہیں۔ کچھ کہانیاں ڈھول دھپہ کے طور پر لکھی گئیں۔

مصنف کو اعتراف ہے کہ بلاشبہ پاپولر لٹریچر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ پبلشرز کی پسند اور معاشی نکتے کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے مگر ہر لکھنے والے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اگر مصنف اپنے اندازِ نظر اسلوب اور تکنیک کو نظر انداز کرتا ہے تو اسے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ خطوط سے اندازہ ہوتا ہے قارئین کی بڑی تعداد ناول میں ڈھول دھپ کو پسند نہیں کرتی۔ ناول ''موت کی آہٹ'' اور ''صحرائی دیوانہ'' کا پیش رس بھی اس ضمن میں قابلِ تعریف ہے۔

سسپنس اور سراغ رسانی کے داؤ پیچ سے بھرپور کہانی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ان لوگوں کو بے حد پسند آئے گی جو غیر ضروری مار دھاڑ سے کتراتے ہیں اور صرف کہانی کی دل چسپی سے لطف اندوز ہونے کا سلیقہ رکھتے ہیں جنھیں مار دھاڑ سے دل چسپی ہے وہ یہی محسوس کریں گے جیسے خاصی مار دھاڑ ہو رہی ہے۔ (۲۱)

روایت اور جدت کے امتزاج سے جاسوسی ناول کا سفر کرنے والے اس ناول نگار نے اپنے قارئین کو ذہنی جنگ کے اصل مفہوم سے آشنا کیا اور ہر قدم پر نت نئے واقعات حالات پیدا کر کے اُنھیں اپنے ساتھ سفر پر آمادہ کر کے اُن کے ذوق کو سنوارتے رہے اور اُن کے شعور کو بلند کرتے رہے۔ اور اپنے ناول کے معیار کو بھی بلند کرتے رہے۔ ساتھ ہی پیش رس میں قارئین کو کردار نگاری کے فنی نکتہ نظر سے بھی آگاہ کرتے رہے کہ کردار نگاری میں اظہارِ واقعیت کا حق ادا کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہاں مصنف ذاتی نظریات سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ تو ہی اس منصب پر پورا اُترتا ہے۔ کرداروں میں نظریات کی تبدیلی مصنف کی سوچ کی پختگی کا ثبوت ہے جس کے بغیر ادیب کی کامیابی مشکل ہے، لکھتے ہیں:

ہر کہانی کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ اس کے مدارج کے لحاظ سے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ہر جگہ زور نہیں باندھا جاسکتا ہے۔ موقع بے موقع ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے سے فن کا خون ہوتا ہے۔ جاسوسی ناول کی خاص خوبی یہ ہے کہ کہانی کا ہر حصہ قاری کے ذہن پر مکمل گرفت رکھتا ہو۔ (۲۲)

جاسوسی ناول کی تکنیک اور فن کا اس سے بڑھ کر بیان نہیں ہوسکتا۔ فن کا خون، ہر جگہ زور نہیں باندھا جاسکتا۔ کہانی کا مدارج کے ساتھ آگے بڑھنا، قاری کے ذہن پر مکمل گرفت یہ وہ فنی تقاضے ہیں جس پر کسی ناول نگار نے اس سے پہلے توجہ نہیں دی۔ یہ پیش رس جاسوسی ناولوں کی بوطیقا ہیں اور خود جاسوسی ناول کے پرکھ کا معیار بھی ہے۔ ابنِ صفی نے اپنے قارئین کو اتنا پختہ شعور عطا کیا کہ خود قارئین اپنے محبوب مصنف کے فن پر نکتہ چینی کرنے لگے۔ قارئین نے یہاں تک لکھ دیا کہ آپ جاسوسی کے فن کا خون کرتے ہیں تکنیک سے واقف نہیں مزاح ٹھونستے ہیں یا اصلاح کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ابنِ صفی بڑے اعتبار اور اعتماد سے ایسے خطوط کو اپنے پیش رس میں جگہ دیتے بلکہ اس کا جواب بھی دیتے۔ چاہتے تو ان خطوط کو نظر انداز کر کے تعریفی و توصیفی خطوط کو ہی جگہ دیتے مگر ان کی عظمت ہے کہ ہر طرح کے خطوط کا مفصل جواب دیا۔ اسی خط کے جواب میں واضح طور سے ترشی جواب دیا کہ موصوف کے ذہن میں انگریزی جاسوسی ناول کا فن ہے۔ ساتھ ہی انگریزی کے ترجمہ شدہ ناولوں کا حشر بیان کرتے ہوئے اُسے ردی کے بھاؤ کے ساتھ کھڑا کر دیتے ہیں اور اس کے حشر سے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں۔

ابنِ صفی نے خود کو قلم کا مزدور کہا تو اُسے ثابت بھی کیا وہ جاسوسی ناول کی تکنیک سے بخوبی واقف تھے کہ آپ نے ابتدا جاسوسی ناول لکھنے کی ابتدا ہی انگریزی کے ترجمے سے نہیں تو انگریزی ناول کا ماخذ لے کر شروع کیا اور ایک مزدور جب عمارت تعمیر کرتا ہے تو مجبوراً اُسے مالک کی پسند کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور کئی موقعوں پر ابنِ صفی ایسا کرنے پر مجبور تھے کہ ناول کو مالک یعنی قارئین اور پبلشرز کی پسند کے مطابق ڈھال دیا۔ ناول نگار کو اپنے معاشرتی رویے کا اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہاں کتب بینی کا رواج عام نہیں۔ کتابوں

کی نشر و اشاعت محدود پیمانے پر ہوتی ہے اور ابنِ صفی کے ناول اُن کا ذریعہ معاش تھے۔ لہٰذا ذریعہ معاش کو جاری رکھنے کے لیے چارو ناچار اس بڑے ادیب اور مصنف نے فن کے تقاضوں سے بعض مواقع پر صرفِ نظر کیا۔ ابنِ صفی نے کئی پیش رس میں اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا۔ ابنِ صفی میگزین سے رشتہ جوڑا تو اکثر قارئین ناول کی تاخیر پر ناراض ہوتے اور تنقید بے جا سے باز نہ آتے۔ اس کا جواب ابنِ صفی نے خواجہ سگ پرست کے پیش رس میں اس طرح دیا۔

> ابنِ صفی میگزین میری ملکیت نہیں تو میں اپنا ذریعہ معاش اس کے حوالے کیوں کروں۔ اُن لوگوں کے لیے اس میں پچھلی کتابیں چھپیں گی جو ناول نہیں پڑھتے۔ ابنِ صفی میگزین میرے دوست شائع کررہے ہیں۔ ابنِ صفی میگزین ان کتابوں پر اثر انداز نہیں ہوں گی کہ یہ کتابیں میرا ذریعۂ معاش ہے۔ (۲۳)

پیش رس میں اصلاحِ معاشرہ کی ترغیب

اسلوب کی سادگی، اصلاحی جذبہ، قومی معاملات پر گہری نظر عہد سرسید کی یاد دلاتی ہے۔ سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے اصلاحی مضامین میں یہ رنگ بہت واضح ہے ''ہلاکو اینڈ کو'' کا یہ پیش رس پڑھیں تو دوسری طرف سرسید کا مضمون ''قومی ہمدردی باہمی اتفاق'' پر ایک نظر ڈالیں اور قومی معاملات پر سوچ کی یکسانیت حیران کن ہے۔

> نااتفاقیوں نے ہماری قوم کو ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کردیا جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی۔ قومی ہمدردی، قومی ترقی اور قومی اُمور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نااتفاقی نے بہت کچھ اثر بد دکھایا۔ اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزل کا ہے وہ یہ کہ بجز ذاتی منفعت کے قومی بھلائی کا خیال بھی نہیں آتا۔ (۲۴)

اس تجزیے سے مراد ہرگز یہ نہیں کہ سرسید جیسے عظیم رہنما کے اصلاحی، علمی، قومی مقاصد کو ابنِ صفی کے برابر ٹھہرایا جائے۔ کہنے کو ابنِ صفی جاسوسی ناول نگار تھے مگر غیر محسوس طریقے سے ان کے لکھے ہوئے پیش رس قارئین کے لیے اخلاقی اصلاح کا ذریعہ تھے۔ وہ قارئین میں درجہ بدرجہ احساسِ ذمے داری بھی پیدا کرتے اور قارئین کو نظم و نسق کے فرائض کی تکمیل کے لیے آمادہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے موضوعات براہِ راست وطنی، ملکی مسائل سے تعلق رکھتے ان کے ناولوں کے پیش رس کا مقام بلند و برتر ہے۔ بین الاقوامی، حالات سازشیں اور امن و امان کے مسئلے کا ذکر انتہائی جامعیت، اختصار اور باریک بینی سے کرتے ہوئے کرۂ ارض پہ ہونے والی ایٹمی تباہی کے ساتھ مغرب کی دہری پالیسیوں اور منافقت کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

> ملک کے دشمنوں کا خون بہتے دیکھنا غیر صحت مند رجحان نہیں اور پھر ایسے دور میں تو اُنھیں غیر صحت مند کہا ہی نہیں جاسکتا ہے جب دُنیا کی بعض اقوام امن اور انسانیت کے ڈھول پیٹ پیٹ کر دھما کے کر رہی ہے یا اُن کی حوصلہ افزائی کر رہی ہوں جو چھوٹی چھوٹی اقوام کو ایٹمی دھمکیاں دیتی رہتی ہیں۔ (۲۵)

ناول نگار اپنے وسیع مشاہدے اور تجربے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وطن دوستی اور محبت کا درس دیتے ہیں ایسی افواہوں کو آگے

بڑھانے سے دشمن کے ناپاک ارادوں کو تقویت ملتی ہے۔سنی سنائی بات کو آگے بڑھانا انتہائی خطرناک ہے جس بات میں صوبائی عصبیت اور نفرت انگیز پیغام ہو اور دو بھائی بھی لڑ پڑتے ہیں۔لہٰذا ایک صوبے میں بیٹھ کر دوسرے صوبے کے خلاف نفرت انگریز باتوں کو ہوا دینے سے گریز کرنا ضروری ہے۔ابنِ صفی وطن سے محبت کا درس دیتے ہوئے انسان کی چھوٹی چھوٹی عادتوں پر بھی بلیغ انداز سے تبصرہ کرتے ہوئے اسے بدلنے کی کوشش کی۔کسی قاری نے پوچھا آپ حاکمیت کے بارے میں کیا تصور رکھتے ہیں تو ابنِ صفی کے خیالات میں اللہ کی حاکمیت اور ملکیت کا عقیدہ راسخ نظر آتا ہے۔اس عقیدے پر یقینِ کامل نہ ہو تو انسان کئی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو کر مجرم بن جاتا ہے۔اپنے کردار اور ناول کے مرکزی خیال کو بیان کرتے ہوئے بڑے دکھ اور کرب سے اس برائی کی طرف نشان دہی کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے اہم منصب پر چند افراد ایسے تعینات ہیں جو ملکی خزانے اور دولت پر قابض ہیں عوام کے حق کو چوری چوری غیروں کی تحویل میں دے دیتے ہیں اور پھر تیسرے آدمی کے ذریعے سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں آخر میں لکھتے ہیں:

> بڑا آدمی صرف وہ نہیں ہوتا جس کی تگ و دو صرف اپنی ہی ذات کے لیے نہیں ہوتی اگر مالدار ہوتا ہے تو خود کو ایک چوکیدار سے زیادہ نہیں سمجھتا وہ اس مال کا چوکیدار ہے جو صرف اللہ کی ملکیت ہے۔ اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقوں پر صرف کرتا ہے۔(۲۶)

پیش رس لکھتے وقت ابنِ صفی کو اختصار سے کام لینا پڑتا تھا مگر اسی اختصار اور کم صفحے پر ناول نگار نے اپنے قارئین کو سوچنے پر مجبور کرنا اور عمل پر راضی کرنا ایک بڑا کارنامہ ہے وہ جانتے تھے کہ مادیت پرستی کے دور میں انسان کے اندر خواہشات کا سمندر موجزن ہے۔ہزاروں ذرائع کے باوجود انسان زندگی کی ضرورت کی تکمیل نہیں کر پا رہا ہے۔اس مسئلے کے حل کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔مصنف جانتے ہیں کہ اس وقت عالمی دُنیا میں ہر جگہ کپڑے، غلے کی گرانی نے گراوٹ پیدا کر دی۔اقتصادی حالت تباہ ہے۔انسان کو سکون ختم ہو کر رہ گیا۔اور انسان بتدریج پستی کی طرف جا رہا ہے اور بلاشبہ انسان چاند پر پہنچ گیا مگر خود غرضی کی پستی میں گر چکا ان کی خیالات کا اظہار لڑاکوں کی بستی کے پیش رس میں کرتے ہوئے انسان کو وجودیت کو تلاش کرنے کی سفر کی جانب مائل کرتے ہیں۔وہ انسانی رجحانات اور نفسیات پر دسترس رکھتے ہیں۔یہ پیش رس بتاتے ہیں سوشلزم کو انسانیت سے نجات دہندہ نہیں سمجھتے۔وہ نفسیاتی الجھن کے شکار کرداروں کا ذکر بھی پیش رس میں باآسانی کر جاتے تھے۔اُنھوں نے حساس مسائل اور واقعات اور پیچیدگی کو بڑی سہولت سے بیان کر ڈالا۔موجودہ دور کے حالات کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ان کا اظہار ادبی انداز سے اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ابنِ صفی کے پیش رس کو ادبی ڈسکورس میں جانچنے سے ایک نیا مفہوم سامنے آتا ہے۔وہ قوم کو متحد رکھنے کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ان کی خواہش ہے کہ یہ قوم ایک منفرد قوم بن کر اُبھرے۔اُن کی خواہش ان کے لفظوں میں پڑھیے۔

> اے اللہ اس قوم کو آزاد اور منفرد قوم کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رکھ۔قوم کو بڑی قوت کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اپنی قوتِ بازو پر بھروسہ کرنا چاہیے۔اقتصادی استحکام کے لیے کفایت شعاری ضروری ہے۔پچیس پیسے بچا کر بھی قوم متحد ہو کر ایک انڈسٹری قائم کر سکتی ہے۔(۲۷)

اس پیش رس کو موجود عہد کے تناظر میں دیکھیں اپنی اقتصادی حالت پر نظر ڈالیں کہ آج ہم کسی اقتصادی بحران سے گزر رہے

ہیں۔ اور موجودہ حکومت اب مسلسل عوام کو کفایت شعاری کی جانب راغب کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ مگر عوام عیش وعشرت کے عادی ہوگئے۔ ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کو کامیابی سمجھنے لگے۔ وہ معاشرے پر گہری نظر رکھتے ہیں کہ خواتین کس نہج پر جارہی ہیں۔ نظامِ معاشرت کی خرابیوں کو سوزِ دل کے ساتھ یوں بیان کرتے ہیں۔ بعض لوگ داڑھیاں رکھنے پہ تیار نہیں۔ بعض خواتین دوبارہ پردہ کرنے پر تیار نہیں۔ جو عیش جس کو نصیب ہوگیا وہ اُسے ترک کرنے پر تیار نہیں۔ نوجوان اپنی پوش بدلنے پر تیار نہیں لوگ محرم اور نا محرم کے چکر میں پڑنے کے بعد دوبارہ اس میں پڑنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو میں اکبرالہ آبادی کے نظریات کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ پردہ جواب قوم کی مردوں کے عقل پر پڑ گیا۔ وہ بڑے رواں اور سلیس اسلوب میں اپنے نظریات کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے موضوعات تصنع تکلف کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ جس طرح عام زندگی میں ہم گفتگو کرتے ہوئے تکلف، تصنع اور مقفع مسجع زبان استعمال کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اپنے روزمرہ معاملات کے اظہار سادہ اور بے تکلف زبان استعمال کرتے ہیں۔ ابنِ صفی پیش رس میں جامعیت اور اختصار کے ساتھ اظہارِ مدعا کرتے ہیں۔ ابنِ صفی کے چھوٹے چھوٹے پرتاثیر رواں اور پرمزاح جملوں نے پیش رس کا رنگ دوبالا کیا۔ بلکہ اُردو زبان کی ترقی و ترویج میں بھی مددگار ثابت ہوئے۔

ابنِ صفی کے ناول کو مقبول کرنے میں ان کے اس اداریے کا بڑا حصہ ہے۔ ناول نگار اور قارئین کے درمیان ذہنی ہم آہنگی اور قلمی رابطے نے ناولوں کے لیے نئے موضوعات کے ساتھ نئی نسل کی افتادِ طبع اور ذہنی نفسیاتی کیفیتوں کے سمجھنے میں بھی مدد دی۔ فکر و فن کے امتزاج اور سہل نگاری کے درمیان جو مضبوط رشتہ استوار ہونا چاہیے اس میں پیش رس نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ادبی ذوق کا معیار جنسی گراوٹ سے اخلاقی قوانین کی پاس داری کا سفر پیش رس میں پیش کردیا۔ ناول کا ابتدائی تعارف ہی نہ تھے اس میں سیاسی حالات، مہنگائی سے لے کر عوام کے طرزِ عمل تک کا جائزہ بھی ملتا ہے۔

حوالہ وحواشی

۱۔ حافظ رحیم چمن دہلوی، ٹوٹا ہوا سکہ شمیم و بہرام، دہلی، جید برقی پریس ۱۹۳۴ء

۲۔ راشد اشرف، ابنِ صفی شخصیت اور فن، کراچی، اٹلانٹس پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۷، ص ۷۶

۳۔ ایضاً، ابنِ صفی شخصیت اور فن، کراچی، اٹلانٹس پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۷، ص ۷۷

۴۔ ایضاً، ابنِ صفی شخصیت اور فن، کراچی، اٹلانٹس پبلی کیشنز، اشاعت دوم، ۲۰۱۷، ص ۲۵۳

۵۔ ابنِ صفی، دیو پیکر درندہ، جاسوسی دُنیا ناول نمبر ۱۰۰، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء

۶۔ ایضاً، شیطانی جھیل، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۹۴ کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۵ء

۷۔ ایضاً، ٹھنڈا جہنم، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۱۱۵، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۸۔ ایضاً، لرزتی لکیریں، عمران سیریز، ناول نمبر ۱۱۱، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۹ء

۹۔ ایضاً، دوسرا رخ، عمران سیریز، ناول نمبر ۱۰۶، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء

۱۰۔ ایضاً، وبائی ہیجان، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۶۷، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، جون ۱۹۵۸ء

۱۱۔ ایضاً، تیسری ناگن، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۱۰۷، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۹ء

۱۲۔ ایضاً، بے چارہ ری، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۸۹، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء، ص ۰۳

۱۳۔ ایضاً، متحرک دھاریاں، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۹۴، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۶ء

۱۴۔ ایضاً، ایش ٹرے ہاؤز، عمران سیریز، ناول نمبر ۶۳، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۲ء

۱۵۔ ایضاً، پیاسا سمندر، عمران سیریز، ناول نمبر ۲۵، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۵۷ء

۱۶۔ ایضاً، ستاروں کی موت، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۹۱، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۳ء

۱۷۔ ایضاً، رائی کا بُت، عمران سیریز، ناول نمبر ۲۳، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۵۷ء

۱۸۔ ایضاً، زلزلے کا سفر، عمران، ناول نمبر ۷۱، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء

۱۹۔ ایضاً، تجوری کا راز، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۰۴، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۵۲ء

۲۰۔ ایضاً، تباہی کا خواب، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۱۰۳، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء

۲۱۔ ایضاً، صحرائی دیوانہ، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۱۲۳، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۹ء

۲۲۔ ایضاً، خطرناک ڈھلان، عمران سیریز، ناول نمبر ۸۴، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء

۲۳۔ ایضاً، خواجہ سگ پرست، عمران سیریز، ناول نمبر ۹۸، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء

۲۴۔ سر سید احمد خان، مقالاتِ سرسید، جلد پنجم، کراچی، مجلسِ ترقی اُردو، ۱۹۶۲ء

۲۵۔ ابنِ صفی، آپریشن ڈبل کراس، عمران سیریز، ناول نمبر ۲۷، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء

۲۶۔ ایضاً، زرد فتنہ، جاسوسی دُنیا، ناول نمبر ۱۱۲، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۷۱ء

۲۷۔ ایضاً، لا بولی لا، عمران سیریز، ناول نمبر ۴۴، کراچی، اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۶۵ء

ڈاکٹر قمر عباس ٭

ابنِ صفی — جاسوسی ادب کا مہ کامل

یوپی کا ضلع الہ آباد، ہندوستان میں ایک امتیازی تشخص کا حامل تھا۔ بیسویں صدی میں کہ جب آزادی کی تحریک ایک واضح شکل اختیار کرتی دکھائی دے رہی تھی، اکبرؔ کی شاعری اپنے طنز و مزاح کی انفرادیت کے باعث الہ آباد کو پورے برصغیر میں مقبولیت کی معراج عطا کرتی نظر آ رہی تھی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اس کی گواہی ان الفاظ میں دی ہے:

> اکبرؔ کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی۔ ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا۔ ان کی شہرتوں کو مسکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے اس عمارت کی ساری داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے۔(۱)

اسی الہ آباد کا قصبہ، نارہ بھی شعر و ادب کی بھرپور سرگرمیوں کے باعث قدیم تہذیب کا ایک توانا مرکز نظر آتا ہے۔ نوحؔ ناروی وہاں کی ادبی محفلوں کا ایک متحرک کردار تھے۔ شعر گوئی گویا طبیعت کا جزو لاینفک۔ مرزا داغؔ دہلوی کے شاگرد۔ زبان کا چٹخارا ایسا کہ گویا داغؔ کلام کر رہے ہوں۔

بڑی سیدھی نگاہِ سُرمگیں معلوم ہوتی ہے　　یہ ظالم ہے مگر ظالم نہیں معلوم ہوتی ہے

چھوڑ کر طرزِ تغافل تیغ لے خنجر اٹھا　　تو نہ مجھ سے ہاتھ اٹھا اب ہاتھ تو مجھ پر اٹھا

''طوفانِ نوح''، ''سفینہ نوح''، ''اعجازِ نوح'' ادبی ورثہ قرار پائے۔ اُسی قصبے، نارہ میں ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء کو ایک بچہ پیدا ہوا۔ والدین نے اسرار احمد نام رکھا۔ لفظ، معنی، حرف، کتاب، کہانی، یہ سارے تلازمات بچے کے لیے ہرگز نامانوس نہیں تھے، کیوں کہ بچہ ایسی فضا کا حصہ تھا کہ جہاں باپ، صفی اللہ اگر اپنی ادبی دل چسپی کے باعث ناولوں اور قدیم داستانوں کا جی بھر کر مطالعہ کرتے دکھائی دیتے تو نانا، نوحؔ ناروی شاعری کی ایک دنیا آباد کیے داغؔ کی نمائندگی کرتے نظر آتے۔ سو یوں کھیلنے کودنے کی عُمر کہانی، داستان اور شعر و شاعری سے عبارت قرار پائی۔ عُمر بمشکل تمام ساتھ آٹھ برس کو پہنچی ہوگی کہ بچہ ''طلسمِ ہوشربا'' سے آشنا ہوا۔ وہی ''طلسمِ ہوشربا'' کہ جو ماضی قریب میں گھر گھر پڑھی جاتی۔ اکبر حسین قریشی ''فرہنگِ طلسمِ ہوشربا'' کے ''عرضِ حال'' میں اس عنوان سے یوں گویا ہوتے ہیں: ''طلسمِ ہوشربا اُردو کی قدیم داستانوں میں ممتاز و منفرد ہی نہیں بلکہ گلِ سر سبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اسے ذوق و شوق سے پڑھا اور سنا جاتا تھا، جا بجا اس کا شُہرہ تھا، گھر گھر اس کا چرچا تھا۔ شاید ہی کوئی گھرانہ اہلِ علم کا ایسا ہو جہاں اس کی حکمرانی نہ ہو۔''(۲)

٭ محقق، ادیب۔ برقی پتا: drqamargeo@gmail.com

سو بچے کے لیے یہ ''طلسمِ ہوشربا'' ایسی ہوشربا ثابت ہوئی کہ جس نے ہوش وحواس سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ وہ طلسمی دنیا ہی اُسے حقیقی دنیا دکھائی دینے لگی۔دل کو بھا لینے اور چھو لینے والے کرداروں کی گویا ایک دنیا آباد تھی۔ امیر حمزہ، عمرو عیار، شہنشاہ افراسیاب، کوکب بادشاہ، ملکہ حیرت وغیرہ وغیرہ۔ کردار ہی نہیں، ایک سے ایک واقعات اور تیزی سے بدلتے اور پلٹتے حالات۔ بچہ پڑھتے پڑھتے اس حد تک اُس میں گُم ہو کر رہ جاتا کہ داستان کے کردار اُسے اپنے آس پاس چلتے پھرتے محسوس ہونے لگتے۔ یہی نہیں اُسے یہ خواہش بھی ستاتی کہ وہ اُس داستان کا ایک ایسا کردار بن جائے جس پر داستان کی ملکہ عاشق ہو جائے۔ جب معاملہ یہ ہوا تو نتیجہ ظاہر تھا کہ اتنی چھوٹی سی عُمر ہی میں ساتوں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ گویا پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آنے لگے۔ ابتدائی تعلیم نارہ ہی کے اسکول سے حاصل کی۔ چوں کہ ''طلسمِ ہوشربا'' کا مطالعہ تو کیا ہی جا چکا تھا اور وہ بھی کوئی ایک دو بار نہیں، بلکہ سات جِلدوں کو سات سات بار پڑھا جا چکا تھا، لہٰذا مطالعہ کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ ساتویں ہی درجے میں ایک کہانی ''ناکام آرزو'' کے عنوان سے تحریر کی۔ ناول نگار، عادل رشید نے اُن ہی دنوں ہفت روزہ، ''شاہد'' کا بمبئی (اب ممبئی) سے اجرا کیا تھا۔ اسرار ناروی کے نام سے تحریر کی گئی اس کہانی کو نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنے جریدے کی زینت ہی بنایا، بلکہ مضمون نگار کو کوئی پُختہ کار قلم کار گمان کرتے ہوئے نام کے ساتھ ''نتیجہِ فکر مصورِ جذبات حضرت اسرار ناروی'' کا تعارفی پیرہن بھی عطا کیا۔ عادل رشید بعد کے عشروں میں ایک مشہور ناول نگار کے طور پر سامنے آئے۔ ''چراغ محفل''، ''دو سائے''، ''ایک بات''، ''بے ننگ و نام''، ''گونگی لڑکی'' کے علاوہ بھی اُنہوں نے بہت سے ناول تحریر کیے۔ ''ناکام آرزو'' سے قلمی سفر شروع کرنے والے ''اسرار ناروی'' کے طلسم کے اسیر ذہن نے شاید یہ سوچ لیا تھا کہ اولین کہانی کے عنوان کے پہلے ٹکڑے ''ناکام'' کو اپنی زندگی کے ابتدائی دَور ہی سے ناکام بنا دوں گا۔ یوں یہی اسرار احمد، ایسے ہی چھوٹے موٹے ادبی مشاغل کا حصہ بنتے ہوئے دیانند آریا ویدک اسکول، الٰہ آباد سے دسویں جماعت کے امتحان میں بھی کامیاب ہوا۔ ان تمام تعلیمی سرگرمیوں میں اُس نے نثر کے ساتھ شاعری میں بھی مشقِ سُخن جاری رکھی۔ گھر کی تہذیب میں شعر وشاعری ایک کارِ مستحسن گردانی جاتی تھی، لہٰذا اسرار کے لیے میدانِ شاعری ہرگز پُراسرار نہیں تھا۔ جگرؔ مراد آبادی کا اسلوب غزل دل کے قریب تر محسوس ہوتا۔ ایک طرف تو یہ کیفیت تھی، اور دوسری جانب وقت کی بدلتی سیاسی فضا کے تحت جس سیاسی جماعت کو ذہن قبول کرتا وہ کمیونسٹ پارٹی تھی۔ گویا ایک قدم روایت تو دوسرا جدت کی طرف بڑھتا دکھائی دیتا۔ کمیونسٹوں کے سماج کو بدلنے والے انقلابی خیالات کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ چند نظمیں بھی اُسی رنگ میں تحریر کیں جو ازکارِ رفتہ اور شکست خوردہ و بوسیدہ نظام کی مکمل نفی کی عکاس تھیں۔ اب اُس کے سامنے ایک نئی منزل اور نیا مستقبل تھا۔ عزائم بلند رکھتے ہوئے ''ایونگ کرسچین کالج، الٰہ آباد'' میں داخلہ لیا۔ یہاں ایک نئی اور وسیع دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ جہاندیدہ، تجربہ کار، پختہ فکر اساتذہ اور ذہین، امنگوں سے بھرپور، انقلابی سوچ کے حامل طالبعلموں کی ہمرہی نے ذہن کے ہر ہر دریچے کو کھول کر رکھ دیا اور یوں فکری تازگی نے اسرار احمد کی بیدار صلاحیتوں کو ایک واضح سمت متعین کر دی۔ کبھی بیت بازی کے مقابلے، کبھی تقریری نشستیں، کبھی ذہنی صلاحیتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے معلوماتِ عامہ کے سوالات، غرض خوب خوب محفلیں جمتیں۔ یہاں کا حصہ بن کر شعری ذوق کو بہت نکھار ملا۔ کالج میں گاہے گاہے منعقد ہونے والی شعری نشستوں کے لیے کلام کہنے کی جستجو نے تخلیق کی طرف مائل ہونے کا بھرپور موقع بھی فراہم کیا۔ انٹر کا دوسرا سال تھا جب کالج کی ''لٹریری سوسائٹی'' کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ اُن ہی

دنوں میں ایک نظم ''بانسری کی آواز'' کہی اور جب کالج کی شعری نشست میں سنائی تو اسے بے حد پسند کیا گیا۔ چوں کہ سامعین میں طالبعلموں کے ساتھ اساتذہ بھی شریک تھے، سو اُنہوں نے بھی نہ صرف یہ کہ نظم کی تعریف کی، بلکہ ایک استاد نے اس رائے کا اظہار کیا کہ بطور شاعر اس طالبعلم کا مستقبل بہت روشن رہے گا۔ کالج میں انگریزی کی تدریس پر مامور، پروفیسر ہنگس بھی نظم کی تحسین کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انٹر کی تکمیل کے بعد گریجویشن کے لیے الہٰ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ یونی ورسٹی نے حقیقی معنوں میں اسرار احمد کی زندگی پر دُوررس اثرات مرتب کیے۔ یہاں بھی اچھی صحبتیں اور احباب میسر آئے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین کی شہرت ایک نامور استاد کے طور پر پورے ہندوستان میں تھی۔ اُن کی کتاب ''نئے ادبی رجحانات'' ہندوستان کے بہت سے نوجوانوں کے ادبی رجحانات کی آبیاری کر چکی تھی۔ اسرار احمد کا شمار بھی ایسے ہی طالبعلموں میں تھا جنھوں نے استاد کی شخصیت اور افکار سے بہت کچھ حاصل کیا۔ یہ وہی سال بھی تھا کہ جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک اپنے منطقی انجام کی طرف جا رہی تھی۔ ۱۹۴۷ کی شورش نے طول پکڑا۔ بلوے اور فسادات پہلے قریہ قریہ اور پھر شہر بہ شہر پھیلنے لگے۔ الہٰ آباد یونی ورسٹی بھی ہنگاموں سے محفوظ نہ رہ سکی اور یوں تعلیمی سلسلہ تعطل کا شکار ہو چلا۔ اسرار احمد نے ذہن تیار کر لیا تھا کہ جونہی حالات معمول پر آئیں گے، تعلیم دوبارہ شروع کر دی جائے گی۔ حالات معمول پر آتے آتے ۱۹۴۸ء کا سال آ گیا۔ اب معاملہ یہ ہوا کہ بجائے الہٰ آباد یونی ورسٹی کے آگرہ یونی ورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی اے کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء تا ۱۹۵۲ء یادگار حسینی اسکول، الہٰ آباد میں بطور استاد تدریس کا آغاز کیا۔ اسی دوران میں الہٰ آباد ہی سے ماہنامہ ''نکہت'' کا اجرا کیا۔ اس رسالے کے لیے ممتاز ترقی پسند افسانہ نگار، علی عباس حسینی کی معاونت بھی حاصل رہی۔ اس پرچے کی وساطت سے اسرار احمد کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مہمیز کرنے کا خوب خوب موقع ملا۔ پرچے کے لیے جو قلمی نام اختیار کیا گیا وہ ''طغرل فرغام'' تھا۔ اس قلمی نام کے تحت بہت سے نامور قلم کاروں کی تحریروں کی مزاح کے پیرائے میں پیروڈی کی گئی تھی، جیسے مولانا محمد حسین آزاد کی شہرہِ آفاق کتاب ''آبِ حیات'' کی طرز پر تحریر کیا گیا مضمون ''آبِ وفات'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا۔ یہ سلسلہ کافی وقت تک جاری رہا اور لگ بھگ سو کے قریب مضامین تحریر کیے گئے۔ اس نوعیت کی تحریروں نے یہ ثابت کر دیا کہ ''طغرل فرغام'' میں مزاح لکھنے کی فطری صلاحیت موجود تھی۔ اسرار احمد کی طبیعت شاید ابھی کسی نئے جادے کی متلاشی تھی۔ اُن ہی دنوں ایان فلیمنگ نے ''جیمس بانڈ'' کے نام سے ایک کردار تخلیق کیا۔ جاسوسی مزاج کے حامل کردار کی پیروڈی ''تھیمس فانڈ'' کے عنوان سے کی گئی۔ کسی نجی نشست میں یہ گفتگو زیرِ بحث تھی کہ ناولوں کو کامیاب بنانے کا مجرب نسخہ ہی یہ ہے کہ اُس میں زیبِ داستاں کے لیے کسی حد تک عُریانیت کا سہارا لیا جائے۔ اسرار احمد نے اُس بات سے اتفاق نہیں کیا۔ اگر چہ جوابِ آں غزل کے طور پر کوئی مضبوط دلیل تو پیش نہیں کی گئی، تاہم تا اختتامِ محفل اسرار احمد اپنے آپ سے یہ عہد باندھ چکا تھا کہ ''مجرب نسخے'' کے بغیر ہی اس میدان میں قدم رکھا جائے گا اور اُس عمومی اور غلط رُجحان کی سختی سے حوصلہ شکنی بھی کی جائے گی۔

''طغرل فرغام'' کے قلمی نام کو ترک کرتے ہوئے اسرار احمد نے ''ابن صفی'' کے قلمی نام سے مارچ ۱۹۵۲ء میں الہٰ آباد سے ''جاسوسی دنیا'' کے عنوان سے سپنس، ایکشن اور مزاح کا اشتراک لیے پہلا ناول ''دلیر مجرم'' پیش کیا۔ ناول کا ہیرو ''انسپکٹر فریدی'' خوب صورت، سنجیدہ، مضبوط جسم اور صاف ستھرے اخلاق و کردار کا مالک تھا، جب کہ اُس کے معاون کے طور پر اسمارٹ، خوش

شکل، پھرتیلا، باتوں کا دھنی سارجنٹ حمید ہنسی مذاق کے پیرائے میں گفتگو کرتا اور کیس حل کرنے کے دوران اپنے باس کی مدد کرتا۔ پہلے ناول کا پلاٹ وکٹر گنز کے پیش کیے گئے ناول سے ماخوذ تھا۔لوگوں نے اس ناول کو پسندیدگی کی سند سے نوازا۔سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ اگست ۱۹۵۲ء میں ابن صفی نے بحری راستے سے پاکستان ہجرت کے لیے رختِ سفر باندھا۔نئی مملکت میں پہنچنے کے بعد اگرچہ غیر یقینی کے بادل سروں پر اُمڈے چلے آتے تھے، تاہم ابن صفی نے پامردی اور استقلال سے حالات کا مقابلہ کیا اور ''اسرار پبلی کیشنز'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔اس طرح ''جاسوسی دنیا'' کے ناول الہ آباد اور کراچی سے ایک ساتھ شائع ہونے لگے۔فریدی اور حمید کے کرداروں کی پسندیدگی کا سلسلہ سرحد کے دونوں اطراف موجود تھا اور لوگ ابن صفی کے نئے ناولوں کے منتظر رہنے لگے۔ اگست ۱۹۵۵ میں ابن صفی نے ''عمران سیریز'' کے نام سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا۔اس سیریز کا مرکزی کردار ایک بظاہر احمق اور بھولا بھالا، مگر بباطن مستعد، ذہین، بہادر، چالاک، اوٹ پٹانگ گفتگو کرنے والا نوجوان عمران تھا، جو اپنی ٹیم کے ساتھ ملک سے جرائم کے خاتمے کے لیے تن من دھن سے کام کرتا۔''عمران سیریز'' نے گویا دھوم مچا دی۔ پھر تو وہ عالم ہوا کہ قارئین بے صبری سے ''جاسوسی دنیا'' اور ''عمران سیریز'' کے منتظر رہنے لگے۔ ابن صفی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک ماہ ''جاسوسی دنیا'' اور ایک ماہ ''عمران سیریز'' کا ناول پیش کیا جائے۔ اب حال یہ ہوا کہ عوام وخواص دونوں ہی ابن صفی کے کرداروں کے اسیر ہو چلے۔شاید یہ ابتدائی عُمر میں ''طلسمِ ہوشربا'' کو جم کر پڑھنے کا فائدہ ہی تھا کہ ہر ناول میں مزاح، کردار نگاری، ماحول کی عکاسی، کہانی کا پلاٹ اور اُس پر بھرپور گرفت قائم رکھنے کا ہنر خوب سلیقے سے برتا جاتا۔ اب قارئین کی طرف سے باقاعدہ فرمائشیں کی جانے لگیں۔کبھی کہا جاتا کہ ناولوں میں ایکشن کا عنصر زیادہ ہونا چاہیے، کبھی کہا جاتا کہ زیادہ ایکشن کے بجائے دماغی مشقت والے کیسوں کے حل کی شرح بڑھائی جائے۔اب حال یہ ہو چلا کہ ابن صفی کے قارئین دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ ''فریدی پسندوں'' کا ہو چلا اور دوسرا ''عمران پسندوں'' کا۔دونوں طرف کے قارئین کا مطالبہ ہوتا کہ اُن کی پسند کے ناول زیادہ تحریر کیے جائیں۔ تاہم ابن صفی کمال درجہ ذہانت اور لیاقت سے دونوں سیریز کے درمیان توازن برقرار رکھتے۔ ۱۹۶۰ء کا سال آیا ہی تھا کہ ابن صفی ایک بڑی بیماری میں مبتلا ہوئے اور وہ بھی اس حد تک کہ ذہنی اور تخلیقی صلاحیت گویا مفلوج ہو کر رہ گئی۔ شیزوفیرینیا نے مصنف کو بستر سے لگا کر رکھ دیا۔ یہ کیفیت لگ بھگ تین برس رہی۔ اُدھر قارئین کا یہ حال تھا کہ اُنھیں گویا کسی پَل چین نہیں۔ ابن صفی کے لاکھوں قارئین جو سرحد کے دونوں اطراف موجود تھے، ایک صدمے سے دوچار تھے۔موقع سے فائدہ اٹھا کر بہت سارے مصنّفین میدان میں کود پڑے۔کوئی ''جاسوسی دنیا'' کی سیریز لکھنے لگا اور کسی نے ''عمران سیریز'' کو مشقِ ستم بنایا۔ پُرلطف بات یہ تھی کہ یہ ساری ''چوری اور سینہ زوری'' ابن صفی کے نام کا سہارا لے کر اس طرح کی جا رہی تھی کہ مصنّفین اپنے نام کے یا تو سابقے یا لاحقے میں یا تو ''ابن'' یا ''صفی'' کا جزوی نام بہت اطمینان سے استعمال کرتے۔ ایسے مصنّفین میں سے بہت سے وہ بھی تھے جو یہ سمجھ بیٹھے کہ اس بیماری سے ابن صفی کا بچنا مشکل ہے اور کچھ وہ تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اگر ابن صفی بچ بھی گئے تو ناول لکھنے کے لیے درکار ذہنی مشقت اُن کے بس سے باہر ہوگی۔ صاف نظر آتا تھا کہ ابن صفی کا نام جاسوسی ادب کی دنیا میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اُن کی بیماری میں برساتی مینڈکوں نے اگرچہ اُن کے کرداروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع تو کیا، مگر کوئی بھی ابن صفی کے بے مثل اندازِ تحریر کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔خدا خدا کر کے ۱۹۶۳ء میں بیماری کا خاتمہ ہوا

اورصحت یابی کے بعد جو پہلا ناول شائع ہوا، وہ ''عمران سیریز'' کا شاہکار ناول ''ڈیڑھ متوالے'' تھا۔شروع سے آخر تک ابن صفی نے اس ناول پر اپنی گرفت برقرار رکھی۔ ناول میں سپنس، ایکشن، مزاح کا کمال درجہ امتزاج دیکھنے کو ملا۔ادارہ نکہت، الہ آباد سے اس ناول کی اشاعت بہت متاثر کُن تھی۔سرورق کے بعد ابن صفی کی خوب صورت تصویر درج کی گئی تھی۔تصویر پر جو شعر درج تھا وہ یوں تھا:

کون کہتا ہے جام خالی ہے
پھر چھلکنے لگے سُبو آو

اگلے صفحات پر میر انیسؔ کے یہ اشعار بھی درج کیے گئے تھے:

لگا رہا ہوں مضامینِ نَو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو
سُبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

ناول کی ابتدا میں ابن صفی سے متعلق ایک متاثر کُن تحریر تھی جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں ابن صفی کے لاکھوں چاہنے والوں نے مسجدوں، مندروں اور گوردواروں میں اُن کی صحت یابی کے لیے دل سے دُعائیں کی تھیں۔ ماوں بہنوں نے اپنے آنچلوں کا واسطہ دے کر ابن صفی کو واپس مانگا تھا۔اس کے بعد ایک تصویر میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم لال بہادر شاستری کو دکھایا گیا تھا جو ''ڈیڑھ متوالے'' کی کاپی لینے نکہت، الہ آباد کے دفتر آئے تھے۔شاستری ہندوستان کے وزیر اعظم بعد میں بنے۔ جب دفتر آئے تو ہندوستانی کابینہ میں مرکزی وزارت کا حصہ تھے۔کتاب کے اختتام پر ہندوستانی اخبارات و رسائل میں ابن صفی کی علالت کے دوران شائع ہونے والی خبروں کے تراشے پیش کیے گئے تھے۔ہندوستان میں''ڈیڑھ متوالے'' کا ایسا والہانہ خیر مقدم کیا گیا کہ اس کا اگلا ایڈیشن اگلے ہی ہفتے شائع کرنا پڑا۔ یہ دراصل مقبولیت کی وہ معراج تھی جو سوائے ابن صفی کے کسی دوسرے مصنف کو حاصل نہ ہوسکی۔

قارئین کی پُرزور فرمائش پر ابن صفی نے اپنے دونوں مقبول کرداروں ''فریدی'' اور''عمران'' کو یکجا کر دیا۔''جاسوسی دنیا'' کی پلاٹینیم جوبلی کے موقع پر شائع ہونے والا یہ ناول ''زمین کے بادل'' تھا۔ابن صفی نے حسبِ سابق اس ناول پر اپنی بھرپور گرفت قائم رکھی اور قارئین کو اس کے سحر میں جکڑے رکھا، تاہم اختتامِ تحریر ناول میں ''فریدی'' کو''عمران'' پر فوقیت دلائی گئی تھی۔ ایسا کرنا مصنف کے لیے انتہائی پریشان کُن ثابت ہوا کہ ''عمران پسندوں'' نے خطوط لکھ لکھ کر پریشان کر دیا۔اپنے اگلے شائع ہونے والے ناولوں میں ابن صفی نے اس بات کو کئی بار اُجاگر کیا کہ اب وہ کبھی دونوں کرداروں کو ایک ساتھ پیش نہیں کریں گے۔ یہ واقعہ اس بات کا بین عکاس تھا کہ اُن کے قارئین اپنے محبوب کرداروں کی شکست کو ایک لمحہ بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اپنے منفرد کام سے شہرت کے ہفت خواں طے کرنے والے ابن صفی نے اپنی تخلیقی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے جس بات کا بہ شدت اور بہ تکرار درس دیا اگر اُسے کم سے کم الفاظ میں بیان کیا جائے تو وہ ہوگا'' قانون کا احترام۔''پلاٹ، کردار نگاری، منظر نگاری، طنز و مزاح اور اُس میں بھی مزاح کو فوقیت، کہ تھکے ذہنوں کے لیے صحت مندانہ تفریح کے کچھ لمحات مہیا کیے جاسکیں، ادب، تنقید، عصری رجحانات، قومی و بین الاقوامی حالات و واقعات غرض یہ کہ ہلکے پھلکے انداز میں قاری کی ذہنی سطح کو بلند کرنے کا بہت سامان مہیا تھا۔اُن کے ناول پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں مسلسل پڑھے جاتے رہے اورشاید یہی وہ ممالک بھی ہیں جہاں'' قانون کا احترام'' نچلی

ترین سطح پر موجود ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ابن صفی نے اپنی تحریروں کو جس پیغام کے لیے وقف کیے رکھا، اُس کی افادیت آج گزرے وقتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔

اُن کے ناولوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو مختلف ممالک، وہاں کے رہن سہن، ناموں، جغرافیائی محل وقوع سے بھی آگاہی دلاتے ہیں۔ اگر اُن کے پچاس کے عشرے میں تحریر کیے گئے ناولوں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُس زمانے میں بیٹھ کر آئندہ ہونے والی ایٹمی ترقی، ہولناک تباہ کاریوں اور عالمی طاقتوں کی بھیانک رسہ کشی سے رونما ہونے والے واقعات سے باخبر کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

پاکستان اور ہندوستان میں مقبولیت کی معراج پانے والے ابن صفی اس بات سے ہمیشہ بے نیاز رہے کہ ادب کے ناقدین اُن کی تحریروں کو ''ادب عالیہ'' تو جانے دیجیے، ''ادب'' کا مستحق قرار دینے میں بھی تامل کیوں کرتے ہیں؟ ایک مقبول عام ٹی وی پروگرام میں مدعو کیے گئے اور جب یہی سوال کیا گیا کہ ''آپ کی کتابیں ڈرائنگ روم میں موجود الماری کی کتابوں میں جگہ کیوں نہیں پاتیں؟'' تو مقبول ترین مصنف نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا تھا کہ ''میری کتابیں لوگوں کے ڈرائنگ روم کی الماریوں کی زینت نہیں بنتیں، بلکہ لوگوں کے تکیوں کے نیچے ہوتی ہیں۔'' اُن کی مقبولیت کا ایک اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہر ماہ جب اُن کے ناول بازار میں آتے تو لوگ بک اسٹالوں پر قطار میں لگ کر خریدا کرتے۔ اُردو ادب کے ممتاز نقاد، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے ''جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے'' میں تحریر کیا ہے: ''طبع زاد جاسوسی ناول نگاروں میں ابن صفی سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔''(۳)

۸۹ نرم خُو، نمود ونمائش سے دُور، بڑی حد تک گوشہ نشین ابن صفی جب تک جیے، اس شان سے کہ جیسے سورج اپنی روشنی سے زمین کو منور کر رہا ہو۔ اُن کی زندگی میں جاسوسی ادب کے میدان میں کوئی دوسرا مصنف یوں قدم نہیں جما سکا کہ سورج کے آگے چراغ جلانا کارِعبث قرار پاتا تھا۔

ابن صفی نے صنفِ شاعری کو بھی اپنایا، تاہم ناول نگاری کے فن کو اختیار کرنے کے بعد شعر گوئی کا سلسلہ تعطل کا شکار ہوتا رہا۔ اگر وہ اس صنفِ سخن میں سنجیدگی سے قدم بڑھاتے تو شاید ایک منفرد اسلوبِ نگارش وضع کرتے۔ ۱۹۷۳ء میں انھوں نے فلم انڈسٹری میں قدم رکھا اور ''دھماکا'' کے نام سے بنائی جانے والی ایک فلم کی کہانی بھی تحریر کی، تاہم یہ سلسلہ مذکورہ فلم ہی تک محدود رہا۔

۱۹۷۹ء میں وہ ایک بار پھر شدید بیمار ہوئے اور یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا اور بالآخر ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو برصغیر میں جاسوسی ادب تخلیق کرنے والا یہ بے بدل اور بے مثل تخلیق کار انتقال کر گیا۔

حوالہ جات

۱۔ مولانا عبدالماجد دریابادی، ''اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں''، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء، ص ۱۲

۲۔ ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، ''فرہنگِ طلسمِ ہوشربا''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۸

۳۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ''جدید ادب کے دو تنقیدی جائزے''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۳ء، ص ۸۹

پروفیسر عقیل ہاشمی ٭

ابنِ صفی اور عصری حسّیت

ادب کی عظمت میں زمانہ یا عہد کا بڑا حصہ شامل ہوتا ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ادیب شاعر اور فنکار اپنے عہد ہی کی ترجمانی کرتا ہے یا خود ہی اس دور کا عکاس ہوگا، اس کے لیے کسی طرح کے فلسفہ یا نظریہ یہ ضرورت نہیں۔ دراصل آدمی جس عہد میں سانس لیتا ہے اس کے بارے میں نہ صرف سوچتا ہے بلکہ اپنے اطراف واکناف، ماحول و معاشرہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ بسا اوقات اس کی یہ کیفیت خود آپ ہی کی تلاش کے تحت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں ہر شخص ساری عمر اس سلسلے میں ہراساں وسرگرداں رہتا ہے کہ وہ کسی طور اپنے ضمیر کی آواز کو پہچان لے۔ اس سے نا آشنا یا بیگانہ، نہ رہے۔ تہذیبی اعتبار سے یہ کوشش نشیب و فراز سے دوچار ہوگی لیکن زندگی یا معاشرہ کی صورت گری کے لحاظ سے اضافی نہیں۔ شاید اسی کو ''عصری حسّیت'' کہتے ہیں، جس کا پیمانہ وقت ہے اور حرکت یا جدو جہد اس کی روح یوں کسی بھی انسان کی صلاحیتیں اندھیرے سے اُجالے کی سمت ایک سفر، مسلسل سفر کا عنوان بن کر اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہیں اس طول طویل سفر میں اس کا عہد ایک درمیانی کڑی سے جدا نہیں جو اس کے ماضی اور مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہمارے عہد، پچھلی نصف صدی میں اردو ادب کا جو کچھ بھی معیار و شعار ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ وزن و وقار، سمت و رفتار کی بحث کے قطع نظر آج کا ادب، ادبیات سے کم فروعات سے زیادہ متعلق ہے۔ اس مرحلہ پر ابن صفی، کی تحریریں (ناولیں) یقیناً ہمیں چونکا دیتی ہیں۔ ابن صفی محض ادیب نہ تھے بلکہ اپنے عہد کے عینی شاہد، نبّاض اور اس کے شریک تھے۔ اُس وقت کے متحدہ ہندوستان میں جاری آزادیٔ وطن کی جدہ جہد، اقلیت و اکثریت کے حسّاس فرقہ وارانہ ماحول، مستقبل کی تہذیبی تبدیلیوں کی سرگرمیوں سے وابستہ ایک فرد تھے۔ تب ہی تو ابن صفی کی ''عصری حسّیت'' کو سمجھنے کے لیے اس رجحان، مزاج اور مذاق کی چنداں ضرورت ہوگی جس کے ذریعے علم و ادب کی دنیا میں ایک نئے انقلاب کے آثار رونما ہوں۔ یہ سچ ہے کہ فطرت کی سرکش اور ناموافق قوتیں انسان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوتی ہیں وہ اس کے ساتھ کسی صورت ہم آہنگ نہیں ہوتیں۔ اس کے عزائم سے اکثر متصادم بھی ہوتی ہیں ان پر قابو پانا ایک اہم اور مشکل کام ہے جس کے لیے غیر معمولی قوت کا ہونا لازم ہے۔ اسی کو فلسفۂ اخلاق، خیر و شر کے مختلف مراحلے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک فردِ واحد کے خیر و شر کا تعلق ہے وہ قابلِ فہم ضرور ہے مگر جب اس کا دائرہ عمل فردِ واحد سے گزر کر دوسرے افراد یا معاشرے کو متاثر کرے تو اس میں پیچیدگی در آئے گی۔

چنانچہ یہ بات واضح ہوگی کہ جو عمل ایک کے لیے نافع اور خیرہ وہ دوسرے کے لیے مضر اور شر ہوسکتا ہے۔ ذاتی احساسات اور

٭ سابق صدر، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی، حیدر آباد دکن، ہندوستان۔

ذاتی رغبتیں ہی سچائی اور خیر کا معیار ہیں چونکہ خیروشر کی کوئی اطلاقی قدر و قیمت نہیں اس لیے اس کا تعین کسی نہ کسی قانون یا معاہدے کے ذریعے ہی ہوسکتا ہے۔ یہی اس کی صحیح مسرت ہے۔شاید سقراط نے خیر کو ایک طرح سے علم وبصیرت کا مترادف قرار دیا ہے۔سب سے بڑی خیر یہی ہے کہ آدمی یہ جان لے کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے جو ہانا چاہیے وہ خیر ہے اور جو نہ ہونا چاہیے وہ شر ہے۔ ابن صفی کے سبھی ناولوں میں اسی خیروشر کی جنگ نظر آتی ہے اور خیر ہمیشہ فتحیاب ہوتی ہے اور شر کا سدا منہ کالا ہوگا۔ ابن صفی کے نزدیک یہی سب کچھ قانون کا بالادستی کی صورت سے بھی نظر آتا ہے۔ اس سے قبل کہ ابن صفی کے ناولوں میں ''عصری حسّیت'' کے نمونے تلاش کیے جائیں۔ضروری ہوگا کہ عصری حسّیت کے ادراک وتعقل کا جائزہ لیا جائے۔قدیم سے قدیم زمانے میں بھی فرد و جماعت کا رشتہ رہا ہے انسان طبعی طور پر خودغرض، حرص وہوس، قوت و جبروت کا عادی کمزوروں کا استحصال کرتا آیا ہے جبکہ کچھ خود ساختہ قوانین بنیادی لحاظ سے تعقل کا اظہار کرتے ہیں اور اُن کا ادراک مجبور ومختار کی اصطلاحوں پر غور بھی کرواتا ہے۔ ویسے بھی انسانی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں۔ کچھ لوگ جبر وتشدد کو یکسر پسند نہیں کرتے اور کچھ شعوری طور سے معاملہ فہم یا صلح جو ہوتے ہیں۔ ایسے میں چند ذی عقل، صاحب سمجھ افراد انسانی فضائل، علم وحکمت، عدالت وصداقت کی فضیلت کو نافذ کرنا چاہتے ہیں جو کسی مداخلت یا جبر کے بغیر ہر فرد اور طبقے کے لیے قابل قبول ہوجاتی ہے اور پھر اقتدار اور حکومتی سطح پر اس کا اطلاق عمومیت سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ یہی انسانیت کی شروعات ہوگی۔ دستور یا قانون کی بالادستی اور اس کا یکساں برتاؤ امن وآشتی مساوات کا ضامن ہوجائے گا۔

یونانی فلسفہ حصوصاً ارسطو کے نزدیک مثالی ریاست اگر چہ ایک سرّی یا اشرافیہ ہے لیکن لوگوں کی سرشت ان کی جبلت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کا میلان ایک امن پسند ماحول کے لیے لازمی ہے۔ اور انسانی برداری کے لیے مساوات کا تخیل اور وقانونِ فطرت کا نظریہ ناقابل بغیر ہوگا۔ ابن صفی نے اپنی دانست میں اسی نظریۂ حیات کو آفاقی سطح پر دیکھا اور دکھانے کی دانستہ اور شعوری کوشش کی ہے۔جس زمانے میں انہوں نے لکھنا شروع کیا وہ کس قدر پرآشوب، دگرگوں بلکہ ہنگامہ خیز تھا اس بارے میں کوئی دورائے نہیں۔ دو عظیم جنگیں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۴۵ء انسانیت کو پارہ پارہ کر چکی تھیں۔ اقوام عالم میں رسہ کشی، اقتدار کی ہوس، طاقت کا بے جا استعمال، استعماریت نیز بھوک، افلاس عربت کے عفریت اپنے دائرہ عمل کو وسیع سے وسیع کرنے پر آمادہ ہی نہیں بلکہ عمل پیرا تھے۔

ابن صفی نے جاسوسی ادب کے حوصلہ مند قارئین کے ذہین کو قانونِ انسانیت اور قانونِ الہیہ دونوں سے واقف کروایا۔ ابتدا ہی ابن صفی نے اس حقیقت کو واضح کیا کہ انسان اپنے اطراف واکناف کی زندگی کو جرائم سے پاک وصاف رکھے معاشرہ میں ومثبت سوچ کے ساتھ ساتھ تعمیر وتوقیر کی بات ہو۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> میں سوچتا رہا... سوچتا رہا، آخر کار اس نتیجہ پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام، کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ ہوتا رہے گا یہ مرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ (میں نے لکھنا کیسے شروع کیا،''عالمی ڈائجسٹ''، ۱۹۷۰ء)

ابن صفی کی اس اعلیٰ تخلیقی استعداد وقابلیت کا احتساب کرتے ہوئے ''ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ'' کے فاضل مرتب محمد عارف اقبال لکھتے ہیں کہ:

ابن صفی کا ادبی نصب العین کا کینویس اس قدر وسیع ہے کہ ان کی ادبی خدمات کے احاطے، کے لیے ہزاروں صفحات بھی کم پڑ سکتے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے عصرِ حاضر میں زندگی کے جملہ، شعبۂ حیات کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کے نزدیک ''قانون'' کی طرح ''جرم'' کا تناظر بھی بے حد وسیع ہے... ابن صفی کے نزدیک وقت اور حالات کے ساتھ جرائم کی قسم اور نوعیت میں بدلتی رہی ہے سنگین جرائم میں عام طور سے چوری، ڈکیتی، قتل، بلیک میلنگ، فرقہ وارانہ فساد، دہشت گردی اور جنسی تشدد کو شمار کیا جاتا ہے لیکن موجودہ سائنس وٹکنالوجی کے عہد میں جرائم کی اتنی شکلیں پائی جاتی ہیں کہ بسا اوقات عقل حیران رہ جاتی ہے۔ (مضمون ابن صفی کا ادبی نصب العین، ص ۱۸)

ابن صفی نے اپنی ناولوں میں قانون اور جرائم کی جہاں مختلف جہتیں پیش کیں وہیں انہوں نے صاف انداز سے جرم سے نفرت کرنا سکھایا جبکہ مجرم سے ہمدردی کے جذبات دکھائے اورتو اور ان جرائم سے پیدا ہونے والے مسائل کے خاطر خواہ علاج کی جانب اشارے بھی کئے ہیں۔ ابن صفی نے یوں تو جاسوسی ناول نگاری کا آغاز بیسویں صدی کے نصف دوم، سے کیا اور لگ بھگ تین دہوں تک چھائے رہے اس دوران انہوں نے اپنے عہد کے تناظر میں مختلف تجربات کیے اس میں نفسیات، حسّیات، مہمات، سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں، یورپ اور امریکہ کی عالمی سازشوں نیز مغربی تہذیب کی مکاریوں کو بڑی چابکدستی، دوربینی، گہرائی و گیرائی اور ادبی چاشنی سے اُجاگر کیا۔ ان کا ہر ناول تخلیقی شعور کے ہمراہ سیاسی، سماجی منظر پس منظر اور عصری بے چینیوں سے مربوط ہے۔ کمالِ فن یہ کہ وہ کسی مرحلے پر بھی قانون کے اہمیت وافادیت سے دست کش نہیں ہوتے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی ابتدائی نالیں عام نوعیت کے جرائم سے قریب لگتی ہیں لیکن جلد ہی انہوں نے ایسے ایسے موضوعات پر قلم اُٹھایا جسے ''غیر معمولی'' کہا جاسکتا ہے۔ یوں تو ابن صفی کا ہر ناول عام طور پر مکمل ہوتا لیکن بعض ناول سلسلہ وار ہوتے اور ان کے مجرم پیشہ ور ہوتے اور کبھی کبھی سوسائٹی کے معزز نامی گرامی سفید پوش ہوتے یہ تمام کردار قومی، بین الاقوامی بھی ہوتے بقول کسے ابن صفی کے موضوعات بڑے متنوع، منفرد اور فکر انگیز ہوتے ہیں ان میں بے ایمانیاں، بدعنوانیاں، ناانصافی، تخریب کاری کے پہلو بہ پہلو بڑی بڑی طاقتوں کے بدنیتی، سازشیں سبھی کچھ صاف نظر آتی ہیں۔ تجزیاتی زوایے سے دیکھیں تو ان کے بیشتر ناول ''عصری حسیّت'' سے مملو، مجرمانہ حرکتوں کے خلاف ''کامیاب سدباب'' کو دکھلاتے ہیں وہ اپنے اسلوب کی شگفتگی، سلاست، ندرت اور جاذبیت سے بھی قاری کو محسوسات کی دنیا میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ چنانچہ انسانی فطری حرص وہوس کی تصویریں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اپنے محض دوسے ہی خاص نمبر ''شاہی نقارہ'' (اکتوبر ۱۹۵۳ء) میں حکیم ارسلانوس کی یہ کیفیت دیدنی ہوگی۔

تختِ عقرب روشنی میں دمک رہا تھا اور اس میں جڑے ہوئے ہیرے جگمگا رہے تھے ارسلانوس نے اسے طرح دبوچ رکھا تھا جیسے وہ انتہائی محبت سے کسی بچے کو پیار کر رہا ہو اور اس کے خون کی بوندیں تخت سے زمین پر رس رہی تھیں۔ (''جاسوسی ادب'' کتابی سلسلہ ۱۴، فریدی حمید سیریز پراسرار آواز، ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء)

ابن صفی نے اپنے جادو نگار قلم کے ذریعے زندگی کی ہر جہت کا احاطہ کیا ہے اپنے لافانی کرداروں فریدی، حمید، عمران کے علاوہ کیپٹن فیاض، انوار، رشیدہ، جولیا فٹز واٹر، روشنی اور قاسم کے ساتھ ساتھ سازشی گھناؤنے مجرمانہ ذہنیت کے حامل کرداروں کو بھی اس طرح پیش کیا کہ وہ قارئین کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو سکتے جیسے لیونارڈ، عظیم لوزاٹا، جیرالڈ شاستری، ڈاکٹر نارنگ، کنور شمشاد، سنگ ہی، الفانسے، اور پھر بین الاقوامی دہشت گرتنظیم زیرو لینڈ کی سربراہ تھریسیا، نانوتہ اور اس کے زیر اثر کارندے بھلائے نہیں بھول سکتے۔ ابن صفی کی تحریریں اپنی کیفیت اور کمیت دونوں طرح سے بے راہ روی، جرم کے خلاف اپنا ایک واضح نظریہ رکھتی ہیں۔ ان میں تحیر خیزی، سنسنی، موضوع کا انوکھا پن معاشرہ میں نئی فکر و آگہی سے وسعت اور زندگی پیدا کرتا ہے۔ خصوصیت سے دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات کے ہمراہ حکومتی سطح پر سفارت خانوں کی ریشہ دوانیوں، تخریب کار ایجنٹوں کی اخلاق سوز بلکہ انسانیت کو تباہی کے دہانے پر پہنچانے والی برائیوں کی منصوبہ بندی، ترقی پسند ممالک کے درمیاں ہنگامے، سیاسی استحصال، ظلم و تشدد کی کارستانیوں، منشیات کا پھیلاؤ، قتل و غارت گری، انتقامی کاروائیوں، سفاکی، بربریت، جنسی ہوسناکی، خوں ریزی ایسی ہولناک بھیانک مناظر دکھائے کہ الامان و الحفیظ، جیسے اپنے مشہور خاص نمبر لاشوں کا آبشار (جون ۱۹۵۶ء) کے مسٹر کیو ڈاکٹر نارنگ کے پاگل پن خطرناک کمپلیکس کا اظہار، جب عدالت میں وہ یہ کہتا ہے:

> کسی موہوم ہستی کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا... سچ ہی کہوں گا البتہ میں بہتے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہوں کیونکہ خونریزی ہی میرا مذہب ہے... میں کہتا ہوں کہ جو مقصد کسی مذہب کا ہو سکتا ہے وہی میری خونریزیوں کا بھی ہے۔ مذہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے اور میں صرف انفردیت پر یقین رکھتا ہوں۔ محض اس لیے کہ اجتماعی زندگی نے مجھے حرامی قرار دیا تھا حرامی! ہاں میں حرامی ہوں... (جاسوسی ادب، کتابی سلسلہ ۵، فریدی حمید سیریز، دردناک انجام، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۴۶)

ابن صفی نے معاشرے میں پھیلنے والی بدعنوانیاں اور افراد کی سادہ لوحی کو درندگی سے بدلتے حالات کی عکاسی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ اسی طرح گولڈن جوبلی نمبر شعلوں کا ناچ (اپریل ۱۹۵۶ء) اپنی نوعیت میں اس قدر انوکھی اور غیر معمولی کہانی تھی جو پہلی مرتبہ ''طاقت'' کے روپ سے ابھری۔ کنور شمشاد، عالمی دہشت کرد تنظیم کا نمائندہ بن کر سامنے آتا ہے اور اس فلسفۂ حیات کو واضح کرتا ہے جو پوری دنیا کو طاقت کے بل بوتے پر غلام بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ ابن صفی کی ''عصری حسیّت'' کی روشن مثال نہیں، ان کی بیدار مغزی عالمی تناظر کی غمازی نہیں کر رہی ہے۔ شعلہ سیریز میں اسی طاقت و جبروت کے مجرمانہ انداز کو کس متاثر کن انداز میں دکھایا گیا ہے جب کرنل فریدی کراغال کی مہم کے دوران خود غرض، فرعونیت کے مکروہ، مہیب چہرے سے نقاب الٹا دیتا ہے اور عصر حاضر کی منفی سوچ غالب نظر آتی ہے۔

> سنو! جس طاقت کو تم غلط سمجھے ہو وہ صرف خدا کی طاقت ہے جو ہمیں اور تمہیں طاقت عطا کر کے رحم کرنا سکھاتی ہے۔ طاقت کا صحیح مظاہرہ یہ نہیں ہے کہ تم کمزوروں کو مسل دو بلکہ طاقت کا صحیح مظاہرہ اس وقت ہوتا جب ہم اپنے نفس سے جنگ کرتے ہیں۔ اپنے اندر بھپرے ہوئے وحشی کو ابھرنے

نہیں دیتے۔ جب تک کہ افراد کی داخلی تنظیم اس نظریے کے تحت نہ ہوگی بہتر سے بہتر نظام حیات بھی دیر پا ثابت نہ ہوسکے گا۔تم آج ایک نظام سے اکتا کر دوسرے نظام کی بنیادیں رکھتے ہومگر کل وہ بھی ڈھیر ہوجائے گا کیونکہ اُسی پرانی زمین پر پیر رکھ رہے ہوجس کے نیچے آتش فشاں سوتے ہیں پہلے اس آتش فشاں کوٹھنڈا کرو۔ (جاسوسی ادب کتابی سلسلہ ۳۰،فریدی حمید سیریز جہنم کا شعلہ، مارچ ۲۰۰۹،ص ۲۳۴)

اس منزل پر اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سرِ ادب میں ابن صفی نے اپنے وہ انمٹ لازوال نقوش مرتسم کیے جو کسی طور پر محو نہیں کیے جاسکتے۔ ایک تازہ ذہین تخلیق کار کے اشہب قلم سے زمانے کے نشیب وفراز ہنگامہ خیزیاں کس شدومد سے عوامی ذہین پر چھا جاتی ہیں اس کا اندازہ کرنا ہوتو پھر ابن صفی کے شاہکار ناولوں کا مطالعہ ضروری نہیں لازی ہوجاتا ہے۔جس میں خیر وشر کی محض روداد ہی نہیں ملتی بلکہ زندگی کو ہرآن ہرلحہ اتھل پتھل کرنے والی تبدیلیاں، دعوت غورفکر دیتی ہیں۔ ادھر ذاتی مفادات آپسی منافرت بھی معاشرہ میں فساد کا موجب ہوجاتی ہے اس کی بہترین مثال ڈاکٹر ڈریڈ اور فنچ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

ننھا شیطان کہہ رہا تھا’’ بے کار ہے ڈاکٹر! تم مجھ سے اتنی بلندی پر واقع ہوئے ہو کہ مجھ تک تمہاری گرج تقریباً ایک ہزار دوسو پچھتّر سال میں پہنچے گی لیکن اُس یتیم لڑکی... کی چیخیں ہر وقت میرے کانوں مین گونجتی رہتی ہیں جوصرف تیرہ سال کی تھی۔ تیرہ سال کی ننھی سی جان... جسے تم بڑی بے دردی سے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا اور جس کی لاش دوسری صبح سڑک پر پڑی اونچی اونچی عمارتوں پر طنز کررہی تھی۔ (جاسوسی ادب، کتابی سلسلہ ۳۲،فریدی،حمید سیریز، لاش کا قہقہہ، مئی ۲۰۰۹ء،ص ۳۱۲)

جاسوسی دنیا فریدی حمید سیریز کے علاوہ جہاں تک عمران سیریز کا تعلق ہے ابن صفی نے اگست ۱۹۵۵ء میں’’ خوفناک عمارت‘‘ لکھ کر شروعات کی تھی جس نے دنیائے ادب میں ایک تاریخ بنائی۔ ان ناولوں میں موضوعات کی ہمہ گیریت نے برصغیر ہندو پاک کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ ان میں زیادہ تر بین الاقوامی سازشوں، سفارتوں کے مابین ٹکراؤ، جدید جوہری اسلحہ جاب کی تخریب کاری، دشت وصحرائی مہمات کی نشاندہی اورسب سے بڑھ کر یہودیت یا صیہونی تسلط خصوصاً زیرولینڈ کے تحت کام کرنے والے مجرموں کی گھناؤنی حرکات کی تفصیلات پیش کیں۔ اپنے انتقال تک انہوں نے کوئی ۱۲۲ ناول لکھے اس میں پیاسا سمندر (نومبر ۱۹۵۷ء) ظلمات کا دیوتا (۱۹۵۹ء) ، بے آواز سیارہ (مارچ ۱۹۶۰ء)، ڈاکٹر دعا گو (۱۹۶۴ء)،شوگر بینک (۱۹۶۷ء) علامہ دہشت ناک (فروری ۱۹۷۶ء) اورجنگل کی شہرت (جولائی ۱۹۷۷ء) جیسے کئی لاثانی شہکار ملتے ہیں۔عمران سیریز کی بیشتر ناول بقول لئیق رضوی:

ابن صفی کے بعض ناول تو مستقبل کی آہٹوں کوسموئے ہوئے ہیں سیاسی سازشوں جنگی جنون اور ہتھیاروں کی ہوڑ کے ساتھ ساتھ ان میں تخریبی اور دہشت گردانہ فکر کے مارے انتہائی خطرناک کرداروں سے بھی ہمارا سامنا ہوتا ہے جواپنی سنگ میں انسانیت کے دشمن بن گئے ہیں۔ ان میں

ولین جیسے سائنس داں بھی ہیں اور ساکا وا جیسے دہشت گرد بھی کنگ چانگ، دھوئیں کا حصار، سمندر کا شگاف، زلزلے کا سفر اور بلیک اینڈ وہائٹ ایسے ہی ناول ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے دہے میں جب یہ ناول منظر عام پر آئے تھے انہیں سائنسی فکشن کی تخیلاتی اڑان سمجھا گیا تھا۔لیکن آج کے تناظر میں یہ ایسا آئینہ ہے جہاں ہمارے عہد کا کالا اور کڑوا سچ نظر آتا ہے۔(ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ مضمون ابن صفی کی معنویت عصر حاضر کے تناظر میں، ص ۲۷۷)

ابن صفی کی پیش گوئی۔ دور بینی عالمی سطح کی مجرمانہ سرگرمیوں کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے بڑی بڑی طاقتوں کی بدنیتی کو بہ بانگ دہل بیان کیا۔ استعماریت کے پھیلاؤ کو مختلف طریقوں سے واضح کیا۔ اس کے علاوہ زیرو لینڈ کی سربراہ تھریسیا کی پلاننگ اس کا مقصد اور ساری دنیا پر حکومت قائم کرنے کا راز کھوم دیا، اور یہ حقیقت ہے۔

جنوبی افریقہ ایٹمی طاقت بننا چاہتا ہے اُسے ری پروسسنگ پلانٹ کی ضرورت ہے لیکن اُ نسل پرست پالیسی کی بناء پر ساری دنیا میں اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ بڑی طاقتیں بھی اس کے حق میں نہیں ہیں کہ وہ ایٹمی طاقت بنے لیکن ایک بڑی طاقت اسے ایٹمی طاقت بنانا چاہتی ہے۔ اس لیے وہ چوری چھپے جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کی مدد کرنا چاہتی ہے۔ دوسری بڑی طاقت کو اس کی سن گن مل گئی تھی لہٰذا اس کے بحری جہازوں نے اُن راستوں کی نگرانی شروع کردی جن سے یہ کالی مدد افریقہ تک پہنچنے کا امکان ہوسکتا ہے۔(جاسوسی ادب کتابی سلسلہ ۵۶ عمران سیریز جنگل کی شہرت فروری ۲۰۰۳، ص ۳۱۶)

بہرحال ابن صفی نے ہمارے ملک ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر جرائم اور قانون کی بالادستی کو واشگاف کیا جو عام طور سے پوشیدہ ہوتی ہے۔ انہوں نے انسانوں کے درمیان استحصالی جذبوں، آزمائشوں کے ناطے زندگی کے مسائل کو فکری و فنی لحاظ سے عصرِ حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں دکھلانے سعیٔ جمیل کی جس کے نتیجے میں ہمارے معاشرے میں یہ شعور اور بھی گہرا ہوتا گیا کہ آج تہذیبی آثار، نفسیاتی رجحان ہی نہیں بلکہ ہر ہر عنوان سے بگاڑ کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ ان عوامل میں بڑی حد تک سائنسی اکتشافات کے تئیں اسمگلنگ، جنسی بربریت، لوٹ کھسوٹ اور نہ جانے کتنی ہی باتیں ابن صفی کے وژن کو وسیع سے وسیع کردیتی ہیں۔ ابن صفی کے ناولوں کا بالاستعاب مطالعہ رفتہ رفتہ عصِ جدید سے جدید تر عہد کی نشاندہی کرتا ہے۔ ابن صفی نے کبھی ٹی وی کی شروعات ہی میں ریموٹ کنٹرول کی جانب اشارہ کیا اور کبھی جیرالڈ شاستری کے زہر آلودہ دماغ میں پیدا ہونے والے فساد نے دو انسانوں اور بندر کے بدن کے اختلاط سے ''قوی الجثہ درندہ'' بنانے کی کارستانی کا خیال پیش کیا۔ کبھی ''نفے گراز'' کی آمد سے دنیا کو حیرت زدہ کردیا۔ نیز دنیا بھر میں یہودیت، استبدادیت اس کی سازشوں کو بے نقاب کیا۔ ٹھیک اسی طرح شعلہ سیریز میں لیزر کی تخریب کاری کے علاوہ دیگر کئی امور کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انہوں نے بارہا اپنی تحریروں میں صیہونی ذہنیت کے زہریلے پن کو آشکار کیا ہے اس سلسلے میں مشتاق احمد قریشی لکھتے ہیں:

یہودی سازشوں کا گڑھ زیرولینڈ صرف ابن صفی صاحب کے ذہین کی اختراع نہیں بلکہ واقعی

یہودی سازشی ذہنوں نے دنیا پر اپنی حکمرانی قائم کرنے اپنے اقتدار کو مضبوط و مستحکم کرنے لے لیے ایسے کئی غیر معروف مقامات پر اپنے خفیہ اڈے قائم کر رکھے ہیں جن میں سے کئی ایک تو ابن صفی صاحب اپنی تحریروں میں نمایاں کر چکے ہیں، گو بقول ان کے ان کے ناولوں کے نام مقام کرداراور کہانی سے تعلق رکھنے والے تمام اداروں کے نام قطعی فرضی ہوتے ہیں۔ (ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ مضمون ابن صفی کے ناولوں میں صہیونی سازشوں کا انکشاف، ص ۶۴۶)

عبارت مختصر! ابن صفی جاسوسی ادب کے ایک ایسے ''زندہ جاوید'' قلمکار ہیں جن کی ہر کہانی منفرد اور اچھوتی ہوگی... ان کے طرز نگارش نے ہر سطح ذہن ہر طبقۂ خیال کے افراد کو متاثر کیا ان کا وژن ابتدا ہی سے عالمی سطح کا حامل رہا۔ اردو ادب میں جاسوسی ناول نگاری کا دور صحیح معنوں میں ابن صفی سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے انگریزی جاسوسی ناولوں کے تراجم خال خال ہی متاثر کرتے تھے۔ اردو زبان و ادب میں تخیل سے زیادہ تخلیق کے جوہر کو آشکار کرنے میں ابن صفی نے جو کارنامے انجام دیے وہ لازوال اور سدا بہار ہیں۔ ابن صفی نے اپنی تحریروں کے توسط سے انسانی معاشرے میں نیکی، صالحیت کو فروغ دینے کا کام بھی انجام دیا۔انہوں نے سماج میں قانون کی نگرانی میں انسانی کرداروں کو مطلبی، پرستی، ہوس اور اقتدار کے ناپاک ارادوں کو یکسر ٹھکرادیا اور پھر اس کی حیات افروزی میں اضافہ کیا جو اعتدال، انصاف اور سچائی سے عبارت ہے۔ عصر حاضر کے سلگتے مسائل کی بازیافت، مثبت سوچ اور ہر شعبۂ حیات میں روشن ضمیری پیدا کی۔ اخر میں ابن صفی کے قریبی دوست معروف ناول نگار شکیل جمالی کے ان الفاظ میں اپنا مافی الضمیر پاتا ہوں۔

دنیا میں بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جب وہ اس دنیا سے چلی جاتی ہیں تب یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے لیے کتنی بڑی جگہ بنائی تھی۔ اور ان کی شخصیت کتنی قدآور تھی... ابن صفی کی ذات بھی ایسی ہی تھی۔ اُن کے چلے جانے سے نہ صرف ادبی دنیا میں زبردست خلا پیدا ہوا ہے بلکہ زندگی کے مختلف گوشوں میں سناٹا محسوس ہورہا ہے۔ (ابن صفی کا جاسوسی سنسار از ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ص ۲۵)

مآخذ

۱۔ انجم اعظمی، ''ادب اور حقیقت''، کراچی اشاعت گھر، کراچی

۲۔ محمد عارف اقبال (مرتب)، ''ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ'' مشمولہ ''اردو بک ریویو''، دہلی

۳۔ ڈاکٹر منظر عاشق ہرگانوی، ''ابن صفی کا جاسوسی سنسار''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۴۔ ایضاً، ''ابن صفی کے جاسوسی ناولوں میں طنز و مزاح''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۵۔ محمد عارف اقبال (مرتب)، ''جاسوسی ادب'' کتابی سلسلہ (فریدی، حمید سیریز) (عمران سیریز) متعدد جلدیں، فرید بک ڈپو، دہلی

سیّد معراج جامی ❁

ابنِ صفی — اردو شاعری کا ایکسٹو

میں نے ۱۹۷۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا مگر ۱۹۶۶ء سے میں نے ابن صفی کے جاسوسی ناول پڑھنے شروع کیے۔ اس زمانے میں دادو میں صرف ایک لائبریری تھی جو رسائل، ناول، جاسوسی ناولز وغیرہ کرایے پر دیتی تھی۔ مجھے یاد ہے ابن صفی کے ناولز کا ایک دن کا کرایہ چار آنے مگر نئے ناول کا کرایہ آٹھ آنے تھا۔ چار آنے والے پرانے ناولز میں نے پہلے پڑھنے شروع کیے۔ لڑکپن اور نوجوانی کی سرحد پر تھا، ٹیلی وژن ہر گھر میں نہیں تھا مگر اس عمر میں خواب رنگین آنے لگے تھے۔ ابن صفی کے ناولز کا سحر اس برق رفتاری سے طاری ہوا کہ میں یہ جملہ کہ ''اس ناول کے تمام کردار فرضی ہیں'' پڑھنے کے بعد بھی ناول کے کردار کو اصلی سمجھتا تھا اور دن کے خوابوں میں خود کو کبھی زیرک اور نڈر کرنل فریدی، کبھی احمق اور بھولا عمران اور کبھی کھلنڈرا کیپٹن حمید سمجھنے لگتا تھا۔

میرا تعلیمی دور بہتر انداز سے گزرا کسی بھی مضمون میں کوئی امتیازی نمبر حاصل نہیں کیے مگر کبھی فیل بھی نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی تھرڈ کلاس سے پاس ہوا۔ میرا تعلیمی دور ہمیشہ ''گڈ سیکنڈ'' رہا۔ ہاں بورڈ آف ٹیکنیکل ایجوکیشن کے امتحان ''سرٹی فیکٹ آف کامرس'' میں پورے سندھ میں دوسری پوزیشن حاصل کی مگر سندھ بورڈ آف سیکنڈری اسکول ہو یا ٹیکنیکل ایجوکیشن بورڈ، پڑھائی بھی جاری رہی اور ابن صفی کے ناولز بھی تواتر و تسلسل سے پڑھتا رہا۔ سارے کردار ازبر تھے، کئی ناولوں کے بہت سے دل چسپ پیرا زبانی یاد تھے، اس زمانے میں ابن صفی کے ناولوں کا مجھے حافظ کہہ سکتے تھے۔

نوجوانی ابن صفی کے ناولوں میں گزر گئی۔ جوانی آئی تو کچھ دیگر رنگ لے کر آئی۔ اب خیالوں میں ابن صفی کے کرداروں کی جگہ محبوبوں اور رقیبوں نے لے لی یعنی میں شاعری کی طرف مائل ہو گیا اور یہ نشہ خود سے چڑھایا نہیں بلکہ از خود چڑھ گیا اور کیوں نہ چڑھتا کہ والد سید محمد حسین دلگیرؔ شاعر، اداکار، ہدایت کار، منجھلے بھائی سید فیاض ہاشمی فلمی دنیا کے اس وقت کے بے تاج نغمہ نگار۔ یہ خاندانی جراثیم تو مجھے لگنے تھے سو لگے۔

میری شاعری کا آغاز ۱۹۷۲ء میں ہوا، پہلے پہل مجھ سے ایک نظم سرزد ہوئی اور پھر چار پانچ ماہ میں کئی نظمیں کہہ ڈالیں، بغیر کسی تصنع کے عرض کروں کہ وہ نظمیں بالکل ایسے شاعر کی تھیں جو اس میدان میں نوزائیدہ ہوتا ہے مگر ایک بات صاف دل سے عرض کروں گا کہ ۱۹۶۸ء سے میں نے کلاسیکی غزل کا مطالعہ شروع کر دیا تھا اور تمام شعرائے قدیم کو پڑھنا شروع کر دیا تھا نہ صرف پڑھنا شروع کر دیا تھا بلکہ میں ہر سال ایک ڈائری خریدتا تھا اور اس میں اپنی پسند کی غزلیں، نظمیں اور اشعار لکھتا تھا اور پھر اس ڈائری کو فرصت میں

❁ فلیٹ نمبر ۲۰۲، بلاک سی۔ ۳، الخلیج ٹاور، عزیز آباد نمبر ۸، یاسین آباد، کراچی۔ فون: ۰۳۲۱-۸۲۹۱۹۰۸

بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ یوں مجھے قافیہ اور ردیف کا علم ہو گیا تھا، وزن بحر کا تعلق چوں کہ شعور سے ہوتا ہے اس لیے بے وزن اور بے بحر اشعار کا پتا چل جاتا تھا مگر اسے پکڑ نہیں سکتا تھا۔

یہاں اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اردو شاعری سے مجھے والہانہ لگاؤ تھا اور پھر اس زمانے میں فلمی غزلوں نے میرے شباب پر دہکتے انگارے رکھ دیئے تھے یوں میں پوری طرح غزل کے حصار میں تھا۔ کچھ مطالعہ اور کچھ شعور کی جوانی نے بھی اثر دکھایا تو پہلے شعر سمجھنے لگا پھر شعر کہنے لگا۔

جیسا کہ بتایا کہ ابن صفی کو ۱۹۶۶ سے پڑھنا شروع کیا مگر اس وقت ابن صفی صرف اور صرف جاسوسی ناول نگار تھے۔ ان کے شاعر ہونے کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا پھر ''ابن صفی میگزین'' کے نام سے ڈائجسٹ نکلنا شروع ہوا۔ ابن صفی کا نام ہو اور وہ رسالہ میری دسترس سے باہر ہو یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ جب پہلی بار ابن صفی میگزین خریدا تو اس کے صفحے نمبر تین پر غزل نظر آتی تھی جو پورے صفحہ پر ہوتی اور نیچے نام ابن صفی کا لکھا ہوتا تو خوش گوار حیرت میں ڈوب جاتا کہ اچھا ابن صفی شاعر بھی ہیں۔

ہر ماہ باقاعدگی سے میں نے ابن صفی میگزین لینا شروع کر دیا صرف اس ایک غزل کے لیے جو ہر ماہ ابن صفی میگزین کے صفحے نمبر پر تین پر سجی ہوتی تھی۔

ابن صفی کی غزلیں پڑھ کر مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ جب ابن صفی اتنے بہترین شاعر ہیں تو پھر وہ جاسوسی ناول نگاری کی طرف کیوں مائل ہوئے۔ اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ابن صفی نے اپنے احباب کے درمیان بیٹھ کر یہ عہد کیا تھا کہ میں ادب سے فحش ناول نگاری کا خاتمہ کروں گا جو اس زمانے میں کثرت سے چھپتے تھے اور اس وقت کی نئی نسل ان ناولوں کے پیچھے دیوانی تھی۔ گویا رب کریم نے ابن صفی کے ذریعے نوع انسان کے لیے ایک خیر کا پہلو تلاش کیا، نوع انسان میں سب سے اہم نئی نسل تھی جو فحش نگاری کے چکر میں اپنا مستقبل تاریک کرنے پر تلی ہوئی تھی کیوں کہ اس زمانے میں نہ تو اینڈرائڈ فون تھے، نہ کمپیوٹر، نہ ٹی وی، فلم بلیک اینڈ وائٹ تھی اور خاندانی موضوع پر بنتی تھی جسے گھر کا ہر فرد ساتھ جا کر دیکھ سکتا تھا سب سے بڑا تفریح کا مشغلہ کتب بینی تھا اور اس کتب بینی میں ناولز کا کردار سب سے اہم تھا، فحش ناولوں نے ایک نسل کو گمراہ کیا ہوا تھا اور یوں اس نسل کو گمراہی سے بچانے کے لیے ابن صفی نے اپنی شاعری کو جو آگے چل کر انھیں ایک بہترین شاعر تسلیم کرا سکتی تھی، جاسوسی ناولز کی طرف راغب ہوئے اور جاسوسی ناولز کی دنیا کے بے تاج بادشاہ کہلائے حالاں کہ اس زمانے میں جاسوسی ناولز زیادہ تر انگریزی سے اردو میں منتقل ہوتے تھے، خود ابن صفی نے شروع میں کئی ناولز انگریزی سے ترجمے کر کے اردو کے قالب میں ڈھالے۔

یہاں یہ سوال یہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے کہ آخر جاسوسی ناولز کی طرف ہی ابن صفی نے کیوں توجہ کی اور دیگر احباب نے انگریزی میں لکھے گئے جاسوسی ناولز کو کیوں اردو میں ترجمے کیے۔ اس کی وجہ بہت صاف اور آسان ہے کہ جاسوسی ناولز میں تجسس بہت ہوتا ہے، جاسوس کی شاطرانہ چال جو زیادہ تر ملک وقوم کو نقصان پہنچانے کے لیے ہوتی ہیں، اس کو پڑھ کر ہر ایک شخص جو حب وطن میں سرشار ہوتا ہے اپنے ملک کے دفاع کے لیے بطور قاری شامل ہو جاتا ہے اور خود کو اس ناول کا کردار سمجھنے لگتا ہے پھر دشمنوں کی چالوں میں الجھتا بھی جاتا ہے اور اسے سلجھانے کے لیے خود بھی اپنے دماغ کو استعمال کرتا ہے اور ملک کے ان نامور جاسوسوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر

چلتا ہے جو اپنے وطن کی سالمیت، حفاظت اور امن کے لیے اپنی زندگی کو ہر ایک قدم خطرے میں ڈالتا جاتا ہے اور شاطر دشمنوں سے حوصلہ، ہمت اور جواں مردی سے لڑتا جاتا ہے جن کی چالوں سے الجھنے میں مزا بھی آتا ہے اور اسے سلجھانے میں عقل کا استعمال بھی کرتا ہے۔

جب جاسوسی ناولز کا سلسلہ شروع ہوا تو نئی نسل تو خیر ان ناولز کی دیوانی ہوئی مگر عمر رسیدہ لوگ بھی یہ ناولز شوق سے پڑھنے لگے نیز میں نے اس دور میں چند خواتین اور لڑکیوں کو بھی ابن صفی کے ناولز پر گفتگو کرتے سنا ہے۔

جب میں نے شعور کی سرحد میں قدم رکھا تو مجھ میں شاعری کا جنون بیدار ہوا اور میں نے سب سے پہلے نظمیں کہنی شروع کیں پھر غزلوں کی طرف آیا جب کہ میں بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہوں۔ غالباً میری غزل گوئی کا آغاز قدرت نے نظموں سے کرایا ہے۔ ابن صفی میگزین میں ابن صفی کی غزلیں پڑھنے میں جو لطف آتا تھا اس کو بیان کرنا ذرا مشکل ہے، بس کبھی کبھی یہ خیال آتا کہ میں ایسے شعر کیوں نہیں کہہ سکتا۔ میں سب سے پہلے ابن صفی کے جس شعر سے متعارف ہوا وہ ابن صفی کا ضرب المثل شعر بن چکا ہے اور اس شعر میں انسانی رویے اور محبت کی جس بھرپور طریقے سے سچائی بیان کی گئی ہے اس موضوع پر مجھے اس سے بہتر کوئی شعر نظر نہیں آیا اگرچہ اس موضوع پر ماضی اور حال کے کئی نامور شعرا نے شعر کہے ہیں مگر جس انداز سے بلکہ تیقن سے ابن صفی نے حقیقت حال بیان کی ہے اس کا جواب نہیں، آپ یہ شعر سنیے اور خود انصاف کیجیے کہ میں کہاں تک درست ہوں: ملاحظہ فرمایے:

بالآخر تھک ہار کے یارو ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے پیار ہے سچا باقی سب افسانے ہیں

اس شعر سے اگر لفظ ’’بال آخر‘‘ نکال دیا جائے اور کوئی دوسرا لفظ رکھ دیا جائے تو شعر کی ساری کیفیت پھیکی پڑ جائے گی۔ اس ایک لفظ نے جو لطف اور مضمون میں وسعت دی ہے اس کا جواب نہیں۔

پھر مجھے ایک غزل پڑھنے کو ملی جس کا مطلع پڑھتے ہی میرے اندر کا عاشق جاگ اٹھا اور طبیعت اس بُری طرح مچلی کہ اگر خدا نخواستہ کوئی پری روسامنے ہوتی تو نقص امن کا خطرہ پڑ جاتا۔ اس مطلع میں ایک عاشق کی بے چارگی کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت کی داد دیجیے کہ اس نے جی نہ بھرنے کے لیے جن تینوں چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ تو ابن صفی کے کیا کسی بھی سچے عاشق کے لیے ناممکنات میں سے ہے یعنی لب، رخسار اور جبیں۔ شعر ملاحظہ فرمایئے:

لب و رخسار و جبیں سے ملیے
جی نہیں بھرتا کہیں سے ملیے

عاشق پر ایک وقت یہ بھی آتا ہے کہ اپنے محبوب سے ملتے رہنے سے، زیادہ باتیں کرنے سے، زیادہ وقت گزارنے سے دل بھر ہی جاتا ہے مگر جن تینوں کا ذکر کیا ہے اس سے بھلا کب کسی کا دل بھرا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابن صفی صرف شاعر حقیقی نہیں تھے بلکہ وہ عاشق حقیقی بھی تھے اور اگر عاشق حقیقی کا ذکر عبد و معبود کی طرف جاتا ہے تو پھر مجھے کہنے دیجیے کہ وہ زبردست عاشق مجازی بھی تھے۔

مجھے یہاں خیال آیا کہ میں ابن صفی کی اشعار کا شارح بن گیا ہوں جب کہ ایسا نہیں ہے میں اب ابن صفی کی چند غزلوں اور ایک دو نظموں پر اپنا خیال پیش کرتا ہوں اور اجازت چاہتا ہوں مگر ٹھہریے میں چاہتا ہوں کہ آپ کو مختصراً ابن صفی کے کوائف عمری سے

آ گاہ کردوں اگر چہ ان کے بارے میں تمام تر تفصیلات ہر جگہ مل جاتی ہیں مگر ہر شخص جو ابن صفی کو دل و جان سے چاہتا ہے ضروری نہیں کہ وہ ان کے کوائف عمری سے بھی واقف ہو۔

اسرار احمد نے اپنا پہلا قلمی نام اسرار ناروی رکھا اور جب جاسوسی ناولز لکھنے شروع کیے تو دوسرا قلمی نام ''ابن صفی'' رکھا۔ تاریخ پیدائش اپریل یا مئی ۱۹۲۸ء ہے، الہٰ آباد کا ایک قصبہ نارا ہے جس کے نامور شاعر 'نوح ناروی' اردو دنیا کا ایک بڑا نام ہے۔ ابن صفی اسی قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابن صفی نے اپنے ذوق سے ہٹ کر تعلیم حاصل کی، یعنی پہلے فلسفہ میں بی اے پھر معاشیات میں بی اے آگرہ یونی ورسٹی سے کیا۔ فلسفہ اور معاشیات کی تعلیم دھری رہ گئی اور قدرت نے ان کو ایک نئی راہ پر ڈال دیا اور وہ جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔

ابن صفی نے ۱۹۵۲ء میں پاکستان کے لیے ہجرت کی اور کراچی میں آ کر بس گئے۔

ابن صفی نے جاسوسی ناولز کے لیے کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کو تخلیق کیا اور عمران سیریز کے لیے علی عمران کو۔ ان دونوں سیریز پر ۲۴۵ ناول لکھے۔

ابن صفی صرف جاسوسی ناول نگار نہیں تھے بلکہ وہ طنز نگاری میں، شاعری میں افسانوں میں، ناول میں اور مصری دیو مالائی ناول میں بھی ید طولیٰ رکھتے تھے۔

طنز نگاری کے لیے انھوں نے اپنے جو قلمی نام تجویز کیے ان میں طغرل فرغان، سنکی سولجر، عقرب بہارستانی وغیرہ ہیں۔

شاعری میں اسرار ناروی کے نام سے سکہ جمایا۔

ابن صفی نے ایک نامکمل نفسیاتی و سماجی ناول ''آدمی کی جڑیں''، سماجی طنزیات پر ''پرنس چلی''، مہماتی ناولز ''بلدران کی ملکہ'' اور ''شمال کا فتنہ''، مصری دیومائی کی پر اسراریت پر ''اب تک تھی کہاں؟'' طنزیہ مضامین کا مجموعہ ''ڈپلومیٹ مرغ'' اور ''شیطان صاحب'' اور تاریخی طنزیہ کتاب ''تزک دو پیازی'' لکھے ہیں۔

ابن صفی میں جاسوسی ناول نگاری کے جراثیم تو وافر مقدار میں تھے ہی مگر ان جاسوسی ناولز میں ان کی طنزیہ جملے جو وہ فریدی، حمید اور زیادہ تر عمران کے منہ سے کہلواتے تھے، ابن صفی کو ایک بہترین طنز و مزاح نگار ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے بعض جملے تو ضرب المثل، محاورے اور روز مرہ بننے کی بھی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔ مجھے وقت ملا تو میں ان سب کی نشاندہی کروں گا مگر میں اپنے سے بہتر کسی ایک لائق فائق فرد کی تلاش میں ہوں جو اس کام کو اپنے شعور، قلب اور دل چسپی سے کرے اس لیے:

شاید کوئی بندہ خدا آ جائے
میں صحرا میں اذان دے رہا ہوں

میں ابن صفی کی شاعری پر اپنی تحریر لکھنا چاہتا ہوں مگر ابن صفی کوئی معمولی شخص تو ہے نہیں اس لیے میرا قلم بار بار بھٹک جاتا ہے مگر مقام شکر ہے کہ ابن صفی کے گرد ہی بھٹکتا ہے۔ اب ابن صفی کی ایک غزل ملاحظہ فرمایئے: اس غزل کو میں نے بطور خاص منتخب کیا ہے کہ یہ مجھے جی سے پسند ہے اس کا ایک ایک شعر اپنے ایک ایک مضمون میں ایک بھر پور تحریر رکھتا ہے:

بس اتنی سی روداد ہے آدمی کی — کبھی رہنمائی کبھی رہزنی کی
اندھیرا ازل سے ابد تک اندھیرا — ذرا دیر کو ہے کرن روشنی کی
محبت کے دھوکے تو کھاتے رہے ہیں — کرم آپ کا آپ نے دشمنی کی
تو ہنس لیں گے اپنے ہی احوال پر ہم — اگر کوئی صورت نہ نکلی خوشی کی
ہم اپنے ارادے سے کب آئے تھے یاں — تو پھر ہے یہ کیسی ہوس زندگی کی
ہے انساں کے سر میں دھماکوں کا سودا — خرد تو فنا ہو چکی ہے کبھی کی
ہمی جانے کس منہ سے آئے یہاں تک — ہوا کیا اگر آپ نے بے رخی کی
غزل بن گئی زینتِ بزم عشرت — غزل گو نے اِفلاس میں خودکشی کی

ویسے تو یہ غزل مرصع ہے مگر اس کے شروع کے پانچ شعر پر اگر آپ نے غور کیا تو آپ کے شعور کی کچھ بند پرتیں کھل جائیں گی۔ دوسری غزل سماعت فرمایئے:

بہیمیت کے نشے میں ابھی تک چور ہے ساقی — ابھی تک آدمی انسانیت سے دور ہے ساقی
یہ کس انداز سے نکلا ہے میخانے سے واعظ بھی — ترے شیشے میں شاید زندگی کا نور ہے ساقی
کسی کم ظرف کے پہلو میں بیٹھوں، بس سے باہر ہے — چلا جاؤں یہاں سے یہ مجھے منظور ہے ساقی
یہ مینائے مئے گلرنگ سے بھی خوب صورت ہے — یہ کوئی اپسرا ہے یا پری یا حور ہے ساقی
ترا میخانہ نذرِ محتسب ہو کر ہوا ویراں — مگر تو کس لیے کس بات پر مسرور ہے ساقی
بھلانے کو تو ہم بھی دختِ رز کو بھول جائیں گے — مگر کب تک کہ اس فتنے کی جڑ انگور ہے ساقی
کبھی تو نے بھی پی ہوتی تو تجھ کو درد بھی ہوتا — کوئی تو، ہم غریبوں کی طرح مجبور ہے ساقی

ابن صفی کی اس دوسری غزل میں بھی آپ کو کچھ ملا ہوگا؟ اس غزل کا ایک شعر دیکھئے کہ:

کسی کم ظرف کے پہلو میں بیٹھوں، بس سے باہر ہے
چلا جاؤں یہاں سے یہ مجھے منظور ہے ساقی

اشرافیہ کے نام پر، حسن کے دام پر اور دوستی کے ابہام پر جو ٹکراتے ہیں کیا وہ ان اوصاف پر پورا اترتے ہیں؟ سب ایسے نہیں ہوتے مگر ایسے ہوتے ہیں اور جو ہوتے ہیں انھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے مگر جو ان اوصاف پر پورا نہیں اترتے ان کے لیے ہی تو ابن صفی نے کہا ہے کہ:

کسی کم ظرف کے پہلو میں بیٹھوں، بس سے باہر ہے
چلا جاؤں یہاں سے یہ مجھے منظور ہے ساقی

ابن صفی نے اپنی زندگی کے دو شرر بار دور میں نظمیں کہیں ہیں، ایک جوانی کی ہذیان آمیز نظمیں اور دوسری ادھیڑی کی ہوش

مندی کی نظمیں۔ اب یہ دیکھیے کہ ابن صفی جوانی کو ہذیان کہتے ہیں تو کیا غلط کہتے ہیں، جوانی ہوتی ہی ہذیانی کیفیت کی بھرپور نمائندہ۔ عقل، شعور، ادراک، آگہی تو عمر کے آخری حصے میں آتی ہے جس ادھیڑ عمر اور بقول ابن صفی ''ادھیڑی'' کہتے ہیں جب انسان ہر حادثے سے، سانحات سے، دھوکے سے، پیار ومحبت کے حسین مگر جھوٹے وعدوں سے اور انسان وزندگی کی چیرہ دستیوں سے بھگت کر اس مقام تک پہنچتا ہے۔ چلیے پہلے آپ کو ابن صفی کی جوانی کی ایک ہذیانی نظم ''بھوک'' سناتے ہیں:

کچھ شکستہ اداس دیواریں
کھانسیوں کی کریہہ جھنکاریں
خوں اگلتی ہوئی حسینائیں
روندی لاشوں پہ چیختی مائیں
بھوک، افلاس، فاقہ، ذہن علیل
یہ ہیں عنواں مرے فسانوں کے
بھوک......میرا طویل افسانہ
آج بازار پر ہے چھایا ہوا
فن کے جوہر شناس کہتے ہیں
قہقہے آنسوؤں میں بہتے ہیں
رس میں ڈوبی ہوئی سی کچھ تلخی
کیف میں بھی چھپی سی بے کیفی
گورے جسموں سے جھانکتی لاشیں
سرخ ہونٹوں پہ موت کی مہریں
گنگناہٹ میں بھی کراہ سی ہے
مسکراہٹ میں سرد آہ سی ہے
فن کی اس بے کراں بلندی پر
کب کسی کی پہونچ سکی ہے نظر
بھوک میرا طویل افسانہ
آج بازار پر ہے چھایا ہوا
بھوک میرا طویل افسانہ
فن کے معیار تک پہنچ تو سکا

فن کے جوہر شناس زندہ باد
پا گیا آج اپنے فن کی داد
فن کی اس بے کراں بلندی پر
اک مری ہی پہنچ سکی ہے نظر
کاش یہ داد پیٹ بھر سکتی
ایک ٹکڑا ہی پیش کر سکتی
تم میں کوئی نہیں جو سوچ سکے
بھوک بکتی ہے روٹیوں کے لیے

کیا آپ اس نظم کو جس میں معاشرے اور صاحب ثروت انسانوں کے بدنما چہرے نظر آ رہے ہیں، ابن صفی کی ہذیانی نظم کہہ سکتے ہیں؟ دراصل جوانی تو دیوانی ہوتی ہے، اس عہد میں انسان بولتا پہلے ہے سوچتا بعد میں ہے مگر صحیح بات یہ ہے کہ اس عمر میں انسان بلا جھجک اور بلا خوف وخطر سچ کہہ ڈالتا ہے، اسے کسی کی پروا نہیں ہوتی اور وہ کسی سے نہیں ڈرتا مگر جب عمر کی کشتی بیچ سمندر میں پہنچتی ہے تو اس وقت تک انسان کو سمندر کی لہروں سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے، سمندر کے جوار بھاٹا کا ایک ایک راز اس پر کھل جاتا ہے اور ڈوبنے اور تیرنے کے سارے حربے بھی آ جاتے ہیں تو وہ دانش مندی کی باتیں کرنے لگتا ہے، وقت اور عمر انسان کو یہی تو سکھاتا ہے وگرنہ اس عمر میں آ کر بھی بہت سے عاقبت نا اندیش روز اول کی طرح ہی ہوتے ہیں اور قدم قدم پر منہ کی کھاتے ہیں۔ اب ذرا ابن صفی کی ادھیڑ عمر کی ہوش مندی کی باتیں سنئے :

دیکھیے دانش مندی طول الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی، یہ مختصر ترین الفاظ میں ہیرے رول دیتی ہے مگر جب معاملہ گمبھیر ہو تو پھر مزید الفاظ کا سہارا لینا پڑتا ہے وہ اس لیے بھی کہ جن کو سنانا چاہتے ہیں ان کا زیرک ہونا بھی تو ضروری ہے مگر ابن صفی کی ادھیڑ عمر کی جو نظم سنا رہا ہوں وہ زود اثر اور مختصر نظم ہے۔ عنوان ہے ''دستگیر'':

محترم دوستو!
وہ جو خاموش ہیں جانے کب بول اٹھیں
اس لیے چند چاندی کے چمچے منگاؤ
اور نگراں رہو
جیسے ہی لب کشا ہو کوئی
ایک چاندی کا چمچہ......
اب تمھیں کیا بتانا کہ تم
خود ہی دانا ہو......صدیوں سے

چاندی کے اوصاف سے باخبر ہو
عقل و دانش کے پیکر ہو تم

دیدہ ور اور طباع ہو
تیغ اٹھاؤ گے تو تیغ ہی پر اسے
روک لے گا کوئی

دیدہ ور دوستو
صرف چاندی کا چمچہ
تمھارے مسائل کا حل ہے اسے یاد رکھنا

بہت مختصر، آسان نظم ہے، آپ نے اگر غور سے پڑھی ہے تو اس کا ابلاغ بھی ہوا ہوگا؟ پتھر مارو گے تو پتھر آئیں گے، چاندی کا چمچہ منھ میں ڈالو گے تو ایک تو پتھر نہیں آئیں گے اور دوسری سب سے بڑی بات کہ اگلے کا منہ بند ہو جائے گا۔ سستا اور تیر بہدف علاج ہے کہ نہیں۔ ایسی باتیں انسان کو اپنی عمر کے آخری حصے میں آتی ہیں اور یہی باتیں دانائی کی ہوتی ہیں۔ میرے جیسے کیس مستثنیات میں شامل ہیں جنھیں کم عمری میں عقل و ادراک سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ (یہ از راہ تفنن کہا ہے تا کہ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ آئے)

ابن صفی ان شاعروں کی طرح تھے جو غم روزگار، غم جاناں اور غم دل کے ساتھ شاعری کرتے تھے، حقیقی شاعر سب ایک جیسے ہوتے ہیں مگر ان میں فرق شاعر کے طرز اسلوب اور مضامین تازہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ سب شاعر داخلی مزاج سے گزرتے ہیں، جدید حسیت کا ادراک رکھتے ہیں، خارجیت کا اظہار کرتے ہیں مگر ان کی انفرادیت ایک دوسرے سے کس طرح مختلف ہوتی ہے اس پر سیف الدین سیف کا یہ شعر سماعت فرمایئے جس نے تمام شعرا کے درمیان امتیاز کا دروازہ کھول دیا ہے کہ:

سیف انداز بیاں رنگ بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

ابن صفی کے انداز بیاں نے بھی ایک ایسا رنگ بدلا ہے جس کی رنگینی کی چمک الگ ہے اس لیے ابن صفی کی غزلوں میں، تازگی ہے، شگفتگی ہے، سلاست ہے اور دوامیت ہے۔

بھڑ کے چھتے کو ہاتھ لگانا تو آپ نے سنا ہے اور اس کا مطلب بھی جانتے ہیں، ابن صفی پر مجھے لکھنے کا کہہ کر گویا آپ نے بھڑ کے چھتے کو ہاتھ لگا دیا ہے مگر یہ محل اس قدر طویل مضمون کا نہیں بڑی مشکل سے مجھے اپنا قلم روکنا پڑا وگرنہ یہ بے لگام اشہبِ قلم نہ جانے مجھے کہاں لے جا کر پٹکتا۔ اس لیے یہ آخری شعر سنا کر اجازت چاہتا ہوں:

شب بھر کتنی راتیں گزریں
حضرت دل! اب ہوش میں آؤ

تبسم حجازی ٭

ابنِ صفی کی تحریروں میں صنفِ نازک کے رنگ

آج اکیسویں صدی میں عورتیں ٹرک سے لے کر ملک تک چلارہی ہیں۔ بڑی بڑی کمپنیوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور ہر شعبے میں نمایاں نظر آنے لگی ہیں تاہم کچھ شعبہ جات اب بھی ایسے ہیں جہاں خواتین کی نمائندگی آج کے دور میں بھی عام نہیں ہے۔ ان میں سے ایک شعبہ سراغ رسانی اور جاسوسی ہے۔ ان شعبوں میں خواتین کا ہونا مستثنیات سمجھا جاتا ہے اور حقیقی دنیا کے علاوہ جاسوسی ادب بھی اس صنفی امتیاز سے پرے نہیں ہے اور جب بات آج سے ستر سال پہلے کے معاشرے کی ہو جہاں عورت کی مظلومیت اس کی پہچان سمجھی جاتی تھی۔ ادب سے لے کر فلموں تک اور منٹو سے لے کر بشریٰ رحمٰن تک کے ہاں عورت مظلومیت کا سمبل تھی، جو کسی مسیحا کی منتظر ہوا کرتی تھی جو اسے آ کر بچالے۔

اسی دور میں اردو جاسوسی ادب میں ایک نیا سورج طلوع ہوا۔ ابن صفی ایک ایسا نام، جس سے اردو ادب سے شغف رکھنے والا ہر انسان واقفیت رکھتا ہے۔ جاسوسی ادب سے پہلے ابنِ صفی نے اسرار ناروی کے نام سے شاعری بھی کی اور طغرل خان اور سنکی سولجر کے نام سے طنز و مزاح میں اپنا سکہ جمایا پھر ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ایک خاص عزم کے ساتھ جاسوسی ناول لکھنے کی ابتدا کی اور گویا اردو سری ادب میں ایک نئے باب کی ابتدا کی۔ ابن صفی نے اپنے کام کو اس اعلیٰ انداز سے پایہ تکمیل تک پہنچایا کہ وہ اردو سری ادب کے اول و آخر کہلائے۔ ان کے بعد بھی اردو جاسوسی ادب میں کافی کچھ لکھا گیا اور آج تک لکھا جا رہا ہے۔ بہت سے مصنّفین کو پذیرائی ملی لیکن ان سب کے درمیان ابن صفی کی تحریریں اپنے اعلیٰ مقام پر قائم رہیں اور وقت کے امتحان میں کھرا اتر کر آج ساٹھ ستر سال بعد بھی اسی ذوق و شوق سے پڑھی جارہی ہیں۔

ابن صفی کی تحریروں کے زندہ رہنے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اردو سری ادب کے بانی تھے۔ بلکہ ان کی چارسو پھیلی مقبولیت کی وجہ ایک طرف ان کے قلم کی پختگی، مزاح کی بے ساختگی، شاعرانہ تخیل، منظرکشی اور زبان کی چاشنی ہے تو دوسری طرف ان کی اعلیٰ کردارنگاری قاری کو ان کرداروں کے سحر میں مبتلا کر دیتی ہے۔ انھوں نے دنیا کی مختلف اقوام کا جائزہ بہت باریک بینی سے لیا ہے اسی لیے ان کے کرداروں میں قاری کو ہر ملک اور خطے کے لوگ نظر آئیں گے۔ انھوں نے فریدی اور عمران جیسے کردار لکھ کر ایک نئے عہد کو جنم دیا جس کے بعد اردو جاسوسی ادب کا آنے والا دور عمران اور فریدی کے بنا ادھورا ٹھہرا۔ لیکن بات صرف ان مرکزی کرداروں تک محدود نہیں ہے ابن صفی کی تحریروں میں کرداروں کی ایک قطار ہے جو قارئین اور محققین کے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں۔

٭ سان فرانسسکو، امریکا۔ tabassum.siddiqui@gmail.com

جس دور میں ابن صفی نے لکھنے کی ابتدا کی اس دور میں خواتین کا جاسوسی ناول پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں ابن صفی نے اپنے ناولوں میں ایسے خوب صورت نسوانی کردار تخلیق کیے جو مرکزی کردار نہ ہونے کے باوجود کسی طرح مردوں سے کم نہیں تھے۔ یہ کردار روایتی انداز میں تفریح طبع کے لیے نہیں شامل کیے گئے جیسے عموماً جاسوسی ناولوں میں ہوا کرتے ہیں یہ ایسے کردار ہیں جو اپنا وجود رکھتے ہیں اور زندگی کے مختلف شعبوں، جذبوں، اور ذہنیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہ کردار جہاں معاشرتی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں وہیں ادبی طور پر بھی وہ اعلیٰ کردار نگاری کی مثال سمجھے جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے ناصرف جاسوسی ادب میں پہلے اردو ادب میں بھی ابن صفی کے منفرد نسوانی کردار کا بدل نہیں ملتا۔ ابن صفی کی یہ باریک بینی ان کو دوسرے جاسوسی ناول نگاروں اور کردار سازوں سے ممتاز کرتی ہے۔

پچاس ساٹھ کی دہائی کا دور ایسا تھا جب مغربی معاشرے میں سرمایہ دارانہ نظام کے باعث عورت معاشی زمہ داریاں اٹھانے تک مرد کے شانہ بشانہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ برصغیر کے کچھ طبقوں میں جہاں مغربی اثر تھا خواتین سوشل سرکل کا حصہ بنی نظر آتی تھیں لیکن زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اس کے باوجود ابن صفی کے ناولوں میں خواتین اہم عہدوں پر بھی نظر آتی ہیں۔

عمران سیریز کا ایک اہم کردار جولیا ہے جو سیکریٹ سروس کی ایک اعلیٰ عہدے دار ہے بلکہ ایکسٹو کی نائب ہے۔ یہ کردار پہلی بار ''دھوئیں کی تحریر'' نامی ناول میں متعارف ہوا۔ جولیا کے کرادر کی تخلیق میں جو باریکیاں ہیں انھیں قاری گہرائی سے پڑھنے کے بعد ہی سمجھتا ہے۔ اس دور کے برصغیر کے ماحول میں ایک خاتون سیکرٹ ایجنٹ کا کردار ایک غیر ملکی خاتون کا ہی ہوسکتا تھا۔ اس کے غیر ملکی اور خاتون ہونے کے باعث سیکرٹ سروس کے دوسرے مرد ممبران اس کی نیابت میں کام کرنا قبول کر لیتے ہیں اور اپنی غیر ملکی شناخت کے باعث وہ کبھی شک کے دائرے میں بھی نہیں آتی۔ ان ساری باتوں کے ساتھ ساتھ جولیا کے کردار میں نسوانی خوبیاں اور خامیاں بھی دکھائی گئی ہیں۔ جہاں وہ ظاہری خوب صورتی میں یکتا ہے اور اپنی اس خوب صورتی اور دلکشی کو ضرورت پڑھنے پر بطور ہتھیار استعمال کرلیتی ہے وہیں وہ عمران سے متاثر بھی ہے اور کبھی کبھار اس جذباتی کمزوری کے ہاتھوں نقصان بھی اٹھاتی ہے۔ اس کی یہ کمزوری اور خوبی دونوں اسے فکشن سے حقیقت کے قریب لے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک جاسوس کی دوسری خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں جیسے بھیس بدلنا، مختلف یورپی زبانوں کی سے واقفیت، ہتھیار چلانا وغیرہ۔ بحیثیت مجموعی یہ کردار ایک مکمل جاسوسہ کا ہے۔ جو اس دور کے اردو ادب میں اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا اور منفرد کردار تھا۔

جولیا کے علاوہ ریکھا، کیلی گراہم، میسی ٹرینی ایدلی دے ساواں کچھ اور مثالیں بھی ابن صفی کے ہاں ملتی ہیں جہاں خواتین ایک ذمے دارانہ پوزیشن سنبھال رہی ہیں۔ اس دور کے ماحول کے مطابق اس طرح کے زیادہ تر کردار غیر ملکی دکھائے گئے ہیں۔

معاشرتی کہانیوں میں خواتین کے منفی کردار عام ہوا کرتے ہیں اور ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن جاسوسی ادب میں ایسے نسوانی کردار جو ولن کے معاون ہوں یا ولن کی منظور نظر ہوں عام ہیں تاہم ایسے کردار کم ہی نظر آتے ہیں جو بذات خود ایک مکمل ولن ہوں۔ ابن صفی نے یہ کام بھی کر دکھایا۔ ان کے ناولوں میں کئی ایسے منفی کردار نظر آتے ہیں۔ جو قابلیت ہنر ذہانت اور سفاکیت میں اردو ادب کے بلند

ترین منفی کردار کہے جا سکتے ہیں۔ نانوتہ، تارتیہ، ریما، مونیکا، ہلدا کارلوس وغیرہ اس کی کئی مختلف مثالیں ہیں۔لیکن ایک ایسا منفی نسوانی کردار جو ناول کے مرکزی کرداروں سے برتر نہ سہی لیکن ٹکر کا محسوس ہوتا ہے وہ ہے تھریسیا کا کردار۔

اسے سب سے پہلے جاسوسی دنیا کی شعلہ سیریز میں مختصرا متعارف کروایا گیا لیکن باقاعدہ ولن کے طور پر یہ کردار'' کالے چراغ''میں پہلی بار آیا۔تھریسیا ایک بہت بڑے بین الاقوامی گروہ کی سربراہ ہے جو انتہائی خوب صورت، ذہین اور بہادر، ہونے کے ساتھ ساتھ میک اپ میں بھی مہارت رکھتی ہے۔مختلف زبانیں اہل زبان کی طرح بول سکتی ہے آواز بدلنے پر بھی قادر ہے اور اس کے علاوہ حبس دم اور صوتی تاثر جیسے کئی ہنر بھی جانتی ہے... ایسی شخصیت جس کے بارے میں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کسی بین الاقوامی تنظیم کی سربراہ ایسی ہی ہوسکتی ہے۔تھریسیا کے کردار کا پس منظر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ تمام تر جدیدیت کے باوجود اسے ایک اساطیری کردار بنا دیتا ہے۔ اس کردار کی ایک خامی جو اسے کمزور کرتی ہے وہ اس کا پہلی ہی سیریز سے علی عمران سے اس درجہ متاثر ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اسے تمام نسوانی کمزوریوں سے مبرا بتایا گیا ہے۔تھریسیا کو اگر ابن صفی کے پانچ بڑے منفی کرداروں میں رکھا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اسی طرح اردو ادب میں اس سے مضبوط نسوانی منفی کردار نہیں آیا۔

ابن صفی کی تحریروں میں ایک چیز بڑی نمایاں رہی ہے کہ نفرت جرم سے ہونی چاہیے مجرم سے نہیں۔وہ اکثر ظالم ترین مجرم تخلیق کر کے اس کے جرم کے پیچھے معاشرتی یا نفسیاتی مسائل اس خوبی سے بیان کرتے ہیں کہ قاری غور وفکر پر مجبور ہو جاتا ہے اور اسے احساس ہوتا ہے کہ انسان پیدائشی مجرم نہیں ہوتا اکثر حالات اسے اس جانب دھکیلتے ہیں۔ایسے مجرموں کو اس دلدل سے نکلنے کا موقع ضرور ملنا چاہیے۔ خاص طور وہ عورتیں جو زبردستی جرم کے راستوں پر دھکیلی جاتی ہیں وہ ایک موقعے کی منتظر ہوتی ہیں۔جیسے روشی، نیلم، کنول، میریانا وغیرہ۔

روشی کا کردار ابن صفی کے اکثر قارئین کا پسندیدہ کردار مانا جاتا ہے۔ یہ سب سے پہلے ''بھیانک آدمی''میں آیا ہے۔جس میں روشی ایک قمار خانہ میں ملازم ہے اور ایک برے پیشے سے منسلک ہے۔عمران سے اس کی دوستی اتفاقیہ ہوتی ہے اور اس معرکے میں عمران کا ساتھ دینے کے بعد وہ اسی کی مدد سے جرم کی دنیا سے نکل آتی ہے۔ روشی کا بیک گراؤنڈ بہت مختصراً بیان کیا ہے لیکن چند جملوں میں اس پیشے کی عورتوں کا کرب بیان ہو جاتا ہے۔ روشی کے کردار کی ایک خوبی اس کا اور عمران کا مخلصانہ تعلق ہے اور دوسری یہ کہ وہ عمران کی مدد سے صحیح راستے پر آتی ہے لیکن اس کے بعد اپنی راہ خود چنتی ہے۔معاشرے میں ایک باعزت خاتون کے طور پر رہتی ہے ملازمت کرتی ہے اور وقت پڑنے پر عمران کی مدد کو حاضر ہو جاتی ہے اور اپنی ذہانت اور بہادری سے کئی بار جولیا سے زیادہ کار آمد محسوس ہوتی ہے۔

ایسا ہی دوسرا کردار نیلم ہے جو جاسوسی دنیا کے ناول ''طوفان کا اغوا'' میں متعارف ہوا۔نیلم والدین کی موت کے بعد ایک مجرم کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتی ہے اور اس کے گروہ کا حصہ بن جاتی ہے۔ جرم کی تربیت کے ساتھ ساتھ انتقام کا جذبہ اس کی پرورش کا حصہ ہوتا ہے لیکن حمید کی چند روزہ صحبت اسے غلط راہ پر ہونے کا احساس دلاتی ہے اور وہ واپس پلٹنے کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتی ہے۔اس کی یہ لگن دیکھ کر فریدی اور حمید اسے ساتھ لے آتے ہیں اور اسے ایک نئی شناخت دیتے ہیں۔اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون

ملک بھیجتے ہیں۔ مجرموں کے گروہ میں پلنے والی لڑکی آخرکار سرکاری سراغ رسانی کے شعبہ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔ یہ بات شاید حقیقت سے دور محسوس ہو لیکن یہ ابن صفی کا خواب ضرور ہے کہ جرم کی دنیا سے پلٹنے والوں کو زندگی جینے کا موقع ملنا چاہیے۔

ابن صفی کے کچھ نسوانی کردار ہیں جو جرم کے خلاف قانون کا ساتھ دیتے ہوئے یہ نہیں دیکھتے کے قانون کی زد پر ان کا کوئی قریبی عزیز آرہا ہے۔ جس دور میں یہ ناول لکھے گئے ہیں اس وقت معاشرے میں عورت کی خودمختاری اور آزادی اظہار رائے کا تصور بھی بہت محدود تھا۔ اس وقت یہ کردار آئیڈیل محسوس ہوتے ہیں جو اتنے باہمت ہیں کہ جرم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے معاشرے کی روایتوں اور اس کے نتائج کی پرواہ نہیں کرتے۔

''خون ریز تصادم'' کی یاسمین جو اپنے وطن کی وفاداری میں اپنے عزیز چچا کے خلاف قانون کی مدد کرتی ہے۔ یہ ایک مختصر سا کردار ہے لیکن اس کی عظمت کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب عمران اپنی کامیابی کا سارا کریڈٹ اسے دیتا ہے اور ساتھ ہی اعلیٰ عہدیداروں کو یہ بھی باور کرادیتا ہے کہ یاسمین نے یہ سب ملک کی محبت میں کیا اور اس کے بدلے اسی کسی انعام کی توقع نہیں ہے۔

دوسرا ایسا کردار زلیخا موگمبی کا ہے جو طویل ایڈلاوا سیریز کے چند مناظر میں نظر آتا ہے لیکن اپنی ایمان داری اور بھائی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے والی جرات اسے یادگار بنادیتی ہے۔

جاسوسی دنیا کے ناول ''ٹھنڈا جہنم'' کی فریدہ تیموری بھی ایسا ہی ایک کردار ہے جو ایک غریب لڑکے کی موت سے متاثر ہو کر اس کے مجرموں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور جب اسے پتا چلتا ہے کہ اس جرم میں اس کے عزت مآب خاندان کا فرد بھی شامل ہے تو پیچھے ہٹنے کی جگہ قانون کے محافظوں کو اس کے راستے پر لگادیتی ہے۔ ''آخری آدمی'' کی لیڈی کاؤس، ''بابا سگ پرست'' کی غزالہ بھی ایسے مضبوط نسوانی کردار ہیں جو ذاتی نقصان اور رشتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے قانون کا ساتھ دیتے ہیں۔

ابن صفی کے ناولوں میں برصغیر کے ماحول کی عکاسی بڑی باریکی سے کی گئی آزادی کے بعد برصغیر میں جو معاشرتی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ان سب کی جھلک ہمیں ان ناولوں میں ملتی ہیں۔ ابن صفی کبھی کرداروں کے نام سے کبھی ان کے لباس سے اور کبھی ان کی زندگی کے معمولات سے قاری کو اس دور کے معاشرے کی پہچان کراتے ہیں۔ یہ چیز ان کے نسوانی کرداروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ہمیں اس میں زینت یا زینو جیسا کردار نظر آتا ہے جو ''کالی کہکشاں'' نامی مختصر سے ناول کا حصہ ہے۔ زینت ایک قبائلی سردار کی بیٹی ہے جس نے بیرون ملک تعلیم حاصل کی ہے اور جو مغربی لباس پہنتی ہے لیکن ساتھ اپنی روایات اور اقدار کی پاسداری بھی کرتی ہے۔ اسی طرح جرات مند اور بہادر بھی ہے۔ جب اس کے باپ پر غداری کا الزام لگا کر قید کرلیا جاتا ہے تو وہ خود ہتھیار اٹھا کر انھیں ڈھونڈنے نکل پڑتی ہے اور بڑی بہادری سے تنہا دشمنوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ عمران جیسا لا اُبالی شخص بھی اس کی بہادری اور خلوص سے متاثر ہوتا ہے اور اسے اپنا دوست کہتا ہے۔

زینو جیسے کرداروں سے ابن صفی نے بتایا کہ لڑکیوں کو تعلیم و تربیت اور اعتماد دیں تو کسی میدان میں پیچھے نہیں رہتیں اور والدین کے اچھے برے وقت میں ان کی ہمت اور حوصلہ بن جاتی ہیں۔

ایسا ہی ایک کردار شعلہ سیریز کی خانم کا ہے جو اپنے شوہر کی اچانک موت کے بعد نہ صرف پورے قبیلہ کی ذمے داری اٹھاتی ہے بلکہ فریدی کے ساتھ مل کر ایک بڑی سازش سے ملک کو محفوظ رکھتی ہے۔ وہ قبائلی ماحول کی پروردہ اور اپنی روایات کی پابند ہے۔ فریدی سے پہلی ملاقات میں وہ ایک سفاک اور سخت مزاج عورت نظر آتی ہے لیکن کہانی کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کے مختلف پہلو نظر آتے ہیں وہ جنگجو بھی ہے، ذہین اور معاملہ فہم بھی۔ ساتھ ہی شوہر کے کئی رازوں میں شریک بھی۔ ایک روایتی اور سخت ماحول میں رہتے ہوئے وہ رائفل سے لے کر ٹرانسمیٹر تک استعمال کرنا جانتی ہے۔ قبائلی سیاست اور غیر ملکی سازشوں کی سوجھ بوجھ بھی رکھتی ہے۔

ابن صفی نے یہ دونوں کردار شہری ماحول کی جگہ قبائلی ماحول سے لیے ہیں کیوں کہ وہاں کا ماحول روایتی ہوتا ہے اور ان علاقوں کی خواتین عموماً گھر کی چار دیواری تک محدود ہوتی ہیں۔ لیکن زینو جو اپنے باپ کے لیے لڑنے کھڑی ہوجاتی ہے اور خانم جو شوہر کی ذمے داری نبھاتی ہے دونوں عمدہ مثالیں ہیں کہ یہ خواتین اپنی روایات کی حدود میں رہ کر بھی کیا کچھ کرسکتی ہیں۔

جاسوسی ناولوں میں عام طور ہر کہانی جرم وسزا کے گرد گھومتی ہے اس لیے نسوانی کردار بھی ایسے ہی نظر آتے ہیں جو کسی نہ کسی جرم یا مجرم سے جڑے ہوں لیکن ابن صفی کی جاسوسی تحریر صرف جرم اور سراغ رسانی تک محدود نہیں ہوتی بلکہ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ اسی لیے ان ناولوں میں کئی ایسے نفسیاتی نسوانی کردار نظر اتے ہیں جو غیر معمولی حد تک معصوم ہیں۔

ڈاکٹر داور کی بیٹی شمی جس کا کردار ''پیاسا سمندر'' میں پہلی بار آیا ہے۔ شمی ایک انتہائی معصوم لڑکی ہے جو زیادہ تر خیالی دنیا میں زندگی بسر کرتی ہے۔ ڈاکٹر داور ملک کے چوٹی کے سائنسداں ہیں اور انھوں نے اپنے نفسیاتی تجربے کے لیے شمی کو اسکول اور کالج نہیں جانے دیا اور اس کی تعلیم اور تربیت گھر پر کی۔ اسکول اور کالج سے دوری اور گھر کے حد درجہ ڈسپلن والے ماحول نے اسے زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم رکھا جو ایک عام لڑکی کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی اس کی ذہنی نشوونما پر بھی اثر ڈالا۔ نوجوانی کے دور میں بھی اس کی ذہنی سطح بچوں جیسی ہوتی ہے وہ بچوں کی طرح ہنسنے کھیلنے کی خواہش مند تھی اسے ہواؤں میں اڑنے کی خواہش تھی۔ اس کی اسی معصومانہ ذہنیت کا فائدہ اٹھا کر مجرم اسے ڈاکٹر کی ایجاد چرانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس سے مماثلت رکھتا ایک کردار شعلہ سیریز کی ساحرہ کا ہے جسے اس کا بھائی سہیل اپنے مقصد کی خاطر ذہنی مریض بنا کر رکھتا ہے اور وہ دوہری شخصیت کا شکار ہوجاتی ہے۔ کبھی وہ انتہائی تعلیم یافتہ لڑکی محسوس ہوتی ہے اور کبھی ایک معصوم بچی جو انتہائی ڈری سہمی ہوئی ہے۔ ساحرہ کا کردار انتہائی دل چسپ اور دل کو چھونے والا ہے اس کا وہ مکالمہ جو وہ فلسفہ کے بارے میں کہتی ہیں بہت یادگار ہے۔

صرف اردو ہی نہیں دنیا کی ہر زبان میں محبت کی ایسی داستانیں موجود ہیں جن کے کردار محبت کی خاطر جان سے گزر جاتے ہیں لیکن جاسوسی کہانی میں ایسے کردار خال خال ہی ہوتے ہیں کیوں کہ ان کہانیوں میں اگر رومانس یا محبت کا ذکر ہو بھی تو عموماً سرسری طور پر یہ کسی جرم کے جواز میں آتا ہے۔ ابن صفی کے ناولوں میں کچھ ایسے نسوانی کردار نظر آتے ہیں جو اپنے جذبوں کی شدت اور افسوسناک انجام کے باعث ذہنوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں۔

''زہریلا انسان'' کی تارا جو فریدی سے حد درجہ متاثر ہے اور اس کی توجہ پانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے۔ مجرم اس کی اس جذباتی کمزوری کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ ادبی طور ہر تارا کا کردار بڑا پیچیدہ ہے۔ اس کی جذباتی مجبوری اور افسوس ناک انجام اس

کے لیے دل میں ہمدردی پیدا کرتا ہے لیکن محبت کی خاطر اٹھایا گیا اس کا انتہائی قدم اسے ایک منفی تاثر بھی دیتا ہے یعنی یہ ایسا کردار ہے جس سے ہمدردی کی جاسکتی ہے لیکن وہ باعث عبرت بھی ہے۔

ایڈلاوا سیریز کی میریانا کا کردار بھی اسی سے ملتا جلتا اور یادگار کردار ہے۔ میریانا اپنی کسی غلطی کے باعث جرم کی دنیا میں پھنس جاتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ ہر غلط بات پر سمجھوتہ نہیں کرتی اور اپنی عزت کی خاطر خودکشی کی کوشش کرتی ہے عمران کا اسے بچانا اس کی زندگی میں ایک مثبت تبدیلی لاتا ہے اور وہ عمران سے متاثر ہوکر اس کا ساتھ دینے اور مجرموں کے خلاف لڑنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے اسے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہوتی وہ خود کو ایک بری عورت کہتی ہے جو معاشرے کی نمائندہ خاتون نہیں ہے۔ آخر میں عمران کی حفاظت کی خاطر اپنی جان کا خطرہ مول لے کر واپس مجرموں کے پاس لوٹتی ہے اور جان سے جاتی ہے... میریانا کا کردار اس خوب صورتی سے تراشا گیا ہے کہ ہر بار اس کی موت قاری کو نئے سرے سے افسردہ کرتی ہے...

ان دونوں کے علاوہ ایک اور کردار ''چاندنی کا دھواں'' میں صوفیہ کا ہے۔ جو ان دونوں کرداروں کی طرح موت سے ہم کنار نہیں ہوتی لیکن اس کی زندگی موت سے بدتر لگتی ہے۔ کہانی کی ابتدا میں صوفیہ ایک شوخ و شنگ لڑکی محسوس ہوتی ہے جس کا مقصد جیلانی نامی مصور کو تنگ کرنا ہوتا ہے لیکن جیلانی کی بنائی ہوئی تصویر سے اس کا حسد اس کے جیلانی سے گہرے تعلق کو بتاتا ہے اور آخر میں جیلانی کی اصلیت سامنے آنے پر صوفیہ کی ذہنی حالت قاری کو جھنجھوڑ دیتی ہے کہ ایک نوجوان لڑکی جو بظاہر شرارتی اور ہنس مکھ ہے اپنے اندر کس قدر گہرائی اور شدید جذبہ رکھتی ہے...

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں بے شمار منفرد مختلف اور ہمہ گیر نسوانی کردار پیش کیے۔ جو اردو ادب کی روایت سے بالکل ہٹ کر تھے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ فکشن کا حسن تھے اور معاشرے کی تغیر پذیر حالت کا کہتا جاگتا ثبوت تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایسے کردار جو ابن صفی نے ماضی حال اور مستقبل سے ناول کے کینوس پر اتارے ان میں یاد رکھے جانے والے نسوانی کرداروں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان شاندار ادبی کرداروں میں سے چند نسوانی رنگ یہ ہیں۔ یہ چند کردار ابن صفی کہ عظمت کا اعتراف ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی ان کے ناولوں میں کئی ایسے چھوٹے موٹے کردار ہیں جو شاید اتنے نمایاں نہ ہوں لیکن ان کو پیش کرنے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ ابن صفی انسانی فطرت کے مختلف پہلو بیان کرنے میں کتنے قادر تھے۔

اماں بی کا روایتی انداز جو سخت گیر اور اصول پرست شوہر اور باغی بیٹے کے بیچ جذباتی کشمکش سے گزرتی ہیں اور اکلوتے بیٹے سے محبت کے باوجود اس کی زندگی سے زیادہ اس کے درست راہ پر ہونے کی فکر کرتی ہیں۔

''بے باکوں کی تلاش'' میں صبیحہ کا کردار ہے۔ باپ کے ماڈرن طرز عمل اور ماں اور نانی کی سخت روایت پسندی اسے کس قسم کی خطرناک شرارتوں تک لے آتی ہے کہ قتل جیسے جرم میں پھنس جاتی ہے۔

کہیں ابن صفی ساجدہ حبیب کی زبانی اس دور کی ساری تعلیم یافتہ لڑکیوں المیہ بیان کرتے ہیں تو کہیں نرس گرٹر ووڈ کی زبانی مغرب کی مجبور عورت کی حالت زار بتاتے ہیں۔ وہیں گل رُخ، قاسم کی بیوی اور ڈی آئی جی کی بیٹی فرزانہ جیسے پر مزاح کردار بھی ہیں جو چہرے پر مسکراہٹ لے آتے ہیں اور قاری کو یہ بتاتے ہیں کہ کائنات میں ہی نہیں جاسوسی ادب میں تمام خوشنما اور دلفریب رنگ

وجودزن سے ہیں۔

دنیا کے ہر ادب میں صنف نازک کومختلف انداز میں پیش کیا جاتا رہا ہے لیکن اردو ادب میں ابن صفی سے بہتر اور بڑھ کر کسی دوسرے مصنف نے نسوانی کردار تخلیق نہیں کیے۔ ان کرداروں کی کہانیوں میں ہونے کی وجہ کبھی خانہ پری اور زیبائش نہیں رہی بلکہ وہ معاشرے میں اپنی اہمیت کے حساب سے ناولوں میں بھی موجود ہیں۔

ابن صفی نے گھریلو خواتین اور معاشرے میں کام کرنے والی دونوں خواتین کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے اور دونوں کو حقیقت کا آئینہ بنا کر قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اماں بی اور ثریا سے جولیا اور روشی تک، نیلم اور زینت سے خانم تک، اور تتاریہ سے تھریسیا تک ایک ہجوم ہے جو قاری کے ذہن پر مدتوں اثر انداز ہوتا ہے۔ قاری نہ صرف اس دور میں خواتین کے مسائل و مصائب کو محسوس کرتا ہے بلکہ ان کی جدوجہد بھی اس کے سامنے آشکار ہوتی ہے۔

ابن صفی نے اپنے دور کی بھرپور عکاسی تو یقیناً کی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ خواتین کی معاشرے میں فعالیت کو دیکھتے ہوئے مستقبل کا جو نقشہ کھینچے کی کوشش کی ہے وہ بھی آج مکمل اور بھرپور انداز میں پورا ہو چکا ہے۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو ابن صفی کے کرداروں کو بطور صنف نازک اور ابن صفی کو بطور مصنف دوسروں سے ممتاز منفرد اور شاندار بناتے ہیں اور وہ اپنے دور کے راوی بھی محسوس ہوتے ہیں اور مستقبل کے نبض شناس بھی۔

محمد عارف اقبال ۞

ابنِ صفی — مشن اور ادبی نصب العین

ابن صفی (پیدائش: اپریل، بروز جمعہ، ۱۹۲۸ء) جو اپنے فن کے مؤجد، امام اور خاتم بھی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ محبانِ اردو کے لیے ان کی علمی و ادبی خدمات بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت حاصل کرچکی ہے۔ اردو دنیا کی ذہنی وفکری تطہیر میں علم و ادب کے وسیلے سے ابن صفی نے جس نصب العین کو مارچ ۱۹۵۲ء میں اپنی حیات کا مشن بنایا تھا، رب العالمین نے اس کام میں اتنی برکت عطا کی کہ وہ تمام تر دشواریوں اور آزمائشوں کے باوجود تا حیات اس مشن (Mission) کی تکمیل میں صبر و استقامت اور توکل کے ساتھ نہ صرف ڈٹے رہے بلکہ ان کے پایۂ استقلال میں ذرّہ بھر بھی لرزش نہیں ہوئی۔

علامہ اقبال کا مرد بزرگ

ابن صفی کے ناولوں کا بنیادی مقصد سماج سے برائیوں کا خاتمہ اور لوگوں کو قانون کا احترام سکھانا ہے۔ مقصدی ادب کا بنیادی نکتہ علم و ادب کے ذریعے سماج کی تہذیب و تطہیر ہے۔ ابن صفی پر تحقیقی کام کرنے کے دوران میں پاکستان کے معروف محقق اور ماہر اقبالیات خرم علی شفیق کے حوالے سے علامہ اقبال کی دو نظموں کا خاص طور سے ذکر کیا گیا کہ ان میں علامہ نے مستقبل کے 'ابن صفی' کا پیغام دیا ہے۔ ''ضربِ کلیم'' کے ادبیات کے حصے میں ''ہنرورانِ ہند'' کے عنوان سے علامہ اقبال کی جو نظم ہے اس میں عہد حاضر کے ادبا و شعرا کا احوال انھوں نے یوں بیان کیا ہے:

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ امر بھی ایک خوشگوار حیرت ہے کہ اس سے اگلی ہی نظم ''مردِ بزرگ'' ایسے ادیب کے خواص گنواتی ہے جو اس ناپسندیدہ اسلوب سے چھٹکارا پا کر ایک مختلف راہ نکالتا ہے۔(۱) لہٰذا یہ بات اب شاید وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ علامہ اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں جس تناظر میں ''مردِ بزرگ'' کا تصور پیش کیا، علم و ادب کی دنیا کے عظیم ادیب و ناول نگار ابن صفی کی نمایاں خصوصیات اس میں نظر آتی ہیں۔ اس نکتے کو اُجاگر کرنے کا سہرا اگرچہ پاکستان کے ایک محقق، تاریخ داں اور ماہر اقبالیات خرم علی شفیق کے سر بندھتا ہے(۲) لیکن یہ بات واضح رہے کہ ابن صفی کو سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ایک آفاقی ادیب تھے۔ جس طرح علامہ اقبال نے آفاقیت کی گفتگو کی

۞ ۱۰۴/۳۹-۱۷۳، فرسٹ فلور، ایم پی اسٹیل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلّی، ہندوستان۔ برقی پتا: urdubookreview@gmail.com

ہے، ابن صفی نے بھی آفاقیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ''حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔'' ذرا ''مردِ بزرگ'' پر ایک نظر ڈالیے آپ خود ہی اندازہ کرلیں گے:

اُس کی نفرت بھی عمیق، اُس کی محبت بھی عمیق — قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق
پرورش پاتا ہے تقلید کی تاریکی میں — ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا تخلیق
انجمن میں بھی میسّر رہی خلوت اُس کو — شمعِ محفل کی طرح سب سے جُدا، سب کا رفیق
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں — بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق
اُس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جُدا — اُس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

ہزاروں صفحات میں پھیلی ابن صفی کی تحریروں پر غور وفکر کرتے رہیے، مجھے توقع ہے کہ علامہ اقبال کی مذکورہ بالا نظم میں آپ کو ابن صفی ہی نظر آئیں گے۔ اگر اس نظم کی کسوٹی پر ابن صفی کے علاوہ دوسرے کسی تخلیق کار کو آپ ڈھونڈ سکیں تو ہمیں ضرور مطلع فرمائیں۔ ابن صفی نے کہا تھا کہ ''یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے...'' ذرا اس جملے پر ٹھہر کر غور کیجیے۔ ''قانون'' کے حقیقی مفہوم پر غور کیا جائے تو عام طور پر دو طرح کے قانون پر ہماری نظر ٹھہرتی ہے۔ اول زمینی قانون، دوم قانونِ قدرت۔ زمینی قانون میں ملکی اور بین الاقوامی دونوں کو شامل کر لیجیے۔ اس تناظر میں ابن صفی کے نزدیک ''قانون کا احترام'' کیا ہے اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ وہ محض زمینی قانون کے قائل نہ تھے بلکہ قانون قدرت یا الٰہی قانون کا احترام بھی ان کے پیشِ نظر تھا۔ اس کی دلیل ابن صفی کی تحریروں میں ہر سو بکھری ہوئی ہے، بشرطے کہ بصیرت کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ وہ اپنے قارئین کو ادب کے ذریعے تخریب سے تعمیر کی طرف ہجرت کی تلقین کرتے رہے تاکہ جرائم سے پاک سماج کی تشکیل ہو۔ اس کے لیے انھوں نے جو ادبی پیرایہ اختیار کیا اسے نہ صرف قبولِ عام حاصل ہوا بلکہ اس نے قارئین کو بدرجہ اَتم جمالیاتی مسرت بہم پہنچائی۔ اسے ادب میں کسی بھی نام سے پکارا جائے، بہرحال یہ ادب کی ایسی قسم ہے جس کا راست تعلق انسانی زندگی، انسانی جان کے احترام، سماج کی تعمیر وتطہیر اور مثبت فکر یا سوچ سے ہے۔ ابن صفی کا کمال یہ ہے کہ وہ بڑے عزم اور صبر کے ساتھ اردو کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشاں رہے اور اردو دنیا میں بلاتفریق مذہب وملت اردو زبان و ادب کے ذوق کو پروان چڑھاتے رہے۔ دو عظیم جنگوں (۱۹۱۴ء اور ۱۹۴۵ء) کے بعد دنیا میں مستقبل سے بڑھتی ہوئی مایوسی، زندگی سے فرار اور عالمی سطح پر سماج میں بڑھتے ہوئے جرائم اور ظلم وتشدد کو ابن صفی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ اپنے ایک ناول کے ''پیش رس'' میں لکھتے ہیں:

> مستقبل سے مایوسی غلط فہمی کی پیداوار ہے اور آدمی کو جرائم کی طرف لے جاتی ہے۔ مستقبل سے مایوس ہوکر یا تو آدمی جرائم کرتا ہے یا پھر کسی ایسے کرنل فریدی کی تلاش میں ذہنی سفر کرتا ہے جو قانون اور انصاف کے لیے بڑے سے بڑے چہرے پر مُکّا رسید کر سکے اور یہی تلاش 'ہیروازم' کی کہانیوں کو جنم دیتی ہے۔ [۳]

ابن صفی کے ناولوں کو ان دنوں محض تفریحی ادب کے خانے میں ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے حالاں کہ خود ابن صفی کے بقول

تفریح بھی انسانی زندگی کا ایک اہم مقصد ہے۔[۴] جن حضرات نے ابن صفی کو پڑھا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اردو ادب میں ان سے بڑا ''ہیومنسٹ'' (humanist) ادیب شاید ہی کوئی ہو۔لیکن وہ نام نہاد ہیومنسٹ نہیں ہیں، وہ انسانی سماج کو قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے بلکہ ہر حال میں سماج میں قانون (زمینی و الٰہی قانون) کی بالادستی چاہتے ہیں۔ وہ کسی بھی اِزم (ism) کے قائل نہیں، وہ انسان کو انسانیت کی معراج پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انسانیت اور ''انسانی حقوق'' کے نام پر درندگی کے ہمیشہ مخالف رہے۔ ان کی تحریر کے بین السطور میں پوشیدہ فکرانگیز پیغام ہر انسان کے دل کو اپیل کرتا ہے۔ اس لیے ان کے قارئین میں طالب علم، یونی ورسٹی کے پروفیسر، اسکول کے اساتذہ، دانشور، ڈاکٹر، انجینئر، صحافی، قانون داں، سائنس داں، پولیس آفیسر، تاجر، ادیب، شاعر، مولوی، سیاست داں اور حکمراں ہر قسم کے لوگ تھے اور آج بھی ہیں۔ ان کی ایک بڑی تعداد معترف ہے کہ ان کی کامیابی اور عملی زندگی کے عروج میں ابن صفی کی تحریروں نے کسی نہ کسی حیثیت سے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔[۵]

ایک بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اصول، حقائق اور مقصدیت پر مبنی تحریریں نہ صرف ادب کا سرمایہ ہوتی ہیں بلکہ کبھی مرتی نہیں اور ہمیشہ اپنے قارئین کے دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ اب اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اردو دنیا میں (بشمول ایشیا، یوروپ، امریکا) ابن صفی کی شاہکار تحریریں تھکے ہوئے ذہنوں کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس کے برعکس ابن صفی کی تخلیقات ان کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں جو خود کو ''قانون'' سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔

یورپ کی ایک خاتون اردو اسکالر کی شہادت

برصغیر (ہندو پاک) کے اردو ادیبوں اور نقادوں کے برعکس اردو زبان کی جرمن اسکالر ڈاکٹر کرسٹینا اویسٹر ہیلڈ (ہائیڈل برگ یونی ورسٹی) سے 'اردو بک ریویو' کے نمائندہ جناب اے یو آصف (سینئر جرنلسٹ) نے ایک انٹرویو کے دوران میں جب یہ سوال کیا کہ ''ابن صفی کے چکر میں آپ کیسے پڑ گئیں؟'' تو ڈاکٹر کرسٹینا نے جو جواب دیا، وہ نہ صرف ابن صفی کے لیے بڑا اعزاز ہے بلکہ برصغیر کے ادیب و نقاد کے لیے چشم کشا اور سامانِ عبرت ہے۔ کرسٹینا کہتی ہیں:

> اسے چکر نہیں کہیے۔ یہ تو حسن اتفاق تھا کہ ادب کی دنیا میں سر راہ چلتے چلتے ابن صفی جیسا زمانہ شناس مل گیا۔ گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے میں ان کے ناولوں کو پڑھ رہی ہوں۔ ان کے ۲۵۰ کے قریب جاسوسی ناولوں میں سے ۲۰-۲۵ اب تک پڑھے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ترجمے کا کام بھی شروع کر رکھا ہے۔ ابن صفی کے معیار سے میں بے حد متاثر ہوں۔ وہ بہت ہی باشعور ادیب تھے۔ ان کے ناولوں میں مکالمے اور طنز و مزاح خوب پائے جاتے ہیں۔ Selfcriticism بھی موجود ہوتا ہے۔ ان میں دیباچے بھی ہوتے ہیں۔ وہ 'پیش لفظ' کو 'پیش رس' کہتے تھے۔ اس میں ان کے اسلوب اور رویے کے بارے میں جاننے کو ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی قارئین کے ردعمل کی بھی واقفیت ہوجاتی ہے۔ اس طرح کا مواد دوسرے ادیبوں کے یہاں شاذ و نادر ہی دکھائی پڑتا ہے۔ میری ان سے

ملاقات نہیں ہوئی لیکن ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی خوش مزاج، نیک اور معصوم تھے۔ ان میں کوئی چھل کپٹ نہیں تھا۔ عام طور پر ادیب حساس ہوتے ہیں لیکن وہ بہت ہی معتدل مزاج تھے۔ ان میں انا بھی نہیں تھی۔ بہت ہی انکساری سے کوئی بات کہتے تھے۔ مجھے ان سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہے۔ میں ۱۹۸۳ء میں ہندوستان پہلی مرتبہ آئی جب کہ ۱۹۸۰ء میں ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں وہ یہ ہے کہ ان کے کردار 'فریدی' اور 'عمران' کبھی کسی عورت کی جانب نگاہِ بد پھیرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ابن صفی کے جاسوسی ناول کی جاسوسی ادب میں اس لحاظ سے انوکھی حیثیت ہے کہ اس میں ایک مشن یا مقصد موجود ہے۔ اس لیے اسے محض تفریحی ادب نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے جاسوسی ناولوں میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے۔ ('اردو بک ریویو' شمارہ مارچ۔اپریل ۲۰۰۷ء)

ابن صفی نے ادب کے ذریعہ درحقیقت سماج کی تطہیر کا گراں قدر فریضہ ادا کیا۔ وہ اس بات کا بخوبی ادراک رکھتے تھے کہ روئے زمین فساد سے بھر چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جاسوسی ادب کا مرکزی موضوع ''فساد فی الارض'' کا سدِّ باب ہے۔ ضربِ کلیم ہے— اعلانِ جنگ ہے— عصر حاضر کے کھلے اور چھپے مجرموں کے خلاف۔ جاسوسی ادب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر ناول میں چند بنیادی کردار ہمیشہ موجود رہتے ہیں جن کے ساتھ کہانی آگے بڑھتی ہے۔ البتہ پلاٹ کی مناسبت سے دیگر کردار بدلتے رہتے ہیں، ان میں منفی اور مثبت دونوں طرح کے کردار ہیں۔ منفی کردار عام طور پر مجرمانہ ذہنیت کے حامل اور قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی سرزمین کے قانون (Law of the Land) کی کبھی پروا نہیں کرتے۔ انھی شر پسند عناصر کی وجہ سے زمین میں فساد برپا ہوتا ہے۔ دوسری طرف اس کے مثبت کردار کی اخلاقیات اور رویے سے معاشرے کو مثبت اور تعمیری پیغام ملتا ہے۔ دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ناول کی کہانی ہمیشہ اپنے عصر کے ساتھ آگے بڑھتی ہے جس میں اس عہد کے ادب اور تہذیب و ثقافت کی نمایاں جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ جاسوسی ادب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ہر کہانی سماج ہی کی کوکھ سے جنم لیتی ہے جس میں خواص ہی نہیں عام آدمی کے کردار بھی موجود ہوتے ہیں اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہی کہانی میں رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔

ابن صفی کے ادبی نصب العین کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ ان کی ادبی خدمات کے احاطہ کے لیے ہزاروں صفحات بھی کم پڑ سکتے ہیں۔ انھوں نے واضح طور پر کہا ہے کہ حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جس پر انھوں نے اپنی تحریروں میں گفتگو نہیں کی ہے۔ درحقیقت انھوں نے عصر حاضر میں زندگی کے جملہ شعبۂ حیات کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کے نزدیک ''قانون'' کی طرح ''جرم'' کا تناظر بھی بے حد وسیع ہے۔ ابن صفی اس بات کا بھرپور ادراک رکھتے ہیں کہ معاشرے کے سنگین مسائل میں عدم مساوات اور نا انصافی کے سبب انسان مایوسی میں مبتلا ہوتا ہے۔ پھر مایوسی کے محرکات انسان کو جرم کی طرف اُکساتے ہیں اور رفتہ رفتہ معاشرہ جرم کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ایسے فساد زدہ معاشرے میں مجرموں کی بن آتی ہے اور شرفا کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔

ابن صفی کے نزدیک وقت اور حالات کے ساتھ جرائم کی قسم اور نوعیت بدلتی رہی ہے۔ سنگین جرائم میں عام طور سے چوری،

ڈکیتی، قتل، بلیک میلنگ، فرقہ وارانہ فساد، دہشت گردی اور جنسی تشدد کو شمار کیا جاتا ہے لیکن موجودہ سائنس و ٹکنالوجی کے عہد میں جرائم کی اتنی شکلیں پائی جاتی ہیں کہ بعض اوقات عقل حیران رہ جاتی ہے۔ کل تک جن رشتوں کو مقدس تصور کیا جاتا تھا اور آج بھی ان پاک رشتوں پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی، ایسا لگتا ہے کہ حالات کے تیز و تند بہاؤ نے ان رشتوں کے تقدس کو پامال کر دیا ہے۔ ''ماں'' ایک ایسا لفظ ہے جس کے تقدس و احترام میں ادبا اور شعرا ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں۔ دنیا کے تمام تخلیقی ادب میں ماں کے کردار کو دیوی کا درجہ دیا گیا ہے۔ اپنے بچوں کے لیے ماں کی ممتا کا لطیف احساس ایسا ہی ہے، جسے الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جاسکتا۔ لیکن عصر حاضر میں ایسے واقعات بھی پے در پے رونما ہو رہے ہیں کہ ماں خود ہی اپنے معصوم جگر گوشوں کی قاتلہ ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح باپ بیٹی کا مقدس رشتہ بھی عہدِ حاضر میں مسلسل مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ دنیا میں اب جنسی جرائم کی اتنی قسمیں پائی جاتی ہیں کہ شاید اب شیطان کی یادداشت میں بھی اتنے جرائم کی تفصیلات محفوظ نہ ہوں۔ ابن صفی نے اسے بھی فکشن کا موضوع بنایا۔[۶]

ابن صفی نے ''ادب میں ہوس پرستی'' کے بڑھتے ہوئے رجحان پر طنز کرتے ہوئے اپنے ایک ناول (جنگل کی آگ، ۱۹۵۵) میں ایک کردار کی زبانی کچھ اس طرح کہا ہے:

> میں جنسیت کو ایک سیدھا سادہ مسئلہ سمجھتا ہوں جسے آدمی جیسے سمجھ دار جانور کے لیے اتنا پیچیدہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ شاعری کرنے لگے۔

اسی طرح سائنس و ٹکنالوجی کے اس عہد میں معاشی جرائم، سیاسی جرائم اور معاشرتی جرائم کی لاتعداد قسمیں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب گلوبل سطح پر مختلف ملکوں کے قوانین میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے اور اگر جرم کی عالمی تاریخ کا ذکر کریں تو کسی ملک کے توسیع پسندانہ عزائم کے تناظر میں برطانیہ کی مثال کافی ہے جس کی حکومت میں کہا جاتا ہے کہ سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اس کی تاریخ ظلم اور جبر کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح اسپین (ہسپانیہ) سے لے کر امریکا کی دریافت تک کی تاریخ لاکھوں بے گناہوں اور معصوموں کے خون سے سرخ ہے۔[۷] ان تاریخوں میں جرائم کی اتنی قسمیں پائی جاتی ہیں کہ انھیں شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ پھر جنگ عظیم اول اور دوم کی خونیں داستان تو کل کی بات ہے۔ ہندوستان میں ۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخ میں کتنے خوفناک واقعات پوشیدہ ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے چشم دید گواہ اور عظیم شاعر مرزا غالب کا جو مقام اردو ادب میں ہے، کون واقف نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ''غدر'' کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور خاص طور پر دہلی میں ظلم و بربریت کی غالب نے ''دستنبو''[۸] میں جو تصویر کشی کی ہے، اس کی ایک ایک سطر پر کیا ہماری آنکھیں اشکبار نہیں ہوتیں۔ آزادیٔ ہند کی جنگ میں انگریزوں کے مظالم سے لوہا لینے والے سورماؤں اور مجاہدوں کے لیے ہمارے دلوں میں کیا ادب و احترام اور عقیدت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کیا ہے؟ ادب کی تعریف ادبا اور نقادوں کے نزدیک جو کچھ بھی ہو لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہر زمانے کا ادب اپنے عہد کا آئینہ اور نمائندہ ہوتا ہے بالخصوص تخلیقی ادب — تاہم شعری ادب کی طرح نثری ادب میں نئی نئی صنفوں کے تجربات کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ خاص طور سے اردو ناول نگاری کا کینوس کھیت کھلیان، جاگیردارانہ نظام، جنسی بے راہ روی، تعلیمی پس ماندگی، مذہبی تشدد اور فرقہ وارانہ فسادات سے زیادہ وسعت نہیں اختیار کرسکا۔ بیسویں صدی میں ابن صفی واحد ناول

نگار ہیں جنھوں نے جاسوسی ادب کی بنیاد ایک صنف کے طور پر رکھی اور ادب میں مقصدیت کو ترجیح دیتے ہوئے ''ٹیم اسپرٹ اور لیڈر شپ'' کو عصر حاضر کے معاشرے کی اصلاح کے لیے لازمی تصور کیا۔

ابن صفی کے ایک شیدائی اور معروف افسانہ نگار ڈاکٹر خالد جاوید نے اپنے بصیرت افروز مقالے میں لکھا ہے کہ ''ابن صفی کے ناولوں کو بھی آج اکیسویں صدی میں کلاسیکی اہمیت حاصل ہوسکتی ہے۔ وہ اردو میں ایک روایت کا نام ہیں، مگر یہ روایت ان کے ساتھ ختم ہوگئی۔''(۹) معروف نقاد و ادیب ڈاکٹر عبدالمغنی (مرحوم) نے بھی ابن صفی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک بلیغ بات کہی تھی:

جاسوسی ناول نگاری میں ابن صفی انگریزی میں شرلاک ہومز کے خالق کونن ڈائل کی سطح پر ہیں۔(۱۰)

معروف ادیب و نقاد سلیم اختر نے غالباً پہلی بار ابن صفی کے بارے میں لکھا کہ ابن صفی کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔(۱۱)

معروف اسکالر اور ماہر اقبالیات خرم علی شفیق نے ابن صفی کے تمام ناولوں کا بڑی گہرائی سے تاریخی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے نثری ادب میں ابن صفی کی اہم خصوصیات کی پانچ نکات میں درجہ بندی کی ہے:

انھوں نے ایک خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ ابن صفی سے بہتر نثر شاید (مرزا غالب اور محمد حسین آزاد کو چھوڑ کر) اردو میں کسی اور نے نہیں لکھی۔ اگر اقبال کی شاعری کو الہامی شاعری کہا جاتا ہے تو ابن صفی کی نثر کو الہامی نثر کہا جاسکتا ہے۔

ابن صفی کی ایک خصوصیت مستقبل بینی ہے جس کے بغیر کوئی ادیب، بڑا ادیب نہیں بن سکتا مگر جس سے بیسویں صدی کے ادیب محروم ہیں۔(۱۲)

ابن صفی ہمیشہ اس اصول پر کاربند رہے کہ ان کی کہانیاں محض برائے تفریح نہ ہوں اور صرف اس لیے نہ پڑھی جائیں کہ ان میں چٹخارے ملتے ہیں بلکہ ان میں تفریح کے ساتھ دورِ حاضر کی مجرمانہ ذہنیت کا پردہ چاک کیا جاتا رہا ہے۔ ابن صفی نے بڑے فن کارانہ انداز میں ان مجرمانہ ذہنیت رکھنے والوں کی طرف اشارے کیے ہیں جن کو سوسائٹی میں بڑا آدمی یا اونچی شخصیت کا مالک سمجھا جاتا ہے۔(۱۳) موجودہ جمہوری معاشرے میں تعلیم یافتہ افراد کے ساتھ بے انصافی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نفسیاتی ردعمل پر انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ۱۹۵۳ء کے ایک ناول (موت کی آندھی) کا یہ اقتباس دیکھیے:

جب کوئی ذہین اور تعلیم یافتہ آدمی مسلسل ناکامیوں سے تنگ آجاتا ہے تو اس کی ساری شخصیت صبر کی تلخیوں میں ڈوب جاتی ہے۔

ابن صفی نے شراب نوشی اور ہر قسم کی نشہ آور ادویات کو معاشرے کے لیے ناسور قرار دیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں فلمی صنعت کے موضوع پر لکھے گئے ایک ناول (ستاروں کی موت) کا اقتباس ملاحظہ ہو:

شراب اُمّ الخبائث اس لیے کہلاتی ہے کہ اس کے استعمال کرنے والے ہر قسم کی خباثت اختیار کرسکتے ہیں۔

افواہوں، فرقہ واریت اور تعصب کے زہریلے اثرات سے آگاہ کرتے ہوئے اپنے ایک ''پیش رس'' میں ابن صفی اس طرح

اپنے قارئین کو متنبہ کرتے ہیں:

> ہر وقت چوکنّے رہیے کہ کہیں آپ خود ہی غیر شعوری طور پر دشمن کا آلۂ کار تو نہیں بن رہے؟ کسی افواہ کو دوسروں تک پہنچانے والا نادانستگی میں دشمن کی مدد کرتا ہے۔ اِس وقت قومی یکجہتی کی حفاظت کرنا ہی ملک وقوم کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی افواہوں کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجیے جس سے صوبائی تعصب یا فرقہ واریت کا زہر پھیلنے کا اندیشہ ہو۔[۱۴]

ابن صفی کے ناولوں میں ''زیرولینڈ'' (Zero Land) ایک ایسا استعارہ ہے جس کے توسط سے انھوں نے انسانیت کو یہ پیغام دیا ہے کہ پوری دنیا معرکہ خیر وشر کی آماجگاہ ہے۔ اس معرکہ خیر وشر میں سائنس وٹکنالوجی سے لیس انتہائی خفیہ ''طاقت کی تنظیم'' پوری انسانیت کو اپنے خود ساختہ نظریہ کے مطابق غلام بنانا چاہتی ہے۔ یہ ایک ایسی پُراسرار سرمایہ دارانہ طاقت کی تنظیم ہے جس کا مقصد اور مشن غاصبانہ عالمی حکومت کا قیام ہے۔ اس خفیہ مشن کے نمائندے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا کی حکومتوں کے حساس شعبوں میں اہم عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی میں طاقت کی اس تنظیم کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس کے افراد اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ''خیر اندیش'' اور ''خدمت گار'' کے روپ میں نظر آسکتے ہیں اور کارپوریٹ سیکٹرز کے اعلیٰ عہدے دار بھی ہوسکتے ہیں۔ خفیہ طاقت کی یہ تنظیم سالہا سال سے قائم ہے۔ ذہانت اس تنظیم کا طرۂ امتیاز ہے اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے پس ماندہ یا پُرتعیش زندگی گزارنے والی قوموں کو غلام بنانا اس کی ضرورت ہے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اس کے نزدیک قتل و غارت گری عام بات ہے لیکن اس کا طریقہ کار عام طور پر پُرامن ہوتا ہے تاکہ شک وشبہات سے بالاتر ہوکر، یہ اپنے لامحدود وسائل میں اضافہ کرتے رہیں۔ ایک ناول ''ریگم بالا'' (جنوری ۱۹۷۰ء) میں ایک کردار کی زبانی زیرولینڈ کی سائنسی ترقی پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:

> — ان کے وسائل لامحدود ہیں۔ سائنسی ترقی میں وہ ساری دنیا کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ چاند پر جاکر کنکر پتھر بٹورنے سے بھی بہت آگے ہیں۔

مصنف کے اس انکشاف سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ چاند یا مریخ پر محض کنکر پتھر یا پانی تلاش کرنے سے کہیں زیادہ بڑا اُن کا مخصوص مشن ہے۔ ''زیرولینڈ'' کی معنویت پر جتنا غور کیا جائے، ذہن کی پرتیں اسی قدر کُھل سکتی ہیں۔

اس سلسلے میں تھریسیا بمبل بی آف بوہیمیا جسے T3B بھی کہا جاتا ہے، ایک لازوال منفی کردار ہے جس کی حیثیت طاقت کی تنظیم کے مستقل سربراہ کی ہے۔[۱۵] طاقت کی اس تنظیم کے ایجنٹوں میں نانوتہ[۱۶] کا سحر انگیز کردار اور اس کے ساتھ ہی بوغا،[۱۷] الفانسے اور سنگ ہی کے کردار بھی ''زیرولینڈ'' کے حوالے سے موجود ہیں۔ ابن صفی نے عالم انسانیت کے خلاف بڑی طاقتوں کی سازشوں کو بے نقاب کرتے ہوئے لیزر اور کیمیائی ہتھیاروں کے علاوہ حیاتیاتی ہتھیار (biological weapons)[۱۸] کی نشاندہی بھی کی۔

اردو ادیبوں اور نقادوں کی یہ بدقسمتی ہی کہی جاسکتی ہے کہ دوعظیم عالمی جنگوں اور تقسیم ہند کے خونیں واقعات سے بھی ان کے ذہن وقلب پر حجابات پڑے رہے۔ کروٹ بدلتی عالمی دنیا کے تیور اور آتش فشاں کی آنچ کو وہ محسوس نہ کرسکے۔ وہ مگن رہے اپنی اُس

ڈیڑھ اینٹ کی ادبی دنیا میں جو مختلف اِزموں (isms) کی صورت میں زہریلے سانپ کی طرح ان سے چمٹے رہے۔ ابن صفی نے اول روز ہی اس نازک اور سنگین صورت حال کا بخوبی ادراک کرلیا تھا اس لیے اردو ادب میں انھوں نے ایسی راہ نکالی کہ سماج کی تہذیب کے ساتھ افکار و کردار کی تطہیر و تعمیر بھی ہو، حتیٰ کہ ہر فرد مستقبل کے استعارہ کو سمجھنے کے قابل ہوسکے۔ چند سال قبل Maria Konnikowa کی ایک اہم تصنیف *Mastermind: How to think like Sherlock Holmes* شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں مشاہدے (observation) کی قوت کو بڑھانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ آرتھر کونن ڈائل کی جاسوسی تصانیف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۸۷ء سے آج تک اس کی کتابیں out of print نہیں رہیں۔[۱۹] ان کتابوں کے قارئین شرلاک ہومز کو لندن کی گلیوں میں تلاش کرتے رہے ہیں[۲۰] اور اب مذکورہ کتاب کے ذریعہ یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ شرلاک ہومز کے نظامِ تعلیم پر گفتگو کی جانے لگی ہے۔ self education کے لیے شرلاک ہومز کے طریقۂ کار پر تحقیق کی جارہی ہے۔ یہ کام ایک زندہ قوم ہی کرسکتی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم آج تک اپنی 'خودی' سے بھی نابلد رہے۔ انسانی وقومی شعور کے ساتھ اپنے مقصد وجود کو بھلا بیٹھے۔ ایسی صورت میں بھلا ہم ایک عظیم ادیب اور مصنف کے ادراک کو کیوں کر چھوسکتے تھے۔ حیرت ہے کہ خود ابن صفی کے مٹھی بھر شیدائیوں میں بیشتر افراد کا ذہنی افق بھی ان کے حقیقی ادبی نصب العین سے میل نہیں کھاتا۔ جس طرح اقبال پر ہزاروں صفحات سیاہ کرنے کے بعد بھی اقبال کا فکری سرا ہاتھ نہیں آتا، ٹھیک یہی حال ابن صفی کے شیدائیوں کا ہے۔ اس افسوس ناک صورتِ حال کے لیے کسی حد تک اس ادبی وسماجی ماحول کو بھی الزام دیا جاسکتا ہے جس کی مسموم فضا میں ہم سانس لیتے رہے ہیں۔ کاش آج بھی ہماری تمام حسیات بے دار ہوجائیں اور جینے کا مقصدی سلیقہ ہم میں آجائے تو "شئے کی حقیقت" تک پہنچنا ہمارے لیے مشکل نہ ہوگا۔

ابن صفی اپنی حیات کے آخری لمحے (م ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء) تک اردو کی خدمت کرتے رہے اور اس کے فروغ کو اپنی زندگی کا لازمی جزو قرار دیا۔ لیکن ابن صفی کے ساتھ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ رہی کہ ان کو اپنوں نے ہی پہچاننے سے انکار کردیا۔ اس ضمن میں احمد صغیر صدیقی اپنے ایک مضمون میں ماہنامہ شاعر، ممبئی میں شائع ایک خط کا حوالہ دیتے ہوئے مکتوب نگار کے الفاظ یوں نقل کرتے ہیں:

> اردو ادب کی یہ بھی بیماری ہے کہ یہاں جو شخص زینہ بہ زینہ پہنچ جاتا ہے وہ اوپر ہی اوپر دیکھتا ہے۔ نہ نیچے دیکھتا ہے نہ دائیں بائیں۔ اپنے پیش رووں کو مسخرے، ہم عصر کو بونے اور نئے لکھنے والوں کو کیڑے مکوڑے سمجھنا اس کی عادت اور اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔ اب یہی دیکھیے ابھی پچھلے دنوں انتظار حسین (پاکستانی افسانہ نگار) میسور آئے تھے۔ وہاں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا۔ 'کون ابن صفی؟' جبکہ ابن صفی نے ایک پوری نسل کو پڑھنا سکھایا۔ انتظار حسین یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ انھیں اور ان کے ہم عصروں کو جو قاری ملے ان میں سے تین چوتھائی کی ذہنی تربیت ابن صفی نے کی تھی اور کیا عجب کہ اس دور کے کچھ لکھنے والوں نے ابن صفی کو پڑھ کر ہی لکھنا سیکھا ہو۔ جہاں تک compact زبان کا سوال ہے (میں تخلیقی زبان نہیں کہہ رہا ہوں، کمپیکٹ زبان کہہ رہا ہوں اور وہ بھی noun کے صیغے میں نہیں بلکہ adjective کے صیغے میں) ابن صفی کی زبان

انتظار حسین سے بہتر ہے۔ (۲۱)

تاہم ایک معروف ادیب نے ابن صفی کو پہچاننے سے تو انکار نہیں کیا لیکن ان کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرنے میں انھیں تامّل رہا۔ بزرگ صحافی و ادیب سعید سہروردی (۲۴؍جنوری ۱۹۱۲ء — ۹؍مارچ ۲۰۱۷ء) لکھتے ہیں کہ ایک مجلس میں سید احتشام حسین نے اعتراف کیا:

اگرچہ میں اسے حقیقت سے فرار کا ادب مانتا ہوں لیکن اگر رسالہ میرے ہاتھ لگ جاتا ہے تو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالتا ہوں۔ میری بیوی تو باقاعدگی سے پڑھتی ہے۔

ابن صفی کے سلسلے میں کم وبیش یہی رویہ اردو ادب کے تمام ہی جدید ادیبوں اور نقادوں کا رہا۔ ابن صفی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ جس مشنری جذبے کے ساتھ اردو کی خدمت کررہے ہیں فی الحال اس وقت ادبی دنیا کا کوئی شخص انھیں گھاس نہیں ڈالے گا۔ وہ یہ بھی محسوس کررہے تھے کہ جدید ادب کے تخلیق کار کو ہر جگہ صرف مزدور ہی دکھائی دے رہے ہیں جن پر سرمایہ داروں نے عرصہ حیات تنگ کررکھا ہے۔ جدید ادب کی تخلیق کا ایک ہی مقصد پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے روٹیوں کا حصول رہ گیا ہے۔ ان میں نفس کی بندگی کرنے والے بعض ایسے ادیب و شاعر بھی تھے جو سرمایہ داروں سے شدید نفرت کا اظہار تو کرتے تھے لیکن غم غلط کرنے کے لیے بعض اوقات وہ سرمایہ داروں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے تھے۔ ابن صفی مسلسل یہ تماشا دیکھ رہے تھے کہ جب ادبی اور شعری محفلوں میں وہ مزدوروں اور مظلوموں کا ذکر کرتے کرتے تھک جاتے تو شراب و شباب کے ذکر سے اپنی روح کو تسکین دیتے اور جام وسبو لنڈھاتے ہوئے ان کی صبح ہوتی۔ ابن صفی نے اول روز سے اپنے کو اس طرح کی محفلوں سے دور رکھا۔ انھوں نے اردو کی خدمت کا جو نصب العین متعین کیا تھا اس کی پاسداری آخری وقت تک کی۔ ان کو اس کی پروا نہیں تھی کہ کوئی ان کو بڑا ادیب، شاعر یا ناول نگار کہے۔ وہ تو اپنی ادبی دنیا میں بھی بن پیئے مست رہنے کے عادی تھے۔ وہ تو اس بات کے قائل تھے:

''اپنے وجود ہی کی مستی کیا کم ہے کہ کسی نشے کا سہارا لیا جائے۔'' (صحرائی دیوانہ، جون ۱۹۷۹ء)

کردار نگاری سے منظر نگاری تک

اگر ابن صفی کے تمام ناولوں کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ کرنا مشکل نہ ہوگا کہ ان کا ہر ناول ادب اور فن کی کسوٹی پر کسا ہوا ہے۔ بالخصوص کردار نگاری اور منظر نگاری کا فن ان کے یہاں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ ان کے ناول میں ہر کردار قارئین کے ذہن وقلب پر ایسے انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے جیسے وہ چلتے پھرتے کردار ہوں۔ کرنل فریدی، عمران، حمید، قاسم، آصف، انور، رشیدہ، روشی، جولیا، صفدر، ظفر الملک، اماں بی، رحمٰن صاحب، ثریا، سلیمان، جوزف، فیاض اور سر سلطان جیسے کردار کسی بھی ملک اور سماج میں سانس لیتے ہوئے پائے جاسکتے ہیں۔ ان کرداروں پر ابن صفی کی گرفت انھیں اعلیٰ تخلیقی فن کار کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ اسی طرح انھیں منظر نگاری پر بھی ملکہ حاصل تھا۔ وہ ہر منظر کے ایک ایک جز کی تفہیم اس طرح کراتے ہیں کہ قاری کے سامنے اس منظر کی بعینہٖ عکاسی ہوتی ہے۔ منظر نگاری سے قاری کا ذہن بوجھل نہیں ہوتا بلکہ اسے ایسی توانائی حاصل ہوتی ہے کہ بے ساختہ وہ اس منظر میں جھانکنے کی کوشش کرنے

لگتا ہے۔ ان کے ناولوں کا وصف یہ بھی ہے کہ وہ سماج کے عام کرداروں کو اپنی کہانیوں میں اس خوب صورتی سے پروتے ہیں کہ ناول کے مستقل کردار کے ساتھ وہ کردار بھی اپنی جگہ زندہ، منفرد اور مکمل محسوس ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہی سماج کے نمائندہ کردار ہیں جو اپنی فکری آزادی، چال چلن، عادات و اطوار، دوستی و دشمنی اور جذبات و احساسات کے اعتبار سے سماج کے ہر طبقے میں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ماں باپ، بھائی بہن، سوتیلی ماں، نوکر، خادمہ، پڑوسی، دوست، طالب علم، استاد، پیشے کے ساتھی، کسی ہوٹل کا منیجر یا بیرا، کسی محکمہ کا باس اور اس کے جونیئرس، صحافی، پولیس اہل کار، فوجی، غنڈے، ایک اجنبی سبھی ان کرداروں میں شامل ہیں۔ ان میں وہ کردار بھی ہیں جن کا تعلق طبقہ اشرافیہ سے ہے اور برصغیر کی جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ ہیں۔ چند شریف الفنس ہیں تو ان میں فرعون صفت بھی ہیں۔ چند تعلیم یافتہ کردار بھی حیوان کے درجے میں نظر آتے ہیں۔ اپنے ملک کے نامور اور بارسوخ افراد بھی ملک کے چھپے ہوئے باغی ہوتے ہیں۔

ابن صفی سماج میں رہنے والے کسی ادنیٰ فرد کے کردار کو بھی اتنی جامعیت اور چابکدستی سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کے سامنے اس کردار کی شخصیت کے تمام خط و خال آئینے کی طرح واضح ہو جاتے ہیں نیز اس کی نفسیات، سوچ، فطری جذبات و احساسات فنی لحاظ سے نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے ہر ناول میں کردار نگاری اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اسی طرح سماج کے منفی کرداروں کو بھی ابن صفی نے اتنے سلیقے سے برتا ہے کہ بہت سے کردار منفی ہونے کے باوجود لافانی دکھائی دیتے ہیں اور سماج میں کہیں نہ کہیں سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض منفی کردار سے قارئین کو ہمدردی بھی محسوس ہوتی ہے۔ ان میں سنگ ہی، مادام تھریسیا، ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر جیرالڈ شاستری، ڈاکٹر ہرمین، نانوتہ، علامہ دہشت ناک، الفانسے، فنچ، بوغا، ضرغام، ہمبگ دی گریٹ، پروفیسر درانی، جابر اور نادر جیسے کردار خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ابن صفی نے اپنے بہت سے ناول مستقبلیات (Futurology) کی روشنی میں لکھے۔ بالخصوص سائنسی ترقی اور اس کے منفی اثرات پر انھوں نے برسوں قبل انکشافات کیے جو اردو ادب کا قیمتی اثاثہ ہیں۔ معروف نقاد ڈاکٹر عبدالمغنی (مرحوم) کہتے ہیں کہ ناول ''پیاسا سمندر'' (نومبر ۱۹۵۷ء) ادب کا شاہکار ہے۔

اگر ابن صفی کے تمام ناولوں کا الگ الگ ادبی اور فنی جائزہ لیا جائے تو ہر ناول کے کردار، اس کی تھیم اور منظر نگاری پر گرانقدر تفصیلات فراہم کی جاسکتی ہیں۔

ادب میں ابنِ صفی کا طرۂ امتیاز

اردو ادب میں ابن صفی کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے جاسوسی ناول نگاری کے روشن باب کا آغاز کیا۔ انھوں نے جرم و سزا جیسے خشک موضوع کو اپنے شگفتہ طرز تحریر اور طنز و مزاح کی چاشنی سے اتنا دلچسپ اور پُرکشش بنا دیا کہ وہ اردو دنیا میں جاسوسی ادب کے مؤجد کہے جانے لگے۔ اس کے برعکس یہ اردو ادب کی بدقسمتی رہی کہ اس میں اخلاقی اقدار سے گری ہوئی شاعری اور گلشن نندہ ٹائپ کے ناولوں کو تو کسی حد تک ادب کا درجہ دیا گیا لیکن ابن صفی کی شفاف اور مقصدی تحریروں کو ادب کے طلبا کے لیے اچھوت بنا کر رکھ دیا گیا۔ بالخصوص تقسیم ہند کے بعد اردو ادب کے چند سکہ بند ادیبوں، شاعروں اور ناول نگاروں نے ادب کا ایک خود ساختہ کینوس بنا

کر اردو ادب کے دامن کو تنگ اور محدود کر دیا۔ حتیٰ کہ 'الف لیلہ'، 'طلسم ہوش ربا' اور 'داستان امیر حمزہ' سے مالا مال اردو ادب میں جاسوسی ادب کو انھوں نے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھا جبکہ ابن صفی نے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور دو عالمی جنگوں کے بعد بدلتی دنیا کے الجھے ہوئے سنگین مسائل نیز جدید قومی و معاشرتی اذہان کے نفسیاتی اور سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

بیسویں صدی کے ادب میں آزادیٔ فکر کا خاص طور سے بہت چرچا ہوتا ہے جس کا تعلق اصل میں کسی نہ کسی سماجی ردِعمل سے ہے۔ اس لیے امیروں اور دولت مندوں کی سفّاک ذہنیت کے مقابلے میں غربا اور مساکین کا ردِعمل دیکھنے کو ملتا ہے۔ مَردوں کی آزادی کے ردِعمل میں عورتوں کی آزادی کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے اور جنسی آوارگی کو شہ ملتی ہے۔ مذہبی رسوم و روایات کا ردِعمل ملحدانہ افکار کے نتیجے میں سامنے آتا ہے۔ فی الحقیقت اس طرح کے ردِعمل سے برپا ہونے والی تحریکیں بھی انسان کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہیں۔ ابن صفی نے اس کے برعکس ادب میں ایسا انوکھا، معتدل اور شفاف تجربہ کیا ہے جو آئینے کی مانند ہے۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں درجنوں قسم کے کرداروں سے متعارف کرایا ہے اور ان کے ذریعے عقل و شعور اور غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ وہ آزادیٔ فکر کی معقول توجیہ کرتے ہیں، غیر معقولیت کی ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حسن و عشق ایک سیدھا سادہ معاملہ ہے اور وہ بے لگام عاشق کی ٹھنڈی آہوں کو خلافِ ادب تصور کرتے ہیں۔ وہ ادب میں خیالی دنیا کے حسین قلعے تعمیر نہیں کرتے بلکہ اس کا رشتہ حال سے مربوط کرتے ہوئے حقیقی اور عملی انسانی مسائل کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ ''اِنذار'' کے ساتھ ساتھ روشن مستقبل کی ''بشارت'' بھی دیتے ہیں۔

عصر حاضر پر گہری نظر

ادب میں ابن صفی کو جہاں ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کی چاشنی سے طرہ امتیاز حاصل ہے وہیں ان کے یہاں انوکھے اور اچھوتے خیال کی آرائش بھی ہے۔ عمران سیریز کے ناولوں میں عمران کا کردار عصر حاضر کا جیتا جاگتا نمائندہ کردار محسوس ہوتا ہے۔ تاہم اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ اس پر بیک وقت جدید اور مابعد جدید دونوں کا گمان ہوتا ہے۔ عمران اگرچہ روایتی اصولوں کا قائل نہیں ہے لیکن دشمنوں اور وطن فروشوں کے مقابلے میں وہ شدت سے روایت پسندی کے اصول پر کاربند نظر آتا ہے۔ ایک طرف جہاں وہ روایتی ہتھیاروں سے کام لینا پسند نہیں کرتا تو دوسری طرف موقع و محل کے لحاظ ناقابل شکست اسلحہ (deterrent) کا استعمال بھی بڑی خوب صورتی سے کرتا ہے۔ شاید انھی خصوصیات کی بنا پر بعض ادیبوں نے عمران کے کردار کا موازنہ ''طلسم ہوش ربا'' کے معروف کردار ''عمرو عیار'' سے کیا ہے۔ فی الحقیقت عمران موجودہ دور کا ایسا نمائندہ کردار ہے جو مایوسی کی انتہائی صورت حال میں بھی امیدوں اور آرزوؤں کی خوشخبری دیتا ہے۔ ساری دنیا قنوطیت اور اضمحلال کا شکار ہوسکتی ہے لیکن عمران کے لغت میں ان الفاظ کا کہیں بھی گزر نہیں۔ سخت سے سخت حالات میں بھی اس کے چہرے پر پژمردگی کا سایہ دکھائی نہیں دیتا۔ بہ الفاظ دیگر وہ حوصلوں اور امنگوں کا نمائندہ کردار ہے۔

پاکستان، ابن صفی کا وطنِ ثانی ہے لیکن ان کا صُلبی اور اصلی تعلق اس ہندوستان سے ہے جہاں انھوں نے اپنی زندگی کے قیمتی اور تلخ و شیریں ایام گزارے۔ بچپن کی خوش گوار یادیں اور دوست و احباب کی صحبتیں یہیں نصیب ہوئیں۔ انھوں نے اپنے ادبی کریئر کا

آغاز یہیں سے کیا اور یہی تحفہ وہ اپنے وطنِ ثانی میں لے گئے۔ مگر افسوس کہ ہند و پاک کے مٹھی بھر ادیبوں اور نقادوں نے، جن کے قلم کی سیاہی ایوانِ ادب میں فیصلہ کن سمجھی جاتی تھی، ابن صفی کے ادبی مشن اور خدمات پر ہمت افزائی کی ایک سطر بھی لکھنے کی زحمت نہیں کی۔ شاید وہ ابن صفی کی شہرت اور مقبولیت سے حسد میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کراچی میں ابن صفی کے معنوی شاگرد اور معروف ادیب جناب مشتاق احمد قریشی لکھتے ہیں کہ ادب کے اماموں میں سے ایک امام علامہ نیاز فتح پوری نے 'نگار' کے ایک شمارہ میں ابن صفی کو ''اردو کا ناسور'' لکھنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ حیدر آباد کے ایک رسالہ کے ایڈیٹر کے نام اپنے ایک خط میں مشتاق احمد قریشی مزید لکھتے ہیں:

> ...ادب کے سارے ہی جغادریوں کا رویہ ابن صفی صاحب کے ساتھ ایسا ہی تھا، وہ انھیں اپنی کسی صف میں جگہ دینے کو تیار ہی نہیں تھے جبکہ خود ابن صفی صاحب نے تو اپنے ہنر سے، اپنے قلم سے اپنی صفِ اول خود بنائی تھی جس میں ان کی پیروی اور نقل کرنے والوں کی ایک طویل فہرست موجود ہے جبکہ ادب کے کسی اہم اور بڑے سے بڑے مصنف کو بھی یہ اعزاز حاصل نہیں ہوسکا تھا کہ ان کے کرداروں کی، ان کے اندازِ تحریر کی نقل کی گئی ہو... (۲۲)

ابن صفی کو خوش قسمتی سے اپنے وطن ثانی پاکستان میں اور وہاں کے توسط سے یوروپ و امریکا کے اردو حلقے میں چاہنے والوں کی معتد بہ تعداد مل گئی تھی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں خود غرضی، بزدلی، مایوسی اور خوف کی نفسیات سے اسیر ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور نقادوں کی تعداد زیادہ رہی ہے۔ ان میں ابن صفی کی تحریروں سے اردو سیکھنے والے مخلصین بھی شامل ہیں۔ مگر افسوس کہ وہ بھی محض تماشائی بنے رہے۔ اپنی نجی مجلسوں میں وہ ابن صفی کے محاسن ضرور گنواتے رہے لیکن قلم اٹھانے کی شاید انھیں توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ البتہ برصغیر کی تاریخ میں پہلی بار یونی ورسٹی سطح پر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں پروفیسر خالد محمود (سابق صدر، شعبۂ اردو) کی سرپرستی میں دسمبر ۲۰۱۲ء میں ایک سہ روزہ سمینار منعقد ہوا تھا۔ اس سمینار کی افتتاحی تقریب میں اس وقت کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ نے ابن صفی کو Genius قرار دیا تھا۔

ادب میں سرقہ کی بدترین مثال

اردو ادب میں سرقہ یا چوری کے متعدد طریقے اختیار کیے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً کسی شاعر کی غزل کا شعر، مصرع اور ردیف وغیرہ کا سرقہ، کسی کہانی کے بنیادی کردار و پلاٹ کا سرقہ، کسی کے دیوان کو اپنا دیوان بنالینا، کسی کی تخلیق کو اپنی تخلیق قرار دینا، کسی مصنف کی اجازت کے بغیر اس کی کتاب وتخلیقات کی اشاعت وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے نادر خیال کو من وعن چُرا لینے کا ہنر بھی ادب میں داخل ہوا۔ حتیٰ کہ پی ایچ۔ڈی کے مقالوں کا سرقہ بھی موضوع وعنوان میں جزوی تبدیلی کے بعد ممکن بنالیا گیا ہے۔ دل چسپ بات یہ بھی ہے کہ اس طرح کے مسروق مقالے پر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی تفویض کی جانے لگی ہے۔ تحقیق میں حوالہ جاتی کتابوں (Bibliography) کا سرقہ بھی عام ہوگیا ہے یعنی ایک موضوع کے تحت درجنوں حوالے نقل کردیے جاتے ہیں لیکن محقق حوالہ میں پیش کی گئی کتابوں کی صورت سے بھی نا آشنا ہوتا ہے۔ یہ رجحان اب برصغیر کی بیشتر یونی ورسٹیز کے طلبا میں عام ہوگیا ہے۔ عہد حاضر

میں نصابی کتابوں کی تیاری میں بھی سرقہ کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ کسی کتاب کو اپنے نام سے چھاپ کر مصنف بننے کا رجحان اور خبط بھی اردو دنیا میں عام ہے۔ راقم الحروف نے پاکستان کے کئی مصنفوں کی کتابوں کے ہندوستانی ایڈیشن پر دہلی کے کسی شخص کا نام لکھا دیکھا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کی کسی کتاب پر اردو اکادمی، دہلی جیسے باوقار ادارہ نے انعام بھی دیا ہے۔

ایشیا میں ابن صفی کی اس مقبولیت اور ان کی تحریروں کی سحر انگیز شہرت سے زوال آمادہ اردو ادب کے پروردہ ادیبوں میں حسد اور رقابت کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ چناں چہ ابن صفی کے نام کو کیش کرانے کے لیے متعدد نقال مصنّفین (ghost writers) وجود میں آئے اور انھوں نے ابن صفی کے قارئین کو رِجھانے کی ناکام کوششیں شروع کر دیں۔ خاص طور سے ابن صفی کی علالت کے دوران میں (۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۲ء) نقال مصنّفین خودرَو جھاڑیوں کی طرح پیدا ہونے لگے کیوں کہ اس دوران میں ان کا کوئی ناول منظر عام پر نہیں آسکا۔ اُس دَور میں صفی کے نام پر کچھ لوگوں نے این صفی، ابّن صفی اور سیفی بی اے وغیرہ کے نام سے عمران کے کردار کو تختۂ مشق بنایا۔ ایسے میں خواتین کیوں پیچھے رہتیں، چناں چہ نجمہ صفی اور نغمہ صفی بھی پیدا ہوگئیں۔ ایسے سارے جعلی صفیوں نے اپنی سی کوشش کر ڈالی لیکن ان کی اشاعت کبھی ایک ہزار سے زائد نہیں ہو پائی، اس لیے کہ زیادہ تر لکھنے والوں کا مطالعہ وسیع نہیں تھا، دوسرے ان کی تحریروں میں وہ دلکشی، سلاست اور روانی نہیں تھی جو ابن صفی کے ناولوں کا خاصہ ہے۔

ابن صفی نے اَن گنت صفیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> رہی مختلف قسم کے ابنوں اور صفیوں کی بات تو بے چارے سارے قافیے استعمال کر چکے ہیں، لٰہذا اب مجھے کسی 'ابن خصّی' کا انتظار ہے۔ میری دانست میں تو صرف یہی قافیہ بچا ہے۔ کوئی صاحبہ (اسی قافیہ والی) عرصے سے غلط فہمی پھیلا رہی ہیں کہ وہ میری کچھ لگتی ہیں۔ لیکن یقین کیجیے کہ میرے والد صاحب بھی ان کے جغرافیے پر روشنی ڈالنے سے معذور ہیں۔ واللّٰہ اعلم بالصواب۔ (۲۳)

اگر ابن صفی یوروپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو کیا ان کے کسی کردار کو وہاں کا کوئی مصنف سرقہ کرنے کی جرأت کرسکتا تھا؟ کیا یوروپ میں کسی ایسے مصنف کا ذکر ملتا ہے جس نے شرلاک ہومز اور ڈاکٹر واٹسن کے کردار کو اپنے ناول میں پیش کرنے کی جرأت کی ہو؟ بات وہیں آتی ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں مجموعی طور پر ہمارا قومی کردار اتنا سطحی، مفاد پرست اور منافقانہ ہوگیا ہے کہ ہمارے اندر کسی کی ذہانت و صلاحیت کے اعتراف کی جرأت پائی جاتی ہے اور نہ ہی ہمارا تخلیقی ذہن اپنی راہ خود بنانے کا حامل رہا ہے۔ خاص طور سے برصغیر میں قومی سطح پر زندگی کے ہر شعبہ میں پستی ہمارا مقدر بنتی جا رہی ہے۔ گزشتہ ساٹھ برسوں کے دوران میں اردو زبان سے وابستہ بیشتر افراد (ادیب، ناول نگار، شاعر اور اردو کتابوں کے ناشر) کا کردار بے حد مشتبہ رہا ہے۔

ابن صفی کو یہ خدشہ لاحق نہیں تھا کہ ان کے اوریجنل ناول کو کوئی من و عن شائع کر دے کیوں کہ ان کی حیات ہی میں اردو دنیا کے ڈائجسٹوں میں یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ انھیں پریشانی اس بات کی تھی کہ اردو کے جعلی مصنّفین اور ناشرین ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کے لیے ان کی شہرت کا فائدہ شرمناک حد تک ناجائز طریقے سے اٹھا رہے تھے۔ ابن صفی ''ڈیڑھ متوالے'' کے پیش رس میں لکھتے ہیں:

کراچی کے ایک ذاتِ شریف نے میرے ناول 'زہریلا آدمی' (فریدی سیریز، فروری ۱۹۶۰ء) کے کرداروں کے نام تبدیل کیے اور اسے اکرم الٰہ آبادی کے نام سے چلادیا۔ اکرم الٰہ آبادی بھی خاصے مشہور لکھنے والے ہیں، اس طرح ان کی بھی توہین کی گئی۔

اس معاملے میں یقینی طور سے کانپور، الٰہ آباد، لاہور، کراچی اور دہلی کے بعض پبلشروں نے بڑی دہشت گردی مچائی۔ کانپور کے شاہین پبلی کیشنز کے محمد درویش خاں نے فریدی، حمید اور عمران سیریز کے درجنوں ناول اس دیدہ دلیری سے شائع کیے کہ اردو دنیا کی تاریخ میں ایسی مذموم حرکت کا ارتکاب شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ ایسا لگتا ہے کہ اس پبلشر نے خود ابن صفی کی ڈمی کا رول ادا کیا اور فریدی، حمید وعمران سیریز کے درجنوں ناول جعلی مصنفوں سے لکھوا کر شائع کیے۔ ہر ناول کے سرورق پر بڑی بے شرمی سے ابن صفی لکھا حتیٰ کہ ''پیش رس'' کی نقالی بھی کی۔

اردو ادب میں سرقہ اور مصنف کے حق پر کسی ناشر کے ڈاکہ ڈالنے کی اس سے بدترین مثال شاید دوسری نہیں پیش کی جاسکتی۔ درویش خاں کے اس ادارے کی طرف سے باضابطہ دو ماہنامے عمران سیریز، کانپور اور حمید۔فریدی سیریز، کانپور شائع ہوا کرتے تھے۔ یہ ماہنامے RNI کے تحت باضابطہ رجسٹرڈ کرائے گئے تھے۔ ماہنامہ حمید۔فریدی سیریز، کانپور کا رجسٹریشن نمبر ۶۹۰۲ / ۶۲ تھا۔ مذکورہ دونوں ماہناموں کے تحت ابن صفی کے نام سے جعلی ناول شائع کیے جاتے۔ یہ ناول جعلی مصنّفین کی طرف سے لکھے جاتے جنھیں دیدہ دلیری کے ساتھ ابن صفی کے نام کی سند دی جاتی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ownership declaration میں ان ماہناموں کے ایڈیٹر کا نام، ابن صفی، قومیت، ہندوستانی اور پتا کے طور پر ۹۲ / ۵۷ پوروہ، ہیرامن، کانپورا۔ درج کیے جاتے۔ محمد درویش خاں (پرنٹر پبلشر) کی طرف سے یہ ڈیکلریشن یکم فروری ۱۹۶۴ء کو عمران سیریز کے گیارہویں شمارہ میں شائع کیا گیا۔

آپ تصور کیجیے کہ ایک ابن صفی (اسرار ناروی) جو ہندوستان کے معروف شہر الٰہ آباد کے ایک قصبہ نارہ میں پیدا ہوئے، الٰہ آباد ہی میں جاسوسی ادب کی بنیاد رکھی پھر ۱۹۵۲ء میں بحالت مجبوری کراچی ہجرت کرگئے۔ دوسرے ابن صفی کانپور میں موجود ہیں اور دھڑا دھڑ عمران اور حمید فریدی سیریز کے ناول لکھ رہے ہیں۔ اردو ادب کی یہ کیسی دنیا ہے جہاں اوریجنل ادیبوں کی ڈمی تیار کی جاتی ہے بلکہ کاغذی کلون (Clone) تخلیق کی جاتی ہے اور اسے اصل بنا کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے جس طرح دجال اکبر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ڈمی بن کر دنیا کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش کرے گا۔ ساٹھ کی دہائی میں جاسوسی ادب کے میدان میں سرقہ، ادبی ڈاکہ زنی اور لوٹ کھسوٹ کا ایسا بازار گرم تھا کہ شاید اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایسا معرکہ کبھی پیش نہ آیا ہوگا۔ جعلی ایڈیشن کے ''ڈمی ابن صفی'' کی جانب سے لکھے ہوئے ایک ''پیش رس'' کے اقتباس کی دروغ گوئی ملاحظہ کیجیے:

''... کچھ احباب نے سوال کیا ہے کہ کیا شاہین پبلی کیشنز اپنا ادارہ ہے تو اس کے لیے عرض ہے کہ ان کا سوال ہی دراصل میرا جواب ہے۔ حقیقتاً شاہین پبلی کیشنز میرا نجی ادارہ ہے اور اس ادارہ سے آپ کو میری تمام تصنیفات پڑھنے کو ملیں گی... اور کہیں نہیں۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے کیوں کہ آپ اپنے محبوب کردار علی عمران سے ملنے کے لیے بے چین ہوں گے۔ اس لیے میں آپ حضرات

کے بیچ میں کباب میں ہڈی کی طرح نہیں آنا چاہتا، اس لیے آپ علی عمران سے ملیے اور مجھے آئندہ ناول کے لیے رخصت کیجیے۔ آپ کا اپنا — ابن صفی۔ (۲۴)

معلوم نہیں اس طرح کے اور کتنے ناول مذکورہ پبلشر نے شائع کیے ہوں گے اور بڑی بے شرمی سے ان ناولوں کا خالق ابن صفی کو قرار دے کر اردو کے قارئین کو گمراہ کیا ہوگا۔ اس طرح کے ناولوں کی کھپت عام طور پر جنوبی ہندوستان کے اردو قارئین میں زیادہ تھی اور وہاں کی مقامی اردو لائبریریوں میں اب بھی یہ ناول محفوظ ہو سکتے ہیں۔

اردو دنیا میں ابن صفی کی غیر معمولی ادبی خدمات کو بعض ادیب اور نقاد مخصوص عصبیت کے سبب ادب کا درجہ نہ دیتے ہوں لیکن یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان کے ناولوں کے قارئین میں ادیب، نقاد، پروفیسر، شاعر، صحافی، سیاست داں، ڈاکٹر، انجینئر، محقق و اساتذہ سبھی شامل تھے۔ یونی ورسٹیوں کے بعض نقاد پروفیسر بھی ابن صفی کے ناولوں کے رسیا رہے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یا المیہ یہ ہے کہ اردو ادب میں اس بے حسی کی مثال نہیں ملتی کہ ابن صفی جیسے بلند پایہ ادیب و شاعر کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ ابن صفی سے غیر معمولی استفادہ کرنے والے ادیب و نقاد نے بھی مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیا اور کانپور کے درویش خاں کی ادبی دہشت گردی پر کسی ادیب، نقاد یا یونی ورسٹی کے پروفیسر کو توفیق نہ ہوئی کہ اس کا محاسبہ کرتے۔ دوسری طرف اردو زبان و ادب کو گھنا اور تناور درخت بنانے والے ادیب ابن صفی کو ادبی صحرا میں یکہ وتنہا چھوڑ دیا جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اردو ادب کی تخلیق کی نذر تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کا شمار خالقِ کائنات کے ان وفادار بندوں میں ہے جن کی زندگی میں تناقض اور منافقت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ انھوں نے جس زمانے میں ادب کے پلیٹ فارم سے مختلف ازموں (Isms) کے برعکس اللہ کی حاکمیت اور اس سے وفاداری کا اعلان کیا تھا، اس وقت وہ اپنے مشن میں تنہا ادیب تھے۔

بالآخر ہزاروں اشعار کا خالق، ڈھائی سو سے زائد ناولوں کا مصنف اور درجنوں طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا انشا پرداز صرف ۵۲ سال کی عمر میں ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو بڑی خاموشی سے اس دارفانی سے رخصت ہو گیا جس کا قول تھا:

"قرآن کو پڑھو، اس پر عمل کرو — اسے علم الکلام کا اکھاڑا نہ بناؤ۔"(۲۵) انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔ آمین!

حوالے وحواشی

۱۔ 'ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟' (راشد اشرف)، صفحہ ۸۶
۲۔ سائیکومینشن۔ ابن صفی، مؤلف و مرتب خرم علی شفیق، ۲۰۱۱، فضلی سنز (پرائیویٹ لمیٹڈ)، کراچی
۳۔ پیش رس، ناول مہلک شناسائی (نومبر ۱۹۶۸)، کرنل فریدی۔ حمید سیریز
۴۔ میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟' از ابن صفی، بحوالہ کہانیوں کا مجموعہ 'ڈپلومیٹ مرغ' ۱۹۷۵، مطبوعہ احباب ادب، کراچی
۵۔ 'ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟' مؤلف و مرتب راشد اشرف، بحوالہ محمد بدر منیر، صفحہ ۷۶

۶۔ خاص طور سے ابن صفی کے تین ناول 'پتھر کی چیخ' (۱۹۵۴)، 'بے چارہ بے چاری' (دسمبر ۱۹۶۰)، 'زہریلا آدمی' (فروری ۱۹۶۰) ملاحظہ کیجیے۔

۷۔ 'ہوئے تم دوست جس کے' از ڈاکٹر حقی حق (شکاگو)، مطبوعہ شفیق پبلی کیشنز، لاہور

۸۔ 'دستنبو' از مرزا غالب، اردو ترجمہ مخمور سعیدی، مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (نئی دہلی)

۹۔ 'ابن صفی: چند معروضات' از ڈاکٹر خالد جاوید، مطبوعہ سہ ماہی 'اردو ادب'، نئی دہلی، مئی تا جون ۲۰۰۶

۱۰۔ 'اردو ادب میں دانشوروں کی روایت' از ڈاکٹر عبدالمغنی، بحوالہ 'انداز تنقید' مرتب ڈاکٹر سیّد احمد قادری

۱۱۔ 'اردو ادب کی مختصر تاریخ' از سلیم اختر (لاہور، ۱۹۹۳)۔ یہ کتاب بھارت میں عاکف بک ڈپو، نئی دہلی سے بھی شائع ہوئی ہے

۱۲۔ 'سائیکومینشن' مصنف، خرم علی شفیق، صفحہ ۱۰، اشاعت ۲۰۱۱، مطبوعہ فضلی سنز، کراچی

۱۳۔ ابن صفی کے دو ناول (عمران سیریز) 'آتش دان کا بت' (ستمبر ۱۹۵۸)، 'جڑوں کی تلاش' (نومبر ۱۹۵۸) ملاحظہ کیجیے۔

۱۴۔ پیش رس 'ہلاکو اینڈ کو' (ستمبر ۱۹۷۰)، عمران سیریز

۱۵۔ عمران سیریز کے ناول 'کالے چراغ' (دسمبر ۱۹۵۶)، 'الفانسے' (فروری ۱۹۵۷)، 'درندوں کی بستی' (مارچ ۱۹۵۷)، 'پیاسا سمندر' (نومبر ۱۹۵۷)، 'سہ رنگی موت' (جون ۱۹۷۶)، 'جونک اور ناگن' (ستمبر ۱۹۷۶)، 'ہلاکت خیز' (مئی ۱۹۷۷)، 'زیبرا مین' (جون ۱۹۷۷)، 'جنگل کی شہریت' (جولائی ۱۹۷۷)، 'ظلمات کا دیوتا' (ستمبر ۱۹۵۹) ملاحظہ کیجیے۔

۱۶۔ فریدی۔حمید سیریز کے ناول 'تباہی کا خواب' (اکتوبر ۱۹۶۸)، 'مہلک شناسائی' (نومبر ۱۹۶۸)

۱۷۔ عمران سیریز کے پانچ ناول عمران کا اغوا، جزیروں کی روح، چیختی روحیں، خطرناک جواری، ظلمات کا دیوتا (جنوری ۱۹۵۹ سے ستمبر ۱۹۵۹ کے درمیان شائع ہوئے)

۱۸۔ 'وبائی ہیجان' (۱۹۵۸)، فریدی۔حمید سیریز

۱۹۔ 'انڈین ایکسپریس' نئی دہلی، ۱۷ مارچ ۲۰۱۳

۲۰۔ 'کیا تیرا بگڑتا' از شبنم رومانی، نئے افق ڈائجسٹ کراچی، جولائی ۱۹۹۴

شبنم رومانی کا اصل نام مرزا عظیم بیگ چغتائی (پیدائش ۲۰ دسمبر ۱۹۲۸ شاہجہاں پور، بھارت۔ وفات ۱۷ فروری ۲۰۰۹، کراچی) شاعر، روزنامہ ''مشرق'' کے کالم نویس، سہ ماہی ''اقدار'' کراچی کے مدیر و ناشر، سات کتابوں کے مصنف، پاکستان نیوی سے اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ (بحوالہ ابن صفی: کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا، از راشد اشرف، صفحہ ۲۰۷)

۲۱۔ ماہنامہ شاعر، ممبئی۔ جنوری ۱۹۹۴

۲۲۔ آندھرا پردیش اردو اکادمی کا ترجمان 'قومی زبان' حیدر آباد، اگست۔ستمبر ۲۰۱۱، صفحہ ۱۶

۲۳۔ پیش رس 'ڈیڑھ متوالے'، اکتوبر ۱۹۶۳

۲۴۔ جعلی ناول 'موت کی محبوبہ' شاہین پبلی کیشنز، کانپور، ۱۹۶۲

۲۵۔ پیش رس 'پاگلوں کی انجمن' (عمران سیریز، جون ۱۹۷۰)

ڈاکٹر رضوان زیب ٭

''آئرن سائڈ زلون ہینڈز'' اور ''دلیر مجرم'' کا تقابلی مطالعہ

اردو ادب میں جاسوسی کہانیوں اور ناولوں کا آغاز ابن صفی مرحوم سے قبل ہو گیا تھا مگر اردو کے جاسوسی ادب کے مطالعے سے ایک چیز واضح ہوتی ہے کہ ابن صفی مرحوم ہی اردو کے جاسوسی ادب کے پہلے اور آخری آدمی تھے۔ اگرچہ کئی لوگ اس امر پر شاکی ہیں کہ اردو ادب کے ٹھیکے دار جاسوسی ناول کو اردو ادب میں اس کا مقام نہیں دیتے لیکن اس کی وجوہات پر زیادہ گفتگو نہیں کرتے۔ اگر ہم انگریزی ادب کو دیکھیں جہاں جاسوسی کہانیوں اور ناولوں کو ادب کا حصہ تسلیم کیا جا چکا ہے تو ایک چیز ہم پر واضح ہوتی ہے کہ وہاں ایک کے بعد ایک اعلیٰ لکھاری نے اس صنف میں طبع آزمائی کی۔ مگر اردو ادب اس سے مجموعی طور پر محروم رہی۔ ابن صفی کے بعد یہ صنف ایک ایسے ناول نگار سے محروم رہا جو ان کے کام کو آگے بڑھا سکتا اور یہی اردو ادب کی اس صنف کی بدقسمتی ہے۔

ابن صفی مرحوم جو ایک منجھے ہوئے مزاح نگار اور شاعر کے طور پر ادبی حلقوں میں متعارف تھے نے جاسوسی ناول لکھنے اور پھر اسے جاری رکھنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ اس پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ان روایات پر راقم کے کچھ اشکال تھے جو برادر عزیز راشد اشرف صاحب سے discuss کیے گئے۔

مختصراً یہ کہ جب یہ طے ہوا کہ جنسی لٹریچر کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لیے کچھ نیا کیا جائے تو پہلے پہل جو خیال آیا وہ بقول مجاور حسین رضوی صاحب کہ یہ تھا کہ سکسٹن بلیک کے طرز پر اردو میں ایک جاسوسی ماہ نامے کا اجراء کیا جائے۔ توقع کے برخلاف اسرار احمد صاحب (ابن صفی) کے نام قرعہ فال نکلا اور وکٹر گن کا ایک ناول ان کے حوالے کیا گیا کہ اس کی بنیاد پر کچھ لکھا جائے جو انھوں نے ایک ہفتے میں کر دیا۔

یہ انسپکٹر فریدی اور سارجنٹ حمید کا پہلا کارنامہ دلیر مجرم تھا۔ اس ناول کے دیباچے میں اس کا ذکر موجود ہے۔ ابن صفی لکھتے ہیں:
''پہلا ناول تھا اس لیے کسی بیرونی سہارے کی ضرورت تھی لہٰذا اس کا مرکزی خیال مغربی ادب سے لیا گیا تھا۔ ایک جرمن مصنف کا کارنامہ تھا جس پر دنیا کے کئی مصنفوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ مثال کے طور پر پیٹر شین نے اسی پلاٹ کو سینٹرل ڈیزائن کے نام سے پیش کیا ہے۔ وکٹر گن نے یہی کہانی آئرن سائیڈز کے نام سے لکھی ہے... وکٹر گن کا انداز پیٹر شینی سے کہیں بہتر ہے۔ اس کے مقابلے میں پیٹر شینی کا ناول کسی بچے کا لکھا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ پیٹر شینی وکٹر گن سے کہیں زیادہ مشہور ہے۔ ہندی میں بھی آپ کو اسی پلاٹ پر ایک ناول قیامت کی رات کے نام سے مل جائے گا۔ اس کے مصنف کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ ہاں تو ''دلیر مجرم'' کا پلاٹ میں

٭ ڈی ایس (ر)، ایسوسی ایٹ پروفیسر، وار ونگ، ایئر وار کالج انسٹی ٹیوٹ، کراچی۔ برقی پتا: srizwanzeb@gmail.com

نے انگریزی سے لیا تھا لیکن فریدی اور حمید میرے اپنے کردار تھے۔ میں نے اس کہانی میں کچھ ایسی دل چسپیوں کا اضافہ بھی کیا ہے جو اوریجنل پلاٹ میں نہیں تھیں۔"

کئی حضرات نے ابن صفی پر سرقہ کا الزام لگایا۔ کچھ ستم ظریف تو اپنی ستم ظریفی میں اس حد پر چلے گئے کہ انھوں نے ابن صفی کے تمام ناولوں کو انگریزی ناول (ناولوں) کا چربہ قرار دیا۔ ان احباب نے بہرحال اپنے دعوے کے حق میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا۔ ابن صفی صاحب نے زمین کے بادل کے پیش رس میں تفصیلاً ان چند ناولوں کا ذکر کیا جن کا مرکزی خیال یا پلاٹ یا کوئی کردار انھوں نے مغربی ادب سے مستعار لیا۔ "دلیر مجرم" ان ناولوں میں شامل ہے مگر جیسا کہ ابن صفی مرحوم نے بقلم خود لکھا ہے کہ اس کا مکمل پلاٹ وکٹر گن کے ناول سے لیا گیا۔ کیا "دلیر مجرم" وکٹر گن کے ناول کا ترجمہ ہے؟ جیسا کہ ابن صفی صاحب نے لکھا انھوں نے کچھ ایسی دل چسپیوں کا اضافہ کیا جو وکٹر گن کے ناول میں نہیں تھیں تو یہ "دل چسپیاں" کیا ہیں؟ کیا یہ دعویٰ درست ہے؟ فریدی اور حمید کے کردار original ہیں؟ کیا فریدی وکٹر گن کے "آئرن سائیڈز" کا ہندوستانی ورژن ہے؟ اس تحریر میں مع "آئرن سائیڈز لون ہینڈ" اور "دلیر مجرم" کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے مندرجہ بالا سوالات کے جواب تلاش کریں گے اور چند اہم تنقیدی امور بھی زیرِ بحث لائیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ "دلیر مجرم" کا تنقیدی مطالعہ بعد کے ناولوں کے ساتھ کریں گے۔ اُمید ہے اس طرح ابن صفی کے فن کے ارتقا کا جائزہ بھی ممکن ہوگا۔ وکٹر گن (Victor Gunn) کے ناول کا نام "آئرن سائیڈز لون ہینڈ" (Ironside's Lone Hand) ہے۔ اس ناول کے آغاز کا "دلیر مجرم" سے تقابلی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ دونوں کا پہلا جملہ بالخصوص اور ابتدائیہ بالعموم بعینہٖ ایک جیسا ہے۔ وکٹر گن کے سردار کا نام Peter Cameron ہے۔ جو کہ St. Mark hospital میں ڈاکٹر ہے۔ ابتداً دماغی سرجن کا ذکر نہیں۔ جوان ہے مگر عمر نہیں بتائی گئی۔ Mrs. Smalley جس کو پیٹر Aunt Susan کہتا ہے اس کے ساتھ Edgune میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی جو کہ پیٹر نے اپنی کمائی سے خریدا تھا۔ Mrs. Smalley اس کی House Keeper ہے۔ ان کے ساتھ اس کی خادمہ یا ملازمہ Doris بھی رہتی تھی۔ پیٹر آپریشن کی وجہ سے لندن روانہ ہوتا ہے۔ Mrs. Smalley ڈورس کو کہتی ہے کہ گرم پانی کی بوتل پیٹر کے کمرے میں رکھے وہ وہاں سوئے گی۔ ڈورس اور Mrs. Smalley کا مکالمہ قدرے طویل ہے۔ ڈورس گھر میں اکیلے ہونے پر اپنے خدشے کا اظہار کرتی ہے کہ اس نے آج ہر اس شخص کو دیکھا ہے جو کل بھی گھوم رہا تھا۔ Mrs. Smalley مردد ہوتی ہے مگر پھر یہ کہتی ہے کہ وہ ہماری مرغیوں کی طاق میں ہوگا۔

رات کو جب ڈورس سونے والی ہوتی ہے تو اسے نیچے بحث مباحثے کی آواز آتی ہے وہ کھڑکی سے نیچے دیکھتی ہے۔ Mrs. Smalley کسی سے بحث کر رہی ہے۔ اندر آتی ہے۔ ڈورس نیچے آ کر پوچھتی ہے تو وہ صبح بتانے کا کہہ کر کمرے میں چلی جاتی ہے۔

وکٹر گن آیندہ صفحات میں قاتل کی آمد اور قتل کی واردات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ مشکوک شخص باغ کے دیوار پھلانگ کر اندر آتا ہے۔ اس کے آنے کا وقت ساڑھے بارہ لکھا گیا ہے۔ اس کا حلیہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ کھڑکی سے اندر آتا ہے۔ پوری قوت سے چھرا گھونپتا ہے۔ Mrs. Smalley ایک اندوہناک ہلکی سے سسکی لیتی ہے۔ قاتل خاموشی سے نکل جاتا ہے۔ صبح پیٹر واپس آتا ہے۔ ڈورس پریشان ہے کہ Mrs. Smalley جو ۷:۳۰ تک اُٹھ جاتی ہے ابھی تک نہیں اٹھی۔ پیٹر اور ڈورس کے درمیان یہاں

ایک مکالمہ ہے جس میں مزاح اور فلرٹ دونوں کا عنصر موجود ہے۔ اس کے بعد جب وہ نہیں اٹھتی، بڑھئی بلا کر دروازہ کھلوایا جاتا ہے وہاں اس کی لاش ملتی ہے۔

پولیس آتی ہے Detective Sergent Rudd ابتدائی تجزیہ کرتے ہوئے اسے ایک مشکل کیس قرار دیتا ہے کیوں کہ بظاہر کوئی Motive نظر نہیں آ رہا۔ جائے واردات پر تمام قانونی اور محکمانہ کاروائی رڈ Rudd ہی کرتا ہے اور آلۂ قتل یعنی خنجر کو بھی محفوظ کرتا ہے۔ اس تمام صورتِ حال میں ابھی تک پیٹر کا کوئی تعلق زیرِ بحث نہیں آتا۔ Rudd پیٹر کو مطلع کرتا ہے کہ وہ سکاٹ لینڈ یارڈ کے اہلکار کا منتظر ہے۔ وہ نوکرانی ڈورس کا انٹرویو بھی کرنا چاہتا ہے جو اس کے خیال میں مشتبہ ہے۔

پیٹر پولیس کی کارروائی سے غیر مطمئن ہوتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ یارڈ سے کوئی ذہنی اور ہوشیار اہل کار آئے گا۔ وہ فوری نتائج کا متمنی ہے جبکہ رڈ پولیس کارروائی کر رہا ہے۔

یہاں پر ایک Lean, Scraggy, Clean shaved بندہ اندر آتا ہے۔ رڈ کے نزدیک قتل کا تعلق Mrs. Smalley کے ماضی کے ساتھ ہوسکتا ہے یہاں پر یہ شخص جو ابھی داخل ہوا ہے یہ سوال اٹھاتا ہے۔ کون کس کمرے میں سویا یہ امر اہم ہے۔ یہ شخص Ironside Cromwell اسکاٹ لینڈ یارڈ کا انسپکٹر اور اس ناول کا مرکزی کردار یا ہیرو ہے کیوں کہ یہ Cramwell کا پہلا کارنامہ نہیں ہے، لہٰذا اس کا تفصیلی تعارف نہیں دیا گیا کیوں کہ Gunn کے قاری Cromwell سے واقف ہیں۔ Cromwell کے اسسٹنٹ کا نام سارجنٹ لیسٹر Liste ہے۔ رڈ اور آئرن سائیڈ میں ایک تناؤ ہے۔ آئرن سائیڈ پائپ پیتا ہے۔ اب خنجر کی بحث ہوتی ہے۔ آئرن سائیڈ کہتا ہے یہ خنجر یوگوسلاویہ کا بنا ہوا ہے۔ یوگوسلاویہ میں کروشیا کے پہاڑی علاقے ''اُسکا'' کا۔ پیٹر کروشیا کے ذکر پر چونکتا ہے اور پوچھتا ہے مطلب قاتل کروشیا کا تھا؟ آئرن سائیڈ اس پر مزید بات نہیں کرتا جبکہ رڈ اپنی ابتدائی تھیوری پر قائم رہتا ہے۔ دونوں گھر اور باغ کا معائنہ کرتے ہیں۔ چند معمولی نشانات ملتے ہیں جو صرف پیٹر کے کمرے والی کھڑکی کے نیچے ہوتے ہیں۔ اس بناء پر وہ پیٹر کو بتاتا ہے کہ قاتل دراصل اسے مارنے آیا تھا۔ (ص ۳۷) پر میری زندگی کا محور تو میرا کام ہے، کوئی رشتہ دار نہیں اور حلقہ ارباب نہایت مختصر اور میری موت سے کسی کو کوئی فائدہ بھی نہیں۔ یوگوسلاوی باشندے کے ذکر پر پیٹر کہتا ہے کہ ایک یوگوسلاوی جس سے اس کا واسطہ حال ہی میں پڑا تھا مر چکا ہے۔

اسی اثنا میں یہ عقدہ بھی کھل جاتا ہے کہ رات کو جس شخص سے Mrs. Smalley بحث کر رہی تھیں وہ کانسٹیبل ایلیٹ ہے۔

اس تمام حصے میں Lister ایک خاموش مبصر تھے۔ اب آئرن سائیڈز اور لیسٹر واپس روانہ ہوتے ہیں۔ یہاں لیسٹر کا تعارف کرایا جاتا ہے کہ وہ اکیڈمی سے گریجویٹ ہوکر کچھ عرصے آئرن سائیڈز کے ساتھ رہا پھر ڈپلومیٹک سروس میں چلا گیا اور اب پھر اس کے پاس واپس آ گیا ہے۔ دونوں میں بے تکلفی اور کسی قدر دوستی تو نظر آتی ہے مگر برادرنہ تعلق کا شائبہ تک نہیں۔ یہ برطانوی معاشرتی تناظر میں ایک غیر ضروری و لایعنی شے ہوتی۔ راستے میں آئرن سائیڈ کی نظر ایک اشتہار پر پڑتی ہے: ''کارکوف ایک سرویٹ خنجر باز'' شام کی تمام اخبارات میں اس قتل کے متعلق اور آئرن سائیڈر کی تھیوری کہ اصل شکار پیٹر تھا کے متعلق خبریں نمایاں طور پر شائع ہوتی ہیں۔ دونوں سرکس دیکھنے جاتے ہیں جہاں کارکوف واضح طور پر disturbted نظر آتا ہے اور اس کی ساتھی لڑکی بال بال بچتی ہے۔

آئرن سائیڈ سرکس کے مالک کے پاس جاتا ہے۔ وہاں آئرن سائیڈز اور سرکس کے مالک کا مکالمہ کافی طویل ہے۔ مالک کے بقول کارکوف ایک ماہر خنجر باز مگر کند ذہن آدمی ہے اور آج کل اس کے پاس کافی پیسا ہے پھر وہ اس کے خیمے کی طرف جاتے ہیں۔ یہ دونوں باہر رکھتے ہیں جبکہ سرکس کا مالک اندر جاتا ہے۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد آئرن سائیڈز اور لیسٹر بھی اندر جاتے ہیں۔ کارکوف کو خنجر سے قتل کر دیا جاتا ہے مگر قاتل فرار ہو جاتا ہے۔

یہاں کافی تفصیل سے discuss ہوتا ہے کہ یہ قتل کیوں ہوا؟ قاتل کون ہوسکتا ہے۔ کیا یہ Pre-planned تھا۔ آلۂ قتل جو ویسا ہی ایک خنجر ہے جو Mrs. Smalley کے قتل اور خنجر بازی کے مظاہرے میں استعمال ہوا۔ یہ قاتل کے پاس کہاں سے اور کب آیا؟ وغیرہم۔

سرکس سے واپسی پر پیٹر کے پاس رکھتے ہیں۔ وہاں ڈورس کی ماں آ گئی ہے تاکہ مدد کر سکے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ Mrs. Smalley / Susan کا قاتل مل گیا مگر وہ مر چکا ہے۔ پھر اس کو معاملے کی تفصیل بتاتا ہے۔ اس کے نزدیک اصل مجرم کافی دنوں سے پیٹر پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اس نے کرویٹ کا انتخاب پیٹر کے ناکام آپریشن کی بنا پر کیا۔

اس طرح اس کیس کی باضابطہ تفتیش شروع سے ہی آئرن سائیڈ کر رہا ہے آگے چل کر ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ ایک سروس فلیٹ میں رہائش پذیر ہے۔

آئرن سائیڈ تجزیے کے دوران اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ سرکس کے مالک نے جو Stoke Styettam جو کہ ایک Small Country Town، Strettan Priors کا حصہ ہے۔ یہ وہی Strettan ہے جس کو Mrs. Smalley نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ ڈورس کے مطابق قتل کی رات وہ Go to Strettan Prior کہنا چاہتی تھی وہ اکیلا Strettan Prior جاتا ہے۔ وہاں جو لوگ لارڈ کے ساتھ رہ رہے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

۱۔ Lady Frement وکہ Lord Strettan کی کزن ہے General Sir Rockwell Fremant کی بیوہ ہے۔

۲۔ June Fremant, Lady Fremant کی بہن ہے۔

۳۔ Freddic Havershan لارڈ صاحب کا بھتیجا ہے۔

لارڈ صاحب کو Time Legalword ہے۔ آئرن سائیڈ کی ملاقات Miss Fremant سے ہوتی ہے جو اسے مہمان سمجھ کر لارڈ صاحب کی علالت کے متعلق بتاتی ہے۔ جب آئرن سائیڈ اس کا منتظر ہوتا ہے تو سیڑھیوں کے نزدیک ایک تصویر دیکھ کر چونک جاتا ہے۔ ان کا مکالمہ کافی طویل ہے۔ لارڈ صاحب کے خاندانی معالج کا نام Dr. Storrs ہے جبکہ اس دماغی عارضے کی تشخیص کے لیے Sir Hunter James کی خدمات حاصل کی گئی ہیں مگر وہ بھی تشخیص نہیں کر سکے۔ البتہ وہ operation کو Final قرار دے کر خارج از امکان کر چکے ہیں۔ اب فریڈی کی انٹری ہوتی ہے۔ آئرن سائیڈ فریڈی سے اس تصویر کے متعلق پوچھتا ہے اور وہ اسے بتاتا ہے کہ یہ دوسرے Lord Strettam کی ہے اور اس کو بغور دیکھ کر چونک پڑتا ہے پوچھتا ہے کہ کیا تم اسکاٹ لینڈ یارڈ کے آئرن سائیڈ ہو؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ اور تم نے خود کو رپورٹر ظاہر کیوں کیا؟ آئرن سائیڈ وضاحت دیتا ہے کہ میں نے صرف اپنا نام بتایا تھا

اور بٹلر نے خود ہی طے کر لیا کہ میں بھی صحافی ہوں۔ خاتون (June) کو میں نے اس لیے نہیں بتایا کہ شاید وہ پھر کھل کر بات نہ کر سکیں۔ اتنے میں June واپس آ جاتی ہے۔ کیوں چیخ رہے ہو؟ کیا تم جانتے نہیں کہ ڈاکٹر نے شور سے منع کیا ہے؟ June یہ صحافی نہیں یہ سکاٹ لینڈ یارڈ سے ہے۔ آئرن سائیڈ وضاحت پیش کرتا ہے کہ وہ دماغی امراض کا ایک طالب علم ہے اور اس پر تحقیق کرتا ہے۔ اس نے ۳ بڑے مجرموں کے دماغ مرتبانوں میں محفوظ کر رکھے ہیں۔ اور لارڈ صاحب کے کیس میں اس کو دل چسپی کی بھی وجہ یہی ہے۔ اور وہ آج یہاں اپنی اسی علمی دل چسپی کی بنا پر آیا ہے کہ شاید اس کی معلومات میں اضافہ ہو سکے۔ جہاں تک یارڈ کا تعلق ہے ان کے نزدیک میں اس وقت ہاکی کھیل رہا ہوں۔ June اس کی وضاحت مان لیتی ہے۔ Freddie اس کی مدد کی پیشکش پر اس کا شکریہ ادا کرتا ہے مگر ساتھ ہی اسے قبول کرنے سے معذرت کر لیتا ہے کیوں کہ ایک تو آئرن سائیڈ ڈاکٹر نہیں دوسرا سر ہنٹر اس کو approve نہیں کریں گے۔

پھر وہ دونوں تفصیلاً لارڈ صاحب کے عارضے کے متعلق اس کو بتاتے ہیں۔ وہ نہایت خوشگوار انداز میں اجازت لیتا ہے۔ عمارت سے نکل کر کچھ دور چل کر وہ نہایت سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اب اس کو شک و شبہ کے بغیر معلوم ہو گیا ہے کہ Mrs. Smalley کے قتل اور اس جگہ میں کیا تعلق ہے۔ راستے میں چلتے ہوئے وہ سوچتا ہے کہ سر ہنٹر ۲۰ سال قبل اپنے کیریئر کے عروج پر تھا مگر اب کئی لوگ ان سے پہلے آگے نکل چکے تھے پھر بھی یہ لوگ اس سے لارڈ صاحب کا علاج کیوں کرا رہے ہیں! وہ ڈاکٹر سٹورز کے پاس جانے کی ٹھانتا ہے۔ ابھی اس کی گاڑی تھوڑی دور گئی ہوتی ہے کہ رائفل کا فائر ہوتا ہے وہ بال بال بچتا ہے مگر کار کو تیزی سے بڑھا لے جاتا ہے۔ تھوڑا دور جا کر کار روکتا ہے واپس جاتا ہے۔ ایک عجیب وغریب شخص کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ فائر غلطی سے اسے لگے ہوں۔ یہ شخص Professor Eroch Bartholomew Rath ہے۔ آنکھوں کے علاوہ اس میں زندگی کے بظاہر کوئی آثار نہیں۔ اس میں بچگانہ معصومیت بھی ہے۔ یہ ماہر فلکیات ہے جو دو سال قبل ریٹائر ہوا ہے۔ میں تو گلہری کا شکار کر رہا تھا۔ پروفیسر آئرن سائیڈ کو بتاتا ہے۔ آئرن سائیڈ اور پروفیسر کا مکالمہ قدرے طویل ہے اور دل چسپ ہے۔ اسی باغ کے ایک کونے میں ایک عمارت Torturer's Keep میں اس کی رہائش ہے۔ یہاں فریڈی آ جاتا ہے اور ان دونوں کا ایک طویل مکالمہ ہے آئرن سائیڈ اسے خود پر ہونے والے حملے کے متعلق آگاہ کرتا ہے۔ پروفیسر لارڈ کا دور کا رشتہ دار ہے اور Alan نامی نوکر اس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ واپسی پر ایک ٹریپز کتا آئرن سائیڈ کی گاڑی کے نیچے آتے آتے بچتا ہے۔

یہ کتا Tim Wiggs کا ہوتا ہے جو اپنی بیوی مارتھا کے ساتھ لارڈ صاحب کی رہائش کے ساتھ ہی مگر لارڈ کی زمین اور دی ہوئی رہائش میں رہتا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی لارڈ صاحب کے خلاف نفرت انگیز جذبات رکھتے ہیں اور ان کے منہ سے اس کے متعلق کوئی کلمہ خیر نہیں نکلتا۔ وہ پچھلے پندرہ سال سے وہاں رہ رہا ہے اور کوئلوں کا دلال ہے اور اس کے لیے لارڈ صاحب کی زمین سے لکڑی چوری کرتا ہے۔ متعدد بار گرفتار ہو چکا ہے مگر ہر بار لارڈ صاحب اسے معاف کر دیتے ہیں۔

وہاں سے آئرن سائیڈ Dr. Storrs کے پاس جاتا ہے۔ یہاں بھی اپنے آنے کی وجہ دماغ اور اس کی متعلق امراض سے دل چسپی بتاتا ہے۔ ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ خاندان Houtan سے علاج کرا رہا ہے۔ اس پر اصرار سیڈی فری ماونٹ کا تھا اور فریڈی نے

بھی حمایت کی تھی مگر لارڈ نے بذات خود یہی احکام دیے تھے کہ ضرورت پڑنے پر Sir John Houtan Juneson یا Sir Michael Atherton کو بلوایا جائے۔ کیوں کہ Atherton میڈرڈ میں تھا اس لیے ہنٹر کو بلوایا گیا جو کہ لارڈ صاحب کی اولین ترجیح تھا۔ Storr اور آئرن سائیڈ کا مکالمہ کافی طویل اور جاندار ہے۔ دوران گفتگو آئرن سائیڈ سٹورز کو پیٹر کیمرون سے علاج کا مشورہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ... کو اسے بتاؤ اور نہ خاندان والوں کو یہ مشورہ کس نے دیا ہے۔ سٹورز ہچکچاتا ہے۔ آئرن سائیڈ ہنٹر کی ذمے داری لیتا ہے۔ باہر آکر اپنے ایک کولیگ Joko کو ٹیلی گرام کرتا ہے۔ جب واپس پہنچتا ہے تو لیسٹر اسے بتاتا ہے کہ چیف اس کو ڈھونڈ رہا ہے۔ ایک واردات ہوئی ہے جس میں قاتل نے کلہاڑے سے چار افراد کو قتل کر دیا ہے اور چیف یہ کیس تمھارے ذمے کرنا چاہتا ہے۔

اسی دوران آئرن سائیڈ Sir Hunter کی کلینک فون کرتا ہے اسے بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک ارجنٹ کیس کے سلسلے میں شمالی سکاٹ لینڈ گیا ہے اور تین دن بعد واپسی ہوگی۔

آئرن سائیڈ چیف کے دفتر جاتا ہے اور کچھ دیر بعد مغلظات بکتا واپس آتا ہے۔ اُسے دوسرا کیس دے دیا گیا ہے۔ جس کے لیے اسے اور لیسٹر کو فوری طور پر Plymouth روانہ ہونا ہے۔

دوسری طرف ڈاکٹر سٹورز پیٹر سے رابطہ کرتا ہے اور تفصیلاً لارڈ صاحب کے کیس کے متعلق آگاہ کرتا ہے۔ پیٹر فوراً کیس میں یوں کھو جاتا ہے کہ وہ لارڈ صاحب اور ان کی جاگیر کے نام کی طرف دھیان نہیں دیتا۔ لارڈ صاحب کی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے ان دونوں کا ٹکراؤ Tim اور اس کی بیوی سے ہوتا ہے۔ ان کا مکالمہ چند صفحات تک چلتا ہے۔

حویلی پہنچ کر ڈاکٹر سٹورز پیٹر کا تعارف خاندان کے لوگوں سے کراتا ہے جو حیرت اور غصے کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر ڈاکٹر سٹورز ذمے داری لیتا ہے۔ پیٹر کا تعارف جب نرس سے ہوتا ہے تو وہ اسے دیکھ کر پوچھتی ہے کہ کیا ہم کبھی ملے ہیں؟ پیٹر اس شناسائی کے اظہار کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ آپ نے اس کی تصویر دیکھی ہوگی، کافی مشہور آدمی ہے سٹورز کہتا ہے۔ اب پیٹر طویل معائنے کے بعد آپریشن کو واحد حال بتاتا ہے اور اسی روز آپریشن کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ فریڈی اس فیصلے کی مکمل حمایت کرتا ہے اور لیڈی بھی پر امید نظر آتی ہے۔ Jane کو تو پیٹر پہلی نظر میں بہا جاتا ہے اور وہ نظر اس سے ہٹا نہیں پاتی۔ واپسی پر سٹورز کو فیملی روک لیتی ہے۔ پیٹر تنہا روانہ ہوتا ہے۔ اس کا عمامہ ڈائریکٹ حویلی پہنچ جائے گا۔ وہ چل پڑتا ہے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ پروفیسر اسے آواز دیتا ہے اور اس کی طرف بڑھتا ہے مگر جونہی اس کے قریب آتا ہے اسے گویا سکتہ ہو جاتا ہے اور اس کا نام پوچھتا ہے اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے واپس دوڑ جاتا ہے۔

ابھی پیٹر اس معاملے کے متعلق سوچ ہی رہا ہوتا ہے کہ ایک کتا اس کی طرف دوڑتا آیا ہے مگر چند قدم کے فاصلے پر چیخ کر گر جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔ اس کی آواز پر ایک لڑکا جو سائیس کے لباس میں ہوتا ہے آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ اس کے کتے کو کیا ہوا؟ پیٹر لاعلمی کا اظہار کرتا ہے اور حیرت کا بھی، معائنہ کرتا ہے اور اس کے پنجے میں سے ایک سوئی نکالتا ہے اور محفوظ کر لیتا ہے۔ سوئی زیادہ پرانی نہیں ہوتی۔ وہ اس کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے وہاں سے وہ اپنے ہوٹل چلا جاتا ہے۔ جو شخص جھاڑیوں سے اس کی نگرانی اور تعاقب کر رہا ہے وہ Tim ہے۔ شام کو اس نے اور سٹورز سے اکھٹے واک کرتے ہوئے جانا ہوتا ہے مگر جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ سٹورز حویلی جا چکا ہے کیوں کہ کچھ دیر قبل فون آیا تھا کہ لارڈ صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔

راستے میں پیٹر پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اور اسے پھندے پر لٹکا چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ دم گھٹنے سے مر جائے مگر وہی شخص یعنی Tim اس کو بچا لیتا ہے۔ جب پیٹر کے حواس بحال ہوتے ہیں تو وہ حویلی کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ جب وہ خیریت سے حویلی میں داخل ہوجاتا ہے تو Tim اپنے کاٹیج کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔

یہ دراصل Tim نہیں بلکہ اس کے بہروپ میں آئرن سائیڈ ہوتا ہے اور یہ سب وہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت کرتا ہے۔ وہ اور لیسٹر بذریعہ ٹرین Plymouth کے لیے روانہ ہوتے ہیں مگر ...اسٹیشن آگے جا کر اتر جاتے ہیں اور بذریعہ کار Tim کے کاٹیج آتے ہیں۔ ایک ہوٹل میں ویک اینڈ کے لیے رہائش اور بیس پونڈ کے عوض انھیں وہاں سے بھیج دیتے ہیں۔ اور وہ اس کے بہروپ میں پیٹر کی حفاظت کرتا ہے۔

دوسری طرف پیٹر آپریشن کی تیاری کر رہا ہوتا ہے اور پروفیسر فریڈی سے ملنے آتا ہے اور اسے بے ہوش کر کے ساتھ لے جاتا ہے۔ پروفیسر کیا آبزرویٹری سے آپریشن کا منظر واضح نظر آتا ہے۔

پروفیسر فریڈی کو ایک مستون سے باندھ دیتا ہے۔ ان دونوں کا مکالمہ بہت طویل تفصیلی اور دل چسپ ہے جو اس پراسرار کہانی کی کئی جہتوں کو کھولتا اور واضح کرتا ہے اور چند نئے سوال اٹھاتا ہے مثلاً مجرم پیٹر کے پیچھے کیوں ہاتھ دھو کر پڑ گیا ہے۔ اسی دوران مجرم کی شناخت ہوتی ہے اور یہ عقدہ بھی کھلتا ہے کہ فریڈی کا یہ تمام مکالمہ دراصل آئرن سائیڈ سے ہو رہا ہے جو اب پروفیسر کے بہروپ میں ہے جبکہ پروفیسر لیسٹر کی زیرنگرانی Tim کے کاٹیج میں ہے۔ فریڈی آزاد ہوجاتا ہے اور ان کی جھڑپ کے دوران آئرن سائیڈ زخمی ہوکر بے ہوش ہوجاتا ہے۔ انجام کار فریڈی اپنے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔

Victor Gunn, *Ironsides Lone Hands*, (Toronot; WM. Collins & Sons, ۱۹۴۳ء)

☆

''دلیر مجرم''، ابن صفی، جاسوسی دنیا نمبر ا، یک رنگ ایڈیشن، اسرا پبلی کیشنز لاہور۔

اب ہم ''دلیر مجرم'' کا تنقیدی مطالعہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ کیا یہ آئرن سائیڈ لون ہینڈز کا ترجمہ ہے۔ جیسے کئی لوگ دعویٰ کرتے ہیں؟ سرقہ یا کاپی کا دعوی اس لیے قابل قبول نہیں کیوں کہ ابن صفی نے ناول کی ابتدا میں ہی یہ واضح کر دیا کہ وہ اس کا استعمال کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا کیوں کہ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور وہ خود بھی کوئی جاسوسی ناول نگار نہ تھے لہٰذا یہ بیرونی سہارا ضروری تھا جو ایک منطقی بات ہے اور پھر Intellectural copyright کا قانون اس وقت تک وضع نہیں ہوا تھا اور ہماری ادبی روایت میں باور سے خارج سے مدد لینا بلکہ اسے اپنی تحریر بنا لیتا، بنا لینے کی روایت کافی مضبوط رہی ہے بلکہ کسی نہ کسی طور آج تک جاری ہے۔ اس ضمن میں عبداللہ حسین کے ''نادار لوگ'' اور خدیجہ گوہر کے انگریزی ناول *The coming Sesson's Yield* اردو ترجمہ ''امیدوں کی فصل'' (خورشید قائم خانی) کا تقابلی مطالعہ کافی مددگار رہے گا۔

''دلیر مجرم'' کی کہانی ڈاکٹر شوکت کے گرد گھومتی ہے جو نشاط نگر میں سیتا دیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ یہاں سے ہی آپ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ابن صفی نے کہانی کو اپنے معروضی اور معاشرتی حالات کے تناظر میں تبدیل کیا ہے۔ سیتا دیوی کا کردار Mrs. Smalley کے

کردار سے مختلف ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں کیوں کہ house-keeper کا رواج نہیں۔ لہٰذا ابن صفی نے اس تعلق کو تبدیل کر دیا۔ سیتا دیوی ڈاکٹر شوکت کی مرحومہ والدہ کی سہیلی ہیں۔ صاحب ثروت ہیں جوانی میں بیوگی کا صدمہ سہا مگر مرحوم میاں کا تمام تر ترکہ ورثے میں پایا۔ نشاط نگر میں اپنی ذاتی کوٹھی میں رہائش پذیر ہیں۔ اور ڈاکٹر شوکت کی پرورش انھوں نے ہی کی ہے اور اپنے مذہب پر کاربند ہونے کے باوجود اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ وہ دنیا کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی حاصل کرے اور شوکت ہی رہے یعنی مسلم ہی رہے۔ ابن صفی نے اس نکتے کو اتنی وضاحت سے کیوں بیان کیا اور اس سے بھی اہم سیتا دیوی اور شوکت کے سرداروں کے مذاہب میں تفاوت دیکھنا کیوں ضروری سمجھا؟ اگرچہ اس کا واضح جواب تو ابن صفی مرحوم ہی دے سکتے تھے مگر ان کی تحریروں اور انٹرویوز سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات نے ان پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور مذہب کی بنیاد پر فساد اور قتل عام کے باوجود انسانیت پر سے ابن صفی کا اعتماد ختم نہیں ہوا تھا (لہٰذا ہم یہ اندازہ لگانے میں حق بجانب ہوں گے کہ سیتا دیوی کا کردار ان کی اسی سوچ کا مظہر ہے اور یہ صرف ''دلیر مجرم'' میں نہیں، ابن صفی کے کسی ناول میں قاری کو مذہب یا دولت کی بنا پر افتخار نظر نہیں آتا۔ یہاں تک کہ ان تحریروں میں بھی جہاں اس کا اظہار مجرم کی شناخت کے طور ہوا ہے جیسا کہ ساڑھے پانچ بجے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ یہ عنصر آپ کو نہیں ملتا۔

خادمہ کا کردار بھی مختصر کر دیا گیا ہے۔ اور اس کا نام بھی نہیں بتایا گیا۔ ایسا کرنا کچھ اتنا غلط بھی نہیں بلکہ برصغیر کے معاشرتی آداب واطوار کے مطابق ہے جہاں خادم یا خادمائیں بے نام ہوتی ہیں۔

اگرچہ کہانی کا آغاز بعینہٖ ایسے ہی ہوتا ہے جیسا لون ہنیڈز میں ہے مگر شوکت اور سیتا دیوی کے مکالمے میں جو جذباتی تعلق اور ممتا جھلک رہی ہے وہ اسی سے خاص ہے مثلاً صرف کھانے کا ذکر نہیں بلکہ سیتا دیوی کہتی ہے میں نے آج تمھارے لیے میکرونی بنوائی تھی۔ اس ایک جملے میں جو ممتا کی جھلک ہے وہ ان کرداروں کے مضبوط تعلق کو واضح کرتا ہے۔

شوکت کے ہسپتال روانہ ہونے کے بعد خادمہ سیتا دیوی کو کہتی ہے کہ وہ شخص آج پھر نظر آیا تھا۔ کیا ہم آج گھر میں اکیلے ہوں گے؟ شاید ہماری مرغیوں کی تاک میں ہو؟

سیتا دیوی یہ سوچتی ہیں کہ یہ پُراسرار شخص کون ہے؟ یہاں ایک دفعہ پھر ابن صفی حقیقت پسندی جو ان کی تحاریر کا بنیادی خاصہ ہے کا اوّلین مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ سیتا دیوی سوچتی ہیں کہ کہیں یہ ان کے مذہبی ٹھیکیداروں کی حرکت تو نہیں؟ مگر اتنے عرصے بعد؟ اگرچہ ابن صفی بین المذہب ہم آہنگی کا پرچار تو کرتے ہیں مگر اس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کرتے کہ ایسے عناصر بہرحال موجود ہیں جو مذہب کی آڑ میں جنونیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ بظاہر سیتا دیوی اس نتیجہ پر پہنچتی ہیں کہ یہ مرغیوں کا ہی معاملہ ہے۔

خادمہ سونے کی تیاری کر رہی ہے کہ اسے باہر بحث وتکرار کی آواز آتی ہے۔ دیکھنے باہر آتی ہے تو سیتا دیوی غصے سے اندر داخل ہو رہی ہیں اور پوچھنے پر صبح بتانے کا کہہ کر سونے چلے جاتی ہیں۔ یہاں ابن صفی Gunn کے ناول کا ایک طویل ٹکڑا حذف کر کے سیدھے شوکت کی واپسی پر آ جاتے ہیں۔ شوکت دروازہ کھلواتا ہے۔ وہاں سیتا دیوی کی لاش بستر پر ہوتی ہے۔ یہاں ابن صفی کی منظر نگاری بہترین ہے۔ پورا منظر گویا قاری کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ شوکت صدمے سے رو پڑتا ہے۔ یہ ایک دفعہ پھر حقیقت نگاری اور ایک انسان کے صدمے کی کیفیت کے دوران جذبات کا اظہار ہے۔ منطقی سے منطقی آدمی بھی اپنے کسی پیارے کے بچھڑ جانے اور اس

طرح بکھر جانے پر رو پڑے گا۔ یہ کوئی کمزوری نہیں بلکہ انسانی جذبات کا حقیقت پسندانہ اظہار ہے۔

یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ابن صفی نے قاتل کی آمد اور قتل کی واردات کے متعلق تفصیل والا ٹکڑا حذف کیوں کیا؟ اور اس سے کہانی پر کیا فرق پڑا؟ اس حذف نے ایک تو قاری کو چونکا دیا کیوں کہ ابھی تک کہانی میں کوئی ایسی چیز نہیں آئی جس سے اس کو واضح ہو کہ کیا ہوا؟ یا ہو رہا ہے بلکہ وہ اب کیا ہوگا؟ میں مبتلا ہو گیا۔ قاری کی دل چسپی بھی برقرار، جب عقدہ کھلا تو حیرت کا شکار اور پھر اب کیا ہوگا؟ قاری کو آخر تک سپنس میں رکھنا ابن صفی کا اسٹائل تھا جس کا اولین مظاہرہ یہاں نظر آ رہا ہے۔ اگر یہ حصہ حذف نہ کیا جاتا تو یہ قاری کو دروازہ کھولنے پر جھٹکا لگا کہ یہ کیا ہو گیا؟ اور کیوں ہوا؟ کس نے کیا؟ ممکن نہ ہوتا بلکہ وہ واقف ہوتا کہ کیا ہوا؟ یہ حصہ حذف کر کے ابن صفی نے سپنس دگنا کر دیا ہے۔ ابن صفی نے نہ صرف یہ حصہ حذف کر دیا ہے بلکہ آگے آنے والی تفصیل کو بھی مختصر کر دیا ہے۔

نئے باب کا آغاز سب انسپکٹر اور دو ہیڈ کانسٹیبل کی بحث کے ساتھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت ان کی کارروائی اور بحثوں سے تنگ آ کر خط لکھ کر اپنے دوست محکمہ سراغ رسانی کے انسپکٹر فریدی کو بلاتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر فریدی کو ذاتی حیثیت میں بھی اس کیس کی تفتیش کرنا پڑی تو وہ کرے گا۔ یہ بھی Gunn کے ناول سے مختلف ہے جہاں آئرن سائیڈ کو تفتیش کرنا ہوتی ہے اور وہ پیٹر سے واقف بھی نہیں ہوتا جبکہ ڈاکٹر شوکت فریدی کا دوست ہے اور اس کو ذاتی حیثیت سے بلاتا ہے۔

اب یہاں ایک نہایت اہم سوال جو کئی قارئین کے اذہان میں بار بار آیا اور ابن صفی صاحب نے اس کا جواب بھی دیا وہ ہے کہ جاسوسی دنیا کے مرکزی کرداروں کے نام کا انتخاب بالخصوص فریدی کے نام کا انتخاب کیسے کیا؟ ابن صفی نے اپنی ایک تحریر میں اپنے ایک استاد کا ذکر کیا ہے جن کے نام کو ابن صفی نے اپنے مرکزی کردار کے لیے منتخب کیا۔ آئن فلمنگ، جیمز بانڈ کے خالق سے جب یہ سوال کیا گیا کہ انھوں نے اپنے کردار کا نام کیونکر منتخب کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اپنے کردار کے لیے ایک Dull نام چاہتے تھے جو کہ منفرد بھی ہو اور کردار سے مماثلت بھی رکھتا ہو۔ بالآخر ان کو یہ نام پرندوں سے متعلق ایک کتاب سے ملا جس کے مصنف کا نام جیمز بانڈ تھا۔ یہ تمام تفصیل فلیمنگ کی سوانح گولڈن آئی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ فریدی بھی ایک ایسا ہی نام ہے۔ اس میں مردانگی ہے اور ایک دہشت کا عنصر بھی۔ فریدی کا کردار بہت گنجلک ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا ارتقا ہمیں ابن صفی کی تحاریر میں نظر آتی ہے۔ لیکن Freddie اور فریدی کے ناموں میں جو صوتی مماثلت ہے وہ بھی معنی خیز ہے۔

آیئے ابن صفی کے سب سے بڑے کردار احمد کمال فریدی سے ملیے: اس ناول میں وہ صرف فریدی ہے، انسپکٹر فریدی۔ فریدی ۳۰، ۳۲ سال کا ایک قوی ہیکل جوان ہے۔ کشادہ پیشانی، خواب آلود آنکھیں، لباس کے رکھ رکھاؤ، تازہ شیو اس کے باسلیقہ اور بااصول ہونے کا مظہر ہے۔ اگر آپ کے ذہن میں Cary Grant یا Raymond Burr کی تصویر گھوم گئی ہے تو خاطر جمع رکھیے۔ زمین کے بادل میں ایک تصویر میں آپ کو Grant یا جان وین کے مماثلت نظر آئے گی جبکہ ابن صفی مرحوم ایک روایت کے مطابق Burr کو فریدی کے کردار کے لیے موضوع سمجھتے تھے۔ آگے چل کر ہمیں پتا چلتا ہے کہ فریدی ایک رئیس آدمی ہے اور نوکری افتادِ طبع کی بنا پر کر رہا ہے۔

سارجنٹ حمید یعنی ہمارے ساجد حمید صاحب جن کی سوانح ٹھنڈی آگ میں آئے گی۔ ۲۴ سال کے نوجوان، طبیعت میں زنانہ پن، حسن کی نمائش کا عادی اور تیز خوشبو والا سینٹ استعمال کرنے والا لیکن بلا کا ذہن۔

اب فریدی اور حمید کا تقابل آئرن سائیڈ اور لیسٹر سے کیجیے۔ بعد المشرقین نظر آئے گا۔ یہ دونوں کردار اور ان کا اسٹائل اور رکھ رکھاؤ سب ابن صفی کی اختراع ہے لہٰذا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ یہ دونوں کردار original ہیں۔ مثلاً آئرن سائیڈ پائپ پیتا ہے۔ فریدی سگار پیتا ہے۔ آئرن سائیڈ سروس اپارٹمنٹ میں رہتا ہے جبکہ فریدی ایک رئیس ہے اور اپنی ذاتی کوٹھی میں رہتا ہے۔ رہی بات لیسٹر کی تو اس کے سردار میں ایسی کوئی بات ہے ہی نہیں جس کے لیے اسے کاپی کیا جائے۔ لون ہنیڈ میں اس کا کردار بہت محدود ہے آخر میں آکر وہ حرکت میں نظر آتا ہے جبکہ حمید کا کردار اگرچہ ''دلیر مجرم'' میں قدرے محدود ہے مگر وہ اہم ہے۔ ایک اور چیز ہے وہ مزاح کا عنصر۔ یہاں بھی حمید میاں چند چٹکلے چھوڑتے نظر آئیں گے۔ جو لیسٹر کے بس کی بات نہیں کہ وہ ٹھہرا ایک سارجنٹ۔

ابتدا ہی سے انسپکٹر فریدی اور پولیس والوں کے درمیان ایک محکماتی تناؤ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ بالخصوص جب سب انسپکٹر فریدی کو بتاتا ہے کہ ہم بے چارے بھلا سراغ لگانا کیا جانیں۔ یہ ٹکڑا ابھی طبع زاد ہے۔ یہاں آپ کو فریدی کا وہ شرارت بھرا انداز اولین طور پر نظر آتا ہے جو بعد کے ناولوں میں گویا اس کا طرہ بن گیا۔ وہ شرارت آمیز انداز میں کہتا ہے کہ وہ اس کیس کو ذاتی حیثیت میں دیکھے گا۔ یہ وہ پولیس والوں کو سنا رہا ہوتا ہے۔ فریدی کے کردار کا یہ انداز بالخصوص اپنے شکار سے اس طرح کھیلنا جیسے بلی چوہے سے بہت دل چسپ ہے اور قاری کو کئی ناولوں کے آخر تک 'اب کیا ہوگا' میں الجھائے رکھتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فریدی یہ کھیل اپنے شکار اور ابن صفی اپنے قارئین کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ مثلاً بیماری پر لوگوں کے تبصرے میں انھوں نے کہا کہ قارئین یہ توقع لگا بیٹھے تھے کہ اب کی بار فریدی ایک والیٔ ریاست، سے جا ٹکرایا ہے مگر نکلا کیا؟

خادمہ کا بیان لیتا ہے وہ بتاتی ہیں کہ سیتا دیوی اکثر سوتے میں راج روپ نگر، راج روپ نگر بڑبڑاتی تھیں۔ کراہ یا آہ کا کوئی ذکر نہیں۔

لاش سے خنجر فریدی نکالتا ہے۔ یہاں ابن صفی نے کروشیا کو ... سے تبدیل کر دیا ہے۔ فریدی کے سوال جواب اور جائے واردات کے معائنے اور اس کی تفاصیل کو ابن صفی نے کافی مختصر کر دیا ہے۔ اسی اثنا میں رات والا شخص بھی مل جاتا ہے اور وہ ایک پولیس والا ہوتا ہے۔

اگرچہ موقعہ واردات کے معائنے کی وہ تفصیل تو نہیں دی گئی ہے مگر جلد ہی فریدی ایک نتیجے پر پہنچ کر ڈاکٹر شوکت کو بتاتا ہے کہ قاتل دراصل اسے مارنے آیا تھا لیکن دھوکے میں سیتا دیوی قتل ہوگئیں۔ اگر وہ سیتا دیوی کو قتل کرنے آیا تھا تو دوسرے کمروں کی کھڑکیوں کے باہر بھی ایسے نشان ملنے چاہیے تھے۔ اور اگر چوری کی نیت سے آیا تھا تو کچھ چوری کیوں نہیں ہوا۔ درواغہ اس پر نکتہ اٹھاتا ہے کہ ممکن ہے اس کے اندر آنے پر وہ جاگ گئی ہوں اور وہ پکڑے جانے کے خوف سے اسے مار کر کچھ چرائے بغیر نکل گیا ہو؟ اس پر فریدی جوش میں آکر... پہلا ناول ہے ابھی فریدی وہ فریدی نہیں بنا لہٰذا وہ جوش میں آسکتا ہے... کہتا ہے کہ قاتل حملے کے بعد کافی دیر تک وہاں رکا رہا۔ دلیل کے طور پر وہ لاش کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مقتولہ کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رہ گیا ہے۔ قاتل نے کمبل سر پر سے ہٹا کر نہیں دیکھا۔

یہ نکتہ بہت اہم ہے اور ابن صفی کے گہرے مشاہدے کا غماز ہے۔

اب ڈاکٹر شوکت نیپالی کے ذکر پر چونکنے کی وضاحت کرتا ہے۔ آئرن سائیڈ لون ہنیڈز کے برعکس بس نیپالی سے ڈاکٹر شوکت کا

واسطہ پڑتا ہے وہ زندہ ہے۔ فریدی کو بتاتا ہے کچھ دن قبل ایک نیپالی اس کے پاس آتا ہے اور ایک مریض کو فوراً دیکھنے کی استدعا کرتا ہے۔ ڈاکٹر شوکت اس وقت ایک آپریشن کرنے جا رہا تھا، سو اس نے معذرت کی مگر وہ رویا گڑگڑایا۔ اگلے دن اتفاقاً شوکت کو وہ پیٹرول پمپ پر ملا اور بولا۔ شاید ہمارا آدمی مر گیا۔ اب ہم تمھاری خبر لے گا۔

اگرچہ پولیس والوں کے ساتھ فریدی کہتا ہے کہ وہ تفتیش نہیں کر پائے گا مگر رخصت ہوتے ہوئے اکیلے میں شوکت کو یقین دلاتا ہے کہ وہ تفتیش کرے گا صرف پولیس والوں کے سامنے نہیں کہا کیوں کہ یہ بڑے افسروں تک شکایت پہنچانے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ تمام تر گفتگو طبع زاد ہے۔ یہاں تک بڑھتے بڑھتے یہ چیز واضح ہو جاتی ہے کہ ابن صفی بنیادی پلاٹ... کرد شمن سے لے رہے ہیں مگر اس میں جابجا اتنی اختراعیں کرتے جا رہے ہیں جو اصل ناول میں نہیں۔ اس طرح ابن صفی کہانی کو لوکل معاشرتی حالات کے مطابق کر رہے ہیں۔ حمید کا کردار محدود ہے ابھی تک یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ابن صفی نے سوچا نہیں کہ اس سے کیا کام لیا جائے۔ ان دو ابواب میں حمید نے سوائے دانت پیسنے اور ایک طنزیہ فقرہ کہنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔

اب فریدی جاسوسی دنیا کی تاریخ کا پہلا سگار سلگاتا ہے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ یا ابن صفی اپنے کردار کو نیا رنگ دینا چاہتے ہیں؟ یاد رہے آئرن سائیڈز پائپ پیتا ہے فریدی اسے دل چسپ کیس کہتا ہے جبکہ حمید بیزاری کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ وہ چھٹی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ یہ تھیم آئندہ بھی کئی ناولوں میں آئے گی۔ یہ گفتگو بھی بالکل طبع زاد ہے۔ فریدی کو پہلے سے سرکس کا پتا ہے اور اس کے مشہور کھیل کا بھی وہ وہاں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ حمید فریدی کی اس اسکیم کو اچھے پیسے والے ناول کے سراغ رساں کی اسکیم کہتا ہے۔ یہ تھیم بھی آئندہ آنے والے جاسوسی دنیا کے نالوں میں بارہا آئے گا۔ لون ہینڈز میں ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ سیدھا سادہ تفتیشی ناول ہے۔ ایک اور تبدیلی یہ بھی ہے کہ آئرن سائیڈز جانتا تھا کہ شام کی اخبار جانتا تھا کہ شام کی اخبار میں تمام تفصیل آجائے گی جب کہ فریدی اور حمید کے لیے ''ایوننگ نیوز'' کی رپورٹ حیران کن تھی۔

آئرن سائیڈز کے برعکس فریدی ابتدا ہی سے راج روپ نگر سے آگاہ ہے۔ یہاں سے نیپالی کے قتل تک ''دلیر مجرم'' کی کہانی بعینہٖ وہی ہے جو لون ہینڈز کی ہے۔ فریدی کو افسوس ہوتا ہے کہ کیس باضابطہ طور پر نہیں مل سکا کیوں کہ وہ چھٹی پر تھا جس میں ابھی دو ماہ باقی ہیں۔ اسی موقعے پر ابنِ صفی اپنے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں کہ فریدی امیر کبیر ہے اور افتادِ طبع کی بنا پر نوکری کر رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اس کیس سے صرفِ نظر کرے گا۔ لیکن اس کا نیا چیف جو دو ماہ قبل ہی تعینات ہوا ہے، اسے بلا کر چھٹی منسوخ کرانے اور کیس کی تفتیش کرنے کا کہتا ہے اور وعدہ کرتا ہے کہ بعد میں وہ اسے چار ماہ کی چھٹی لے کر دے گا۔ فریدی مان جاتا ہے۔

واپس گھر آتا ہے تو حمید اس کا منتظر ہوتا ہے۔ حمید ابھی الگ گھر میں رہتا ہے وہ اسے اپنے تعاقب کے متعلق بتاتا ہے اور فریدی اس سے مجرم اور جرم کے متعلق ایک نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یہ ٹکڑا ابھی طبع زاد ہے اور ان اضافوں میں سے ایک ہے جن کا ابنِ صفی نے ذکر کیا ہے۔

واللہ! آپ نے تو شرلاک ہومز کے بھی کان کاٹ کر کھا لیے۔ حمید ہنس کر بولا۔ تم نے پھر وہی جاسوسی ناولوں کے جاسوس کے حوالے دینے شروع کر دیے۔'' فریدی نے بُرا مان کر کہا۔ کیا یہ ٹکڑا ابنِ صفی کے اس ارادے کا غماز ہے کہ یہ جاسوسی دنیا کا سلسلہ مروّجہ طریقوں سے الگ ہوگا اور کچھ الگ کر کے دکھائے گا؟

فریدی راج روپ نگر کی طرف روانہ ہوتا ہے۔ جہاں نواب وجاہت مرزا پندرہ دن سے کوما میں ہیں۔فریدی نواب صاحب اور اُن کی جاگیر کے متعلق کافی تفصیل اکٹھی کر چکا ہے۔ راج روپ نگر پہنچ کر وہ اپنا تعارف روزنامہ ''خبر'' کے نمائندے کے طور پر کراتا ہے اور جب کنور سلیم کا انتظار کر رہا ہوتا ہے تو ہال میں دیواروں پر لگی تصاویر دیکھتے ہوئے چونک پڑتا ہے اسے ایک تصویر میں گھنی مونچھوں اور ڈاڑھی کے پیچھے کوئی جانا پہچانا چہرہ نظر آتا ہے۔

اتنے میں کنور سلیم آجاتا ہے۔ اسے دیکھ کر تھوڑا جھجکتا ہے، چونکتا ہے، پھر مسکراتا ہوا آگے آتا ہے۔ یہ ٹکڑا اگرچہ ویسا ہی ہے جیسا گَن نے لکھا ہے، مگر اس میں ابنِ صفی نے دو اہم تبدیلیاں کی ہیں: ایک تو فریدی اپنا تعارف ایک اخبار کے نمائندے کے طور پر کراتا ہے اور کنور سلیم اسے بظاہر پہچان نہیں پاتا۔ ابنِ صفی نے تصویر کے متعلق ایک نکتہ بیان کر کے قاری کے تجسّس میں اضافہ کر دیا ہے۔فریدی اور کنور سلیم کا مکالمہ نہایت مختصر ہے اور کوئی اثر نہیں چھوڑتا۔ ابنِ صفی ماہرِ فلکیات پروفیسر عمران کے تعارف میں کافی تفصیل بیان کرتے ہیں۔ فریدی پر فائر اور فریدی کا واپس حویلی جانا اور پروفیسر کے ہاتھ میں رائفل، کنور سلیم اور فریدی کا مکالمہ قریباً حرف بہ حرف ویسا ہی ہے جیسا گَن نے لون ہینڈز میں بیان کیا ہے۔ جاگیر سے واپسی پر فریدی نواب صاحب کے فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر توصیف سے ملنے جاتا ہے۔

ابنِ صفی نے Tim Wiggs اور اس کی بیوی کا کردار ''دلیر مجرم'' میں استعمال نہیں کیا۔ ابنِ صفی نے یہ اس مہارت سے کیا ہے کہ کہانی میں کوئی سقم یا جھول نہیں آتا۔ ڈاکٹر توصیف اور فریدی کی ملاقات قدرے مختصر ہے۔ ڈاکٹر توصیف آپریشن کے حق میں ہے مگر دماغی معالج کرنل تیواری اس کے حق میں نہیں۔ ''دلیر مجرم'' میں ابنِ صفی نے نواب کے خط کا متن مختصر اور تبدیل کر دیا ہے۔

خط جس کاغذ پر لکھا گیا ہے اس کے متعلق فریدی کا اظہارِ خیال معاملے کو مشکوک کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر توصیف فریدی کو بتاتا ہے کہ نواب صاحب نے اس کے ساتھ آپریشن کے امکان پر تفصیلی گفتگو کی تھی اور اس گفتگو کے دوران ڈاکٹر شوکت کا ذکر بھی آیا تھا۔ اس پر فریدی کہتا ہے کہ معاملہ صاف ہو گیا: ''ممکن ہے خط لکھ چکنے کے بعد نواب صاحب نے یہ لکھا ہے کہ اگر کرنل تیواری نہ مل سکیں تو ڈاکٹر شوکت کو لیتے آئیے گا۔ اسی حصے کو کسی نے غائب کر دیا...''

پھر فریدی ڈاکٹر توصیف کو قائل کرتا ہے کہ وہ ڈاکٹر شوکت کو بلائے۔ وہ ڈاکٹر کو بتاتا ہے کہ کرنل تیواری کی فکر نہ کرے کیوں کہ اگرچہ ابھی یہ خبر عام نہیں ہوئی مگر کرنل کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ یہاں سے فریدی کی واپسی پر ''دلیر مجرم'' کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جو کہ ابنِ صفی نے خود لکھا اور مکمل طور پر طبع زاد ہے۔ یہ طویل ٹکڑا فریدی پر قاتلانہ حملہ اور اس حملے میں فریدی کے جاں بحق ہونے کے متعلق ہے۔لیکن یہ ''دلیر مجرم'' کا کم زور ترین اور غیر ضروری حصہ ہے۔ اس کے بغیر بھی ناول کی دل چسپی میں کوئی کمی نہ آتی اور اس سے ناول کی کہانی میں کوئی ایسا twist نہیں آتا جو اس کی دل چسپی اور قاری کے تجسّس میں اضافہ کرتا ہے۔لیکن کیوں کہ ابنِ صفی Tim کے کردار کو استعمال نہیں کر رہے اور فریدی کو کسی اور کیس پر بھی نہیں بھیج رہے کیوں کہ وہ پہلے لکھ چکے کہ پولیس چیف نے خود فریدی کو اس کیس کی تفتیش کے لیے کہا۔ لہٰذا اب کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے ابنِ صفی کو فریدی کے قتل کا سہارا لینا پڑا۔ اس واقعے کے باوجود کہانی آگے بڑھتی ہے اور ڈاکٹر شوکت، نواب صاحب کے آپریشن کے لیے راج روپ نگر پہنچتا ہے۔ ان کے خاندان سے شوکت کی ملاقات مختصر ہے اور معاملات کی اتنی تفصیل بیان نہیں کرتی جتنی گَن نے دی ہے۔ ابنِ صفی ''دلیر مجرم'' کو ہر موقعے پر اختصار کا مظاہرہ کرتے

ہیں لیکن کہانی پر اپنی گرفت مضبوط رکھتے ہیں لہٰذا کہانی میں کہیں کوئی جھول نہیں آتی۔ یہاں سے نواب صاحب کے آپریشن کے آغاز تک کی تفاصیل ویسی ہی ہیں جیسی لون ہینڈز میں بیان ہوئی ہیں۔ سوئی سے قتل ہونے والا کتا ''دلیر مجرم'' میں نجمہ یعنی نواب صاحب کی بھانجی کا ہوتا ہے۔

پروفیسر عمران کا کردار ابنِ صفی کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس کردار کی بُنت میں ابنِ صفی نے نفسیات اور کردار نگاری کا احسن استعمال کیا ہے۔ پروفیسر کوکین کا استعمال کرتا ہے اور اس کی سپلائی چند جرائم پیشہ افراد سے حاصل کرتا ہے۔ ''پرانی کوٹھی کے باہر'' باب میں پروفیسر جو قسمیں اٹھاتا ہے اور دھمکیاں دیتا ہے اس سے ابنِ صفی کی یونانی اور مصری اساطیر سے دل چسپی عیاں ہوتی ہے جن کا اظہار ''شاہی نقارہ'' اور ''اب تک تھی کہاں'' میں ہوتا ہے۔

اب ایک دفعہ پھر پروفیسر اور سلیم کے درمیان ہونے والا واقعہ اور مکالمہ بعینہٖ وہی ہے جو فریدی اور پروفیسر کے درمیان لون ہینڈز میں ہے۔ ''دلیر مجرم'' میں پروفیسر کے بہروپ میں انسپکٹر فریدی ہوتا ہے جو اپنے افسرانِ بالا کے ساتھ مل کر مجرم کو جکڑنے کے لیے اپنے قتل کو اسکیم تیار کرتا ہے۔ وہاں ہونے والی جھڑپ میں سلیم فرار ہوجاتا ہے۔ جب حمید مالی کی جھونپڑی جہاں وہ بے ہوش پروفیسر کی نگرانی کر رہا ہوتا ہے، سے پروفیسر کی آبزرویٹری میں آتا ہے اور فریدی کو ہوش میں آنے میں مدد دیتا ہے۔ جب تک فریدی ہوش سنبھالتا ہے، سلیم کھڑکی تک پہنچ کر بلو پائپ نکال چکا ہوتا ہے۔ فریدی اسے رائفل سے نشانہ بنا دیتا ہے۔ بعد ازاں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ شوکت، نواب صاحب کا بیٹا ہے۔ کہانی کے آخری حصے میں شوکت اور نجمہ جن کی شادی طے ہوچکی ہے اور فریدی اور حمید کی ملاقات کا احوال ہے۔ یہاں شادی کے متعلق قارئین پہلی دفعہ فریدی کے خیالات سے واقف ہوتے ہیں، ''سیدھی سی بات ہے... اگر میری شادی ہوگئی ہوتی تو میں بچوں کو دودھ پلاتا یا سراغ رسانی کرتا... میرا ذاتی خیال ہے کہ کوئی شادی شدہ شخص کامیاب جاسوس ہو ہی نہیں سکتا...''

''تو پھر کیا تم ساری زندگی کنوارے ہی رہو گے۔ شوکت نے کہا۔ ارادہ تو یہی ہے۔ فریدی نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔''

مختصراً فریدی کا کردار جو بعد کے ناولوں میں مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، ابھی اپنے ابتدائی ارتقائی مراحل میں ہے۔ آئندہ آنے والے ناولوں میں فریدی ایک بہت مضبوط کردار کے طور پر سامنے آتا ہے۔ ''دلیر مجرم'' سے لے کر ''موت کی آندھی'' تک کے ناول فریدی کے کردار کو سمجھنے کے لیے اہم ہیں۔ ''لون ہینڈز'' اور ''دلیر مجرم'' کے تقابلی جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ابنِ صفی کا یہ دعویٰ کہ یہ ترجمہ نہیں ہے اور انھوں نے اس میں کئی تبدیلیاں کی ہیں، بالکل درست ہے۔ اگرچہ اس کی سطر سطر پر ان کا دعویٰ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ بہرحال ''دلیر مجرم''، ''لون ہینڈز'' کی ہی اردو میں ترجمانی ہے مگر ابنِ صفی نے ''دلیر مجرم'' میں جو تبدیلیاں کی ہیں، وہ اسے نہایت دل چسپ بنا دیتی ہیں اور پہلی دفعہ قارئین کو ایک ایسی جاسوسی تحریر پڑھنے کو ملتی ہے جس کی زبان، پلاٹ، تناظر اور منظرنامہ اور کردار سب مقامی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''دلیر مجرم'' ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ایک نہایت کامیاب اور اپنی نوعیت میں یکتا سلسلہ ہائے کتب کا نکتۂ آغاز ثابت ہوا۔

شفیع موسیٰ منصوری ٭

ایک عہد ساز فسوں گر

یہ ستر کی دہائی کا کراچی ہے۔ رنچھوڑ لائن کے علاقے بوہرہ پیر میں واقع ’ہلال (آنہ) لائبریری‘ کے بند شٹر کے پاس کھڑے درجنوں افراد بے چینی سے صدیق بھائی کی راہ تک رہے ہیں۔ شام کے چار بجنے میں ابھی چند منٹ باقی ہیں، لیکن یہ چند منٹ وہاں کھڑے لوگوں کے لیے صدیوں کے برابر ہیں۔ اسی اثنا میں گلی کے نکڑ پر صدیق بھائی نمودار ہوتے ہیں۔ شٹر اُٹھتے ہی لوگوں کا ریلا دُکان نما چھوٹی سی لائبریری میں درآتا ہے۔ لائبریری میں موجود ہر فرد ’جاسوسی دنیا‘ کے نئے ناول کی صدا لگا کر صدیق بھائی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پرانے تعلقات، رشتے داریاں اور ’پہلے میں آیا تھا‘ کے جملوں اور حوالوں سے ناول حاصل کرنے کی تگ و دو جاری ہے۔ اس ’ہجوم بے کراں‘ میں پھنسے منحنی سے صدیق بھائی ہر ایک کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کا ہر ایک ناول صدیق بھائی کے لیے کڑا امتحان لے کر آتا ہے۔ ان ناولوں کے حصول کے لیے لوگ دگنا کرایہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ صدیق بھائی کے پاس نئے ناول کی تین جلدیں ہیں اور طلب گار درجنوں، ایسے میں حل یہ نکالا جاتا ہے کہ جو شخص ناول وہی بیٹھ کر ختم کرے گا، اُسے سب سے پہلے پڑھنے کو دیا جائے گا۔ لوگ اس پر بھی تیار ہو جاتے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تین افراد دکان پر بیٹھے ناول پڑھ رہے ہیں اور باقی ان کے سروں پر سوار ہیں۔

صدر کے ریگل چوک پر واقع بُک اسٹال کے مالک محمد انور کو بھی اسی قسم کی صورتِ حال کا سامنا ہے۔ انور کے پاس جاسوسی دنیا کے تیس ناولوں پر مشتمل بنڈل آتے ہی فروخت ہو گیا ہے اور وہ ایجنٹ سے دوسرا بنڈل خریدنے کی فکر میں ہیں۔

یہ ماجرا ہے اُردو کے عظیم جاسوسی ناول نگار ابنِ صفی کے ناولوں کی مقبولیت کا، جنھوں نے پچاس سے اسّی کی دہائی تک ایک دنیا کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا اور آج بھی اس فسوں گر کے طلسم سے لوگ نکل نہیں پائے۔ ان کا پہلا ناول ۱۹۵۲ میں منظر عام پر آیا اور ۷۰ برس گزرنے کے بعد بھی ان کے ناولوں کی اشاعت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

ابن صفی کا شجرہ اور خاندانی پس منظر

ابن صفی کے آبا و اجداد کا تعلق ہندوؤں کی ذات ’کائستھ‘ سے تھا۔ اس ذات کی کئی نسلیں گزرنے کے بعد اس کے سربراہ وشیشر سنگھ نے اسلام قبول کیا، جو بعد ازاں بابا عبدالنبی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا مزار آج بھی نارا (الٰہ آباد) میں واقع ہے۔ عبدالنبی

٭ فلیٹ B-403، بلال گارڈن، غلام حسین قاسم روڈ، الماری والی گلی، گارڈن ویسٹ، کراچی۔

کے بیٹے عبدالرزاق سے شجرہ اس طرح شروع ہوتا ہے،عبدلغفور،محمد اشرف، بدیع الدین، طالع یار،قبول احمد،عبدلحکیم اور پھر عبدالفتح سے ہوتا ہُوا ابن صفی کے والد صفی اللہ (وفات ۲۷رجون ۱۹۶۷ء) تک پہنچتا ہے۔

ابن صفی کے والد اور والدہ پڑھے لکھے زمیں دار گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ابن صفی کے دادا اسکول ماسٹر تھے اور والد وزیر علی اینڈ کمپنی میں ملازم تھے۔ابن صفی کی والدہ نذیرہ بی بی (وفات جون ۱۹۷۹ء) ایک دین دار خاتون تھیں۔ان کا خاندان ’حکیموں کا خاندان‘ کے نام سے مشہور تھا۔ابن صفی کے ایک بھائی ایثار احمد اور بہن غفیرہ خاتون کا نوجوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ان کی ایک چھوٹی بہن عذرا ریحانہ جو بلاغت خاتون کے نام سے جانی جاتی تھیں، نے ابن صفی کے ہم راہ پاکستان ہجرت کی تھی۔ان کا انتقال ۲۰۰۵ میں کراچی میں ہوا۔

ابن صفی کی اہلیہ اُم سلمیٰ (وفات ۱۲ جون ۲۰۰۳ء) محمد امین احسن کی صاحب زادی تھیں، جو سلطان پور میں ڈپٹی سپرنٹینڈنٹ آف پولیس تھے۔ان کے والدین ان کے بچپن ہی میں فوت ہو چکے تھے اور ان کے پھوپھا ظہیر احسن (وفات ۱۹۷۰ء) نے ان کی پرورش کی تھی۔

ابن صفی کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں ہیں، جن میں سب سے بڑی بیٹی نزہت سلمان خاتون خانہ ہیں۔ابن صفی کے بڑے بیٹے ڈاکٹر ایثار احمد صفی پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے، جن کا انتقال جولائی ۲۰۰۵ء میں ہُوا۔تیسرے بیٹے ابرار احمد شکاگو (امریکا) میں مکینیکل انجنیر ہیں۔منجھلی بیٹی ثروت افروز صدیقی شادی کے بعد لندن مقیم ہوچکی ہیں۔احمد صفی مکینیکل انجینئر ہیں اور لاہور میں رہتے ہیں۔افتخار احمد صفی الیکٹریکل انجینئر ہیں اور کینیڈا میں مقیم ہیں۔ابن صفی کی سب سے چھوٹی بیٹی محسنہ صفی کراچی میں رہائش پزیر ہیں۔

الٰہ آباد سے ادبی زندگی کی ابتدا

ابن صفی انڈیا کی ریاست اتر پردیس کے شہر الٰہ آباد کے ایک چھوٹے سے قصبے نارا میں ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام ’اسرار احمد‘ رکھا۔ پرائمری کی تعلیم انھوں نے نارا کے مجیدیہ اسلامیہ ہائی اسکول سے حاصل کی بعدازاں ان کا خاندان نارا سے الٰہ آباد منتقل ہوگیا، جہاں ڈی اے وی اسکول سے انھوں نے میٹرک پاس کیا۔میٹرک کے دوران انھیں کمیونسٹوں کی صحبت حاصل ہوئی اور انھوں نے معاشرتی مسائل پر شاعری شروع کر دی۔حکیم احسان علی مرحوم ابن صفی کے پر نانا تھے، جنھوں نے طب یونانی میں فارسی زبان میں کتاب لکھی تھی۔ان کے والد صفی اللہ کو بھی مطالعے کا شوق تھا، جس کی وجہ سے گھر ایک لائبریری کا سماں پیش کرتا تھا۔ چناں چہ ابن صفی نے آٹھ سال کی عمر میں طلسم ہوش رُبا کی ساتوں جلدیں پڑھ ڈالیں۔ابن صفی ساتویں جماعت کے طالب علم تھے، جب انھوں نے اپنی پہلی کہانی ’ناکام آرزو‘ لکھی۔ یہ کہانی ہفت روزہ ’شاہد‘ میں شائع ہوئی، پھر وقفے وقفے سے اس رسالے میں ان کی کئی کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔اُس وقت اُن کا طرزِ تحریر رومانوی ہُوا کرتا تھا۔اس دوران انھوں نے الٰہ آباد کے مشہور شاعر ’نوح ناروی‘ کی نسبت سے ’اسرار ناروی‘ کے نام سے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں برصغیر میں ’ہندوستان چھوڑ دو‘ تحریک کا آغاز ہُوا۔اس تیرہ سالہ بچے نے اس موقع پر ایک نظم کہی، جس کے بول تھے:

اب چھوڑ بھی دو میرا دامن، للّٰہ نہ روکو، جانے دو
وہ دیکھو اُفق کے سینے پر لہرائے شہیدوں کے دامن
بن جائے گا لالہ زار وطن کچھ دیر میں شہدا کا مدفن

ابن صفی نے ایونگ کرسچین کالج، الٰہ آباد سے انٹر پاس کیا۔ انٹر سال اوّل میں انھوں نے پہلی بار کالج کے سالانہ مشاعرے میں حصّہ لیا۔ دوسرے سال وہ کالج کی ادبی سوسائٹی کے صدر چُن لیے گئے۔ ۱۹۴۷ میں انھوں نے الٰہ آباد یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ اس دوران تقسیم کے فسادات شروع ہوگئے اور یونی ورسٹی میں ایک طالب علم قتل ہوگیا۔ ابن صفی کے بزرگوں نے ان کا یونی ورسٹی جانا بند کروا دیا۔ تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ میں حالات کچھ بہتر ہوئے تو انھوں نے آگرہ یونی ورسٹی سے بی اے مکمل کیا۔ وہ ۱۹۴۹۔۵۲ء تک الٰہ آباد کے اسلامیہ اسکول اور پھر یادگار حسینی اسکول میں معلّم بھی رہے۔

۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کے قتل پر ابن صفی نے ایک نظم لکھی جس کا پہلا شعر تھا:

لوئیں اداس، چراغوں پہ سوگ طاری ہے
یہ رات آج کی انسانیت پر بھاری ہے

پاکستان کے ایک نجی ٹی وی چینل نے اس نظم سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ گاندھی، ابن صفی کے آئیڈیل تھے اور اُن کی موت کی خبر ان پر بجلی بن کر گری تھی۔ ابن صفی کے بیٹے احمد صفی اس تاثر کو رد کرتے ہیں۔ اُن کا ماننا ہے کہ اُن کے والد سمجھتے تھے کہ گاندھی کو پاکستان کی حمایت میں مارا گیا تھا، کیوں کہ گاندھی نے پاکستان کو اُس کا اثاثہ دینے کے لیے 'مرن برت' رکھا تھا۔ گاندھی کی شخصیت کے اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے اُن کی موت پر یہ نظم کہی تھی۔ اگر ابن صفی کا کوئی آئیڈیل ہوتا تو وہ یقیناً قائداعظم ہوتے، جن کی بعض عادتیں ان کے پسندیدہ کردار 'فریدی' سے ملتی جلتی تھیں۔ قائداعظم بھی فریدی کی طرح قانون کا احترام کرتے تھے، غریبوں اور مظلوموں کی مدد کرتے تھے اور لباس، سواری، کھانے پینے اور رکھ رکھاؤ کے معاملات میں بڑے نفاست پسند تھے۔

۱۹۴۸ء میں اے ایچ وھیلر اینڈ کمپنی کے جنرل مینیجر اور مشہور ادیب سیّد حسین حیدر کے صاحب زادے عباس حسینی نے جب الٰہ آباد سے ماہ نامہ 'نکہت' نکالا تو اس رسالے کے ابتدائی ارکان ادارت میں ابن صفی بھی شامل تھے، جو رسالے کے شعری حصّے کے مدیر بنائے گئے۔ دیگر ارکان میں ڈاکٹر مجاور حسین (ابن سعید)، شکیل جمالی، راہی معصوم رضا، اشتیاق حیدر، قمر جائسی، نازش پرتاب گڑھی وغیرہ شامل تھے۔ اس رسالے کے لیے ابن صفی نے تجرباتی طور پر 'طغرل فرغان' اور 'سنکی سولجر' کے نام سے طنز و مزاح پر مشتمل مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ جون ۱۹۴۸ء میں 'نکہت' میں ان کی پہلی کہانی 'فرار' شائع ہوئی۔ بعدازاں، وہ جاسوسی ادب کی جانب متوجہ ہوئے۔

جاسوسی ناول نگاری کی شروعات کیسے ہوئی؟

اپنے ناول 'لاشوں کا بازار' میں ابن صفی اپنی ناول نگاری کی شروعات کے بارے میں لکھتے ہیں، 'اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمیوں کی محفل میں کتابوں اور مصنفوں کی مقبولیت کے بارے میں بحث چھڑ گئی، ایک صاحب بولے کہ جنسی لٹریچر کے علاوہ کسی کی

مارکیٹ نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ بس اُسی دن سے دھن سوار ہوگئی کہ جنسی لٹریچر کے سیلاب کو روکنا چاہیے، چناں چہ 'جاسوسی دنیا' کی داغ بیل ڈال دی۔'

'جاسوسی دنیا' کا پہلا ناول 'دلیر مجرم' مارچ ۱۹۵۲ء میں 'نکہت' میں شائع ہُوا۔ ان ہی دنوں انھوں نے اپنا نیا قلمی نام اپنے والد صفی اللہ کے نام پر ابن صفی رکھ لیا۔

اس ناول کی اشاعت سے پہلے اُردو کے جاسوسی ادب کا قاری صرف تیرتھ رام فیروز پوری کے مغربی ناولوں کے اُردو تراجم یا ظفر عمر کے چند ناولوں سے بہلا کرتا تھا۔ ظفر عمر نے فرانسیسی ناول نگار میورس لیبلانک (Maurice Leblanc) کے ناولوں کو ہندوستانی ماحول میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لحاظ سے ابن صفی کو بجا طور پر اُردو کا پہلا جاسوسی ناول نگار کہا جا سکتا ہے، جس کے ناول کے کردار اُن کے اپنے تخلیق کردہ تھے۔

اگرچہ ابن صفی نے بھی 'جاسوسی دنیا' کے ابتدائی پانچ ناول دلیر مجرم، پراسرار اجنبی، رقاصہ کا قتل، ہیرے کی کان اور خونی پتھر کا مرکزی خیال مغربی ادب سے مستعار لیا تھا، جب کے کہانی کے کردار اور مکالمے اُن کے اپنے تھے۔ ان کے ناول 'خوفناک ہنگامے' کا پروفیسر درانی، 'پہاڑوں کی ملکہ' کی سفید رانی اور 'گوریلا' جیسے چند کرداروں کے علاوہ ابن صفی کے ناولوں کے دیگر کردار اور مرکزی خیال اُن کے اپنے زرخیز ذہن کی پیداوار تھے۔ اس راز سے پردہ کسی ادبی نقاد نے نہیں اُٹھایا، بل کہ ابن صفی نے خود جاسوسی دنیا کے پلاٹنیم نمبر 'زمین کے بادل' کے پیش لفظ میں ایمان داری سے اس بات کا اقرار کیا۔ یہ ناول ۱۹۵۸ء میں شائع ہُوا تھا۔

دل کش اور سحر انگیز انداز بیان سے عبارت 'دلیر مجرم' نے اُردو کے جاسوسی ادب کے قارئین کو چونکا دیا۔ اس ناول کا مرکزی خیال وکٹر گن (Victor Gunn) کے ناول 'آئرن سائڈس لون ہینڈ' (Ironside's Lone Hand) سے لیا گیا تھا۔ ناول کی مقبولیت کے بعد ابن صفی نے مُڑ کر نہ دیکھا۔ اس فسوں گر کے قلم سے ایک سے بڑھ کر ایک شاہ کار تخلیق ہوتا چلا گیا۔ ہر نیا ناول ابن صفی سے خوب سے خوب تر کا تقاضا کرنے لگا۔ چناں چہ انھوں نے اپنی جاسوسی ناول نگاری سے پورا پورا انصاف کرنے کے لیے شاعری کو خیر باد کہہ دیا۔ طنزیہ کالموں کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا۔ اس وقت ابن صفی کے ناول کی قیمت نو آنے ہوا کرتی تھی۔ ناول کے سرورق مصطفی مرزا، دیپک، مشیر صدیقی، شیلے آرٹسٹ، ولایت احمد اور صدیقی آرٹسٹ ڈیزائن کیا کرتے تھے۔

پاکستان کی جانب ہجرت

انڈیا میں ۱۹۵۲ء میں تلنگانہ تحریک زور پکڑ چکی تھی، چناں چہ ترقی پسندوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ ابن صفی کا اُٹھنا بیٹھنا ترقی پسندوں کے ساتھ تھا، چناں چہ ان کے نام کا وارنٹ گرفتاری بھی نکل آیا۔ ان کے دوستوں نے انھیں خفیہ طور پر الٰہ آباد سے بمبئی پہنچایا اور پھر وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے پاکستان روانہ کر دیا۔ ان کی والدہ اور چھوٹی بہن بھی اس سفر میں ان کے ہم راہ تھیں۔ ابن صفی کی پاکستان ہجرت سے قبل ان کے والد کا کراچی تبادلہ ہوگیا تھا، اس لیے وہ ان سے پہلے ہی پاکستان آ گئے تھے اور کراچی میں واقع ایک کمپنی کے وئیر ہاؤس میں بہ طور انچارج تعینات تھے۔

کراچی آنے کے بعد ابن صفی نے لالوکھیت (موجودہ لیاقت آباد) کے سی ون علاقے میں رہائش اختیار کی۔ اُن کی اہلیہ اُم سلمیٰ خاتون کے والدین محمد امین احسن اور ریاض فاطمہ بیگم کا انتقال اُن کے بچپن میں ہوگیا تھا اور اُن کی پرورش اُن کے پھوپھا ظہیر احسن نے کی تھی، جو فوج میں اکاؤنٹینٹ تھے اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد راول پنڈی ہجرت کر کے جی ایچ کیو میں تعینات ہوگئے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں ابن صفی کی اُم سلمیٰ سے دوسری شادی ہوئی، جو راول پنڈی میں انجام پائی۔ ان کی پہلی شادی انڈیا میں اُم سلمیٰ کی خالہ زاد بہن فرحت خاتون سے ہوئی تھی، جن کا شادی کے کچھ عرصے بعد انتقال ہوگیا تھا۔ اُم سلمیٰ سے ابن صفی کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔

’عمران‘ کا معرکہ آرا کردار تخلیق کیا

جاسوسی ناول نگاری میں اکرم الٰہ آبادی، اظہار اثر اور مسعود جاوید، ابن صفی کے ہم عصر تھے۔ یہ تینوں افراد ابن صفی کے آگے زیادہ عرصہ نہ ٹھہر سکے۔ ہجرت کے تین سال بعد ستائیس سالہ ابن صفی کی شہرت کا ڈنکا چارسُو بجنے لگا تھا۔ ان دنوں جاسوسی دنیا کی ’شعلہ سیریز‘ نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے ’عمران‘ کا معرکہ آرا کردار تخلیق کیا۔ عمران سیریز کا پہلا ناول ’خوفناک عمارت‘ اگست ۱۹۵۵ء میں شائع ہُوا۔

عمران کا کردار جاسوسی دنیا کے کرنل فریدی سے بالکل مختلف تھا۔ وجیہہ عمران کے چہرے پر ہمہ وقت حماقتوں کے ڈونگرے برستے رہتے ہیں اور وہ خود کو ’احمق اعظم‘ کہلوانا پسند کرتا ہے، لیکن جب یہی عمران خاص مواقع پر اپنی جُون بدلتا ہے تو اُس کے ساتھی بھی اس کے چہرے کی سنجیدگی دیکھ کر کانپ جاتے ہیں۔ عمران جیسا اچھوتا کردار ایشیا تو کیا، مغرب کے کسی ادیب سے بھی آج تک تخلیق نہیں ہوسکا۔

اکتوبر ۱۹۵۷ء میں ابن صفی نے لالوکھیت میں اپنے اشاعتی ادارے ’اسرار پبلی کیشنز‘ کی بنیاد رکھی۔ اس ادارے سے جو پہلا ناول شائع ہوا وہ جاسوسی دنیا کا ’ٹھنڈی آگ‘ تھا۔

ناول کے ہیروز کی طرح، وِلنوں نے بھی خاص شہرت پائی

ابن صفی کے ناول کے ہیرو کی طرح ان کے تخلیق کردہ ویلینوں نے بھی خاص شہرت پائی، ان میں ’سنگ ہی‘ کا کردار جاسوسی ادب پڑھنے والوں کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ابن صفی نے اسے پہلی بار اپنے ناول ’نیلی لکیر‘ میں متعارف کروایا اور پھر وہ جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے متعدد ناولوں میں سامنے آتا رہا۔ بام مچھلی کی طرح لمبا چینی باشندہ، جو آکٹوپس کی طرح اپنے مخالف کے جسم سے لپٹ کر اُس کا دَم گھونٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور بندروں کی طرح اُچھل کود کر کے خود کو گولیوں کی زد سے بچانے کا ماہر ہے۔ ابن صفی کے تخلیق کردہ دیگر ویلینوں میں تھریسا بمبل بی آف بوہیمیا پہلی بار ’کالے چراغ‘ میں متعارف ہوئی۔ اس کے علاوہ دیگر ویلینوں میں ڈاکٹر ڈریڈ، فنچ، بوغا، ہیمبرگ دی گریٹ، ناتوتہ، گیراڈ شاستری اور قلندر بیابانی نے خاص شہرت پائی۔

ناولوں کے انگریزی تراجم

عمران سیریز کے ناول 'خوفناک عمارت' کو ہندوستان کے ایک مشہور اشاعتی ادارے 'رینڈم ہاؤس' نے ۲۰۱۱ء میں The House of Fear کے عنوان سے انگریزی میں شائع کیا، جس کا ترجمہ پاکستانی مصنف بلال تنویر نے کیا تھا۔

انڈیا کے بلافٹ پبلی کیشنز کے مدیر راجیش کھنہ نے بھی ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے چار ناول جو 'ڈاکٹر ڈریڈ' کے نام سے مشہور ہے، انگریزی میں شائع کیے گئے۔ ان ناولوں کے تراجم انڈیا کے نام ور ادیب شمس الرحمٰن فاروقی نے کیے ہیں۔

ناول کا نام دو سالہ بھانجی کے مشورے پر رکھا

ابن صفی اپنے ناول کے نام خود تجویز کیا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کسی سے مشورہ نہیں کرتے تھے۔ تاہم انھوں نے عمران سیریز کے چوالیسویں ناول کا نام اپنی دو سالہ بھانجی کے مشورے پر رکھا تھا۔ ہُوا یہ کہ ایک دن ابن صفی کی بہن نے اُن سے پوچھا کہ آپ اپنے نئے ناول کا نام کیا رکھیں گے؟ ابن صفی نے اپنی گود میں بیٹھی بھانجی سے پوچھا کہ کیا نام رکھا جائے؟ بچی کے منہ سے چند بے معنی الفاظ ادا ہوئے، 'لوبولی لا' یہ سُن کر ابن صفی فوراً بولے، 'بس میرے نئے ناول کا نام یہی ہوگا، لوبولی لا'

عالمی سیاست پر گہری نظر، آنے والے واقعات میں حیرت انگیز مماثلت

ابن صفی اپنے ناولوں میں جاسوسی کے ساتھ قاری کو معاشرتی بُرائیوں سے آگاہ کرتے اور عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً عمران سیریز کے ناول 'زیبرا مین' کا اقتباس ہے:

'لیکن اس ملک (تنزانیہ) کے لوگ تو برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں۔' شیپرڈ نے کہا۔

'ٹھیک ہے، لیکن اب یہ لوگ اتنے بھولے بھی نہیں کہ متبادل دام کو نہ پہچان سکے۔ وہ جانتے ہیں کہ اب ان پر اقتصادی امداد کا جال پھینکا گیا ہے۔ اپنے سرمائے کی زنجیروں میں انھیں جکڑنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔' عمران نے کہا۔

عمران سیریز کے ناول 'آدھا تیتر' اور 'آدھا بٹیر' میں ۲۰۱۱ء میں دو پاکستانیوں کے قتل میں ملوث ریمنڈ ڈیوس سے ملتا جلتا کردار (ڈاؤڈن) نظر آتا ہے اور نیپال کے ولی عہد کے ہاتھوں ۲۰۰۱ء میں شاہی خاندان کے افراد کے قتل جیسے واقعے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عمران سیریز 'تین سنکی' ناولوں میں امریکا کا لوگوں کو قیدی بنا کر گوانتا ناموبے پہنچانے جیسی صورتِ حال نظر آتی ہے۔

ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کی نفی

ابن صفی نے محض ذہنی عیاشی یا وقت گزاری کے لیے جاسوسی ادب نہیں لکھا، انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے معاشرے میں پھیلی توہم پرستی کو بھی ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ عمران سیریز کے ناول 'خطرناک ڈھلان' میں لکھتے ہیں، 'تنگ نظری، توہم پرستی اور

قدامت پرستی سے پیچھا چھڑائے بغیر بقیہ دنیا کے ساتھ نہیں چل سکو گے۔'

ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے بعض ناولوں میں کرنل فریدی ایسے پراسرار واقعات سے پردہ اُٹھاتے ہوئے اس کی کوئی نہ کوئی سائنسی توجیہ پیش کرتا ہے یا اُس کے پیچھے چھپے اصل حقائق سے آگاہ کرتا ہے، جسے لوگوں نے آسیب یا اس قسم کے دوسرے ناموں سے منسوب کر رکھا ہوتا ہے۔ اس طرح ابن صفی اپنے قاری کے اندر توہم پرستی کے خلاف سائنٹیفک اندازِ فکر کی تحریک پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ جاسوسی دنیا کے ناول چیختے دریچے، پراسرار کنواں، عجیب آوازیں، آتشی پرندہ اور برف کے بھوت وغیرہ میں ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی کی نفی کی گئی ہے۔

ابن صفی کے ہیروز شراب و شباب سے کوسوں دُور

عام طور پر جاسوسی ناول کا ذکر سُنتے ہی ذہن میں شراب اور شباب کا تصور اُبھرنے لگتا ہے، کہانی کا ہیرو جیمز بانڈ کی طرح مہ جبینوں میں گھرا جام لنڈھاتا دکھائی دیتا ہے۔ ابن صفی کے ناول کے ہیرو اس قسم کی عیاشیوں سے قطعی 'محروم' نظر آتے ہیں۔ اپنے ناول 'لاشوں کا بازار' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں، 'نہ میں افلاطونی عشق کا قائل ہوں اور نہ جنسی بے راہ روی کا، لہٰذا میرے ناولوں سے نہ لیلیٰ مجنوں کی کہانیاں ملتی ہیں اور نہ کسی ڈان ژوان کی داستان۔'

ابن صفی کے ناولوں میں جاسوسی کے اسرار و رموز کے ساتھ فلسفہ، نفسیات، اخلاقیات اور حب الوطنی کے حوالے جا بہ جا ملتے ہیں۔ چناں چہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ابن صفی نے اپنے ناول کے ذریعے نوجوان نسل کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کی۔

اُردو زبان کی جرمن اسکالر ڈاکٹر کرسٹینا آئسٹر ہیلڈ ابن صفی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں، 'ابن صفی کی جس بات سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوئی، وہ یہ ہے کہ ان کے کردار فریدی اور عمران، کبھی کسی عورت کی جانب نگاہ بد پھیرتے دکھائی نہیں دیتے۔ ان کے جاسوسی ناولوں کو محض تفریحی ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ان کے ناولوں میں فکری اور ذہنی تربیت بھی پوری طرح موجود ہوتی ہے۔'

ابن صفی نے اپنے بعض ناولوں میں سیاسی نظریات سے بحث کرتے ہوئے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ناول 'دھواں ہوئی دیوار' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں، 'اسلام کے علاوہ کوئی ازم حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا، لیکن اس کے لیے انفرادی طور پر ایمان دار بننا پڑے گا، جو بے حد مشکل کام ہے۔'

ابن صفی اپنی تحریر میں مولویوں سے بھی شاکی نظر آتے ہیں۔ انھیں اس بات کا دکھ ہے کہ مذہبی راہ نما قوم کی راہ نمائی کرنے کی بہ جائے اپنا الّو سیدھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ناول 'کالی کہکشاں' کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

'کیا تمھارے پیغمبر کا پیغام یہاں تک نہیں پہنچا؟'

'پیغام پہنچانے والوں کو زیادہ تر اپنی پوجا کرانے کی فکر رہتی ہے، اس لیے وہ صرف اختلافی مسائل پر ایک دوسرے کو للکارتے رہتے ہیں۔'

محدود وسائل کے باوجود درست جغرافیائی معلومات

ابن صفی مغرب کے جاسوسی ناول نگاروں کے مقابلے میں زیادہ وسائل نہیں رکھتے تھے، نہ ملکوں ملکوں سیر و تفریح کی 'عیاشی' کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود اُن کے ناولوں میں جغرافیہ سے متعلق درست معلومات ملتی ہیں۔ جیمز بانڈ ڈبل او سیون کے خالق این فلیمنگ صحافی اور نیول انٹیلی جنس بھی تھے، انھوں نے دوسری جنگ عظیم میں بھی حصہ لیا تھا، اس لحاظ سے ان کے پاس جیمز بانڈ کا کردار تخلیق کرنے کے لیے وسیع مشاہدہ اور تجربہ موجود تھا۔

ایک اور برطانوی جاسوسی ناول نگار John Le Carre پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں برطانیہ کی خفیہ ایجنسیوں MI-5 اور MI-6 کے لیے کام کرتے تھے۔ چناں چہ وہ بھی جاسوسی نیٹ ورک سے متعلق وسیع تر معلومات اور جاسوسی کے اسرار و رموز سے واقفیت کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر جاسوسی ناول نویسی کے میدان میں اُترے اور کام یابی کے جھنڈے گاڑتے چلے گئے۔ جان لی اپنے تیسرے ناول کی مقبولیت کے بعد خفیہ اداروں سے ریٹائرمنٹ لے کر کُل وقتی جاسوسی ناول نگار بن گئے تھے۔

ایک اور برطانوی ناول نگار رائیڈر ہیگرڈ نے اگرچہ جاسوسی ادب نہیں لکھا، لیکن نوآبادیاتی دور میں وہ چھے برس تک سرکاری آفیسر کے طور پر جنوبی افریقا کے مختلف شہروں میں تعینات رہے، چناں چہ ان کے ناولوں میں زیادہ تر افریقا سے متعلق ان کے تجربات کا عکس جھلکتا ہے۔ اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر وہ فکشن میں 'گم شدہ دنیاؤں' جیسی مقبول طرز تخلیق کرنے میں کام یاب رہے۔

ابن صفی کا معاملہ ان ناول نگاروں سے بالکل برعکس ہے۔ انھوں نے ساری زندگی سوائے پاکستان ہجرت کرنے کے کسی اور ملک کا سفر نہیں کیا اور نہ ہی وہ پولیس یا کسی خفیہ ادارے سے وابستہ رہے۔ اس کے باوجود ان کے ناولوں میں جاسوسی کی نت نئی تکنیکیں اور جغرافیہ سے متعلق معلومات پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ اُن کی ساری زندگی ان ہی صحراؤں کی خاک چھانتے گزری ہو۔ ان کے ناول ظلمات کا دیوتا، زمین کے بادل، ہلاکت خیز، زیبرا مین، شوگر بینک، بمبوکیسل اور برف کے بھوت جاسوسی کے ساتھ مہم جوئی کے شاہ کار ہیں۔ معلومات حاصل کرنے کے جدید ذرائع کی عدم موجودگی اور جہاں گردی کیے بغیر ابن صفی ساری معلومات کہاں سے حاصل کرتے تھے؟ ابن صفی کی بیٹی نزہت سلمان کا ایک جملہ اس سوال کی وضاحت کے لیے کافی ہے:

> ابّو کو ہر قسم کے مطالعے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور ہمارے گھر میں کتابیں ہی کتابیں نظر آیا کرتی تھیں۔

ابن صفی کا گھر کسی لائبریری سے کم نہ تھا، وہ اکثر نئی یا پرانی کتابوں کے بازار کا چکر لگایا کرتے اور جو کتاب انھیں دل چسپ لگتی، اُسے خرید لیا کرتے تھے۔ موسیقی کی باریکیاں، نفسیات کی پیچیدگیاں اور فلسفے کے مسائل سے لے کر سانپوں اور کتّوں کی نسلوں کے بارے میں معلوماتی کُتب تک اُن کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ ان کے ناولوں میں اکثر ان چیزوں کے حوالے ملتے ہیں۔

سائنس سے متعلق اگر کوئی چیز پوچھنی ہوتی تو اپنے بیٹوں سے بلا جھجک پوچھ لیا کرتے تھے، جو ان دنوں سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں وہ کراچی میں واقع مختلف سفارت خانوں سے بھی رابطے میں رہتے تھے اور انھیں خطوط لکھ کر

ان ممالک سے متعلق معلوماتی کتابیں منگواتے رہتے تھے۔ وہ تحقیق کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ۱۹۷۶ء میں ابن صفی Shout at the Devil صرف اس لیے سنیما دیکھنے گئے کہ یہ فلم تنزانیہ پر بنی تھی اور ان دنوں وہ عمران سیریز کا ناول 'ہلاکت خیز' لکھ رہے تھے، جس کی کہانی تنزانیہ سے متعلق تھی۔ اس ناول میں تنزانیہ کے شہر موانزا، اروشاہ، قصبہ کی گوما، سیرنگیٹی نیشنل پارک، گریٹ رفٹ ویلی، جھیل ٹانگانیکا اور کلیمنجارو پہاڑ کا ذکر ملتا ہے۔ ابن صفی کہانی کے پلاٹ کی طرح جغرافیہ کو بھی اہمیت دیتے تھے اور کسی جگہ سے متعلق پوری تحقیق کے بعد اس پر قلم اُٹھاتے تھے۔ اس بات کا ایک اور ثبوت ان کے عمران سیریز کے ناول آپریشن ڈبل کراس، خیر اندیش، پوائنٹ نمبر بارہ اور ایڈلاوا ہیں، جن میں اٹلی کے مشہور شہروں، سڑکوں، جھیلوں اور دیگر جگہوں کا ذکر ملتا ہے۔

ابن صفی کے کردار سُپر ہیروز کے بجائے عام انسان ہیں

ابن صفی نے اپنے کرداروں کو پیش کرتے وقت کبھی مبالغے سے کام نہیں لیا۔ گولی اور خنجر کے گھاؤ سے جس طرح عام انسانوں کو تکلیف ہوتی ہے، اسی طرح ان کے ہیرو بھی اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کرداروں کو کبھی اتنا بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا کہ اُن پر سُپر مین یا اسپائڈر مین کا گمان ہونے لگے۔ یہاں ابن صفی کے دو ناول 'ڈاکٹر دُعاگو' اور 'پہاڑوں کے پیچھے' کا حوالہ دینا بے جا نہ ہوگا۔

'ڈاکٹر دُعاگو' میں عمران کو بازو میں گولی لگنے کے بعد چکر سا آجاتا ہے اور اُسے علاج کی غرض سے اسپتال میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ ناول کے اختتام تک عمران کو گولی لگنے کی تکلیف کو وقفے وقفے سے بیان کیا گیا ہے۔ پہاڑوں کے پیچھے نامی ناول میں عمران ایک خاندان کے افراد کو متاثر کرنے کے لیے جھیل میں کود کر ہاتھ سے زندہ مچھلی پکڑنے کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ واقعہ بہ ظاہر محیرالعقل لگتا ہے، لیکن آگے چل کر عمران اپنے باڈی گارڈ جوزف سے اس واقعے کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اُس نے رات کو ہی بازار سے زندہ مچھلیاں خرید کر اُسے جھیل کی تہ میں قید کر دیا تھا اور ان لوگوں کی فرمائش پر تہ نشین جال سے ایک ایک مچھلی نکال کر پیش کر دیا کرتا تھا۔

ریمنڈ بُور: ابن صفی کے کردار 'فریدی' کے سراپے پر پورا اترنے والا اداکار

ابن صفی کے جاسوسی ناول کے کرداروں پر صرف ایک فلم 'دھاکا' بنائی گئی، لیکن اس میں بھی انھوں نے صرف ظفر الملک اور جیمسن کے کرداروں کو فلمانے کی اجازت دی تھی۔ ابن صفی نہیں چاہتے تھے کہ ان کے کردار فریدی اور عمران کو کسی اداکار پر فلمایا جائے۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر کوئی اداکار ان کرداروں پر پورا نہ اُتر سکا تو ان کے لاکھوں قارئین کو دلی صدمہ ہوگا، جنھوں نے اپنے ذہنوں میں فریدی اور عمران کے سراپے کے الگ الگ تصورات باندھ رکھے ہیں۔ تاہم انھوں نے ایک بار اپنے بیٹے احمد صفی سے کہا تھا کہ انھیں ایسا لگتا ہے کہ فریدی کا جو تصور ان کے ذہن میں ہے اُس پر امریکن ٹی وی ڈراما آرٹسٹ ریمنڈ بُور (Raymond Burr) کا سراپا پورا اُترتا ہے۔ خاص طور پر اس کی ٹی وی سیریز 'پیری میسن' (perry Mason) میں وہ بالکل فریدی لگتا ہے۔

شاہد منصور کی ابن صفی سے متعلق دل چسپ یادیں

شاہد منصور (وفات اپریل ۲۰۲۰ء) ابن صفی کے دیرینہ دوست تھے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کر کے لالوکھیت میں رہائش اختیار کی تھی، اُس وقت یہاں نہ پکی سڑک تھی اور نہ پانی بجلی کی کوئی سہولت موجود تھی۔ صدر سے تین ہٹی پہنچنے کے بعد ندی میں اُتر کر لالوکھیت آنا پڑتا تھا۔ لیاقت آباد پولیس اسٹیشن کے قریب ایک میدان تھا، جہاں 'ادریس ہوٹل' کے نام سے ایک نیا ہوٹل کھلا تھا۔ اس ہوٹل میں ہمہ وقت بیٹری سے چلنے والا ایک بڑا ریڈیو رکھا ہوتا، لوگ گانے اور خبریں سُننے کے لالچ میں وہاں چائے پینے آیا کرتے تھے۔ شاہد منصور کی ابن صفی کے ساتھ پہلی ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی تھی۔

اس ملاقات کا احوال انھوں نے راقم کو انٹرویو دیتے ہوئے سُنایا:

> میری ابن صفی کی پہلی ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی، ادریس ہوٹل کی میز، ابن صفی، پروفیسر محمد علی اور مصطفی زیدی کے لیے مخصوص ہُوا کرتی تھی۔ یہ حضرات ہر شام یہاں جمع ہوتے اور ادبی مسائل پر گفت گو کرتے تھے۔ میں دوسری میز پر بیٹھا بڑی دل چسپی سے اُن کی باتیں سُنتا تھا۔ اُس زمانے میں منٹو نے میرا جی پر ایک مضمون لکھا تھا، اُس دن وہ لوگ میرا جی کے بارے میں جو باتیں کر رہے تھے، میرے خیال میں وہ غلط تھیں، چناں چہ میں اُن کے پاس گیا اور کہا کہ میرا جی سے متعلق صحیح بات یہ ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ وہ لوگ خاموشی سے اُٹھے اور چلے گئے۔ اُس کے بعد وہ تینوں، دو تین دن تک نظر نہیں آئے۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ لوگ مجھے سی آئی ڈی والا سمجھ بیٹھے تھے۔ چوں کہ اُن دنوں میرے پاس سی آئی ڈی والوں کی خاص نشانی 'کالا ڈنڈا' ہُوا کرتا تھا جو میں کتوں کو اپنے سے دُور رکھنے کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ حکومت کی طرف سے اُن دنوں ترقی پسندوں پر سخت نظر رکھی جا رہی تھی، اس لیے ابن صفی اور دیگر احباب یہ سمجھے کہ میں اُن پر نظر رکھنے کے لیے وہاں بیٹھتا ہوں۔ بعد میں ان کی غلط فہمی دُور ہوئی اور میرا ابن صفی کے یہاں آنا جانا شروع ہوا۔

شاہد منصور نے اس انٹرویو میں ایک دل چسپ انکشاف کرتے ہوئے کہا:

> ایک دن مجھے گمان ہُوا کہ جاسوسی دنیا کا کردار 'قاسم' میں ہی ہوں۔ جب میں نے اس بات کا اظہار ابن صفی سے کیا تو وہ بہت ہنسے اور پوچھا کہ تم نے کیسے پکڑا، میں نے اس کردار کو اتنا مختلف کر دیا تھا کہ کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میرے بعض جُملے تم نے قاسم کے منہ سے کہلوا دیے ہیں۔

ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھیں

ابن صفی نے ریڈیو اور ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھیں۔ ریڈیو پاکستان نے ایک قسط وار جاسوسی کھیل 'آوازوں کا جال' ان

سے لکھوایا تھا۔ اس کھیل میں فریدی کے بہ جائے صرف حمید کا کردار پیش کیا گیا تھا، بدقسمتی سے اس ڈرامے کا اسکرپٹ ریڈیو پاکستان کے پاس محفوظ نہیں رہا۔ ڈراما آرٹسٹ ایس ایم سلیم، جنھوں نے پی ٹی وی کے منٹو راما میں سعادت حسن منٹو کا کردار ادا کیا تھا، اس کھیل میں حمید بنے تھے۔ ۱۹۷۷ء میں پی ٹی وی نے الیکشن نشریات کے لیے ابن صفی سے عمران سیریز پر مبنی ڈراما سیریل 'ڈاکٹر دُعا گو' لکھوایا، ابن صفی کا اصرار تھا کہ عمران کا کردار محمد قوی خان سے کروایا جائے اور اس کی ڈرامائی تشکیل حمید کاشمیری کرے۔ چناں چہ ایسا ہی ہُوا۔ اس ڈرامے کے پروڈیوسر فیاص ہاشمی تھے۔ تاہم یہ ڈراما ٹی وی پر کبھی نشر نہ ہوسکا۔ ابن صفی نے اس بات پر ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے اخبار میں ایک خط شائع کروایا تھا، جس میں انھوں نے پی ٹی وی کے بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ اس ڈرامے کی چھے اقساط لکھنے پر انھیں ۲۰۷۳ روپے کا چیک ملا تھا۔

ڈرامے کو ٹی وی پر نشر نہ کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے احمد صفی نے راقم کو بتایا:

> ڈرامے میں پی ٹی وی والوں نے تھوڑا سا سیاسی رنگ شامل کر دیا تھا اور ڈرامے کے کچھ ڈائیلاگ حکومت کی حمایت میں کہلوائے گئے تھے۔ جب انتخابات قریب آئے تو پی ٹی وی کے اسٹاف کو لگا کہ شاید انتخابات میں موجودہ حکومت کام یاب نہ ہوسکے، چناں چہ انھوں نے یہ ڈراما نشر نہیں ہونے دیا۔

مصوری، موسیقی اور فلم کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے

ابن صفی کو ہر طرح کے مطالعے کا شوق تھا۔ وہ اگاتھا کرسٹی، جیمز ہیڈلے چیز، الیسٹر میکلین اور انگریزی مزاح نگاہ اسٹیفن لیکاک کو شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اُردو شعرا میں انھیں میر تقی میر، میرا جی اور فیض احمد فیض سے خاص لگاؤ تھا۔ موسیقی میں روشن آراء بیگم، طلعت محمود، حبیب ولی محمد اور مہدی حسن کی گائی غزلیں پسند تھیں۔

ناول نگاری کے علاوہ وہ ایک اچھے مصور بھی تھے۔ اور ستار بجانے کا شوق رکھتے تھے۔ وہ اپنے ناولوں کے مسودات کے کونے پر منٹوں میں بڑا خوب صورت اسکیچ بنا دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کچھ عرصہ ستار بجانے کی مشق بھی کی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے باقاعدہ ستار خرید کر ایک ستار نواز کی خدمات بھی حاصل کی تھیں تاہم، کچھ عرصے بعد انھیں احساس ہوا کہ یہ کام اُن کے بس کا نہیں ہے۔

ابن صفی کو انگریزی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ان کی سنیما بینی سے متعلق اُن کے دوست شاہد منصور کہتے تھے کہ ابن صفی نے فلم 'بن حرُ' دیکھنے کی فرمائش کی تھی، وہ فلم انھیں بہت اچھی لگی تھی۔ ایک بار وہ اُن کے ساتھ پنجابی فلم دیکھنے گئے، جب ہیروئن نے کھیت میں اچھل اچھل کر گانا شروع کیا تو ابن صفی بہت محظوظ ہوئے۔ فلم 'ڈریکولا' میں عبیداللہ علیم بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ فلم اتنی بور تھی کہ تینوں، آدھی فلم دیکھنے کے بعد گھر آ گئے۔

ابن صفی کی بیماری اور جعلی 'صفیوں' کی چاندی

ابن صفی لالو کھیت کے مکان میں ۵۷۔ ۱۹۵۳ء تک قیام پزیر رہے، اس کے بعد وہ ناظم آباد دو نمبر منتقل ہوگئے۔ انھوں نے

اپنی زندگی کے آخری دن اسی مکان میں گزارے۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے ماہ نامہ 'جاسوسی دنیا' نکالا۔ ابھی اس میگزین کے چار ایڈیشن شائع ہوئے تھے کہ کام کی زیادتی کے باعث ان پر شیزوفیرینیا کا حملہ ہُوا۔ اس بیماری میں وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے۔ گھر کے دالان میں ٹہلتے رہتے یا خاموش بیٹھے رہتے، مخاطب کرنے پر انتہائی مختصر جواب دیتے۔ ان کی یہ ذہنی کیفیت تین سال برقرار رہی اور اس عرصے میں وہ کچھ نہ لکھ سکے۔

ان کی بیماری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انڈیا اور پاکستان کے متعدد ناول نگاروں نے کرنل فریدی اور عمران کے کرداروں پر شب خون مارا اور بازار میں جعلی 'صفیوں' کی لائن لگ گئی۔ عوام کو دھوکا دینے کے لیے کوئی 'این صفی' کے نام سے لکھ کر، این میں موجود ایک نقطے کو انتہائی باریک اور دوسرے کو واضح لکھ کر اُسے 'ابن' دکھانے کی بے ڈھنگی کوششوں میں لگا تھا تو کوئی صاحبہ 'نجمہ صفی' کے نام سے عمران سیریز لکھ کر ابن صفی سے ابھی قریبی رشتہ داری ظاہر کرنے کی کوشش فرما رہی تھیں۔ غرض کرنل فریدی اور عمران کے کردار کی وہ مٹی پلید کی گئی کہ انھیں شرابی اور عورتوں کے پیچھے بھاگنے والا 'لوفر' بنا کر ہی چھوڑا۔

یہ طوفان بدتمیزی تین سال جاری رہنے کے بعد اُس وقت تھما، جب ابن صفی رو بہ صحت ہو کر پھر سے اپنے قلم کا جادو جگانے لگے۔ سورج طلوع ہوتے ہی 'اندھیرے' چھٹتے چلے گئے۔ ابن صفی کی صحت یابی کے بعد ۲۵ نومبر ۱۹۶۳ء کو عمران سیریز کا ناول 'ڈیڑھ متوالے' شائع ہوا۔ تین برس کے پیاسے دیوانہ وار ناول پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ناول کی ساری کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ ہندوستان میں اس ناول کی تقریبِ رونمائی کی صدارت اُس وقت کے وزیرِ داخلہ لال بہادر شاستری نے کی تھی۔ انڈیا میں اس ناول کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کی اشاعت کے ایک ہفتے بعد ہی اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ دوسری تقریب رونمائی کے مہمان خصوصی انڈیا کے صوبائی وزیر قانون علی ظہیر تھے، ڈیڑھ متوالے کے دیباچے میں ابن صفی ایک طرف جعلی ابن صفیوں کا رونا روتے نظر آتے ہیں تو دوسری طرف حکیم محمد اقبال حسین کا شکریہ ادا کرتے ہیں، جن کے علاج سے وہ صحت یاب ہوئے تھے۔

ابن صفی کے ناول پر بننے والی فلم کی رُوداد

فلم ساز محمد حسین ٹالپر جو 'مولانا ہپی' کے نام سے مشہور تھے، انھیں عمران سیریز پر فلم 'دھماکا' بنانے کا خیال آیا۔ ابن صفی نے اپنے ناول کے کردار عمران اور اس کی پوری ٹیم کو فلمانے سے معذرت ظاہر کی، البتہ عمران سیریز کے دو کردار ظفرالملک اور جیمسن کو فلمانے پر راضی ہوگئے۔ فلم 'دھماکا' کی کہانی ابن صفی کے ناول 'بے باکوں کی تلاش' پر مبنی تھی۔ یہ جاوید شیخ کی پہلی فلم تھی، جو اُس وقت جاوید اقبال کہلاتے تھے۔ اس فلم میں انھوں نے ظفرالملک کا کردار نبھایا تھا، جب کہ مولانا ہپی نے جیمسن اور اداکارہ شبنم نے صبیحہ کا کردار ادا کیا تھا۔ اداکار رحمان کی بہ طور ولن یہ پہلی فلم تھی۔ دیگر فن کاروں میں لہری، تمنّا، قربان جیلانی، عرش منیر اور نینی شامل تھے۔ دھماکا کے چند گیت ابن صفی نے خود لکھے تھے۔ فلم کے ہدایت کار قمر زیدی اور پروڈیوسر مولانا ہپی تھے۔ اس کی موسیقی لعل محمد اقبال نے دی تھی۔ اس فلم میں ایکس ٹو کی پراسرار آواز کے لیے ابن صفی نے خود اپنی آواز ریکارڈ کروائی تھی۔

دھماکا ۲۹ دسمبر ۱۹۷۴ء کو ریلیز ہوئی اور ناکام فلم ثابت ہوئی۔ اس کی ناکامی کی بہت سے وجوہ بیان کی گئیں۔ ابن صفی کے

نزدیک اس کی سب سے اہم وجہ مولانا ہی کا فلم کو جلد از جلد ریلیز کرنا تھا۔عبدالاضحیٰ قریب تھی اور سارے ڈسٹری بیوٹرز اس موقع پر مشہور ہیروز کی نئی فلمیں ریلیز کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ مولانا ہی نے بہ طور ڈسٹری بیوٹر خود کو رجسٹرڈ کروا کر عید کے چند دن پہلے خود ہی اسے ریلیز کر دیا۔ جب عید آئی تو مشہور سنیما گھروں نے اس فلم کو اُتار کر اس کی جگہ نئی اُردو فلمیں لگا دیں۔ اس طرح یہ فلم چھوٹے سنیماؤں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ فلم بینوں کا رجحان بڑے سنیما گھروں میں لگنے والی نئی فلموں کی طرف تھا۔ یہ فلم ویڈیو ریکارڈر، سی ڈی اور ڈی وی ڈی میں منتقل نہیں کی جا سکی، جس کی وجہ سے بعد ازاں بہت سے لوگ اس فلم کو دیکھنے سے محروم رہے۔

تیس روزے، تیس سگریٹیں

ابن صفی سگریٹ پینے کے عادی نہیں تھے، البتہ وہ سگریٹ پینے کا شوق ضرور رکھتے تھے، لیکن ۱۹۷۰ء سے انھوں نے سگریٹ پینی بالکل کم کر دی تھی اور خود سے سگریٹ کا پیکٹ نہیں خریدتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی دوست سگریٹ پیش کر دیتا تو پی لیتے تھے۔ ماہ رمضان میں ان کے ساتھ دل چسپ معاملہ رہتا تھا۔ رمضان شروع ہوتے ہی وہ سگریٹ کا پیکٹ خریدتے اور افطار کے وقت ایک سگریٹ پیتے۔ اس طرح تیس روزوں میں وہ تیس سگریٹیں پوری کرتے اور پھر پورا سال سگریٹ نہیں خریدتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ سگریٹ نوش روزے داروں کو سگریٹ کے پہلے ہی کش سے روزے کا ثواب مل جاتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ابن صفی کے والد صفی اللہ کا بھی اپنی زندگی میں یہی طرز عمل رہا اور وہ بھی تیس روزوں میں تیس سگریٹیں ختم کرنے کے بعد پورا سال سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

اچھے ادیب، اچھے باپ

ابن صفی اچھے ادیب کے ساتھ اچھے باپ بھی تھے۔ انھوں نے اپنے بچوں پر کبھی سختی نہیں برتی۔ کبھی کبھار چھٹی کے روز وہ اپنے بیٹوں کو اپنے ساتھ انگریزی فلم دکھانے سنیما لے جاتے اور اُردو فلم کے لیے پوری فیملی کے لیے بکنگ کرواتے تھے۔ ان دنوں پی ٹی وی پر ویک اینڈ سنیما کے نام سے رات کو ایک انگریزی فلم دکھائی جاتی تھی، ابن صفی نہ صرف خود وہ فلم بڑے شوق سے دیکھتے، بل کہ فلم شروع ہوتے ہی اپنے بچوں کو بھی آواز دے کر بلوا لیا کرتے تھے۔ امتحانات کے دنوں میں بھی وہ اپنے بچوں کو ٹی وی دیکھنے یا ناول پڑھتا دیکھ کر خفا نہیں ہوتے تھے۔ اُن کے بیٹے احمد صفی کہتے ہیں:

> ابّو نے ہم پر سختی کرنے کا کام ہماری والدہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ ایک دن والدہ نے ابّو سے میری شکایت کر دی کہ کل اس کا پرچہ ہے اور یہ آپ کا ناول پڑھ رہا ہے۔ میرے والد نے کہا کہ اگر میرے ناول پڑھنے سے بچوں کا نقصان ہوتا ہے تو سب سے پہلے میرے بچوں کا ہونا چاہیے۔ ہمارے والد نے ہم پر کبھی سختی یا مار پیٹ نہیں کی، اُن کا ہماری طرف غصّے سے دیکھنا ہی کافی ہوتا تھا۔

ابن صفی کے بچوں نے بھی اُن کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔ اُن کے سارے بیٹوں اور بیٹیوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے

کے بعد کام یاب زندگی گزاری۔ ابن صفی کے سات بچوں میں احمد صفی کا پانچواں نمبر ہے، پیشے کے اعتبار سے وہ مکینیکل انجینئر ہیں۔ امریکا میں پندرہ برس گزارنے کے بعد ۲۰۰۲ء کے اواخر میں وطن واپس لوٹنے کے بعد وہ اپنے والد کی یادوں کو محفوظ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے www.ibnsafi.info کے نام سے ایک ویب سائٹ بھی بنائی ہے، جہاں ابن صفی اور ان کی کتابوں سے متعلق معلومات دست یاب ہے۔

انڈیا جانے کی خواہش پوری نہ ہوسکی

ابن صفی کو پاکستان ہجرت کرنے کا کوئی غم نہ تھا۔ ان کے نزدیک پاکستان ہی ان کا سب کچھ تھا۔ البتہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بیماری کی حالت میں وہ اکثر اپنے گاؤں 'نارا' اور وہاں کے راستوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مرنے سے پہلے ایک بار انڈیا ہو آئیں۔ انھوں نے انڈیا میں اپنے دوست شکیل رحمانی کو خط لکھا تھا کہ اب اگر تم پاکستان آئے تو ہم سب ایک ساتھ انڈیا جائیں گے۔لیکن موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ ستمبر ۱۹۷۹ء میں انھیں پیٹ میں تکلیف محسوس ہوئی، تشخیص پر پتا چلا کہ انھیں لبلبے کا کینسر ہے۔ ابن صفی جن ڈاکٹروں کے زیر علاج رہے، ان میں ڈاکٹر سعید اختر زیدی، ڈاکٹر فخر الدین صدیقی، جنرل فزیشن ڈاکٹر رب اور کینسر اسپیشلسٹ ڈاکٹر سید حسین منظور زیدی شامل تھے۔ ان ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود وہ شفا یاب نہ ہوسکے اور آخری بار اپنے پرکھوں کی سرزمین دیکھنے کی خواہش دل میں لیے اپنے اہل خانہ اور کروڑوں پرستاروں کو سوگوار چھوڑ کر ۲۸ جولائی ۱۹۸۰ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

اُردو کے نام نہاد نقادوں کی کم ظریفی

اُردو کے نام نہاد نقادوں نے ابن صفی کو بڑے ادیب کے طور پر کبھی تسلیم نہیں کیا۔ یہ کم ظرف نقاد عمر بھر اپنے ہی 'ادبِ عالیہ' کا ڈھول پیٹتے رہے اور چھپ کر ابن صفی کے ناولوں سے 'استفادہ' بھی کرتے رہے۔ بُرا ہو، ابن صفی کے لاکھوں چاہنے والوں کا، جنھوں نے انھیں مقبولیت کے بامِ عروج پر پہنچا کر ان نام نہاد نقادوں کے منہ بند کردیے۔ اس بلند پایہ ادیب کے کام کو اُن کے شایانِ شان نہیں سراہا گیا۔ بعد از مرگ اگست ۱۹۹۷ء میں انھیں صوبائی سطح کا 'اسپیکر ایوارڈ' دیا گیا، جسے اُن کے مرحوم بیٹے ڈاکٹر ایثار صفی نے وصول کیا تھا۔حکومت پاکستان نے ۲۰۲۰ء میں انھیں 'ستارۂ امتیاز' سے نوازا۔ یہ ایوارڈ اُن کے بیٹے احمد صفی نے وصول کیا۔

پاکستان کی وزارتِ اطلاعات کے ادب سے بے بہرہ لوگوں کو کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ ابن صفی کو ان کی زندگی میں یا بعد از مرگ پرائیڈ آف پرفارمنس جیسے بڑے ایوارڈ سے نوازتے۔ بہر حال اس ایوارڈ کے نہ ملنے کے باوجود اس عوامی مصنف کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ایوارڈ کا نہ ملنا ابن صفی کی بدنصیبی نہیں، بل کہ بدنصیب وہ ایوارڈ ہے، جس کے نصیب میں کوئی ابن صفی نہیں۔

ابنِ صفی کی تصانیف

ابنِ صفی نے جاسوسی دنیا (احمد کمال فریدی) کے ۱۲۵ ناول لکھے۔ انھوں نے ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی اور طنز و مزاح، افسانے، سوانح حیات اور رومانوی ناول لکھ کر قارئین سے ڈھیروں داد سمیٹی۔ ابن صفی کے طنز و مزاح پر مبنی مضامین کا مجموعہ 'ڈپلومیٹ مرغ' میں وہ مضامین بھی شامل ہیں، جو انھوں نے ادبی پرچے 'نکہت' اور دیگر رسائل میں طغرل فرغان کے قلمی نام سے لکھے تھے۔ 'شیطان صاحب' کے نام سے طنز و مزاح پر مشتمل ایک اور مجموعہ جن میں 'سنکی سولجر' اور طغرل فرغان' کے نام سے لکھے جانے والے مضامین شامل ہے۔ 'ساڑھے پانچ بجے' ابن صفی کی مختصر کہانیوں کے مجموعے کا نام ہے۔ ابن صفی کے تخلیق کردہ علاقے شکرال، کرغال کملاک کی سنگلاخ اور پُرخطر وادیوں میں جنم لینے والی داستانیں، بلدران کی ملکہ، شمال کا فتنہ، گُل ترنگ اور معزز کھوپڑی کے کردار اب تک قارئین کے دلوں پر نقش ہیں۔ ۱۹۵۸ء کے سماجی پس منظر میں لکھا جانے والا طنزیہ ناول 'شیخ چلی' بعدازاں مزید اضافے کے ساتھ 'زلفیں پریشاں ہوگئیں' کے نام سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہُوا۔

''عالمی ڈائجسٹ'' میں قسط وار شائع ہونے والا ابن صفی کا ایک اور ناول 'اب تک تھی کہاں' مصری اساطیری دَور سے بیسویں صدی عیسوی تک پھیلی ایک رومانی اور پُرتجسس کہانی پر مشتمل ہے۔ مغلیہ دَور کی ریشہ دوانیوں پر ایک بھرپور طنز کرتی ابن صفی کی ایک اور کہانی 'تزک دو پیازی' اپنے تخلیق کار کی موت کے سبب مکمل نہ ہوسکی۔ یہ کہانی 'ابن صفی میگزین' میں قسط وار شائع ہوتی تھی۔ اسی طرح ۱۹۵۹ء میں ابن صفی نے انسانی نفسیات کے پہلو پر ایک ناول 'آدمی کی جڑیں' لکھنے کا آغاز کیا تھا، جو قسط وار ماہ نامہ 'حجاب' میں شائع ہوتا تھا۔ تاہم ان کی بیماری کے باعث یہ ناول مکمل ہونے سے رہ گیا۔

ابن صفی کی زندگی کا آخری ناول عمران سیریز کا 'آخری آدمی' تھا۔ اس ناول کے چند صفحات لکھنے سے رہ گئے تھے، کہ اُن کا انتقال ہوگیا اور یہ ناول مکمل نہ ہوسکا۔ بعدازاں اس ناول کے باقی رہ جانے والے صفحات کو کسی اور صاحب سے لکھوا کر شائع کیا گیا۔ اُن صاحب کا نام راقم کے لاکھ اصرار کے باوجود احمد صفی نے نہیں بتایا۔ ان کے خیال میں اس نام پر پردہ پڑا رہے تو اچھا ہے۔

ابن صفی کا ایک اہم حوالہ شاعری بھی ہے۔ ان کی نثر میں کوئی ایسی تحریر نہیں جو شائع ہونے سے رہ گئی ہو۔ البتہ ان کی غزلیں اور نظمیں کافی عرصے تک غیر مطبوعہ حالت میں رہیں۔ احمد صفی نے اپنے والد کی شاعری کا مجموعہ 'متاعِ قلب و نظر' کے نام سے ۲۰۱۳ء میں شائع کرایا۔ یہ مجموعہ ابن صفی اپنی زندگی ہی میں شائع کرانے کی غرض سے مرتب کر چکے تھے، لیکن چھپوانے کی نوبت نہ آسکی اور ان کی وفات ہوگئی۔

مکرّم نیاز ✿

ابنِ صفی کے ناولوں میں سائنس فکشن: سوشل میڈیا کا ایک دل چسپ مکالمہ

مورخہ ۲۶ر نومبر ۲۰۱۶ء کو کولکاتا (مغربی بنگال، انڈیا) کے جواں سال ادیب ومصنف جاوید نہال حشمی نے اپنی فیس بک ٹائم لائن پر ایک خبر کی سرخی لگاتے ہوئے ابن صفی کے ناولوں میں سائنس فکشن کے حوالے سے مکالمے کا آغاز کیا۔ دنیا بھر کے میڈیا میں جاری خبر یہ تھی کہ اطالوی نیورو سرجن سرجو کاناویرو نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے ۲۰۱۷ء میں انسانی سر کو ٹرانسپلانٹ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

جاوید نہال حشمی: قارئین کو اردو جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ابن صفی کا مشہور ناول ''تسڈل کی بیداری'' تو یاد ہی ہوگا۔
The all-time great Urdu detective novelist Ibn-e-Safi had predicted this decades ago in his famous novel *Tisdil ki Bedaari*...

اظہر الحق نسیم قریشی: شکرال کی کہانیاں اور زیرو لینڈ کی تلاش بھی تو ثابت ہو چکے ہیں، کیا فے گزار آج کے دور میں موجود نہیں؟ وہ پاکستان کا بہت بڑا دماغ تھا، جسے بھلا دیا گیا۔

امین بھایانی: یہ تو ایک قومی المیہ ہے کہ ہم اپنے ہر ہیرو کو محض اُس کی وفات کے بعد چند دنوں اور پھر اُس کی سالگرہ اور برسی کے روز ہی یاد کرتے ہیں۔

احمد صفی: یہ اور ایسی بہت سی باتیں جو عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے ناولوں میں لکھ دی گئی ہیں ہمیں اپنے اطراف میں نظر آ جاتی ہیں چاہے سائنس فکشن ہو، نفسیاتی گرہیں ہوں یا سیاسی مسائل...

اقبال حسن: بھئی وہ ایک دنیا تخلیق کر دیتے تھے۔ ایک ایسی دنیا جس کے حقیقت بننے کا یقین ہونے کے ساتھ ان کی تحریریں پڑھی جاتی تھیں۔ میں ان کی سب کتابیں اپنے پاس ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے لیے نہیں بلکہ نئی نسل کے لیے تاکہ انھیں علم ہو سکے کہ ہمارے پاس بھی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھی۔

محمود یاسین:

There must have been some indications in this regard and I will have to go through it.For as per a Turkish author there are more or less 750 aayaat or places in which science and technology have been refered.

I regard Ibne Safi mohtaram as my foster university.My mother had died when I was still a child and when I was ten my father died too.

✿ حیدرآباد دکن، ہندوستان۔ برقی پتا:taemeer@gmail.com

ابن صفی جینیس تھے انھوں نے اپنے ناولوں میں سائنس فکشن کے حوالے سے جو باتیں کہی ہیں وہ بہت حد تک سچ ثابت ہو رہی ہیں سرجری کا یہ تجربہ امید ہے کامیاب ہوجائے اسی سے ملتی جلتی ایک خبر باڈی ٹرانسپلانٹ کی بھی آئی تھی جس میں اگر کسی کا ذہن مردہ ہوجائے تو اس کے جسم کو آپریشن کے ذریعے معذور افراد کو لگانے کی بات کہی گئی تھی اس میں بھی سر جوڑنے کا ہی آپریشن ہوتا ہے۔

اسحٰق مرزا بیگ: ظهر الفساد في البر و البحر بما كسبت ايدي الناس ...زمین میں اور سمندر میں انسانوں کے ہاتھوں فساد پھیل گیا۔ یہ انسانی ذہن ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرنے میں لگا رہتا ہے۔ پہلے کلوننگ اور اب ہیڈ ٹرانسپلانٹ۔ خلانوردی، اور انسانی اعضا کی تبدیلی پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا، اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا... سورج کی شعاؤں کو جس نے کیا قید، اپنی شب تار سحر کر نہ سکا۔

انسانی ذہن کی اختراعی بلندی اپنی انتہاؤں پر ہے اور شائد یہ قرب قیامت کی نشانی ہے اور اللہ تعالی کے قادر مطلق ہونے کی نشانی بھی۔ انسان جس کو نہ اپنے بول و براز پر اختیار ہے اور نہ خود اپنے اندرونی اعضا پر جب وہ اتنی قدرت رکھتا ہے تو پھر اللہ تعالی کیا کچھ نہیں کرسکتا۔ واللہ علی کل شئی قدیر۔

ایک بات کا خلاصہ کرنا یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی سائنسی ترقی کو اسلام کے خلاف چیلنج نہیں سمجھا بلکہ انسان کی ہر ترقی خالق مطلق کی قدرت کاملہ کا بین ثبوت بنتی جارہی ہے۔ ابن صفی نے اپنے کسی ناول میں برین ٹرانسپلانٹ کو بھی پیش کیا تھا۔ میرا چہرہ چرالیا گیا کا انوکھا واقعہ پیش کیا تھا۔ اب ناول کا نام حافظے میں کہیں ہو تو ہو۔

احمد صفی/شمس الرحمٰن علوی: دیو پیکر درندہ۔

جاوید نہال حشمی: جی، میرا اشارہ اسی طرف تھا۔ ''ٹسڈل کی بیداری'' کا موضوع برین ٹرانسپلانٹ ہی ہے۔ ''ٹسڈل کی بیداری'' سیریز کا دوسرا حصہ ہے جس کے پہلے حصے میں ایک ''اجنبی'' جس کی کھوپڑی میں فریدی کے آئی جی کا دماغ ٹرانسپلانٹ کر دیا گیا ہوتا ہے فریدی کی تجربہ گاہ میں خفیہ دروازے سے داخل ہوتا ہے (جس کا علم فریدی اور آئی جی کے علاوہ اور کسی کو نہیں ہوتا) اور اسے اپنے آئی جی ہونے کا یقین دلاتا ہے۔ مجھے بھی اس پہلے حصے کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔

فاضل حسین پرویز: طوفان کا اغو جب پڑھا تھا تب میٹرک میں تھا۔ ۳۸ برس پہلے۔ اب مصنوعی سونامی، مصنوعی زلزلے، ہارپ ٹکنالوجی کی مدد سے کیے جارہے ہیں جنھوں نے ابن صفی کو پڑھا ان کے لیے ایسے واقعات حیران کن نہیں۔ جاپان کے نیوکلئیر ری ایکٹر کو مصنوعی زلزلہ سے تباہ کر دیا گیا۔

آسیہ تنویر: ابن صفی اردو ادب کا ایک ایسا شاہکار جو اگر فرانس یا انگلستان میں پیدا ہوتا تو اس کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا... ہر زبان میں اس کے ترجمے ہوتے... افسوس ابن صفی کو وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ حقدار تھے۔

سجاد الحسنین: ابن صفی کو یہاں بھی سر آنکھوں پر بٹھایا گیا ہے لیکن... قارئین نے!

اور جاسوسی ادب کو ادب کا درجہ نہ دینے کا ابن صفی کو نہ تو غم تھا اور نہ ہی انھوں نے پرواہ کی، جہاں تک میرا خیال ہے ستر اور اسی کی دہائی میں اردو والوں نے سب سے زیادہ اگر کسی کو پڑھا ہے تو وہ ابن صفی ہیں اور اگر جس کے ناولوں کا بیتابی سے انتظار کیا گیا ہے تو

وہ جاسوسی دنیا اور نکہت پبلی کیشنز کے وہ ناول تھے جو ابن صفی نے لکھے۔ ابن صفی نے از خود کہا تھا کہ مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میرے ناولوں کو ادب میں کیوں جگہ نہیں دی جارہی ہے مجھے تو اس بات کا اطمینان ہے کہ لوگ میرے ناول پڑھنے کے لیے اردو سیکھنے لگے ہیں اور میرے ناول تکیوں کے نیچے چھپا کر پڑھے جاتے ہیں۔

معظم راز: ستر واسّی کی دہائی کا دور کئی حوالوں سے اردو زبان و ادب میں بیسویں صدی کا انتہائی روشن و پہلو دار دہے کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ یادش بخیر کہ ہمدرد لیبارٹریز، دہلی کے ادارے سے ''شمع'' و ''سشما'' (ہندی) سے اسی دور میں ''مجرم'' و ''دوشی'' (ہندی) بھی بپابندی شائع ہوا کرتے تھے اور قارئین ان کے بھی منتظر رہا کرتے تھے۔لیکن قانون والا (قلمی نام) کے لکھے گئے ''مجرم'' و ''ابن صفی کے ناولوں'' میں فرق و امتیاز یہ رہا کرتا تھا کہ: قارئین کے نزدیک از خود ''مجرم''، ''اے'' سرٹیفکیٹ یعنی صرف بالغوں کے لیے تھا، جبکہ ''ابن صفی کے ناول'' ہر عمر کے قاری کے لیے ''یو'' سرٹیفکیٹ کے حامل قرار پاتے تھے، اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن صفی کے ناولوں کی پذیرائی و پہنچ اس دور کے قارئین کی عمر کے لحاظ سے کہاں سے کہاں تک رہی ہوگی۔

سجاد الحسنین: ابن صفی اور پھر حسینی صاحب نے مقدمات میں کئی بار اعتراف کیا ہے کہ ادب جب فحاشی کی طرف گامزن تھا اور فحش نگاری اپنے عروج پر پہنچ گئی تھی اس زمانے میں اپنے صاف ستھرے اور پوری فیملی کے لیے لکھے گئے ناولوں کے دریعہ ابن صفی نے فحش نگاری کے حلاف گویا ایک محاذ کھولا تھا اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے تھے۔

علی عباس حسینی کے مقدمے تبصرے اور تمہیدیں لاجواب ہوا کرتی تھیں وہ کون ہوگا جس نے ناول شروع کرنے سے پہلے علی عباس حسینی کا مقدمہ نہ پڑھا ہو۔

احمد صفی: علی عباس حسینی صاحب ایک الگ افسانہ نگار تھے نکہت پبلی کیشنز کے روحِ رواں عباس حسینی صاحب تھے۔ اکثر لوگ دونوں شخصیات میں گڑبڑا جاتے ہیں، اللہ ان کو اپنی رحمت کے سائے میں رکھے، آمین۔

جاوید نہال حشمی: جی احمد صفی صاحب، ''باسی پھول'' شاید علی عباس حسینی صاحب کی ہی تخلیق ہے جو ہمارے زمانے کے ہائر سیکنڈری کے نصاب میں شامل تھی، اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو...

احمد صفی: اس پوسٹ نے واقعی بہت سے معززین سے متعارف کرایا اور کچھ پرانے احباب کو بھی مجتمع کر دیا ہے۔ مجاور چچا نے حسینی انکل اور ابو پر مضامین لکھے ہیں۔ یہ سب مضامین یہاں میسر ہیں: www.ibnesafi.info

علی نثار: میرے خیال میں ڈاکٹر مجاور حسین رضوی ہونا چاہیے۔

احمد صفی: علی نثار صاحب، جہاں جہاں مجاور لکھا خود کار تصحیحی سافٹ وئیر نے اسے مجبور بنا دیا... دلی معذرت مگر مجھے یقین ہے کہ مجن چچا میرا مطلب ہے مجاور چچا دیکھ پاتے تو بہت محظوظ ہوتے اور کوئی تڑپتا ہوا کمنٹ ضرور پاس کرتے۔ ان سے اب بھی گفتگو کر کے طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ اللہ صحت مند و سلامت رکھے آمین

سبین علی: اوبسیشن کا شکار ایک ڈاکٹر۔

شبیر حسین بلوچ: جاوید صاحب کیا ہی سنہرا دور یاد کروایا ہے آپ نے اسرار احمد المعروف ابن صفی کا تذکرہ کر کے، انکی مقبولیت

کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ آپ کی اس پوسٹ پر کتنے تبصرے اور لائیک آئے ہیں، مغربی دنیا میں جیمز بانڈ کو سب بھول جاتے اگر ابن صفی وہاں کے ہوتے لیکن افسوس ہم نے انکو انکا جائز مقام کبھی نہیں دیا۔

سبین علی: ابن صفی کی کیا بات ہے۔ دراصل ادیب کا تخیل ان آئیڈیاز کو پینٹ کرتا ہے جو عام انسان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتے مگر عشروں یا صدیوں بعد حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔

اکرام ناصر: سائنس فکشن میں جناب ابن صفی صاحب کا نظریہ حقیقت سے بہت قریب تھا یہ وجہ ہے کہ ان کے ناولز میں ذکر کیے گئے بیشتر نظریات ابھی حقیقت میں ممکن ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ جن میں قابل ذکر زیرولینڈ کی ایجادات ہیں۔

مکرم نیاز: جیمز بانڈ کی کچھ فلموں میں ''زیرولینڈ'' سے مماثل مملکت کی عکاسی کی گئی ہے، مثلاً فلم ''مون ریکر'' (Moonraker)۔ ویسے حقیقی دنیا میں ابھی ایسی کسی دنیا کا وجود نہیں۔

ابرار مجیب: جبرالڈ شاستری جو ابن صفی کا لافانی کردار ہے انسان اور جانوروں کی آمیزش سے نئی مخلوق بناتا ہے۔ انسان نما جانور یا جانور نما انسان۔

جاوید نہال حشمی: کچھ عرصے قبل آل انڈیا ریڈیو کلکتہ سے نشر ہونے والے پروگرام کے تحت ''اردو میں سائنس فکشن'' کے موضوع پر مقالہ پڑھتے وقت میں نے جیرالڈ شاستری کی اس گوریلا نما ''تخلیق'' کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔

سجاد الحسنین: پتھر کا آدمی بھی تو کمال ہے۔

ابرار مجیب: جبرالڈ شاستری ناول ''جنگل کی آگ'' اور ''موت کی چٹان'' میں موجود ہے۔

سبین علی: آج اپنے بیٹے کو آملا اور کاملا کے واقعے سے کشید کہانی ''دا وولف چلڈرن'' پڑھا رہی تھی۔ بھیڑیے جیسا خوفناک درندہ بھی کئی انسانوں سے بہتر ہے۔ سب سے بڑا مانسٹر یا عفریت خود انسان ہی ہے۔

ابرار مجیب: ابن صفی کے ناولوں کا مکمل سیٹ میں نے خریدا ہے جسے ہندوستان میں فرید بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔

امین بھایانی: محترم ابرار مجیب بھائی، گزارش ہے کہ فرید بک ڈپو والوں نے ابنِ صفی کی کتب ابنِ صفی کے وارثان جن کے پاس ابنِ صفی مرحوم کی تمام تر کتب کے قانونی حقوق ہیں کی بلا اجازت نہ صرف شائع کی ہیں بلکہ اُس میں اپنی جانب سے ترامیم بھی کی گئی ہیں۔ اس حوالے سے اُن کی جانب سے فرید بک ڈپو کے سربراہ سے بھی متعدد بار تحریری طور پر اس غیر قانونی سلسلے کے حوالے سے آگاہ کیا گیا ہے مگر یہ سلسلہ ہنوز یونہی جاری ہے۔

احمد صفی: میں سائنس کی تھوڑی شُد بُد رکھنے کی وجہ سے ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ تبدیلِ دماغ کیسے ممکن ہو سکتی ہے جیسے دیو پیکر درندہ میں اس کا بیان ملتا ہے۔ میں نے پڑھا کہ ہمارا ذہن نیورل نیٹ ورک ہے جس میں یادداشت نیٹ ورک کے تانے بانے میں محفوظ ہوتی ہے۔ جیسے ہی ہم کسی تجربے سے دوچار ہوتے ہیں، نئے کنکشنز وجود میں آتے ہیں۔ ان سب سے ایک کومپلیکس سرکٹ وجود میں آتا ہے جو ہماری شخصیت کے ہر پہلو کو اپنے اندر سمیٹے ہوتا ہے، یادیں، باتیں، تجربات، تصورات، عکس وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر ہم اس نیٹ ورک کی برقی نقل تیار کر لیں اور اسے کسی اور دماغ پر کاپی کر دیں تو شخصیت کی کاپی تیار ہو جائے۔ اب یہ

ہم پر ہے کہ پچھلے دماغ سے یہ نیٹ ورک مٹا دیں۔ اور نئے مٹے ہوئے دماغ پر کاپی کر دیں۔ یہ کام ہم کمپیوٹر میموریز میں کر ہی رہے ہیں۔ اور مصنوعی فہم آرٹیفیشیل انٹیلیجنس میں یہ نیورل نیٹ ورک ہی ہیں جن کی مدد سے آپ کے اسمارٹ فون آپ کی چیزوں کو یاد رکھتے ہیں اور جیسے ہی آپ فون تبدیل کرتے ہیں یہ ساری فہم نئے ڈیوائس میں منتقل ہوجاتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن صفی صاحب نے دکھایا کہ یہ عمل پلٹ سکتا ہے یعنی ریورسیبل ہے؟ پتا یہ چلا کہ ہم اپنی پوری زندگی میں اپنے دماغ کا چند فیصد حصہ استعمال کرتے ہیں۔ تو گویا باقی جگہ مزید نیورل نیٹورکس کے لیے بہت ہے۔ دماغ کے کسی نئے حصے پر نیورل نیٹ ورک کو کاپی کیا جاسکے تو ''یادداشت واپس آسکتی ہے۔''

اب اس تناظر میں دیکھیے تو ابن صفی کا تبدیلیِ دماغ کا تصور دور از کار نظر نہیں آتا۔ یاد رہے کہ ناول میں آپریشن سے پورا دماغ ٹرانسپلانٹ نہیں کیا جارہا تھا بلکہ سر پر ہیڈ فون ٹائپ کا آلہ استعمال کر کے یادوں کو محصور یا کاپی کیا جارہا تھا...

محمد حنیف: احمد بھائی بہت اچھا تجزیہ پیش کیا ہے۔

امین بھایانی: اس ناچیز نے اپنے دو افسانوں ''کوما'' اور حالیہ دنوں میں لکھے گئے افسانے ''سائنس کی ڈور'' جس میں بھی ایک کردار کوما کا شکار ہوجاتا ہے کے لیے کئی بار مفصل طور پر دماغ، دماغ خلیات، یادداشت، نیورانز اور دیگر افعال کا مطالعہ کیا۔

علاوہ ازیں جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے کمپیوٹر اور بطورِ خاص ان تمام آلات میں یادداشت کے حوالے سے استعمال ہونے والے چپ/میموری ڈرائیوز/ ہارڈ ڈسک/میموری کارڈز واسٹکس سب کے سب انسانی دماغ ہی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بنائے گئے اور عین اسی طور پر کام کرتے ہیں۔

اس لحاظ سے ابنِ صفی مرحوم نے اُس دور میں یہ تمام باتیں اپنے ناولوں میں من وعن اُسی طور پر شامل کر کے بلاشبہ اپنے آپ کو اُس دور کے ساتھ دورِ حاضر کا ایک عظیم دانشور ثابت کیا جب یہ باتیں ابھی نہ تو رائج ہی تھیں اور نہ ہی اُس طور پر سامنے آئی تھیں جیسا کہ آج کے دور میں ہے۔

جاوید نہال حشمی: برقی سرکٹ اور اعصابی سرکٹ بنیادی طور پر ایک ہی طرز اور اصول پر کام کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اول الذکر میں ڈیٹا کی منتقلی الیکٹرون کے دوڑنے سے ہوتی ہے جب کہ موخر الذکر میں سوڈیم آیون (Na+) کے دوڑنے سے۔ لہذا انسانی دماغ سے یادداشت کی منتقلی مستقبل میں ناممکن نظر نہیں آتی۔

احمد صفی: بالکل بھائی جاوید میں نے اصول کی وضاحت کی ہے، سوڈیئم آئن کے دوڑنے کی وجہ بھی منفی چارج کی موجودگی ہی ہو شائد۔ دل دھڑکنے کی وجہ بی ان ہی آئنز کی حرکت پر ہے جبکہ پیس میکر مصنوعی طور پر برقیاتی طور پر دھڑکن کو قائم رکھتے ہیں...

منور فضل اللہ قاضی: طالب علمی کے زمانے میں جہاں ہمیں ناولز پڑھنے پر پابندی تھی... جناب ابن صفی کی ناولز ہم اجازت کے ساتھ پڑھتے تھے... میرے ابا بھی ''پنکھا'' تھے ابن صفی کے...

علی نثار: دھاری دار انسان بھی ابن صفی صاحب کی ہی کسی ناول میں پڑھا تھا میں نے اب نام یاد نہیں لیکن جس کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ آدمی ہونے کے باوجود ہاتھی جیسے جانور کی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔

احمد صفی: زیبرا مین۔

علی نثار: عباس حسینی، علی عباس حسینی، اسرار احمد، ان تمام معززین کے بارے میں استاد محترم سید مجاور حسین رضوی صاحب کی زبانی بارہا سن چکا ہوں آج عباس حسینی صاحب پر ''ایک ادارہ ایک انجمن'' مضمون پڑھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ ایسی بھی سحر انگیز اور کرشماتی شخصیت ہوتی ہے جو اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ محفوظ رہ جاتی ہے۔

احسن علی عباسی: آپ حضرات یہ نہ بھولیں کہ ہر اچھے مصنف کی ذہنی پرواز بہت اونچی ہوتی ہے اور وہ اپنی نئی خیالی تخلیق کے لیے دوسرے شعبوں کے ماہران کو اکساتا ہے کہ وہ ان خیالی تخلیقات کو حقیقی شکل میں تبدیل کریں۔ یہ جو ہم آج بہت سی نت نئی سائی فائی (Sci-fi) کہانیاں پردے پر دیکھتے ہیں ان میں سے آہستہ آہستہ کتنی ایجادات دیکھنے کو ملی ہیں اور ملتی رہیں گی۔ اِبنِ صفی ایسے ہی اعلیٰ مصنّفین کی صف میں ہیں جنھوں نے اپنے پڑھنے والوں حیرت ناک وادیوں کی سیر کرائی ہے، مرحوم کی تحریر، اور ان کی یاد ہمیشہ ہمارے اور آنے والی نسلوں (اگر انھوں نے اردو کو ہمیشہ کے لیے دفن نہ کیا تو) کے دلوں میں تازہ رہے گی۔

محمد علی صدیقی: جاوید نہال صاحب نے اچھا موضوع چھیڑا جس کے نتیجے میں بہترین تبصرے پڑھنے کو ملے۔ معظم راز صاحب نے ''شمع'' اور ''مجرم'' کی یاد بھی تازہ کرادی۔ میں انھیں بھی پابندی سے پڑھا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ ہما ھدی شبستاں اور بیسویں صدی بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ بھی اپنے دور کے بہترین رسائل ہوا کرتے تھے۔ قارئین کو ان کا بھی بے صبری سے انتظار رہتا تھا۔ کچھ دنوں قبل جاوید نہال صاحب کی پہل پر ہی واٹس ایپ کے قرطاس وقلم گروپ میں عمران اور فریدی پر ایک دل چسپ بحث ہوچکی ہے جسے مکرم نیاز صاحب نے ایڈٹ کر کے اخبار میں شائع بھی کروایا تھا۔ ابن صفی کے لکھے ہوئے ناولوں کا جادو ہی ایسا ہے کہ بات چھڑ جائے تو کچھ کہے بغیر رہا نہیں جاتا۔

منور فضل اللہ قاضی: ایک مضمون انگریزی اخبارات میں بھی اس موضوع پر لکھ کر شائع کریں تاکہ انگریزی میڈیا اور قارئین کو بھی پتا چلے کہ اردو ادب میں بھی ایسے لازوال مصنّفین موجود ہیں۔

مکرم نیاز: برصغیری انگریزی میڈیا اور قارئین بخوبی ابن صفی کے نام و کام سے واقف ہیں۔ ابن صفی پر حال میں نہ صرف سیکڑوں انگریزی مضامین لکھے جاچکے ہیں بلکہ ابن صفی کے کچھ عمران/فریدی ناولوں کا انگریزی ترجمہ بھی حال ہی میں منظرِ عام پر آچکا ہے، یہ ناول فلپ کارٹ یا امیزن سے خریدے جاسکتے ہیں، تمام انگریزی ناولوں کے مترجم مشہور ناقد شمس الرحمٰن فاروقی ہیں۔

احمد صفی: جولائی سن بہتر میں جناب ایچ اقبال صاحب نے الف لیلہ ڈائجسٹ کا ابن صفی نمبر ان کی زندگی ہی میں نکال کر مردہ پرستی کی روایت کو بھرپور انداز میں توڑ دیا۔ اس میں مشاہیرِ ادب نے ابن صفی پر مضامین لکھے تعریفی بھی تنقیدی بھی۔ شاعر اور ابو کے دوست سہیل اقبال صاحب مرحوم (انبالہ سوئیٹس والے) نے اگاتھا کرسٹی سے منسوب واقعہ درج کیا۔ ایک زمانے تک ہم اس کے مستند ہونے پر شبہ کرتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ شائد ڈیم اگاتھا کبھی پاکستان نہیں آئیں۔ مگر پھر راشد اشرف اور عقیل عباس جعفری صاحبان کی تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی کہ وہ پاکستان تشریف لائی تھیں۔ مقبول جہانگیر صاحب مرحوم کا ایک مضمون بھی دریافت ہوگیا جس میں انھوں نے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ بی بی سی کے عارف وقار صاحب نے بھی اپنے بچپن کی یادداشتوں کو تحریر میں لاتے ہوئے اپنی

والدہ کے ساتھ ان سے ملاقات کا بیان کیا۔ یوں یہ بات قرینِ قیاس ثابت ہوئی کہ رضی اختر شوق کا بیان کردہ واقعہ درحقیقت درست ہوسکتا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبدالحق: نمبر سے شناخت کا تصور بھی ابن صفی کی دین ہے۔ پیاسا سمندر ۱۹۵۶۔

اظہرالحق نسیم قریشی: ابن صفی نے اپنے روبوٹ (فولادی) کے بارے میں اپنے ناول میں کہا تھا کہ بھئی اب کوئی یہ نہ کہے کہ فولادی کو مغرب کی ایجاد ہے... جبکہ ہمارے ہاں یہ موجود ہے... (مجھے لفظ بہ لفظ یاد نہیں اس لیے مفہوم لکھا ہے)

کاش ہمارے فلم ساز ان کو ایک بار پڑھ لیں... مگر ایسا ممکن نہیں، کیوں کہ میں نے بہت عرصہ پہلے سید نور اور شہزاد رفیق کے ساتھ بہت لمبی بحث کی تھی اور اپنی سائنس فکشن کہانی کو انھیں دیا تھا، مگر وہیں پر بیٹھے جاوید شیخ (جو فلم دھا کہ کے ہیرو بھی تھے) کہنے لگے کہ ابن صفی کو لوگ فلما نہیں سکتے... وہ کتابوں کے شاعر ہیں... ورنہ دھا کہ کامیاب فلم ہوتی اگر وہ فلم کے لکھاری ہوتے، مگر جب میں نے انھیں انکے ٹی وی کے خاکے یاد کروائے تو... چُپ ہو گئے... سید نور نے اسکرپٹ لیا مگر پھر کئی بار فون کرنے کے باوجود رپلائی نہیں کیا۔۔ ہم اپنے ٹیلنٹ کو آگے لانا ہی نہیں چاہتے...

رحمت امین:

> Ibne Safi is all-time great novelist amongst detective novel writers. His thoughts was beyond his own era and such visionary writer is rare even in most advanced languages of the world. You have done an excellent job to draw our attention tawards his famous novel Tisdil ki Bedaari via-a-vis a resembling current news. Jb. S. R. Faruqui, a great writer, linguistic and critic, has translated his some novels into english but such work is continuously required to take him to non-Urdu speaking world and no doubt the whole world salute his visions.

محمد علی صدیقی: آج کل دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھ کر کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ بات میں ابن صفی کے کسی ناول میں بہت پہلے پڑھ چکا ہوں۔ یونی پولر ورلڈ کی بات ہو، دہشت گردوں کی حرکتیں ہوں یا مختلف ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیاں۔ ابن صفی کے ناولوں کی جھلکیاں آ ہی جاتی ہیں۔

سجادالحسنین: انڈیا میں واردات نام کی ایک فلم آئی تھی بہت پہلے متھن چکرورتی اس فلم کے مرکزی کردار تھے کہا جاتا ہے کہ اس فلم کا مرکزی خیال ابن صفی کے ناول سے لیا گیا تھا چوں کہ میں نے یہ فلم دیکھی نہیں ہے اس لیے شاید وثوق سے کچھ نہ کہہ سکوں البتہ مکرم نیاز صاحب بحیثیت فلم ناقد اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

مکرم نیاز: ''گن ماسٹر جی۔۹''، فلم ''سرکشا'' جاسوسی تھرلر فلم تھی، جو ممتاز بالی ووڈ اداکار متھن چکرورتی کی، بحیثیت جاسوس ''گن ماسٹر جی۔۹'' کی دو فلموں کی سیریز کی اولین فلم تھی، دوسری فلم تھی ''واردات''۔

ڈاکٹر سہیل محمود ٭

ابنِ صفی کا نظریۂ فن — جاسوسی دنیا کے پیش رس کے تناظر میں

کہنے کو تو جدید اردو ادب میں نثر کی ابتدا جاسوسی ناولوں سے ہی ہوئی تھی۔ مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا سے پہلے جاسوسی ناول ہی لکھے یا ترجمہ کیے تھے لیکن اس صنف تحریر میں جو اعزاز اور کمال ابن صفی کو حاصل ہوا ہے وہ دوسروں کے حصے میں نہیں آیا۔ انھوں نے نہ صرف بہت لکھا بلکہ بہت اعلیٰ بھی لکھا، اسقدر کہ اپنے زورِ تخیل سے وہ دنیائیں قائم کیں جو ان کے دور سے پچاس سے سو برس کے فاصلے پر تھیں۔ تحریر میں ایسی روانی ہے کہ قاری اپنی رفتار سے خوف کھانے لگتا ہے۔ ابن صفی نے نہ صرف بہت اعلیٰ لکھا بلکہ بہت زیادہ بھی لکھا اور ایک مختصر سی عمر میں اردو ادب کے دامن میں جاسوسی ادب کے دفتر قائم کر دیے۔ لیکن خود ابن صفی کے تنقیدی نظریات یا نظریہ فن ان کے کسی مبسوط یا تنقیدی مضمون کی صورت میں موجود نہیں لیکن ان کی کہانیوں کے پیش رس میں ہمیں بہت سے ایسے نکات مل جاتے ہیں جن سے ابن صفی کے نظریہ فن کی بازیافت ممکن ہے۔ زیر نظر مضمون میں وہی جواہر پارے جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

تعارف

ابن صفی ۲۶ جولائی ۱۹۲۸ کو متحدہ ہندوستان کے صوبے اتر پردیش کے گاؤں نارا میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام اسرار احمد رکھا گیا۔ اگست ۱۹۵۲ میں والدہ اور بہن کے ہمراہ پاکستان آ گئے۔ یہاں انھوں نے لالوکھیت میں رہائش اختیار کی، والد پہلے ہی کراچی میں مقیم تھے۔ صحافت سے وابستہ ہوئے اور طغرل فرغان اور سنکی سولجر جیسے اچھوتے قلمی نام اختیار کیے... اہل نقد آپ کی جاسوسی نگارشات کے دونوں سلسلوں سے جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کے فنی اوصاف پر بہت کچھ سپرد قلم کر چکے ہیں۔

جائزہ نقد (تابہ امروز)

ویکیپیڈیا کے مطابق ''ڈاکٹر اعجاز حسین نے ''اردو ادب آزادی کے بعد'' اور ڈاکٹر علی حیدر نے ''اردو ناول سمت و رفتار'' میں ان کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان میں ڈاکٹر سلیم احمد نے اپنی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' میں ''ابن صفی کا'' ذکر کیا ہے۔ ابن صفی کے فن کو سراہنے والی ادبی شخصیات میں بابائے اردو مولوی عبد الحق، پروفیسر مجنوں گورکھپوری، محمد حسن عسکری، کالم نگار حسن نثار، شاعر امجد

٭ راول پنڈی

اسلام امجد، صحافی وادیب قاضی اختر جونا گڑھی، سیاسی شخصیات میں فیلڈ مارشل ایوب خان اور محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب جیسے نام شامل ہیں۔لیکن ابن صفی پر جس تحقیقی کام کو مبسوط اور مکمل کہا جاسکتا ہے وہ ڈاکٹر خالد جاوید،۲۰۰۶ء کا مضمون ''ابن صفی چند معروضات'' ہے جو ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''کہانی موت اور آخری بدیسی زبان'' میں شامل ہے۔خرم علی شفیق بھی ابن صفی پر دو کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔اس کے بعد راشد اشرف نے ۲۰۱۳ء میں ابن صفی۔شخصیت وفن لکھی۔اہل نقد اسے تفہیم ابن صفی میں وہی مقام دیتے ہیں جو غالب شناسی کے زمرے میں یادگار غالب کو ہے۔اسی سے ملتا جلتا کام بھارت میں خالد جاوید نے ''ابن صفی شخصیت اورفن کے آئینے میں'' ۲۰۱۵ء میں انجام دیا۔راشد اشرف نے اس کے بعد''ابن صفی کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا'' کے نام سے ایک کتاب بھی تالیف کی جس میں ابن صفی سے متعلق مختلف مصنّفین کی آرا کو یکجا کیا گیا ہے۔ایک تازہ ترین اور قابل قدر اضافہ غیر شبنم امان کا ابن صفی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جو انھوں نے ۲۰۲۰ء میں مکمل کیا ہے۔

احاطہ تحقیق

ابن صفی کے زودنویس قلم سے جاسوسی ناولوں کے دو عظیم سلسلے جاسوسی دنیا کے ناولوں کا سلسلہ اور عمران سیریز کے ناولوں کا سلسلہ برآمد ہوئے۔زیر نظر تحقیق میں ہم جاسوسی دنیا کے سلسلے کے ناولوں کے پیش لفظ کے جائزے تک محدود رہیں گے جنھیں بسا اوقات ابن صفی نے پیش رس کے عنوان سے لکھا ہے۔ ہمارا مقصود اور اس مطالعے کی اغراض ابن صفی کے جاسوسی دنیا کے سلسلے کے ناولوں کے پیش لفظ، دیباچوں یا مقدموں کا جائزہ لے کر ان کے تنقیدی نظریات یا نظریہ فن کا پتا چلانا ہے۔بالعموم یہ وہ ناول ہیں جو الہ آباد سے چھپ چکے تھے اور جب ابن صفی بھارت سے پاکستان اور پاکستان میں لاہور سے کراچی منتقل ہوئے تو اسرار پبلی کیشنز سے ان ناولوں کو دوبارہ سے چھاپا (اشرف ۲۰۱۳ء)۔زیر نظر مضمون کے لیے جن ناولوں کے پیشرس کا جائزہ لیا گیا ہے ان میں جاسوسی دنیا میں جو ناول چھپے ان میں دلیر مجرم،خوفناک جنگل،عورت فروش کا قاتل، تجوری کا راز،فریدی اور لیونارڈ، پراسرار کنواں،خطرناک بوڑھا،مصنوعی ناک، پراسرار اجنبی،احمقوں کا چکر، پہاڑوں کی ملکہ،موت کی آندھی، ہیرے کی کان، تجوری کا گیت، آتشی پرندہ،خونی پتھر، بھیانک جزیرہ،عجیب آوازیں،رقاصہ کا قتل، نیلی روشنی،شاہی نقارہ،خون کا دریا،قاتل سنگریزے، پتھر کی چیخ،خوفناک ہنگامہ،چار شکاری، بیگناہ مجرم،لاشوں کا آبشار،مونچھ مونڈنے والی،گیتوں کے دھماکے،سیاہ پوش لٹیرا، برف کے بھوت، پُرہول سناٹا،چیختے دریچے،خطرناک دشمن،جنگل کی آگ، کچلی ہوئی لاش،اندھیرے کا شہنشاہ، پُراسرار وصیت،موت کی چٹان، نیلی لکیر،تاریک سائے،سازش کا جال،خونی بگولے،لاشوں کا سوداگر، ہولناک ویرانے،لیونارڈ کی واپسی، پاگل خانے کا قیدی،شعلوں کا ناچ، گیارہواں زینہ،سرخ دائرہ،خونخوار لڑکیاں،سائے کی لاش، پہلا شعلہ،دوسرا شعلہ،تیسرا شعلہ،جہنم کا شعلہ،زہریلے تیر، پانی کا دھواں،لاش کا قہقہہ،ڈاکٹر ڈریڈ،شیطان کی محبوبہ،انوکھے رقاص، پراسرار موجد،طوفان کا اغوا، رائفل کا نغمہ،ٹھنڈی آگ، جاپان کا فتنہ،چشمنوں کا شہر، لاش کا بلاوا، گارڈ کا اغوا، شادی کا ہنگامہ، زمین کے بادل، وبائی ہیجان، اونچا شکار، آوارہ شہزادہ۔ چاندنی کا دھواں،سیکڑوں ہمشکل۔لڑاکوں کی بستی، الٹی تصویر، چمکیلا غبار، انوکھی رہزنی، دھواں اٹھ رہا تھا۔فرہاد ۵۹، زہریلا آدمی، پرنس وحشی، بیچارہ بیچاری، اشاروں کے شکار،ستاروں کی موت،

ستاروں کی چیخیں، ساتواں جزیرہ، شیطانی جھیل، سنہری چنگاریاں، سہمی ہوئی لڑکی، قاتل کا ہاتھ، رلانے والی، تصویر کا دشمن، دیوپیکر درندہ، ٹسڈل کی بیدری، خوفناک منصوبہ۔ تباہی کا خواہب مہلک شناسائی، دھواں ہوئی دیوار، خونی ریشے، تیسری ناگن، ریگم بالا، بھیڑیئے کی آواز، اجنبی کا فرار، روشن ہیولی، زردفتنہ، ریت کا دیوتا، سانپوں کا مسیحا، ٹھنڈا جہنم، عظیم حماقت، زہریلا سیارہ، نیلم کی واپسی، موروثی ہوس، دہشتگر، شکاری پر چھائیاں، پرچھائیوں کے حملے۔ سایوں کا ٹکراؤ، ہمزاد کا مسکن، صحرائی دیوانہ شامل ہیں۔

جاسوسی دنیا کے پیش رس کا تحقیقی مطالعہ

ابن صفی کے نزدیک فنی تکنیکیوں میں کردار نگاری اور پلاٹ کی منطقی بنت سب سے اہم ہے۔ پلاٹ نہ صرف ہر ناول میں انفرادی سطح پر بہت اہم ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناولوں کے کرداروں میں جو تبدیلی یا بدلاؤ آرہا ہے یہ ایک بڑے پلاٹ کا حصہ ہیں اور ان میں ایک منطقی تسلسل درکار ہے۔ یہ کم وبیش وہی چیز ہے جسے مجنوں گورکھپوری کے حوالے سے ڈاکٹر خالد جاوید نے ابن صفی کا ''مہا کاویہ یا مہا بیانیہ'' قرار دیا تھا۔[۱] مثال کے طور پر جاسوسی دنیا کے ابن صفی نے اپنے پہلے ناول ''دلیر مجرم'' کی اشاعت مکرر (کے پیش لفظ کے لیے پیش رس کے بجائے دیباچے کی اصطلاح استعمال کی ہے۔)۔ انھوں نے اصل ناول کے اندر تبدیلیوں کی اکساہٹ کو اس بنیاد پر رد کیا ہے کہ اس سے ناول کی نامیاتی بُنت متاثر ہوگی۔ چناں چہ دیباچے میں وہ لکھتے ہیں'' یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی بالغ آدمی اپنے بچپن کی تصویر میں داڑھی مونچھوں کا اضافہ کردے۔''[۲] اس دیباچے سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ سیریز کے کرداروں کی نفسیات بھی رفتہ رفتہ بدلتی رہتی ہے۔ اپنے کردار حمید کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ''یہ اس زمانے کی کہانی ہے جس میاں حمید محبوباؤں کے لیے بڑی سنجیدگی سے دو چار آنسو بہالیا کرتے تھے اور وہ کسی حد افلاطونی عشق کے بھی قائل تھے۔ بہرحال وہ اتنے اسمارٹ نہیں تھے جتنے آج کل نظر آتے ہیں۔ فریدی کی شخصیت میں بھی تھوڑا بہت کچا پن تھا لیکن اس کے باوجود بھی وہ آپ کو اس پوری کہانی پر چھایا ہوا نظر آئے گا۔'' کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار وہ جاسوسی دنیا کی دوسری جلد کے پہلے ناول ''فریدی اور لیونارڈ'' میں یوں کرتے ہیں کہ ''جب بھی میں جاسوسی دنیا کا کوئی ابتدائی ناول دوبارہ چھاپنے لگتا ہوں تو بے اختیار یہی دل چاہتا ہے کہ اس میں کچھ تبدیلیاں کی جائیں لیکن یہ سوچ کر باز ہی رہنا پڑتا ہے کہ ایسا کرنے سے میرے پڑھنے والوں کو فریدی اور حمید کے کرداروں میں تدریجی ارتقا کا اندازہ کرد شوار ہوجائے گا۔ حمید صاحب کے متعلق اب یہ کہا جارہا ہے کہ وہ سنجیدہ ہوتے جارہے ہیں لیکن آپ آخر یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ فریدی بھی تو بہتیری تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ حمید میں بہت زیادہ سنجیدگی آگئی ہے۔ وہ اب بھی عموماً غیر سنجیدہ ہی رہتا ہے مگر اس کے مزاج میں اب پھکڑ پن نہیں رہ گیا۔ وہ جچی تلی بات کرتا ہے اور موقع بے موقع ہنسانے کی کوشش نہیں کرتا۔''[۳] خونی پتھر کے پیش رس کو پیش لفظ لکھا گیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ کیسے ''قارئین فریدی اور حمید کے کرداروں سے مانوس ہوچکے ہیں تاہم وہ انور اور رشیدہ کے کرداروں سے شناسائی قائم کرنے میں تردد محسوس کررہے ہیں۔''[۴]

''عورت فروش کا قاتل'' کے پیشرس میں آپ کہانی کے منصب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کہانی زوردار ہونی چاہیے اور اگر چہ اس کا بنیادی تفاعل تفریح ہے مگر یہ سبق آموز بھی ہوسکتی ہیں۔'' یہ کہانی آپ (قارئین) کے الفاظ میں زوردار ہے مگر یہ

محض تفریح پر مبنی نہیں بلکہ سبق آموز ہے۔'' (۵) اپنے اس جملے سے انھوں نے گویا ادب برائے فن اور ادب برائے زندگی جیسے پیچیدہ نظریات کے عملی افادے کا تعین کر دیا ہے۔ اسی طرح آتشی پرندے کے پیشرس میں مصنف نے ایک قاری کے خط کے پس منظر میں ادب کی افادیت کے موضوع پر ایک پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ کراچی سے آنے والے ایک خط کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ ''مجھے للکارا گیا ہے کہ قوم کو سدھارنے کی کوشش کروں لیکن قوم اس قلم سے صرف کہانیوں کا نزول چاہتی ہے۔'' (۶) ناول ''موت کی چٹان'' کے بارے میں لکھا ہے پڑھنے والوں کا اصرار کہ پیشرس بھی لذیذ ہونا چاہیے۔ مگر پیشرس میں تو میں خود ہی مرغا بن کر کھاؤں تو آپ کو ہنسی آئے گی کیوں کہ پیشرس میں میرے علاوہ اور کون ہوتا ہے... مجھے میری کتابوں میں تلاش کرنے کی عادت ڈالیے، وہیں ملوں گا بالمشافہ قسم کی ملاقات پر آپ یقیناً مایوس ہوں گے۔'' (۷)

تجسس کو ابھارنے کے لیے محیر العقول واقعات کے پیچیدہ سلسلوں کو استعمال کرنا ابن صفی کی تکنیک کا اہم حصہ ہے اور اس حوالے سے وہ اپنے ناول ''تجوری کا راز'' کے پیشرس میں یوں رقم طراز ہیں کہ ''آپ اس ناول کو پلاٹ اور تکنیک کے اعتبار سے سابقہ ناولوں سے کہیں زیادہ دل چسپ پائیں گے۔ پھر ناول نگاری میں برتی گئی ادبی صنعتوں کا تعارف یوں کراتے ہیں کہ اس میں ''محیر العقول واقعات دل دہلا دینے والے مناظر، جرات وہمت سے لبریز کارنامے، سرجنٹ حمید کی دل چسپ حرکتیں اور آپ کے ہر دلعزیز انسپکٹر فریدی کا عجیب وغریب رول، آپ کے پسندیدہ جاسوس رکے ہوئے نظر آئیں گے۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ ایک بار کتاب اٹھانے کے بعد اختتام پر پہنچے بغیر کتاب ہاتھ سے نہیں رکھ سکتے'' اسی کے ساتھ ابن صفی اپنے اس ناول کی ایک اور اچھوتی خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ''اس ناول کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئی خون نہیں ہوا پھر بھی ایسے واقعات سے لبریز ہے کہ دل چسپی بڑھتی جاتی ہے۔'' (۸) وہ لوگ جنھوں نے کبھی جاسوسی ناولوں کا مطالعہ کیا ہو وہ جانتے ہوں گے کہ جاسوسی ناولوں میں اگر قتل کی وارداتیں نہ ہوں تو ان میں تجسس اور دل چسپی برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہوگا۔ پر اسرار کنواں میں ابن صفی پیشرس میں اپنے کرداروں کا تعارف اس اچھوتے انداز میں کراتے ہیں کہ گویا اپنی تخلیقات پر اپنا فخر وانبساط چھپا نہ پا رہے ہوں۔ یہ تخلیقات معمول کی دنیا سے نہیں تھیں۔ انھیں نیم سائنس فکشن کے طور پر متعارف کرایا گیا تھا...'' طارق کے پاس عجیب وغریب نیولا تھا جو پل بھر میں بڑے بڑے شہتیر کاٹ کر پھینک دیتا تھا۔ پرویز ہے ایک چالیس سال کا بچہ جو گھٹنوں کے بل چلتا تھا۔ فیڈر سے دودھ پیتا تھا اور ملازمین اسے گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ اپنی منظر کشی کے حوالے سے بوالعجبیوں کا تعارف یوں کراتے ہیں۔ وہ عمارت جس کی دیواروں سے درندوں کی آوازیں آتی تھیں اور پوری عمارت کسی جنگل کی طرح گونجنے لگتی تھی اور ایک کنواں جس سے انگاروں کی بوچھاڑیں نکلتی ہیں۔ اپنے ایک اور ناول قاتل سنگریزے کے پیش رس میں ابن صفی لکھتے ہیں کہ ''قاتل سنگریزے کو آپ ہر حیثیت سے دل چسپ پائیں گے۔ اس میں تحیر، مزاح، کردار نگاری اور داستان کی دل چسپی سب کچھ موجود ہے۔ ایک کرنل کی موت پر اسرار حالات میں ہوئی۔ وہ اپنے ریوالور سے کسی پر حملہ کرتا ہے مگر خود مرجاتا ہے لیکن اسے گولی نہیں لگی تھی، اسکا بھائی پھول توڑتے وقت چیخ کر گرتا ہے اور مرجاتا ہے۔ پھر بھتیجا اپنی کار میں بیہوش پایا جاتا ہے۔ آسمان سے مردہ پرندوں کی بارش ہوتی ہے ایک عجیب وغریب جانور کا تذکرہ جس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا۔ پر اسرار آدمی کی داستان جس سے سب خائف رہتے تھے جو نوجوان لڑکیوں کو اٹھالے جاتا

تھا اور اس نے کرنسل سے انتقام لینے کی قسم اٹھائی تھی۔فریدی اس ناول میں بہت پرسکون نظر آتا ہےلیکن وہ خاموشی سے کیا کرتا رہا تھا؟ انکشاف ہوتے ہی آپ چونک پڑیں گے۔ایک لڑکی تین مرد، سارجنٹ حمید نے دل پر جبر کرکے ہاتھ تو ایک حماقت کر بیٹھا لیکن وہ حماقت بھی کام آ گئی۔‘‘(۹) جلد ۹ کے دوسرے ناول ’’بے گناہ مجرم‘‘ کے پیش رس میں لکھتے ہیں کہ اس ناول کی کہانی اپنے پیچیدہ پلاٹ کے اعتبار سے دنیا کی چند انتہائی پراسرار کہانیوں میں سے ایک ہے۔یہی شخص جو قاتل ہےمگر بے گناہ ہے۔ایک عورت جس نے شوہر کو دھوکا دیا ایک عجیب وغریب گڑیا! ایک آدمی جو گرمیوں میں پاگل ہوجاتا ہے جس کی مونچھیں ابرو پلکیں، چندیا سب کچھ صاف تھی۔قتل کا ایک حیرت انگیز کیس جس میں میاں حمید بے پناہ دل چسپی لے رہے ہیں، حمید کے انوکھے لطیفے، اس کے قہقہے آپ کبھی نہ بھول سکیں گے،فریدی نے زیادہ پریشانی نہیں دکھائی،مگر ایک منزل پر پہنچ کر وہ بھی چکرا جاتا ہے۔

ناول برف کے بھوت کے پبلشر کی حیثیت سے ابن صفی خود اپنے بارے میں صیغہ غائب استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’برفانی پہاڑیوں اور گھپاؤں کی ایک ایسی طلسماتی فضا ملتی ہے کہ جہاں پہنچ کر انسان سب کچھ بھول جاتا ہے...‘‘ ابن صفی کے جادونگار قلم نے اس تحیر واستعجاب کی آتش بازیوں میں رن وطلسمات کے قہقہہ آفرین پھول کھلائے ہیں، ایک بار پھر انھوں نے ثابت کردیا کہ ان کے قلم کی انگڑائیوں میں لافانی دل چسپیوں اور انوکھے پن کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ایک شہنشاہ کی طرح وہ جب اور جس طرح چاہتے ہیں اپنے قلم کو دل چسپ سمتوں میں موڑ دیتے ہیں۔جلد ۹ کے پہلے ناول ’’چار شکاری‘‘ کے تعارف میں پیشرس کے دوران پبلشر (ابن صفی) کہتے ہیں کہ ایک بینک کا ڈیڑھ من سونا خاک ہوجاتا ہےاور ایسے شکاری جو کووں کا شکار کھیلتے تھے... بھلاسونے کی خاک اور کووں سے کیا تعلق ہوسکتا ہےلیکن فریدی اپنی حیرت انگیز معلومات کی بنا پر دونوں کا تعلق ڈھونڈ ہی نکالتا ہے... حمید تنہا مجرموں کا مقابلہ کرتا ہے...(۱۰) اندھیرے کا شہنشاہ(۱۱) کا پیشرس ابن صفی نے اپنے نام سے لکھا ہے اور اس کی خصوصیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ’’اندھیرے کا شہنشاہ‘‘ سنسنی خیز، تحیر اور رونگٹے کھڑے کردینے والی لڑائیوں کا طوفان لے کر ابھرتا ہے اس میں ایک بہت بڑا مجرم ہے۔ایک قبیلے کا مذہبی پیشوا اور وہ بھی ایک غیر ملکی سرزمین سے تعلق رکھنے والا اور سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ اندھا ہےمگر چا آنکھوں و الوں کے کان کترتا ہے اس کی بے پناہ طاقتیں فریدہ کو بھی مبہوت کردیتی ہیں... لوگ کتے پالتے ہیں، کبوتر اور طوطے پالے ہیں، حمید بکرا پالتا ہے اور آپ یقین کیجے یہ ’’برخوردار بغراخان‘‘ حمید کی سابقہ محبوبہ ’’چوہیا‘‘ سے کم قیامت خیز نہیں ہیں۔قاسم بھی ہےمگر س کی حماقتیں ذرا دبی ہوئی ہیں۔

ابن صفی کے نظریہ فن کا ایک اور اہم عنصر ان کا سماجی شعور ہے اور متعدد پیشرسوں سے اس کا اظہار چھلک جاتا ہے۔مثال کے طور پر ’’مصنوعی ناک‘‘ دوسری جلد کا چوتھا ناول ہے۔اس کے بارے میں ابن صفی کا کہنا ہے کہ ’’یہ ناول ایک چیلنج کے ساتھ لکھا گیا اس کا مرکزی کردار صرف ڈاکو نہیں ہے۔بلیک میلر، خونی اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑا مفکر اور سائنسدان بھی ہے۔قدم قدم پر آپ کو ایسی باتیں ملیں گی کہ آپ کانپ اٹھیں گے۔ننگی لاشوں کا چھت سے ٹپکنا، پانچ ہزار کبوتروں کا خون، نواب رشید الزماں کی فریدی سے دشمنی اور پراسرار کنوں کا عجیب وغریب بوڑھا، طارق یہ سب کو اپ کو اسی ناول میں ملے گا۔ایک اور بڑے مزے دار آدمی کنور ظفر علی خان جو ہمیشہ پراسرار بنا رہا ہے اور جابر کا انجام وہ کون تھا کیا کرتا تھا اور کیوں کرتا تھا ان سب کا جواب مصنوعی ناک دے گی

اور آخر میں اپ کا ہردلعزیز انسپکٹر پاس بار آپ کو بے انتہا مصائب میں گرفتار نظر آئے گا۔‘‘(۱۲) اس سے پہلے جاسوسی دنیا کی تیسری جلد کے پہلے ناول ’’پراسرار اجنبی‘‘ مصنف کی نظر میں الجھے ہوئے واقعات کی بنا پر دل چسپ ہے۔ اس میں انسانی کرداروں کی نزاکتوں کے حوالے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ’’جرائم کسی خاص طبقے تک محدود نہیں، مصلح بھی مجرم ہوسکتا ہے، ایک ادیب بھی جرم کرسکتا ہے۔لوگ جنھیں منصف سمجھتے ہیں وہ بھی مجرم ہوسکتے ہیں۔محرم ایسے بھی ہوسکتے ہیں جنھیں سوسائٹی عموماً بے ضرر سمجھتی ہے لیکن جب ان کے سیاہ کارناموں سے پردہ اٹھتا ہے تو دنیا انگشت بہ دنداں رہ جاتی ہے۔‘‘(۱۳) اسی ناول میں عورت کی نفسیات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے وہ ابن صفی کہتے ہیں کہ ’’ایک انتہائی چالاک عورت جس کی ایک ہی جنبش ابرو پر بڑے بڑے مجرموں کے دل دہل جاتے ہیں وہ اپنی جنسی خواہشات کے طوفان میں گھر کرکس طرح بے بس و مجبور ہوجاتی ہے۔‘‘ ’’تاریک سائے‘‘ کا پیش رس ایک سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ ابن صفی اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کہانی میں چھپا ہوا ایک گہرا طنز بھی ہے، ان لوگوں پر جو دوسروں کی ایجادات پر دوسروں کے کارناموں پر اپنی شہرت کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں وہ چاہے سائنٹسٹ ہوں، فلسفی، مصنف یا کاریگر! آخری صفحات میں فریدی کی زبان سے ایسے نقالوں کا پردہ فاش ہوتے دیکھیے حالاں کہ فریدی صرف مجرم کے بارے میں ہی بتاتا ہے لیکن یہ بات ہر اس فرد پر عائد ہوتی ہے جو دوسرے کی ایجاد کے امتیاز کو چھین کو اپنا بنانا چاہتا ہے۔‘‘(۱۴) ابن صفی نے اس کہانی میں دو تین باتیں جان بوجھ کر چھوڑ دی ہیں ان کے اشارے بہت لطیف ہیں، آپ خود سوچیے کہ فریدی نے ایسا کیوں کیا؟ اور تھوڑا سا سوچنے پر آپ کو اس کا جواب مل جائے گا۔

سماجی شعور کے ساتھ ساتھ ایک اور عنصر جو ابن صفی کے نظریہ فن کا اہم حصہ ہے اور ان کے پیشرسوں میں جس کا جا بجا اظہار ہے وہ ان کا نفسیاتی شعور ہے۔ وہ جس گہرائی سے اپنے کرداروں کا نفسیاتی پس منظر بنتے ہیں اس کا اظہار بھی برملا کرتے ہیں۔انسانی نفسیاتی پیچیدگیوں کا گہرا ادراک تواتر سے ان کے متعدد ناولوں سے جھلکتا ہے۔مثال کے طور پر’ ’لاشوں کا آبشار‘‘ وہ ناول ہے جس کا ہر لفظ، ہر جملہ اپنی جگہ پر نفسیاتی حقیقتوں کے ذخیرے رکھتا ہے اس میں ایک ایسی کشش اور جاذبیت ہے کہ ابتدا سے انتہا تک ہر کردار، کسی ڈراما کے افراد کی طرح ہنستا بولتا اور چیختا نظر آتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار کرن، فریدی اور حمید کے بجائے ایک مجرم ہے مگر ایسا مجرم جو سماج اور سوسائٹی کے لیے ہمیشہ اسے ایک مسئلہ رہا ہے۔ ایسا عجیب وغریب سوال جس کا جواب اب تک نہ دیا جاسکتا۔ ’’اس ناول میں شاید ہی کوئی ایسا کردار ہو جسے آسانی سے بھلایا جاسکے!‘‘(۱۵) آٹھویں جلد کے پہلے ناول پتھر کی چیخ کے بارے میں پیش لفظ کے عنوان سے ابن صفی لکھتے ہیں کہ’’ یہ ناول ایک بالکل انوکھی اور نئی کہانی پیش کرتا ہے۔ جرم کرنے والوں میں سادیت پسند (سیڈسٹ) یا اذیت کوش آج کل نمایاں نظر آتے ہیں۔آئے دن آپ اخبارات میں کم عمر لڑکوں اور لڑکیوں کے اغوا اور بعد میں ان کے بے تحمانہ قتل کے بارے میں پڑھتے ہوں گے۔آپ یقین مانیں کہ ایسے بھیانک جرائم کے پیچھے ایسی معصوم صورتیں بھی ہوتی ہیں جن کی طرف کسی کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔ یہ اپنے جنسی دباؤ سے مجبور ہوکر اس حد تک خطرناک، مریضانہ اور بھیانک شکل اختیار کرلیتے ہیں کہ انسانی ہڈیوں کے چچوڑنے میں رسیلی جلیبیوں کا مزہ آتا ہے۔ ایسا ہی ایک کردار آپ کو اس ناول میں ملے گا۔‘‘(۱۶)

گیارہوں جلد کے دوسرے ناول ’’پرہول سناٹا‘‘ میں مصنف نے ایک نیا تجربہ کیا ہے اور وہ یہ ہے، مجرم کا ذہن کس طرح اپنے

حالات پر پردہ ڈالتا ہے؟ وقت آنے پر کتنا بے رحم، سفاک اور درندہ صفت ثابت ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کہانی کے دو بھیانک کرداروں سے ہو سکے گا۔[۱۷]

اور سنسنی خیز کہانی کی کڑیاں ہیں اس کہانی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا تحیر اور مجرم ہے۔مجرم کے سامنے آتے ہی قاری کے ذہن کو جھٹکا لگتا ہے اور پھر وہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے ابتدا کی تفریحات کی نوعیت سنجیدگی میں بدل جاتی ہے۔'[۱۸]

''سازش کا جال کے پیشرس میں لکھا ہے کہ''اس کے کرداروں میں ایک ایسی عورت بھی ہے جس سے آپ کو ہمدردی ہوگی، جس پر غصہ بھی آئے گا، جھلاہٹ بھی ہوگی، آپ قہقہے بھی لگائیں گے، نفرت کریں گے اور پھر اس کی تعریف کرنے پر بھی مجبور ہوں گے... سازش کا جال کا مجرم انتہائی چالاک، سفاک مگر بے حد پھرتیلا ہے وہ ایسے جرموں میں سے جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ''یہ دلاورا ست دزدے کہ بکف چراغ دارد' آپ کی الجھن ہر لمحہ بڑھتی رہے گی کہ بھورے بالوں والا دستانے پہننے والا یہ آدمی کون ہے۔دھڑکنیں ہر لحظہ بڑھتی جائیں گی اور عجیب وغریب مجرم سامنے آئے گا تو آپ اچھل پڑیں گے۔''ابن صفی اپنے قارئین کی ذہانت کے قائل ہیں اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے ناول صرف پڑھنے والے ڈھیر کی چیز بن کر نہ رہ جائیں بلکہ ان میں ذہانت بھی ہو، معلومات بھی ہوں، غور وفکر بھی ہو اور گہرائی بھی ہو۔اس گہرائی اور بلند فکری کی مثال اس کہانی میں چھوٹے چھوٹے وہ سیکڑوں جملے ہیں جو پروفیسر داغ کی زبان سے کہلوائے گئے ہیں یا فریدی نے انھیں ادا کیا ہے۔اس کے علاوہ تاریک سائے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا ہیبت ناک ماحول ہے۔سنسنی خیز، پراسرار رونگٹے کھڑے کردینے والا ماحول! کہیں کہیں تو دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہوجاتی ہیں کہ آپ ہی آپ سارا جسم کانپ اٹھتا ہے۔

تلخیص

پیش رس سے حاصل کیے گئے مندرجہ بالا اقتباسات کا تجزیہ کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ناول نگاری کے حوالے سے ابن صفی کے نظریہ فن میں کرداروں اور ان کے منطقی ارتقا کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اپنے پرانے ناولوں کی اشاعت نو کے موقع پر ناول کے پلاٹ میں بہتری کی غرض سے انھوں نے کرداروں میں تبدیلیاں کرنے کے تصور کو رد کردیا۔اپنی تحریروں میں جس دوسرے نکتے پر انھوں نے سب سے زیادہ زور دیا وہ پلاٹ کی بنت ہے۔وہ پلاٹ کی پیچیدگی کو فن ناول نگاری کا اہم نکتہ تصور کرتے ہیں اور اس پیچیدگی کے لیے وہ تحیر، تجسس، پراسراریت سنسنی اور قول محال جیسے وسائل استعمال کرتے ہیں، وہ اپنے معاصر بین الاقوامی ادب کی ایک تکنیک سائنس فکشن اور متخیلّہ کے زور پر ایجادات سے بھی اپنے قارئین کے لیے دل چسپی و رغبت کا سامان پیدا کرتے ہیں۔

تاہم اس کے باوجود ان کا پلاٹ اکہرا ہوتا ہے اور نہ ہی انھوں نے اپنے پلاٹ میں متوازی دھاروں یا علامتی پیچیدگیوں کا دعویٰ کیا ہے۔البتہ قاری کے ذہن کو جھٹکے دینے پر یقین رکھتے ہیں۔انھیں کند مغز قاری پسند ہیں نہ وہ ان کے لیے لکھتے ہیں۔ان کی تکنیک کا تیسرا اہم نکتہ مزاح، طنز یا مضحک صورتحال تخلیق کرنا ہے۔بعض ناقدین کے مطابق ابن صفی تجسس سے بھی بڑھ کر مزاح کی تکنیک استعمال کرتے ہیں مثال کے طور پر محمد مقیم لکھتے ہیں کہ'' ان کی تحریروں میں پلاٹ کی دل چسپی مزاح کے سہارے قائم ہوتی ہے۔نہ صرف

پلاٹ کی دل چسپی بلکہ کہانی بھی اکثر مزاح کے ذریعہ ہی آگے بڑھتی ہے۔ مزاح ابن صفی کے بیانیے میں اس قدر غالب رہتا ہے کہ جزئیات نگاری نہ ہونے کے باوجود جہاں کہیں فروعات سے کام لیا گیا ہے، فروعات نگاری مزاح ہی کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ بہ لفظ دیگر فروعات نگاری اور حس مزاح ایک دوسرے میں تحلیل ہوجاتے ہیں۔[19]

راقم کے خیال میں البتہ ان کی تکنیک کا بنیادہ جز وتجسس وتصادم ہے اور مزاح ضمناً مگر بھرپور طریقے سے ان کے پلاٹ کی بنت میں شامل رہتا ہے۔ ابن صفی کے پیشرس سے ہمیں ان کی زبان پر دسترس جانچنے کا موقع بھی ملتا ہے اگرچہ اس حوالے سے زیادہ تر پیشرس مارکیٹنگ اور ایڈورٹائزنگ کے جنگلز کے زیادہ قریب ہیں تاہم اس ایڈورٹائزنگ میں بھی انھوں نے سکہ رائج الوقت یعنی جنس کو ناول بیچنے کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ایسے کئی مواقع تھے جہاں وہ سراپا نگاری اور جنسیت کو نمایاں کر کے اپنے ناولوں کی طلب بڑھا سکتے تھے مگر انھوں نے یہ جادہ پائمال نہیں چنا۔

ابن صفی کی تکنیک کے تشکیلی عناصر میں ''مکالمہ نگاری'' بہت اہم ہے اور اس کا عکس ہمیں پیشرس میں بالواسطہ طور پر ملتا ہے... ''ابن صفی کی مکالمہ نگاری عموماً چھوٹے چھوٹے فقروں اور جملوں پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کے یہاں مکالموں ہی کے ذریعے مزاح کا ظہور ہوتا ہے اور ابن صفی کی مزاح نگاری اپنے شباب پر ہوتی ہے۔''[20] البتہ بعض اوقات طویل مکالمے بھی دیکھنے کے ملتے ہیں اور ان کا سب سے توانا پہلو یہ ہے کہ انھی مکالموں میں بڑے بڑے نظریات، فلسفیانہ خیالات، دانشورانہ تفکرات اور مسلمہ اصول ونظریات پر تنقید کی جاتی ہے۔

مآخذ

۱۔ ابنِ صفی، ''آتشی پرندے''، کراچی: اسرار پبلی کیشنز، ۱۹۵۳ء

۲۔ راشد اشرف، ''ابن صفی شخصیت اور فن''، بزم تخلیق ادب کراچی پاکستان، ۲۰۱۳ء

۳۔ ابنِ صفی، ''اندھیرے کا شہنشاہ''، اسرار پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۵۵ء

۴۔ بشیر، ن، (۲۰۲۲ء)، ''ابن صفی: ایک غیر ادبی ناول نگار''، ملاحظہ کیجیے:
Retrieved from https://jang‹com.pk/news/1048259: https://jang.com.pk/news/1048259

۵۔ ابنِ صفی، ''پتھر کی چیخ''، اسرار پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۵۴ء

۶۔ ایضاً، ''پراسرار اجنبی''، ایضاً، ۱۹۵۲ء

۷۔ ایضاً، ''پرہول سناٹا''، ایضاً، ۱۹۵۴ء

۸۔ ایضاً، ''تاریک سائے''، ایضاً، ۱۹۵۵ء

۹۔ ایضاً، ''تجوری کا راز''، ایضاً، ۱۹۵۲ء

۱۰۔ ایضاً، ''چار شکاری''، ایضاً، ۱۹۵۴ء

۱۱۔ ایضاً، ''چیختے دریچے''، ایضاً، ۱۹۵۴ء

۱۲۔ ایضاً، م، حنیف، (۲۰۱۲, جون)، سری ادب کا بے تاج بادشاہ،
http://www.urdufalak.net/urdu/%D8%B3%D8%B1%DB%8C-%D8%A7%D8%AF%D8%A8-%DA%A9%D8%A7-%

D8%A8%DB%92-%D8%AA%D8%A7%D8%AC-%D8%A8%D8%A7%D8%AF%D8%B4%D8%A7%DB%81-%D8%AD%D8%B5%DB%81-%D8%AF%D9%88%D9%85-%D8%A7%D8%A8%D9%86-%D8%B5%D9%81%DB%8C/:

http://www.urdufalak.net/urdu/%D8%B3%D8%B1%DB%8C-%D8%A7%D8%AF%D8%A8-%DA%A9%D8%A7-%D8%A8%DB%92-%D8%AA%D8%A7%D8%AC-%D8%A8%D8%A7%D8%AF%D8%B4%D8%A7%DB%81-%D8%AD%D8%B5%DB%81-%D8%AF%D9%88%D9%85-%D8%A7%D8%A8%D9%86-%D8%B5%D9%81%DB%8C/

۱۳۔ ج، ڈ، خالد، ''ابن صفی: چند معروضات''، مشمولہ: ''اردو میں پاپولر لٹریچر روایت اور اہمیت''، مرتبین: ارتضیٰ کریم، اظہار عثمانی، دہلی: اردو اکادمی، ۲۰۰۷ء

۱۴۔ ا، ر، رضی (ستمبر ۲۰۲۱ء)، ''عقیل عباس جعفری کی تحقیق: ناول نگار ابن صفی کی تخلیقی قوت کسی سائنسدان سے کم نہ تھی''، ملاحظہ کیجیے:
Retrieved from girdopesh.com: https://www.girdopesh.com/aqeel-abbas-jafry-3/

۱۵۔ ابنِ صفی، ''خونی پتھر''، اسرار پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۵۳ء

۱۶۔ ایضاً، ''دلیر مجرم''، ایضاً، ۱۹۵۵ء

۱۷۔ ایضاً، ''عورت فروش کا قاتل''، ایضاً، ۱۹۵۳ء

۱۸۔ ایضاً، ''فریدی اور لیونارڈ''، ایضاً، ۱۹۵۲ء

۱۹۔ ایضاً، ''قاتل سنگریزے''، ایضاً، ۱۹۵۳ء

۲۰۔ ایضاً، ''لاشوں کا آبشار''، ایضاً، ۱۹۵۴ء

۲۱۔ ایضاً، ''مصنوعی ناک''، ایضاً، ۱۹۵۲ء

۲۲۔ م مقیم، ''ابنِ صفی کی تکنیک''، اردو ریسرچ جرنل، نئی دہلی، جولائی ۲۰۱۵ء

۲۳۔ ابنِ صفی، ''موت کی چٹان''، اسرار پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۵۵ء

https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-1/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-2/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-3/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-4/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-5/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-6/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-7/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-8/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-9/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-10/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-11/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-12/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-13/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-14/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-15/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-16/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-17/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-18/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-19/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-20/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-21/

https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-22/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-23/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-24/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-25/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-26/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-27/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-28/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-29/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-30/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-31/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-32/
https://rspk.paksociety.com/jassosi-dunya/jasoosi-duniya-jild-33/

محمد فیصل ٭

سائنس فکشن کی مختصر تاریخ اور ابنِ صفی کے سائنس فکشن ناول

لفظ ''سائنس'' کو اس کے اصل معنی اس وقت ملے جب شعور اس نہج پر پہنچا کہ کسی بھی تجربے کی بنیاد ٹھوس نتائج اور وجوہات پر مشتمل ہونی چاہیے وگرنہ نظریہ صرف خیال بن کر رہ جاتا ہے۔ ادب کی مروّجہ اصناف میں فکشن کو ہمیشہ سے پذیرائی ملتی رہی کہ قصے کہانیاں سننا انسان کی فطری جبلت ہے۔ اس ضمن میں جہاں بھی داستانوں کا ذکر آتا ہے اس میں محیرالعقول واقعات، کردار اور جگہوں کا ذکر ان کہانیوں کو دل چسپ بنانے میں اہم ترین عنصر ثابت ہوئے ہیں۔ عرصۂ دراز تک ادب اور سائنس کو متضاد اور متصادم علوم تسلیم کیا گیا۔ جہاں اہلِ ادب سائنس کو خشک اور بنجر مضمون مانتے ہیں وہیں سائنس دان ادب کو بے روح یا بے بنیاد شے سمجھتے ہیں۔ تاہم فکشن کی صنف ''سائنس فکشن'' سائنس اور فکشن کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتی ہے۔ سائنس فکشن کی تاریخ بے حد قدیم ہے اور دیومالائی داستانوں سے لے کر آج تک یہ مختلف شکلوں میں ادب کا اہم حصہ رہا ہے۔ سائنس فکشن بطور اصطلاح انیسویں صدی میں وضع ہوئی۔ ابتداً سائنس فکشن کی بجائے چند مختلف اصطلاحیں استعمال میں رہیں جن میں یوٹوپیا (Utopia)، فنتاسی (Fantasy) یا پھر ہارر/گوتھک (Horror/Gothic) شامل ہیں۔ یوٹوپیا ایک خیالی جگہ ہے جہاں ہر چیز انسانی تخیل کے مطابق مکمل اور بے عیب اور کسی بھی قسم کی برائی یا جرائم سے پاک ہے۔ اس اصطلاح کا مقصد دراصل انسان کو اس عروج تک پہنچتے دیکھنا ہے جب وہ ناانصافی اور بے ایمانی سے پاک ہو جائے گویا زمین پر جنت ایک یوٹوپین معاشرے کی مثال ہے۔ فنتاسی صرف ایک انسان کے خیالات اور خواہشات پر مرکوز ہوتی ہے جب کہ یوٹوپیا دراصل ایک سماج/معاشرے کا احاطہ کرتا ہے۔ ایک انسان جب خود کو ماورائی طاقتوں کا حامل سمجھے یا جادو کرنا شروع کر دے تو وہ گویا فنتاسی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اگر صرف سائنس فکشن کی تعریف کی جائے تو مختلف محققین اور لغات میں اس کی مختلف تشریحات نظر آتی ہیں۔ کیمبرج ڈکشنری کے مطابق:

> ادب کی ایسی صنف جو سائنس کی ممکنہ ترقی کی زندگی اور انسانی مستقبل پر اس کے اثرات کے موضوع کا احاطہ کرے۔

اوکسفرڈ امریکی لغت کے مطابق:

> کتاب، فلم وغیرہ کی ایسی قسم جو متخیلہ سائنسی ایجادات پر مبنی ہو، خاص طور پر مستقبل میں سائنسی ترقی، خلائی سفر یا دوسرے سیاروں میں زندگی کے متعلق ہو۔

٭ مکان نمبر NORE 15/E-23، مولوی تمیز الدین خان روڈ، کراچی۔ برقی پتا: solutions.inno@gmail.com

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا کے مطابق:

فکشن کی ایسی قسم جو معاشرے یا افراد پر سائنسی ترقی اور اس کے اثرات کا بیان ہو۔

کنگزلے آمس کے مطابق:

سائنس فکشن ایک ایسا نثری بیانیہ ہے جو اس صورت حال کو ظاہر کرتا ہے جو اس دنیا میں واقع ہونا ممکن نہیں اور جس میں سائنس، ٹیکنالوجی یا کسی مخصوص ایجاد کا ذکر لازمی ہو۔

ممتاز سائنس فکشن نگار آئزک آسیمو اس اصطلاح کو یوں بیان کرتے ہیں:

وہ صنف جو سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدت کے خلاف انسانی ردعمل کا احاطہ کرے۔

ان تمام تعریفوں سے درجِ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

سائنس فکشن ایک ادبی صنف ہے۔ سائنس فکشن ایک فلمی صنف ہے۔ سائنس فکشن کی بنیاد سائنسی نظریات اور تصورات پر قائم ہے۔ سائنس فکشن نہ صرف حال بلکہ مستقبل کی سائنسی ایجادات اور انسان اور معاشرے پر اس کے اثرات کے جائزے کا نام ہے۔ سائنس فکشن نہ صرف زمین بلکہ دوسرے سیاروں پر زندگی کے ممکنات کا جائزہ لیتا ہے۔

اور میری ذاتی رائے میں سائنس فکشن دو انگریزی لفظوں کی تشریح ہے اور وہ ہیں What If۔ کیا ہو اگر انسان چاند پر چلا جائے؟ کیا ہو اگر زمین کی گردش تیز ہوجائے؟ کیا ہو اگر انسان اڑنے لگے؟ کیا ہو اگر زمین سے بیماری ختم ہوجائے؟ کیا ہو اگر روبوٹ اس سیارے پر قبضہ کرلیں؟ ایسے کتنے ہی خیال اس ادبی صنف کو جنم دیتے ہیں اور جب تک یہ دو لفظ ذہنوں میں آتے رہیں گے تب تک سائنس فکشن لکھا جاتا رہے گا۔

وقت گزرنے کے ساتھ جو واقعات محیر العقول یا صرف دیوانے کی بڑ تھے وہ سائنسی حربوں کے استعمال کے بعد قرین از قیاس نظر آنے لگے۔ طلسم ہوش ربا میں روغنِ عیاری دراصل میک اپ کی ابتدائی شکل تھی۔ جنوں، پریوں، قنطوروں، بونوں اور ان جیسی دیگر مخلوقات جو کام جادو یا طلسم کی مدد سے کرتے تھے، وہی سائنسی ایجادوں اور آلات کے ذریعے ہونے لگے۔ ایک صنف فنتاسی کہلائی تو دوسری سائنس فکشن۔ ایک حیران کن بات یہ بھی ہے کہ ٹائی ٹینک جہاز ڈوبنے سے بارہ برس قبل ایک خاتون نے خواب میں ایک بہت بڑے جہاز کو ڈوبتے دیکھا۔ جاگنے پر اس نے بذریعہ خط کسی اخبار نویس سے اس خواب کا مطلب دریافت کیا۔ جواب تو خدا جانے کیا تھا مگر ٹائی ٹینک ڈوبنے کے بعد کسی کی نظر اس خط پر پڑی تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض اوقات انسان ایسی دور کی کوڑی لاتا ہے جو اپنے زمانے میں تو دیوانے کا خواب نظر آتا ہے مگر جلد ہی وہ خیال یا سوچ حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔ دو ہزار قبل مسیح میں آنے والی گلگامش کا مہا کاویہ سائنس فکشن کا نقطہ آغاز تسلیم کیا جاتا ہے۔ معروف امریکی سائنس فکشن مصنف لیسٹر ڈیل رے نے اس قصے کو لافانی زندگی حاصل کرنے کی کوششوں کے باعث سائنس فکشن کا آغاز تسلیم کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ رومن شاعر اووِڈ کی نظم میٹا مورفوسس (۸ عیسوی)، انگریزی نظم ''بیوولف (Beowulf) جو آٹھویں سے گیارہویں صدی عیسوی

کے عرصے میں سامنے آئی اور ۱۲۰۳ میں شائع ہونے والی جرمن نظم Nibelungenlied میں سائنسی علامات نظر آتی ہیں۔ دور کیوں جائیں رامائن میں ویمان یعنی اڑن کھٹولوں کا ذکر ہے اور رِگ وید میں میکانکی پرندوں کا ذکر ملتا ہے اور مہابھارت میں راجا ککدمی کا ذکر ہے جو برہما دیوتا سے ملنے آسمان پر جاتا ہے اور واپس زمین پر آ کر اسے علم ہوتا ہے کہ زمین پر تو نہ جانے کتنی صدیاں گزر چکی ہیں گویا اپنے سمے سے آگے یا پیچھے نکلنے کا نظریہ یعنی Time Travel سامنے آتا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں یونانی/شامی مصنف لوشن کی مصنفہ True History میں خلا کے سفر اور کسی ان جانی مخلوق سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے دیو قامت خلائی مکڑیوں کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ اس ضمن میں ۷۲۰ عیسوی میں مصنفہ جاپانی کہانی میں وقت سے آگے نکلنے کا بیان ہے جیسے Nihongi درج کیا گیا ہے۔ دسویں صدی میں تحریر کردہ کہانی The Tale of Bamboo Cutter میں مرکزی کردار چاند کی ایک شہزادی ہے جو چاند کے تباہ ہونے کی وجہ سے زمین پر بھیج دی جاتی ہے اور جب حالات بہتر ہوجاتے ہیں تو وہ واپس چاند پر بلالی جاتی ہے۔ اس کہانی میں اڑن طشتری کی تصویر بھی بنائی گئی تھی۔ عربوں کی الف لیلہ میں تو اتنے محیر العقول واقعات ہیں جن کی وضاحت میں چند سطور ناکافی ہیں۔ تھامس مور کی کتاب Utopia ایک ایسے فرضی جزیرے کی کہانی ہے جس میں ہر لحاظ سے ایک مثالی معاشرہ نظر آتا ہے اور یوٹوپیا نامی اصطلاح بھی اسی ناول کی بنیاد پر سامنے آئی۔

جوہانز کیپلر کی مصنفہ The Dream جو ۱۶۳۴ء میں شائع ہوئی آئزک آسیموو کارل سگان سائنس فکشن کا نقطہ آغاز مانتے ہیں۔ انگریزی زبان میں فرانسس گوڈون کے ناول The Man in the Moone کو پہلا سائنس فکشن ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جوناتھ سوئفٹ کا ناول Gulliver's Travels کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جولز ورن کے تو تقریباً سبھی ناول سائنس فکشن میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ ان کے کسی ناول میں آگ کو آگ سے بجھانے کا عمل دکھایا گیا تو کہیں آتشی شیشے کی مدد سے برفانی جگہوں پر آگ پیدا کی گئی۔ ۱۷۷۱ء میں شائع شدہ ناول L'An 2440 مصنفہ Louis Sebastien Mercier میں ۲۵ویں صدی عیسوی کی زندگی کا عکس دکھایا گیا۔ انیسویں صدی میں شیلے کا Frankenstine اور رابرٹ لوئی سٹیونسن کا Strange Case of Dr Jackyll and Mr Hyde سائنس فکشن کی نئی جہات اور ممکنات کے مظہر تھے، خصوصاً موخر الذکر ناول میں شخصیت کی تبدیلی کا ذکر ہے جو اس ضمن میں ایک نئی جہت تھی۔ ایڈگر ایلن پو، ایچ جی ویلز اور بعد ازاں آئزک آسیموو اور رابرٹ ہینلن کی تخلیقات نے سائنس فکشن کو باقاعدہ ایک صنف تسلیم کروایا۔

بارے برصغیر پاک و ہند کی بات کی جائے تو امبیکا دت بیاس کی ایک کہانی Aascharya Vrittant جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی، کو پہلی ہندی سائنس فکشن کہا جاسکتا ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار پاتال کا سفر کرتا ہے۔ ۱۹۰۰ء میں بابو کیشو پرشاد سنگھ کی کہانی ''چندر لوک کی یاترا'' لکھی۔ راہول سنکر تیاین نے ۱۹۲۴ء میں ''بائیسویں صدی'' کے عنوان سے بائیسویں صدی کا منظر نامہ تخلیق کیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد جمنا دت ویشنو اشوک نے سائنس فکشن میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ساٹھ اور ستّر کی دہائی میں بہت سے ہندی مصنّفین سامنے آئے جن میں دیوندر موادی بے انتہا مقبول ہوئے۔ ہندی لکھاریوں کے بعد بنگلہ زبان کے مصنّفین کا ذکر دل چسپی سے خالی نہیں۔ ڈاکٹر جگدیش چندر بوس کی کہانی Shukra Bhraman بنگال میں ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی اور اس میں دو سیاروں میں

خلائی مخلوقات کے ارتقا پر بات کی گئی ہے۔ اس کہانی کا اختصاص یہ ہے کہ یہ کہانی ایچ جی ویلز کی کتاب War of the Worlds سے دس برس قبل شائع ہوئی۔ ہیمندر کمار رائے کا طبع زاد سائنس فکشن ناول Kancher Coffin بڑھتی عمر کو روکنے کے بارے میں ہے اور اسی طرح ان کے ایک اور ناول میں مریخ کے سفر کا بیان ہے۔ دیگر ممتاز مصنّفین میں پر میندر مترا، کاشی تیندر نرائن بھٹا چاریہ اور پروفیسر شانکو کے کردار کے خالق ممتاز فلمی ہدایت کار ستیہ جیت رے شامل ہیں۔ پروفیسر شانکو کی ایک کہانی میں ایک خلائی مخلوق کی زمین پر آمد اور یہاں رہائش کا بیان ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر مشہور فلم Extra Terristrial کا خیال آتا ہے مگر رے کی کہانی اس فلم سے بہت پہلے شائع ہوئی۔ بنگال کی رقیہ سخاوت حسین نے انگریزی زبان میں Sultana's Dream نامی کہانی لکھی جس میں مردوں کا پردہ لازمی قرار دیا گیا تھا۔

اردو میں سائنس فکشن کی جڑیں پچھلی صدی میں جا نکلتی ہیں۔ محمد حسین جاہ اور احمد حسین قمر کی طویل داستان ''طلسم ہوش ربا'' کو سائنس فکشن کا نقطہ آغاز کہا جاتا ہے۔ اس داستان میں اڑن کھٹولوں، زنبیل، روغنِ عیاری اور عیاروں کے مختلف سفوف سائنس فکشن عناصر کے زمرے میں آتے ہیں۔ باقاعدہ سائنس فکشن کا سہرا منشی ندیم صہبائی فیروز پوری کے نام جاتا ہے جنھوں نے ۱۹۳۰ء میں شائع شدہ ''نقلی رئیس'' نامی ناول میں دماغوں کی تبدیلی کا آپریشن دکھایا تھا۔ خان محبوب طرزی کے کئی ناولوں میں ٹائم مشین، روشنی کی رفتار اور سمے کے حصار کو توڑ کر مہا بھارت دیکھنے جیسی کہانیاں ملتی ہیں۔ اظہار اثر نے ۵۰ سائنس فکشن ناول لکھے اور ان کا پہلا ناول ۱۹۵۵ء میں بعنوان ''آدھی زندگی'' شائع ہوا جس میں روبوٹ کا ذکر ملتا ہے۔ دوسرے ناول ''شعلوں کے انسان'' میں خلائی سفر، ''بیس سال بعد'' میں کسی سیارے کی مخلوق ایک بہت بڑا مشینی دماغ بناتی نظر آتی ہے، مشینوں کی بغاوت نامی ناول میں روبوٹس کی بغاوت کا ذکر نظر آتا ہے۔ ایک ناول ''زیرو زیرو زیرو'' میں دماغ کو ایٹمی تاب کاری سے طاقت ور بنانے کا ذکر ملتا ہے۔ اکرم الٰہ آبادی کے چند ایک ناول سائنس فکشن کے زمرے میں آتے ہیں۔ اشتیاق احمد کے اکثر ناول سائنسی ایجادات کی دریافت اور ان کے استعمال کے گرد گھومتے ہیں۔ وہ بلاشبہ بچوں کے ادب کے سب سے بڑے سائنس فکشن ناول نگار ہیں۔

ابن صفی کا شمار ایسے عبقریوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اصنافِ ادب میں نئی راہیں نکالیں۔ اگر ابن صفی کی تحریروں کی درجہ بندی کی جائے تو انھیں جاسوسی ناول، افسانہ، سفرنامہ، سائنس فکشن اور انشائیوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ موضوعات کے لحاظ سے ابن صفی کی تخلیقات اتنی متنوع ہیں کہ بقول ابن صفی ''حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو'' تاہم ابن صفی کی تمام تر تخلیقات صرف ایک محور کے گرد گھومتی ہیں اور وہ ہے قانون کا احترام۔ ان کی کتب سے قاری کا ذہن کوئی منفی اثر قبول نہیں کرتا بلکہ اس میں قانون کی اہمیت اور اس کی پیروی کرنے کی خواہش ابھرتی ہے۔ سنجیدہ مزاج فریدی ہو یا حماقت پسند عمران، مقصد دونوں کا ایک ہی ہے اور وہ قانون کا بول بالا کرنا اور مجرم خواہ وہ کتنا ہی بااثر کیوں نہ ہو اسے قانون کے دائرے میں لانا۔ یہ ابن صفی کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کی تمام دیگر خدمات سے بڑھ کر ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۲ میں اپنے قارئین کی جو فکری اور ذہنی تربیت شروع کی اس کا بظاہر اختتام ان کی وفات پر ہوا مگر ابن صفی کی فکر اور فلسفے کا سرچشمہ آج بھی جاری ہے۔ یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ابن صفی کے قارئین بلند ذہنی سطح IQ کے حامل ہوتے تھے اور ان میں قانون کے احترام کا جذبہ دیگر شہریوں کے مقابلے میں زیادہ

ہوتا تھا۔ابن صفی نے سیکڑوں کہانیوں میں انتہائی پیچیدہ پلاٹ پیش کیے مگر آخر کار جیت ہمیشہ قانون ہی کی ہوئی خواہ اس کے لیے فریدی کو کسی بھی حد تک جانا پڑے اور عمران کو تمام رشتوں کو بالائے طاق رکھنا پڑا۔حیرت انگیز طور پر ان کی ہر تحریر،''پیشرس'' یہاں تک کہ انٹرویوز میں بھی انھوں نے ایک ہی بات لکھی اور کہی کہ وہ تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح بھی فراہم کرتے ہیں اور انھیں قانون کا احترام بھی سکھاتے ہیں۔ اقبال نے کیا خوب کہا تھا کہ''عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں''،آج کا معاشرہ اس مصرعے کی مکمل تعبیر ہے جس میں ایسی سائنسی ایجادات نظر آتی ہیں کہ نصف صدی قبل جس کا اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔ بلکہ صرف تیس برس پہلے کا انسان اگر موجودہ معاشرہ دیکھ لے تو اس کا حال بھی اصحابِ کہف جیسا ہو۔Touch Panel سے کریڈٹ کارڈ اور سیٹلائٹ اسٹیشن سے مریخ پر زندگی کی تلاش ہو یا سمارٹ ڈیوائسز ،آج ہماری زندگی ان آلات اور انٹرنیٹ کے بغیر ادھوری ہے۔ پچاس کی دہائی سے ابن صفی نے جہاں قانون کے احترام، اعتدال پسندی، رواداری اور زندہ دلی کو فروغ دینے کی کوششیں شروع کیں وہیں انھوں نے سائنسی عجائبات سے بھی اپنے قارئین کو روشناس کروایا۔ان کے ناولوں میں پیش کردہ ایجادات کی فہرست ہی کئی صفحات پر مشتمل ہوگی۔انھوں نے سائنس کی کون سی جہت ہوگی جس کو اپنے ناولوں میں نہیں متعارف کروایا۔ ذیل میں ابن صفی کے ان تمام ناولوں کا مختصر تعارف درج ہے جن میں سائنس فکشن کے مختلف عناصر نظر آتے ہیں۔

خطرناک بوڑھا اور مصنوعی ناک

یہ ناول اگست اور ستمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں بھی ایک ایسی سازش کا پردہ چاک ہوتا ہے جو ایک بڑی گہری منصوبہ بندی کر کے بنائی جاتی ہے۔کہانی ایسے مجرم کے متعلق ہے جو برطانیہ سے فلسفے اور جرمنی سے سائنس کی اعلیٰ ڈگری کا حامل ہے مگر انتقام کے رستے میں آکر وہ پٹری سے اُتر کر تخریبی کاموں کی طرف راغب ہوجاتا ہے۔انتقامی جذبہ، لالچ اور سونا بنانے کا جنون ایک انسان کو کس حد تک گرا سکتا ہے یہ سب اس کہانی میں نظر آئے گا۔ انتہائی حد تک دلیر اور ذہین مجرم کہانی میں بہت سے پینترے اور روپ بدلتا ہے۔مگر آخر کار مجرم کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو قانون سے نہیں بچ سکتا۔مصنوعی ناک اپنے عنوان کی طرح ایک چونکا دینے ناول تھا جس میں مجرم نے اپنے چہرے پر مصنوعی ناک لگا رکھی تھی اور کہانی کے اختتام پر وہ اسی ناک میں چھپایا گیا زہر کھا کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔

موت کی آندھی

جنوری ۱۹۵۳ء میں شائع ہونے والا یہ ناول جاسوسی ادب میں ایک کلاسیک کا درجہ رکھتا ہے۔ انسانی سوچ کی تباہ کاریاں، ذہانت اور جنون اس پوری کہانی کا مرکز ہے۔ایک رقاصہ کے قتل سے شروع ہونے والی کہانی ایسے انجام تک جاتی ہے کہ قاری کی سوچ کی حد ختم ہوجاتی ہے۔اس ناول کو ابن صفی کا وہ پہلا ناول بھی کہا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے محیر العقول سائنسی ایجادات کے بارے میں بیان کیا ہے۔فریدی اور حمید اس بار مصر کے ایک ساحلی علاقے کا سفر کرتے ہیں جہاں فریدی اپنی خداداد ذہانت اور دلیری سے

جرمن سائنس دانوں کے ٹھکانے کا کھوج لگاتا ہے۔اس ٹھکانے میں جو ایک چٹان کے اندر واقع تھا باقاعدہ بجلی گھر قائم تھا جس کی مدد سے ریڈیائی لہروں کی قوت سے لوہے کے دیو قامت روبوٹ (اگرچہ ابن صفی نے یہ لفظ استعمال نہیں کیا) چٹان سے باہر نکل کر انسانوں کی ٹانگیں چیر دیا کرتے تھے۔ یہاں ایک ٹیلی وژن نما مشین تھی جس سے مصنوعی آندھیاں پیدا کی جاسکتی تھیں اور پورے ساحل کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ایسی مشینوں کے گرد مختلف پینلز Panels ہوتے ہیں جن پر بٹنوں کی لمبی قطاریں ہوتی ہیں۔مگر ابن صفی نے اس مشین کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ صرف ایک سکرین پر مشتمل ہے جس سے دھیان Touch Panel کی طرف جاتا ہے جس کا استعمال اس ناول کی اشاعت کے کئی دہائیوں کے بعد شروع ہوا۔اس داستان میں ابن صفی نے نازیت کی مخصوص ذہنیت کا پردہ چاک کیا ہے۔کہانی اتنی دل چسپ اور سنسنی خیز ہے کہ ناول ختم کیے بنا چین نہیں آتا اور جتنی بار بھی پڑھیں ہر بار ایک نیا لطف آتا ہے۔

لاشوں کا آبشار

۱۹۵۴ء کے چھٹے مہینے میں منظر عام پر آنے والا ناول ''لاشوں کا آبشار'' ایک بہت ہی منفرد ناول ہے۔یہ ناول انسانی ذہن کی فتنہ سازیوں اور انتقام کی ایک ایسی داستان ہے جو بھلائے نہیں بھولتی۔اس ناول میں لاسلکی ہتھیاروں Wireless Weapons کا تذکرہ ہوتا ہے۔ہزاروں کے مجمعے میں ایک سیاسی رہنما کو لاسلکی رائفل سے نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔کہانی کا پلاٹ بھی بے حد پیچیدہ اور گنجلک ہے اور ڈاکٹر کیو پر بالکل آخر میں آکر روشنی پڑتی ہے۔فریدی بڑی خوں ریزی کے بعد مجرم پر قابو پاتا ہے۔اس کہانی میں ابن صفی نے معاشرے کے ایک ایسے ناسور کا احاطہ کیا ہے جس کا تذکرہ کرنا معیوب Taboo سمجھا جاتا ہے۔مجرم دراصل ایک ناجائز اولاد تھی جس کا طعنہ اسے زندگی بھر دیا جاتا رہا۔اسے اتنا ستایا گیا کہ اس کی شخصیت میں انتقامی جذبہ پیدا ہوگیا۔اگر اسے اس نفرت کا نشانہ نہ بنایا جاتا تو شاید وہ معاشرے کا ایک کارآمد فرد ہوتا۔

سیکڑوں ہم شکل

ابن صفی کا ایک اور ناول ذاتی انتقام کی تباہ کاریوں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ ناول ''سیکڑوں ہم شکل'' ہے جس میں ایک بدصورت ڈاکٹر کو اس کی بدصورتی کی بنا پر طعن وتشنیع کی جاتی ہے تو وہ بھی معاشرے سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔یہ ناول نومبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا۔اس ناول میں کلوننگ جیسی ٹیکنالوجی دکھائی گئی کہ ڈاکٹر اپنے جیسے سیکڑوں ہم شکل تیار کرتا ہے۔

برف کے بھوت

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آنے والی کہانی ''برف کے بھوت'' ذہن سے چپک کر رہ جانے والی ایک ایسی داستان ہے جس میں محیر العقول واقعات قاری کو اپنی گرفت میں لیے رکھتے ہیں۔کہانی ٹیکم گڑھ کے مختلف حصوں میں ڈیڑھ فٹ لمبے پیروں کے نشانات

سے شروع ہوتی ہے۔ پھر وہاں سفید لباس میں دیو قامت بھوت نظر آتے ہیں جن پر گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں۔ یہ کہانی ایک سائنس دان کے گرد گھومتی ہے جو جنگی جنون میں مبتلا ہو کر قیامت خیز اور مہلک کیمیاوی گیس بنانے میں مصروف تھا۔ یاد رہے کہ یہ ۵۴ء ہے جب کیمیاوی ہتھیاروں کا ذکر ایک بالکل نیا نظریہ تھا۔ اس کہانی میں بھی انسانی ذہن کی تباہ کاریوں کو واضح کیا گیا ہے کہ ایک انسان جب جانور بن جائے تو وہ کس حد تک گر سکتا ہے۔

جنگل کی آگ

فریدی اور حمید کے علاوہ ابن صفی کی جاسوسی دنیا کے دل چسپ اور اہم کرداروں میں جیرالڈ شاستری شامل ہے۔ وہ مشرقی علوم کا ماہر اور ایک بہت طاقت ور شخصیت ہے جس کے تعلقات اعلیٰ ترین شخصیات سے ہیں۔ پنڈتوں کی طرح زرد پگڑی پہنتا ہے اور اس کے چہرے پر سب سے عجیب چیز اس کی آنکھیں ہیں۔ کہانی فریدی کے والد کے دوست اور محکمے میں استاد جیسے بزرگ عرفانی کی ہلاکت سے شروع ہوتی ہے اور ایسے واقعات پر منتج ہوتی ہے کہ عقل ہے محوِ تماشا والی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ناول ابن صفی کا وہ پہلا ناول ہے جس میں کسی بین الاقوامی تنظیم کی سیاہ کاریوں کا ذکر ہے۔ ''جنگل کی آگ'' میں جیرالڈ شاستری اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ حکومت ان کا حق ہے جو طاقت ور ہیں۔ جی ہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ اس ناول میں بھی سائنسی ایجادات اور حیرت انگیز مشینوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اس ناول کو اردو میں سائنس فکشن کی اعلیٰ داستانوں میں سے ایک بناتے ہیں۔ اس ناول میں ایسے درندوں کا ذکر ملتا ہے جو انسانی اجسام سے تیار کیے جاتے ہیں۔ ایک ایسی مشین جس میں انسانوں اور ایک معمولی بندر کو بند کریں تو ایک دیو قامت بن مانس تیار ہو جاتا ہے۔ ارتقا کا عمل جو صدیوں پر محیط ہے وہ جیرالڈ شاستری کی تنظیم گھنٹوں میں مکمل کر لیتی ہے۔ سائنسی طور پر ترقی یافتہ یہ تنظیم انتہائی ترقی یافتہ ہے اور نہ جانے کتنے مہلک اور جدید ہتھیار اور مشینیں بنا چکی ہے۔ کہانی کے آخر میں شاستری اور اس کے کارندے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تاہم ان کا ایک اہم اڈا تباہ اور ان کے عزائم دنیا پر عیاں ہو جاتے ہیں۔

موت کی چٹان

''جنگل کی آگ'' سے شروع ہونے والی کہانی ''موت کی چٹان'' میں آ کر مکمل ہو جاتی ہے۔ اس بار آخری معرکہ رام گڑھ کی پہاڑیوں میں ہوتا ہے۔ فروری ۵۵ء سے شروع ہونے والی کہانی جون ۵۵ء میں مکمل ہوئی۔ اس بار کہانی ایک قتل کی تفتیش سے شروع ہو کر جیرالڈ شاستری کی گرفتاری پر منتج ہوتی ہے۔ اس تنظیم اور شاستری پر قابو پانے پر حکومت فریدی کو اعزازی کرنل اور حمید کو اعزازی کیپٹن کا عہدہ تفویض کرتی ہے۔

شعلوں کا ناچ

''شعلوں کا ناچ'' کی کہانی ایک ایسی تنظیم کے گرد گھومتی ہے جو طاقت کی پجاری ہے اور جس کا مقصد صرف اور صرف طاقت کی

حکمرانی ہے۔اس تنظیم کے فلسفے کے مطابق کم زوروں کو حکمرانی کا کوئی حق حاصل نہیں وہ صرف غلامی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔اس تنظیم کے آلۂ کاروں میں معاشرے کے معززین شامل ہیں جو مختلف طریقوں سے اپنے ہی ملک کو کم زور کرنے کی سازش میں ملوث ہیں۔اس کہانی میں بھی سائنسی ایجادات کی ایک نئی دنیا ہمارے سامنے آتی ہے۔خود کو تباہ کردینے والے ٹرانسمیٹر اور ایسی روشنی جس سے جسم کی قوت سلب ہوجائے اس کی مثال ہیں۔یہ کہانی ابن صفی کے شہ پاروں میں شامل ہے جو ان کی جاسوسی تخلیقات میں ایک نیا سنگ میل ثابت ہوئی۔

شعلوں کا سیٹ

شعلوں کا سیٹ دراصل چار ناولوں کا مجموعہ ہے۔ان ناولوں میں ''پہلا شعلہ (ستمبر ۱۹۵۶ء)''، ''دوسرا شعلہ (اکتوبر ۱۹۵۶ء)''، ''تیسرا شعلہ (نومبر ۱۹۵۶ء)'' اور آخری حصہ جس پر اس کہانی کا اختتام ہوا ''جہنم کا شعلہ (دسمبر ۱۹۵۶ء)'' شامل ہیں۔ متذکرہ بالا اقتباس میں بیان کردہ حقائق کی روشنی میں ابن صفی نے سلسلہ وار ناول لکھے اور شعلوں کا سیٹ اس سلسلے میں سرخیل کا مقام رکھتا ہے۔یہ کہانی بھی طاقت تنظیم کے سلسلے کی کہانی ہے جس میں بہت سی کہانیاں منسلک ہیں۔اس کہانی میں ابن صفی نے چند لازوال کردار پیش کیے جن میں تاریہ اور ساحرہ شامل ہیں۔تاریہ ایک اذیت پسند عورت ہے جو بیک وقت جنسی کج رویMasochistاور اذیت پسندیSadist جیسے رجحانات کی حامل ہے۔ساحرہ ایک انتہائی قابل اور صاحب مطالعہ ہستی ہے جو فلسفے کو ہمبگ قرار دیتی ہے۔ اس داستان کا مرکزی خیال طاقت ور مجرم تنظیموں کی ریشہ دوانیاں اور پس ماندہ اور ترقی پذیر ممالک کو پنے زیرِ تسلط لانا ہے۔ایسی تنظیمیں بڑے پیمانے پر جعلی کرنسی، اغوا اور قتل و غارت جیسے مکروہ کام کرتی ہیں تاکہ ان کے مذموم مقاصد کامیاب ہوسکیں۔ان تنظیموں کا مقصد اپنی باطنی حکومت قائم کرنا ہے۔بلاشبہ یہ پوری کہانی ایسے محیر العقول واقعات اور ایجادات سے پُر ہے جو اس سے پہلے جاسوسی ادب کے منظرنامے پر دیکھنے کو نہیں ملے۔

زمین کے بادل

زمین کے بادل ابن صفی کا ایک اور شاہ کار ہے جس میں پہلی بار فریدی اور عمران پہلی اور آخری بار جلوہ گر ہوئے۔ابن صفی نے ایک خفیہ تنظیم زیرولینڈ کا تذکرہ عمران سیریز کے ناول ''پیاسا سمندر'' میں کیا تھا۔یہ ایک ایسی تنظیم ہے جو سائنسی طور پر بے حد ترقی یافتہ ہے اور انتہائی خاموشی سے اپنی قوت بڑھانے میں مصروف عمل ہے۔اس کہانی میں زیرولینڈ کی انتہائی جدید سائنسی ایجادات خاص طور پر اڑن طشتری جسے وہ ''فے گراز'' کہتے ہیں خاصے کی چیز ہیں۔اس ناول میں ابن صفی نے قارئین کے بے پناہ اصرار پر فریدی اور عمران کو اکٹھا کیا۔اس ناول کے بعد انھوں نے ان دونوں کو کبھی اکٹھا نہیں کیا۔

طوفان کا اغوا

''طوفان کا اغوا'' اگست ۱۹۵۷ء میں منظر عام پر آیا۔اس کہانی میں ابن صفی نے فولادی کو متعارف کروایا۔یہ ایک ایسا روبوٹ

ہے جو ٹریفک کی روانی کو بحال رکھتا ہے، موسمی تغیرات اور یہاں تک کہ طوفانوں پر بھی قابو پا سکتا ہے۔اس کے گرد نہ نظر آنے والی لہروں کا ایک جال ہے جس سے اس کی طرف آنے والی ہر چیز خواہ وہ گولی ہو یا میزائل واپس پلٹ جاتے ہیں۔یہ کہانی بھی جاسوسی ادب میں سائنس فکشن کا ایک اگلا پڑاؤ تھا جس میں پہلی بار وائرلیس ریڈیو کی لہروں کی سمت کے ذریعے اس کے مخرج تک پہنچنا دکھایا گیا۔گو آج ایسے بہت سے روبوٹ عام ہیں جو انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں مگر اس دور کا اندازہ کیجیے جب فولادی محض ایک نظریہ تھا اور کچھ ہی عرصے بعد ایک ادیب کے تخیل نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

چاندنی کا دھواں

اگست ۱۹۵۸ء میں آنے والا یہ ناول ابن صفی کے قلم کا ایک اور شاہ کار ہے جس میں سائنس فکشن، زیرولینڈ اور انسانی نفسیات کا ایک عجیب سا انضمام ہے۔وادی کاجیک میں حمید، قاسم اور فریدی کے ناقابل فراموش کارنامے اور نفسیاتی طریقوں سے زیرولینڈ کی ایک بڑی ہستی نانوتہ کی گرفتاری عمل میں آتی ہے۔کہانی میں ایک بار پھر پس ماندہ ممالک کی قیمتی معدنیات لٹتے ہوئے دکھائی گئی ہیں کہ کس طرح ترقی یافتہ مجرم تنظیمیں ملکوں کو نقصان پہنچاتی رہتی ہیں۔اس بار بھی زیرولینڈ کا مقصد وادی کاجیک سے ایک نایاب ترین ایندھن لے کر جانا تھا جسے وہ لمبی پروازوں اور خاص طور پر دوسرے سیاروں پر جانے کے لیے استعمال کریں گے۔یہ ایندھن پٹرولیم سے کئی ہزار گنا ہلکا اور سریع الاثر ہوتا ہے۔اس ناول میں ایسے آلات کا ذکر ہے جنھیں آج Bunker Buster کہا جاتا ہے۔راکٹ کے آگے ایسے آلات ہیں جو پتھروں کو پگھلا دیتے ہیں اور راکٹ اس نرم زمین سے آرام سے گزر جاتا ہے۔آج Bunker Buster بھی اسی اصول پر کام کرتے ہیں۔اس ناول میں ایک ایسی سائنسی مشین دکھائی گئی ہے جو آج کے Hologram سے ملتی جلتی ہے کہ انسان کی شبیہ بالکل اصل حالت میں کسی دوسری جگہ منتقل ہو جائے۔پورا ناول بہت سی دل چسپیوں اور حیرتوں کا مجموعہ ہے

چمکیلا غبار

مئی ۱۹۵۹ء میں شائع ہونے والا یہ ناول سائنس فکشن میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔اس ناول میں فنچ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ کئی غیر ملکی ایجنٹ ایک ایجاد چرانے کے سلسلے میں مصروف عمل ہیں۔یہ ایجاد دراصل جس کا تذکرہ از حد ضروری ہے Multi Ammunition Softkill System کے اصول پر کام کرتا ہے۔اس اصول کے مطابق جب کوئی میزائل کسی ہوائی یا بحری جہاز کی طرف آتا ہے تو جہاز سے چند دھاتی ٹکڑے نکلتے ہیں جس سے میزائل بجائے جہاز سے ٹکرانے کے ان دھاتی ٹکڑوں سے ٹکرا جاتا ہے اور جہاز اس حملے سے بچ جاتا ہے۔اس ناول میں ایسی ہی ایجاد دکھائی جاتی ہے جو فنچ لے اڑتا ہے۔فریدی اسے بڑی حکمت سے قابو کرتا ہے اور اس بار اسے اپنا قیدی بنا لیتا ہے۔

دیو پیکر درندہ

ویسے تو ابن صفی کا ہر ناول ایک انوکھی اور اچھوتی کہانی پیش کرتا ہے مگر ’’دیو پیکر درندہ‘‘ تمام کہانیوں سے الگ ایک نیا سائنسی

نظریہ پیش کرتا ہے اور وہ ہے ذہنوں کی تبدیلی جی ہاں ایک شخص کا دماغ کسی دوسرے شخص کے دماغ میں رکھ دیا جانا۔گو ۱۹۶۷ء میں یہ چیز صرف ایک دیوانے کی بڑ نظر آتی تھی مگر کتنے ہی تصوارت تھے جب وہ پیش ہوئے تو انھیں تضحیک کا نشانہ بنایا گیا مگر کچھ ہی عرصے بعد ان کی افادیت سب پر آشکار ہوگئی۔یہ کہانی بھی ایسا ہی منظر نامہ دکھاتی ہے جو ایک ادیب کے تخیل کی پرواز کی اونچائی کو سامنے لاتی ہے۔

تباہی کا خواب اور مہلک شناسائی

یہ دونوں ناول (اکتوبر، نومبر ۱۹۶۸ء) بھی زیرو لینڈ سلسلے کے ناول ہیں جس میں نانوتہ ایک دفعہ پھر فریدی سے ٹکراتی ہے۔فریدی اس بار بھی ذہنی لڑائی کے ساتھ ساتھ جسمانی طور پر بھی پوری کہانی پر چھایا نظر آتا ہے۔دونوں ناول ابن صفی کا مخصوص رنگ لیے ہوئے ہیں جن میں سائنس فکشن کے ساتھ ساتھ سراغ رسانی اور ذہنی جنگ عروج پر نظر آتی ہیں۔ناول کے اخیر میں فریدی بالآخر نانوتہ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ان ناولوں کے بعد ''خونی ریشے (ستمبر ۱۹۶۹ء)''، ''تیسری ناگن (نومبر ۱۹۶۹ء)'' اور ''ریگم بالا (جنوری ۱۹۷۰ء)'' بھی زیرولینڈ سیریز کے ناول ہیں۔ان ناولوں میں بھی کئی سائنسی شعبدے اور نفسیاتی حربوں کا ذکر ہے جن سے ابن صفی کے قلم کی تخلیقی قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

زہریلا سیارہ

فروری ۱۹۷۵ء میں شائع ہونے والا یہ ناول زیرولینڈ سیریز میں ایک شاہ کار کی سی حیثیت رکھتا ہے۔اس کہانی میں ایک مصنوعی سیارے کا ذکر ہے جس کی مدد سے زیرو لینڈ بہت سی تباہیاں لا سکتا ہے۔زیرولینڈ نے اس مصنوعی اور زہریلے سیارے کا کنٹرولنگ سٹیشن رام گڑھ کی پہاڑیوں میں بنایا ہوا ہے۔اس بار زیرو لینڈ کھُل کر پوری دنیا کے سامنے آتا ہے۔خلا میں اپنا سیارہ چھوڑنے کے بعد وہ اعلانیہ عالمی طاقتوں کے بحری جہاز تباہ کر دیتا ہے اور یہ اعلان کرتا ہے کہ اگر انھوں نے زیرولینڈ کے ایجنٹ نہ چھوڑے تو وہ ان کے خفیہ میزائلوں کے اڈوں کے بارے میں سب کو بتا دے گا۔زیرولینڈ والے ایک بار پھر فریدی کے ملک سے اس مصنوعی سیارے کے لیے ایک ایندھن چراتے ہیں اور اسی کے ملک میں مصنوعی سیارے کا کنٹرولنگ سٹیشن بنا دیتے ہیں۔اپنے سائنسی آلات، تہہ در تہہ پلاٹ اور دیگر دل چسپیوں کی بدولت یہ ناول ابن صفی کے قلم سے نکلا ایک شاہ کار ہے۔

ہم زاد کا مسکن سیریز

ہم زاد کا مسکن سیریز ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا ایک اور شاہ کار سلسلہ ہے جس میں سائنس فکشن ایک نئی بلندی کو چھوتا ہے۔یہ سلسلہ چار ناولوں پر مشتمل ہے اس میں پہلا ناول ''شکاری پرچھائیاں (جنوری ۱۹۷۸ء)''، دوسرا ناول ''پرچھائیوں کے حملے (فروری ۱۹۷۸ء)''، تیسرا ناول ''سایوں کا ٹکراؤ (اپریل ۱۹۷۸ء)'' اور یہ داستان ''ہم زاد کا مسکن (جون ۱۹۷۸ء)'' میں مکمل ہوتی ہے۔اس کہانی میں بھی طاقت ور تنظیموں کو تیسری دنیا کی اقوام کو اپنا آلہ کار بنانا اور ان کے ممالک کو اپنا اکھاڑہ بنانا دکھایا گیا ہے۔بغیر

ڈرائیور چلنے والی کار، مستقبل کا حال بتانے والا کمپیوٹر اور طاقت ور لاسلکی ٹرانسمیٹر اس ناول کا خاصہ ہیں۔دشمن ایجنٹوں کا اصل مقصد زیر زمین پانی کا ایک طبقہ توڑ کر تیل کے ذخیرے کے ساتھ ملانا تھا تا کہ فریدی کا ملک تیل کے اس ذخیرے سے فائدہ نہ اُٹھائے اور ہمیشہ عالمی طاقتوں کا دست نگر رہے۔اس کہانی میں ابن صفی ایسے بین الاقوامی ٹھگوں کا پردہ چاک کرتے ہیں جو پس ماندہ ممالک کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے اور اس ضمن میں کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔

نیلے پرندے

امریکا نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں عراق پر اس لیے حملہ کیا کہ وہ کیمیاوی ہتھیار بنانے کے ساتھ ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کا حامل ہے۔اس جنگ سے قریباً پچاس برس پہلے ابن صفی نے اس ناول میں ایک کیمیاوی مائع کا ذکر کیا جس کے ذریعے کسی بھی شخص کو جلدی بیماریوں میں مبتلا کیا جاسکتا ہے۔یہ ناول (فروری ۱۹۵۶ء) بھی سائنس فکشن پر مشتمل ایک اہم کہانی میں ہے جس میں عمران کی حماقتیں اور مزاح سونے پہ سہاگے کا کام کرتی ہیں۔

پیاسا سمندر

عمران سیریز کا پہلا اور مکمل سائنس فکشن ناول (نومبر ۱۹۵۷ء) ہے جس میں زیرولینڈ اور ڈاکٹر داور متعارف ہوتے ہیں۔اس ناول میں تھریسیا سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔اس بار ابن صفی نے اپنے قلم اور تخیلات کے ایسے کرشمے دکھائے ہیں کہ اس ناول کو طلسم ہوشربا کا سائنسی ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔اس ناول میں ایسی محیر العقول ایجادات سامنے آتی ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ زیرولینڈ کتنی طاقت ور تنظیم ہے۔ان ایجادات میں اڑن طشتریاں، تیز رفتار آب دوز، غوطہ خوری کے جدید ترین لباس، پانی میں کام کرنے والی شعاعیں، روبوٹ بچے جن میں ٹرانسمیٹر کے ساتھ ساتھ آتش گیر مادہ بھی موجود ہے۔آج ہم میں سے اکثر مصنوعی سیاروں سے واقف ہیں۔''پیاسا سمندر'' کی کہانی انھی مصنوعی سیاروں کے گرد گھومتی ہے۔یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ زیرولینڈ پوری دنیا سے سائنس دانوں کی ایجادات چوری کرنے میں بھی ماہر ہے۔

ظلمات کا دیوتا (بوغا) سیریز

''ظلمات کا دیوتا'' یعنی بوغا سیریز پانچ ناولوں پر مشتمل ہے۔ان ناولوں میں ''عمران کا اغوا (دسمبر ۱۹۵۸ء)''، ''جزیروں کی روح (فروری ۱۹۵۹ء)''، ''چیختی روحیں (اپریل ۱۹۵۹ء)''، ''خطرناک جواری (جون ۱۹۵۹ء)'' اور آخری حصہ ''ظلمات کا دیوتا (ستمبر ۱۹۵۹ء)'' شامل ہیں۔یہ ناول بھی زیرولینڈ سے متعلق ہے۔اس کہانی کا پلاٹ اتنا پیچیدہ اور اس کے کردار اتنے متنوع اور دل چسپ ہیں کہ ہر کردار پر طویل بحث ہوسکتی ہے۔ان کرداروں میں بوغا، ڈنگو اور مونیکا شامل ہیں۔یہ سیریز ابن صفی کے ان ناولوں میں سے ہے جس میں وہ اپنے قاری کو بہت دور دراز جگہوں کی سیر کرواتے ہیں۔ایسے جزائر جن کے وجود سے آج بھی ایک بڑی تعداد

نا آشنا ہے۔ کہانی زیر ولینڈ کے ذرائع آمدنی کے گرد گھومتی ہے۔ان تمام حصوں میں بتایا گیا ہے کہ زیر ولینڈ منشیات، اسلحے اور اغوا جیسی سرگرمیوں سے پیسا کماتے ہیں۔کہانی میں الیکٹرو سپیکٹر نامی سائنسی ایجاد کا ذکر ہے جس سے چنگاریاں نکلتی ہیں اور جس چیز پر ڈالی جائے وہ ٹکروں میں بٹ جاتی ہے۔

ڈیڑھ متوالے

''ڈیڑھ متوالے (اکتوبر ۱۹۶۳ء)'' ابن صفی کے تخلیقی سفر کا سب سے اہم پڑاؤ ہے۔اس ناول کی کہانی پہلے دو حصوں ''دل چسپ حادثہ (جنوری ۱۹۶۰ء)'' اور ''بے آواز سیارہ (مارچ ۱۹۶۰ء)'' سے شروع ہوتی ہے۔تاہم اسی دوران میں ابن صفی شدید بیمار ہوئے اور تین سال تک کچھ نہ لکھ پائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل و کرم سے صحت یاب ہونے کے بعد ''ڈیڑھ متوالے'' ان کی پہلی تخلیق تھی۔ یہ ناول ابن صفی کے دوسرے تخلیقی دور کا نقطہ آغاز تھا۔اس ناول میں بہت دل چسپ کردار متعارف کروائے گئے جن میں قابلِ ذکر کردار کبڑے کا ہے۔کبڑا ایک انتہائی عیار اور قابل شخص ہے جو اس کہانی میں بہت سے ناقابل یقین روپ بھرتا ہے۔ عمران کی طرح اسے بھی انسانی نفسیات پر پورا عبور حاصل ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔کہانی میں سائنس فکشن کے عناصر خصوصاً مصنوعی سیاروں کا ذکر بھی ہے اور افسانوی مناظر بھی۔اس ناول میں کہیں مشاعرے ہوتے نظر آتے ہیں تو کہیں امریکی طرز کے دیسی کاؤ بوائز، کہیں طنز اپنے عروج پر ہے تو کہیں پُر مزاح گفتگو کہانی کا لطف بڑھا دیتی ہے۔یہ داستان کبھی نہ بھلائی جانے والی داستانوں میں سے ایک ہے۔

آتشی بادل سیریز

''آتشی بادل'' سیریز تین حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا ''لوبولی لا (دسمبر ۱۹۶۵ء)''، دوسرا ''سہ رنگا شعلہ (جنوری ۱۹۶۶ء)'' اور تیسرا ''آتشی بادل (مارچ ۱۹۶۶ء)''۔ اس کہانی میں ابن صفی نے غیر ملکی قوتوں کے ہتھکنڈوں کا پردہ چاک کیا ہے۔کس طرح یہ قوتیں، مختلف توہمات کے جال میں، کسی خیراتی اسپتال کی آڑ میں اور ضمیر فروش لالچی افراد کی مدد سے کسی بھی ملک میں افراتفری اور بے چینی پھیلاتے ہیں۔خیراتی اسپتال والا پہلو بالکل نیا پہلو تھا کہ مغربی اقوام اس طرح کے اداروں کو بھی اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔اس کہانی میں تجسس اور مزاح کو اس طرح ملایا گیا ہے کہ داستان پوری کیے بنا چین نہ آئے۔کہانی میں چند سائنسی ایجادات کا ذکر بھی ہے جن میں کسی بھی جان دار کو راکھ بنانے والی مشین قابل ذکر ہے۔مختلف النوع کیمیاوی گیسیں اور ذہنی جنگ اس ناول کو ایک یادگار ناول بناتی ہیں۔

مناروں والیاں اور سبز لہو

اس داستان میں بھی نباتاتی سائنس کا ذکر بیان کیا گیا ہے۔پہلی کہانی میں جاسوس خواتین اپنے جوڑوں میں ٹرانسمیٹر چھپا کر

پھرتی ہیں اور دوسری کہانی میں ایک مہلک منشیات کا ذکر ہے جسے پیوند کاری کے خصوصی تجربے کے بعد اس قابل بنا دیا گیا ہے کہ یہ کسی بھی زمین یا جگہ پر اُگ سکیں۔

شوگر بینک سیریز

ابن صفی کا ایک اور شاہ کار۔اس ناول (۱۹۶۷ء) میں ابن صفی نے سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ Cryptography/Encryption یعنی خفیہ کوڈ کے بارے میں قارئین کو آگاہی بخشی۔ زیرو لینڈ کی مزید ہوشربا ایجادات اور تھریسیا کا پھر نمودار ہونا۔اس بار کہانی کے آغاز میں ایک ایسے بندر سے ملاقات کیجیے جو پائپ پیتا ہے، بئیر کی بوتلوں سے شغف رکھتا ہے، موسمیات کا ماہر ہے، چائے اور سلائیس کا عادی ہے۔مگر درحقیقت اس میں ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر موجود ہے جو ایک طرف کی آوازیں دوسری طرف نشر کرتا ہے۔اس بندر میں ایک طاقت ور بم بھی ہے جو بڑی تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ دوسری حیران کن شے عمران کا تخت موسیقی جو چھبیس تاروں پر مشتمل ہے۔اسی تخت کی مدد سے وہ زیرو لینڈ کی Encryption کو توڑ دینے میں کامیاب ہوتا ہے۔اس ناول میں ''ظفر الملک'' اور ''جیمسن'' کے کردار متعارف کروائے گئے۔اس سائنس فکشن داستان میں زیرو لینڈ کی مزید سائنسی ایجادات سامنے آتی ہیں جن میں ایک جاسوس طیارہ ''ایکوراڈار'' اہم ہے۔ یہ ناول بھی بے حد سراہا گیا۔

کنگ چانگ

ابن صفی کی اس تخلیق (ستمبر ۱۹۷۳ء تا فروری ۱۹۷۴ء) کو اگر سائنس فکشن سفرنامہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔اس بار وہ اپنے قارئین کو بحرالکاہل کے دور دراز جزائر کی سیر کرواتے ہیں۔تاہیتی اور اس سے ملحقہ بہت سے جزائر جن میں سے ایک پر ''پومارے پنجم'' کا مقبرہ موجود ہے۔اس مقبرے کی خاص بات یہ ہے کہ اس پر شراب کی بوتل، جسے Decanter کہا جاتا ہے، نصب ہے۔کہانی کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس میں ابن صفی کے مخصوص تہہ در تہہ پلاٹ موجود ہیں۔اس داستان میں نئی سائنسی ایجادات سے ملیے۔اسٹرائیکر، ایک ایسا تارپیڈو جو ٹھوس ربڑ سے بنا ہے اور اس کے اگلے حصے پر لچک دار تاریں ہیں جن سے کشتیاں اور جہاز الٹ سکتے ہیں۔ساحل سمندر کی حفاظت کے لیے زیر آب لہریں جن سے ٹکرانے والی شے ٹکڑوں میں بٹ جاتی ہے۔ایک جزیرے میں پائی جانی والی دھند جس سے بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔زیرِ زمین زلزلہ پیدا کرنے والے میزائل ایسی تباہی لاتے ہیں جو قدرتی آفت محسوس ہو۔ یہ کہانی بھی انسانی سرشت کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو انتقام کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں اور مغربی ممالک کی ان کوششوں کی طرف بھی نشاندہی کرتی ہے جو وہ پس ماندہ اقوام کو اپنے زیرنگیں رکھنے کے لیے کرتے ہیں اور اپنی استعداد میں ہمہ دم اضافہ کی جستجو میں مصروف ہیں۔

تین سنکی

شکرال کی یہ داستان صیہونیت کی غیر انسانی سازشوں کا پردہ چاک کرتی ہے جن سے وہ معصوم افراد کو اپنے سائنسی تجربات کی

بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اس ضمن میں وہ تمام غیر یہودیوں کو، جنھیں وہ گویم کہتے ہیں، ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔ابن صفی نے آج سے پچاس سال پہلے بتا دیا تھا کہ صیہونی مسلمان اور عیسائی دونوں کے مشترکہ دشمن ہیں۔اس داستان (مئی تا ستمبر ۱۹۷۵ء) میں محیر العقول تجربات ہمارے سامنے آتے ہیں۔یہودی سائنس دان ایسے سیرم Serum تیار کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جن سے انسان کے جسم پر گوریلوں کی طرح لمبے لمبے بال اُگ آتے ہیں تاہم اس کی سوچ یا ذہن میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ان گوریلوں کو یہ صیہونی سائنس دان ایک طرف تو مختلف تجربات کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور دوسری طرف وہ انھیں متمول افراد کو بیچ کر دولت کماتے ہیں۔صیہونیت Zionism نوع انسانی کے لیے کتنا بڑا خطرہ ہے اس کا ادراک ابن صفی کو نصف صدی قبل ہی ہو گیا تھا۔اور وہ اپنی تحریروں میں بار بار اپنے قاری کو بھی اس کا احساس دلاتے رہے۔

جونک اور ناگن

ایک بار پھر زیرولینڈ والوں نے عمران کے ملک کو اپنا اکھاڑا بنا لیا ہے۔یہ داستان (جون تا ستمبر ۱۹۷۶ء) نئے سائنسی تجربات پر مشتمل ہے جس میں ایک بار پھر پس ماندہ اقوام کے افراد کو تجربوں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔وہ عام افراد کو دھاری دار آدمیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں جو اس تجربے کے بعد انتہائی طاقت ور ہو جاتا ہے اور اس کو جو بھی ہدایت دی جائے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتا ہے۔یہ داستان ''جنگل کی شہریت'' میں مکمل ہوتی ہے۔

جنگل کی شہریت

اس کہانی (مئی تا جولائی ۱۹۷۷ء) میں افریقی ملک تنزانیہ کی سیر کیجیے۔زیرولینڈ ہر پس ماندہ ملک میں ڈیرے ڈال کر بیٹھا ہوا ہے تاکہ اسے مفت کے مزدور مل سکیں۔یہ کہانی بھی تنزانیہ کے جنگلوں میں زیرولینڈ کی فیکٹریوں کی ہے جہاں وہ بسنے والے جنگلیوں کو ان دھاری دار آدمیوں، جنھیں زیبرا مین کہا جاتا ہے، کو قابو میں رکھتے ہیں۔اس بار تھریسیا ایسا پلاٹ ترتیب دیتی ہے کہ خود عمران پر زیرو لینڈ کے ایجنٹ ہونے کا شک ہونے لگتا ہے۔اس کے کیمرے سے زیبرا مین کی ہلاکت خیزیاں دکھانے کے بعد ہلا کو نامی بین البراعظمی میزائلوں کے پروجیکٹ ہلاکت خیز کی تصاویر ملتی ہیں۔یہ میزائل آج Inter Continental Ballistic Missiles (ICBM) کہلاتے ہیں۔پراجیکٹ ہلاکت خیز دراصل ایک شعاع ہے جو بہت ہی تباہ کن ہے یہ نظریہ جو ابن صفی نے سن ۷۷ میں پیش کیا تھا آج Laser Weapon System کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس میں ایک انتہائی شدت کی شعاع استعمال کی جاتی ہے۔اس کہانی میں ابن صفی نے Warfare کی ایک ایسی قسم کا ذکر کیا ہے جو اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں Smart Weapons Gadgets کے نام سے متعارف ہوئی۔اس کہانی میں ابن صفی نے ایسے پرندوں اور جانوروں کا ذکر کیا ہے جن کو باقاعدہ آپریشن کر کے ان کی ایک آنکھ میں کیمرہ اور پیٹ میں ٹرانسمیٹر اور آتش گیر مادہ نصب کیے گئے۔یہ پرندے، جن میں طوطے اور بندر شامل ہیں، پورے جنگل میں نگرانی کے کام آتے ہیں اور نگرانی کے علاوہ جب کسی سے بات کرنی ہو یا کسی کی آواز سننی ہو تو بھی یہ جانور اور

پرندے بڑے کارآمد ہیں۔ اس داستان میں جہاں انوکھی اور محیر العقول ایجادات سامنے آتی ہیں وہیں بین الاقوامی ریشہ دوانیاں بھی بے نقاب ہوتی ہیں کہ بڑی طاقتیں کس طرح اپنے مفاد کے لیے پس ماندہ اقوام کو استعمال کرتی ہیں۔

بابا سگ پرست اور مہکتے محافظ

ان کہانیوں میں ابن صفی نے ایک مختلف جہت کا اظہار کیا۔ کسی سائنسی عمل سے عام سی نسل کے کتے کو اعلیٰ نسل میں تبدیل کیا جاتا تھا اور کسی خاص کیمیاوی عمل سے ان کے جسم میں خاص منشیات چھپادی جاتی تھی۔ اسی کہانی میں ایک ایسی لڑکی کا بھی بیان ہے جسے سانپ ڈسیں تو مر جائیں۔

زیرو لینڈ کی تلاش

زیرو لینڈ کے سلسلے کا سب سے طویل سلسلہ (جولائی ۱۹۷۸ء تا مئی ۱۹۷۹ء) جو سات حصوں پر مشتمل ہے۔ اس بار کہانی بہت ہی دل چسپ، پُر پیچ اور تحیرات سے بھرپور ہے۔ ہر حصہ ایک مکمل کہانی اور تمام کہانیاں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی۔ اس ناول میں ابن صفی پھر ایک بار نئی سائنسی ایجادات سے اپنے قارئین کو حیران کر دیتے ہیں۔ اُڑنے والی گاڑی، ایک ایسی ایٹمی آب دوز جس کے اوپری حصے پر چٹانیں بنی ہوئی ہیں اور وہ عام آب دوزوں سے بے حد تیز رفتار آب دوز ہے۔ یہاں ابن صفی ایک اور چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مغربی اقوام کی طرف سے جو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پس ماندہ ممالک میں کام کر رہے ہیں وہ بھی اپنے ملکی مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اس کہانی میں بہت سی جہتیں ہیں جن پر بڑی طویل بحث کی جاسکتی ہے جن میں مصنوعی مریخ، خلائی سٹیشن اور انسانی چہرے والے روبوٹ شامل ہیں۔ یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ روایتی اور غیر روایتی ہتھیاروں کی دوڑ کے بعد اب امریکا، روس اور چین خلا میں اپنے سٹیشن اور ان سے منسلکہ ہتھیار اور گاڑیاں وغیرہ بنا رہے ہیں۔

خطرناک انگلیاں

یہ سلسلہ بھی تین ناولوں پر مشتمل ہے۔ یہ کہانی ۱۹۷۹ میں لکھی گئی تھی جب ہمارا ملک ایٹمی قوت نہیں بنا تھا۔ مگر ابن صفی کی نگاہ دور بیں نے یہ جان لیا تھا کہ مغربی قوتیں ہر حالت میں ہمارے ایٹمی پروگرام کی مخالفت کریں گی اور اگر ہم یہ قوت اپنے زورِ بازو پہ حاصل کر لیں گے تو پھر وہ اسے تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ سلسلہ بھی اسی نظریے کو بنیاد بنا کر لکھا گیا ہے۔ کہانی میں عام انسانوں کو روبوٹ میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور روبوٹ بھی کیسے کہ جن کا پورا جسم نہیں بلکہ چند حصے جیسے ہاتھ یا پیر ہتھیاروں میں بدل دیے جاتے ہیں۔ ناول میں ولن کی انگلیاں دراصل تباہ کن گولیاں چلانے کی اہلیت رکھتی تھیں جن پر عمران خصوصی کاوش سے قابو پاتا ہے۔

جدید سائنسی ہتھیار، میزائل، لاسلکی آلات، خفیہ کوڈ Encryption، پرندوں اور جانوروں میں کیمرے اور ٹرانسمیٹر نصب کرنا، بغیر تاروں کے ٹیلی وژن، مصنوعی دھند، روبوٹ، اڑن طشتریاں، لیزر LASER شعاعیں، ذہن پر مختلف اثرات ڈالنے والے

سیرم Serums، خلائی سیارے اور مراکز یہ وہ ایجادات ہیں جن سے ابن صفی کے قارئین کی شناسائی آج سے نصف صدی قبل ہی ہوگئی تھی۔حیرت انگیز طور پر ان کے تحریر کردہ ہتھیار، میزائل اور Cryptography آج پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔کچھ تصوارت کہ جب وہ بیان کیے گئے صرف تصورات تھے مگر آج وہ استعمال میں ہیں۔انھوں نے سائنسی طور پر بے حد ترقی یافتہ تنظیم زیرولینڈ کا ذکر کیا تھا جو Space Warfare میں بھی بہت آگے تھے۔خلا سے زمین پر مار کرنے والے میزائل اور سیاروں کی تباہی کی استعداد رکھنے والی زیرولینڈ تنظیم نے نہ صرف مصنوعی مریخ بنایا بلکہ وہ ایسے ہتھیار استعمال کرتے تھے جن کو آج Fifth Generation Warfare کہا جاتا ہے۔موجودہ زمانے میں استعمال ہونے والے ڈرونز Drones یعنی بغیر پائلٹ کے جہاز جن کی مدد سے انتہائی اونچائی سے نہ صرف فضائی نگرانی ہوسکتی ہے بلکہ میزائل بھی داغا جاسکتا ہے ان کا تصور وہی ہے جو زیرولینڈ کے تیار کردہ ایکو ریڈار طیارے کا تھا۔اڑن طشتریاں آج بھی سائنسی معما بنی ہوئی ہیں اور انھیں Unidentified Flying Object (UFO) کہا جاتا ہے ابن صفی کے ناولوں میں فے گراز کی شکل میں پیش ہوئی اور انھوں نے ساٹھ سال قبل بتادیا تھا کہ یہ UFO نہیں بلکہ مغربی طاقتوں کے زیرِاستعمال جہاز ہیں جنھیں وہ مناسب وقت پر سامنے لے کر آئیں گے۔آج خفیہ نگاری یا Cryptography کے بغیر کوئی کمپیوٹر یا موبائل فون پروگرام مکمل نہیں،اس کا استعمال محفوظ انٹرنیٹ کی ضمانت ہے۔ابن صفی نے اس تکنیک کو اپنے ناولوں میں مفصل طور پر بیان کیا ہے۔کیمیاوی ہتھیار جن کی بدولت عراق پر قبضہ کیا گیا پہلے پہل ان کے ناولوں میں ذکر ہوا۔پرندوں پر تجربات اور کیمرے وغیرہ نصب کرنا بھی ایک محیر العقول واقعہ ہے گو آج ایسے کئی روبوٹ جاسوس جن میں جاسوسی کرنے والے کیڑے مکوڑے شامل ہیں جو بہت چھوٹے سائز میں بنائے جاتے ہیں اور ان سے نگرانی اور جاسوسی کا کام لیا جاتا ہے۔دو انسانوں کے جسم سے ایک طاقت ور درندہ بنانے والی مشین بھی بجائے خود ایک کارنامہ ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔خود کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے ٹرانسمیٹر بھی خاصے کی چیز ہیں جن کو پہلی بار ۱۹۹۵ء میں فلم Mission Impossible میں دکھایا گیا تھا۔ابن صفی نے مصری علاقے کلب الشیاطین میں ایک چٹان میں موجود آندھی پیدا کرنے والی مشین کی صورت اور بعدازاں زلزلے کے سفر میں ایک ایسا تصور دیا جسے ہم آسان الفاظ میں موسمی تبدیلیوں پر قابو پانا کہہ سکتے ہیں۔اس ضمن میں حیران کن بات یہ ہے کہ امریکا نے اس موضوع پر تحقیق کے لیے ۱۹۹۵ء میں High Frequency Active Auroral Research Program(HAARP) نامی ادارہ قائم کیا۔پہلی ایٹمی آب دوز جس میں ایٹمی قوت سے چلنے والا پلانٹ لگا ۱۹۵۴ میں بنی اور اس کا نام USS Nautlilus تھا اس کی رفتار 14 Knots تھی۔ابن صفی نے ''پیاسا سمندر'' میں اس سے بھی تیز رفتار اور بڑی آب دوز کا تصور دیا جو بعد میں Ohio Class Submarines کی صورت میں سامنے آیا۔قارئین کی معلومات کے لیے Ohio آج تک کا تخلیق کردہ سب سے مہلک ہتھیار ہے۔صرف ایک آب دوز ایسے تباہ کن میزائل رکھتی ہے جو بیک وقت ۲۴ شہر زمین کے نقشے سے مٹا دیں۔ابن صفی کو سمندر کی گہرائیوں اور اس کی اہمیت کا بھی اندازہ تھا۔انھوں نے واضح کیا کہ سمندر ہی ترقی یافتہ تنظیموں اور ملکوں کی ترقی کا راز ہے۔آج کی مسلمہ طاقت ریاست ہائے متحدہ امریکا اسی برتے پر پوری دنیا پر حکمران ہے کہ ہر سمندر تک اس کی رسائی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہر اہم جگہ جس میں بحرین، جبوتی، جاپان وغیرہ میں اس کے بحری اڈے ہیں۔چمکیلا غبار میں انھوں نے جس غبار کا ذکر کیا ہے وہ آج Multi

Ammunition Softkill System کے نام سے جانا جاتا ہے اور کسی بھی بحری اور ہوائی جنگی جہاز کی حفاظت کا ضامن ہے۔

ابن صفی اردو ادب میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ فطری قصہ گو تھے شاعری ان کا پہلا عشق تھا لہٰذا ان کی نثر میں ایک خاص نوع کی غنائیت تھی۔ انھوں نے مختصر عمر پائی مگر ایک بھرپور تخلیقی زندگی بسر کی۔ اگر ہم ان کی ادبی کائنات پر نظر دوڑائیں تو کہیں ہمیں ان کے ناولوں میں آئزک آسیموف کے ناولوں سی حیران کن سائنسی ایجادات نظر آتی ہیں کہیں روبوٹ تو کہیں اُڑن طشتریاں، کسی جگہ سراغ رسانی کے مروجہ اصولوں پر تفتیش ہوتی ہے تو کہیں ہمیں بہت سے کیس بالکل مختلف انداز سے حل ہوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ اپنے قاری کو اٹلی لے جاتے ہیں تو کبھی امریکا اور کبھی کبھار تو ہمیں وہ تاہیتی جیسے دور دراز جزیروں کی سیر کروادیتے ہیں۔ زیرولینڈ جیسی پُراسرار جگہیں ہوں یا فرضی چاند، رام گڑھ جیسے پہاڑی مقام ہوں یا تارجام جیسے قصبے، فزارو، نیاگرا اور مے پول ہوٹل جیسی تفریح گاہیں، کیا کیا منظرنامے تخلیق کیے ہیں جناب ابن صفی نے۔ کردار نگاری میں ابن صفی کا کوئی ثانی نہیں۔ متذکرہ بالا مغربی مصنّفین نے اپنی کہانیوں میں زیادہ سے زیادہ دو یا چار کردار تخلیق کیے ہوں گے مگر ابن صفی نے فریدی و عمران سیریز میں کم و بیش بیس مستقل کردار اور ان گنت غیر مستقل کردار تخلیق کیے۔ زبان ایسی کہ ایک زمانے نے ان کے ناولوں سے اردو سیکھی۔ مزاح ایسا کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجایئے اور طنز ایسا کہ اس کی کاٹ پوری آب و تاب سے محسوس ہو۔ اسی لیے تو میں عرفان صدیقی کا یہ شعر ذرا سی ردو بدل کے ساتھ ابن صفی کے نام کرتا ہوں کہ:

کوئی سلطان نہیں تیرے سوا تیرا شریک
مسند خاک پہ بیٹھا ہے برابر اپنے

یاسر پیرزادہ ❁

ابنِ صفی

یہ میرے لڑکپن کی بات ہے، میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے کسی ملنے والوں کے ہاں گیا ہوا تھا۔ بڑوں کے درمیان امریکا اور روس پر گفتگو ہو رہی تھی اور میں بے تحاشہ بور ہو رہا تھا۔ اس گھر میں میرا کوئی ہم عمر تھا اور نہ ہی دل چسپی کا کوئی سامان، اچانک میری نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ایک ناول پر پڑی اور میں نے حسب عادت وقت گزاری کے لیے اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ جوں جوں میں اس ناول کے صفحے پلٹتا گیا توں توں میری دل چسپی میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر ایک گھنٹے کے اندر میں نے وہ پورا ناول گھول کے پی لیا۔ ابن صفی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

ابن صفی سے اگلا تعارف والد محترم نے کروایا۔ ان کے علم میں تھا کہ میں گھٹیا قسم کے جاسوسی ناول پڑھتا ہوں اور اگر اسی تواتر کے ساتھ پڑھتا رہا تو ایک دن نالائق قسم کا جاسوس بن جاؤں گا یا پھر خودکش بمبار کیوں کہ ان ناولوں میں ''مذہبی جاسوسی'' کا تڑکا لگا ہوتا تھا۔ سو ابن صفی کا دوسرا ناول مجھے والد صاحب نے لا کر دیا جسے مجھ سے پہلے وہ خود پڑھنے بیٹھ گئے اور جیسا کہ مجھے اندیشہ تھا، ختم کر کے ہی دم لیا۔ بعد ازاں میں نے ایک عدد لائبریری دریافت کی جہاں سے اس نوع کے ناول اور رسالے بآسانی کرائے پر پڑھنے کے لیے مل جاتے تھے چناں چہ میں نے ایک دن میں چار چار ناول پڑھنے شروع کیے اور لگ بھگ اڑھائی تین مہینوں میں ابن صفی کی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا ختم کر ڈالیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کے بعد دوبارہ ہر ناول کرائے پر لیا گیا اور نئے سرے سے پڑھا گیا۔ چند مہینوں بعد اس لائبریری کی ایک نئی ''برانچ'' کھل گئی، مجھے شبہ ہے کہ وہ برانچ میرے کرائے کے پیسوں سے ہی کھولی گئی ہوگی۔ آج میری اپنی چھوٹی سی لائبریری میں ابن صفی کے تمام ناولوں کا سیٹ موجود ہے جسے میں نہ جانے کتنی بار پڑھ چکا ہوں اور ہر بار یوں لگتا ہے جیسے پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔ آپ مجھے ''حافظ'' ابن صفی بھی کہہ سکتے ہیں۔

ابن صفی کی تحریر کی بنیادی خوب صورتی اس کی کردار نگاری ہے، وہ دو سطروں میں کردار کا خلاصہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کا سب سے مقبول کردار علی عمران ہے جو بظاہر احمق نظر آتا ہے مگر حقیقتاً اس کے کئی روپ ہیں۔ علی عمران کا کردار دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ بھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر ناول میں اس کردار کے چند ایسے پہلو سامنے آتے ہیں جو قاری کے لیے نئے ہوتے ہیں۔ اس کردار کا تفصیلی احاطہ خود ابن صفی نے اپنے ایک شاہکار ناول ''ڈاکٹر دعا گو'' میں کیا اور بتایا کہ کیوں علی عمران کی شخصیت اس قدر غیر متوازن ہے، اس کی اپنے باپ سے کیوں نہیں بنی، وہ ہر بات کو ہنسی میں کیوں اڑا دیتا ہے، اسے کرمنالوجی میں دل چسپی کیسے

❁ معروف صحافی و کالم نویس

پیدا ہوئی اور وہ لندن سے یورپین سٹائل کا قلندر بن کر کیسے لوٹا!

ابن صفی کا دوسرا بڑا کردار کرنل فریدی ہے۔ ابن صفی کو عمران سے زیادہ فریدی سے پیار تھا کیوں کہ جو رکھ رکھاؤ، خاندانی وقار، رعب و دبدبہ، امارت، طاقت اور پرسنالٹی فریدی کے حصے میں آئی، عمران ایک لحاظ سے اس سے محروم رہا۔ قارئین نے اس ''جانبداری'' کا عملی مظاہرہ ان کے ناول ''زمین کے بادل'' میں دیکھا جس میں یہ دونوں کردار پہلی اور آخری بار یکجا ہوئے۔ ناول کے کلائمکس میں عمران کسی زہریلی گیس کے زیر اثر ناکارہ ہو جاتا ہے جبکہ فریدی سانس روکے رکھتا ہے اور پھر بالآخر تن تنہا آٹھ آدمیوں کو زیر کر کے اپنے ساتھیوں کو دشمن سے صاف بچا لے جاتا ہے۔ اس موقع پر عمران کی بے بسی قائین کو ایک آنکھ نہیں بھائی اور انھوں نے ابن صفی کو لاتعداد خطوط لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جس کے جواب میں موصوف نے توبہ کر لی کہ آئندہ ان دونوں کرداروں کو اکٹھا کر کے کسی کی مٹی پلید نہیں کریں گے۔

اسی ناول کے پیشرس میں ابن صفی نے بتایا کہ ان کے تمام ناول اور کردار ان کے اپنے ہیں سوائے پہلے ناول ''دلیر مجرم'' کے جسے اور بھی کئی مغربی مصنّفین نے اپنے اپنے انداز میں لکھا تاہم فریدی اور حمید ابن صفی کے اپنے کردار تھے، صرف پلاٹ باہر سے لیا گیا تھا۔ ابن صفی کی کل پانچ کہانیوں کے پلاٹ اور تین کرداروں کے علاوہ کوئی ایک کردار یا ناول ایسا نہیں جو اوریجنل نہ ہو۔ عمران سیریز کے تمام ناول اور کردار بے داغ ہیں اور ان میں کسی قسم کی کوئی ملاوٹ نہیں۔ سنگ ہی، تھریسیا، جوزف، جولیانا فٹنر واٹر، کیپٹن حمید، انور، رشیدہ، استاد نرالے عالم، روشی، سر سلطان، ظفر الملک، جیمسن، تنویر، سپرنٹنڈنٹ فیاض اور میرا پسندیدہ قاسم چند ایسے لازوال کردار ہیں جو ابن صفی کی تخلیقی جادوگری کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کے ناولوں کے وہ کردار بھی قاری کی یادداشت سے چپک کر رہ جاتے ہیں جو کسی ایک ناول میں ہی جلوہ گر ہوئے جیسے فراگ، علامہ دہشت ناک، ہمبک دی گریٹ، ایڈلاوا، بوغا، الفروزے اور خمیسو۔ یہ فہرست مزید طویل بھی ہو سکتی تھی کیوں کہ ابن صفی اگر کسی راہ چلتے بندے کا بھی ذکر کرتے جس کا کام دو صفحوں کے بعد ختم ہو جاتا تو اس کی کردار نگاری بھی ایسے کرتے کہ بندہ عش عش کر اٹھتا۔

ابن صفی کے ناول پڑھتے وقت ایک اور بات جو قاری کو مبہوت کر دیتی ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے۔ برازیل اور اٹلی کے ساحلوں اور افریقا کے جنگلوں کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں جیسے سالہا سال وہاں رہ چکے ہوں۔ مقامی لوگوں کی بولیوں، ان کے رہن سہن، بودو باش اور رسم و رواج کا ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ قاری اپنے آپ کو اسی مقام پر تصور کر کے گم ہو جاتا ہے۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابن صفی نے ہندوستان سے پاکستان آنے کے بعد افریقا اور یورپ تو کجا کبھی پاکستان سے باہر تک قدم نہیں رکھا۔ یہ تمام محیر العقول کہانیاں انھوں نے اپنے چھوٹے سے گھر کے کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھ کر تخلیق کیں۔ واضح رہے کہ جس زمانے میں یہ کہانیاں لکھی گئیں وہ انٹرنیٹ تو کیا فون کا دور بھی نہیں تھا۔ اب تو ایک بچہ بھی گوگل پر سرچ کر کے معلوم کر لیتا ہے کہ افریقا میں کتنی قسموں کے سانپ پائے جاتے ہیں!

ابن صفی کی ایک اور خصوصیت ان کی مزاح نگاری ہے، جس اعلیٰ پائے کا مزاح ہمیں ان کے ہاں ملتا ہے وہ کسی بھی جید، مستند اور باقاعدہ قسم کے مزاح نگار سے کمتر درجے کا نہیں۔ ان کے ناول کے تو ''پیشرس'' کا ہی جواب نہیں۔ ان کے کردار قاری کو بے ساختہ

قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہی فن مزاح نگاری کی معراج ہے۔ اس مختصر سے کالم میں ابن صفی کے فن کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں لہذا میں صرف ان کے ایک دو جملے یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ ’’بوغا‘‘ سیریز میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ’’ڈیڈی ہمیں بالآخر آدمی مل گیا!......‘ لڑکی نے خوش ہو کر کہا! ’’بڑی دل چسپ اطلاع ہے!‘‘ ڈیڈی نے کتاب سے نظر ہٹائے بغیر کہا! ’’حالاں کہ مجھے سالہا سال سے تلاش تھی لیکن ایک بھی نہ مل سکا!‘‘ اسی طرح ان کا ایک جملہ ہے ’’عمل اور ردعمل کا نام زندگی ہے۔ منطقی جواز تو بعد میں تلاش کیا جاتا ہے۔‘‘ یہ چاولوں کی دیگ کے دو دانے بھی نہیں۔

میں کوئی نقاد نہیں جو ادب میں ابن صفی کے مقام کا تعین کر سکوں تاہم میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ابن صفی کے مقام کا تعین کسی نقاد کے بس کا کام بھی نہیں کیوں کہ بقول ابن صفی ’’میری کتابیں لائبریریوں میں نہیں بلکہ بستر کے تکیے کے نیچے پائی جاتی ہیں۔‘‘ ابن صفی کو محض ایک جاسوسی ناول نگار کا لیبل لگا کر نظر انداز کر دینا اس کہنہ مشق ادیب کے ساتھ ’’ادبی دہشت گردی‘‘ ہے۔ ہمیں اس دہشت گردی کا نوٹس لینا چاہیے۔

کامران نفیس ۞

برصغیر کا جینئس — ابنِ صفی

کہتے ہیں کہ ڈپریشن سے بچاؤ کا بہترین طریقہ ایسی کتب پڑھنا بھی ہوتا جن سے حوصلہ ملے، ذہن تر و تازہ رہے اور جو انسان کو مشکلات سے لڑنے پر مائل کرے۔ میں یہ بات ذمے داری سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب میں اگر یہ خصوصیت کسی لکھنے والے کے ہاں شدت سے پائی جاتی ہے تو وہ ابن صفی ہیں۔

بدقسمتی سے ادب کے نقادوں نے کبھی جاسوسی ناول کو ادب کا حصہ نہیں مانا، کئی نقاد جاسوسی ناول کو ادب کا حصہ بنانے کے حامی ضرور نظر آئے لیکن انھوں نے بھی اس کا اظہار کھل کر نہیں کیا۔ اس بات سے قطع نظر کہ جاسوسی ناول کو ادب کا حصہ تسلیم کیا گیا یا نہیں ایک بات حتمی ہے کہ ابن صفی نے نہ صرف اپنے عہد بلکہ اس کے بعد بھی آنے والے عصر میں یعنی آج تک نہ صرف اپنے نئے قارئین پیدا کیے بلکہ عوام میں اردو زبان کا وہ ذوق پیدا کیا جو بڑے بڑے ادیب نہ کر سکے۔

یہاں میں ابن صفی کے ناولز اور ان کے پیش رس سے کچھ اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا جس کے بعد قارئین کو نہ صرف ان کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوگی بلکہ آگے چل کے ان کی ناول نگاری کی خصوصیات بیان کرنا میرے لیے ممکن ہوگا۔

پاگلوں کی انجمن میں لکھتے ہیں:

ایک بار خود شمس الدین سے کسی نے پوچھا میاں اس قدر جامے سے باہر کیوں رہتے ہو!

اس پر وہ ہنس کر بولے، حسن تدبیر! جس طرح کوئی مداری تماشائیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے پہلے بنسری اور ڈگڈگی بجاتا ہے، اسی طرح میرے مضامین کے عنوان بھی محض توجہ مبذول کرانے کے لیے ہوتے ہیں...! اگر میں اپنی تنقید کو جوش کی شاعری کا نام دوں تو لوگ سرسری طور پر نگاہ ڈالیں گے اور صفحہ پلٹ دیں گے ... لیکن اگر میرے تنقیدی مضمون کا عنوان ''جوش اور پاپوش'' ہو تو خود سوچیئے گا کیا ہوگا۔ آپ اسے ضرور پڑھیں گے جلد شہرت حاصل کا بہترین طریقہ ... بھلا اس سے جوش صاحب کا کیا بگڑے گا... لیکن میری شہرت مسلم!

یہاں ابن صفی نے دوطرفہ تنقید کی ایک تو اردو ادب کے نام نہاد ناقدین پر دوسرا ان پر جو ان کے ناولز کی چوری کرتے رہے۔ ان کے کتنے ہی ناول ہندوستان پاکستان میں نام بدل بدل کر لکھے جاتے رہے، اور وہ ان نقالوں کو بے پردہ کرتے رہے۔

عمران سیریز کے ناول پیاسا سمندر میں ایک جگہ لکھتے ہیں، ڈاکٹر داور کا مکالمہ ہوتا ہے، ''میں اپنے ذہن کی بلندیوں سے ان چوروں

۞ مکان نمبر R-743، نزد بلال مسجد، سیکٹر ۸، شمالی کراچی۔ برقی پتا: mknafees@gmail.com

پر حقیر نگاہ ڈالتا ہوں، جو میری ایجادات چوری کرتے ہیں، وہ نہیں جانتے کہ میں اس ایجاد سے بھی بہتر ایجاد سامنے لا سکتا ہوں۔''

تیسری ناگن کے پیش رس میں لکھتے ہیں مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ عجیب بات ہے کہ جب میرا کوئی ناول بہت پسند کیا جاتا ہے تو مجھ سے ادب کی خدمت کرنے کی فرمائش ضرور کی جاتی ہے۔ بھائی آپ مجھے صرف اردو کی خدمت کرنے دیجیے (اس کے باوجود صرف ونحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہوں گی) آپ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی بنگالی بھائی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اردو پڑھ رہا ہوں، پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کب تک لیا جائے۔

اب بتائیے میں ادب کی خدمت کروں یا میرے لیے اردو ہی کی خدمت مناسب ہوگئی۔ ویسے اپنے نظریات کے مطابق میں ادب کی خدمت بھی کر رہا ہوں اور سوسائٹی کی بھی اور میری اس خدمت کا انداز نہ تو بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور نہ وقتی مصلحت کے تحت کوئی دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ہر حال میں قانون کا احترام کرنا سکھاتا ہوں۔

کچھ لوگ ادب میں میرے مقام کی بات کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ آپ کی نظروں میں میرا کوئی مقام ضرور ہے۔ ورنہ آپ کو اس کی فکر ہرگز نہ ہوتی۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ''مجھے اس وقت بڑی ہنسی آتی ہے جب آرٹ اور ثقافت کے علمبردار مجھ سے کہتے ہیں کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔
>
> ان کی دانست میں شاید میں جھک مار رہا ہوں، حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریقِ کار ہمیشہ عام روِش سے الگ تھلگ رہا ہے۔ میں بہت زیادہ اونچی باتوں اور ایک ہزار کے ایڈیشن تک محدود رہ جانے کا قائل نہیں ہوں۔ میرے دوسرے احباب کا اعلیٰ وارفع ادب کتنے ہاتھوں تک پہنچتا ہے؟ اور انفرادی یا اجتماعی زندگی میں کس قسم کا انقلاب لاتا ہے؟''

ابنِ صفی نے بڑے کرب کے ساتھ اس بات کا بھی اظہار کیا:

''بہت ہی بھیانک قسم کے ذہنی ادوار سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہوں، ورنہ میں نے بھی آفاقیت کے گیت گائے ہیں، عالمی بھائی چارے کی باتیں کی ہیں لیکن ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا، اس نے میری پوری شخصیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ سڑکوں پر خون بہہ رہا تھا اور عالمی بھائی چارے کی باتیں کرنے والے سوکھے سہمے اپنی پناہ گاہوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہنگامہ فرو ہوتے ہی پھر پناہ گاہوں سے باہر آگئے اور چیخنا شروع کر دیا یہ نہ ہونا چاہیے تھا، یہ بہت بُرا ہوا لیکن ہوا کیوں؟ تم تو بہت پہلے سے یہی چیختے رہے تھے۔ تمھارے گیت دیوانگی کے اس طوفان کو کیوں نہ روک سکے۔

میں سوچتا رہا... سوچتا رہا۔ آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ آدمی میں جب تک قانون کے احترام کا سلیقہ نہیں پیدا ہوگا یہی سب کچھ

ہوتا رہے گا۔ یہ میرا مشن ہے کہ آدمی قانون کا احترام کرنا سیکھے... اور جاسوسی ناول کی راہ میں نے اسی لیے منتخب کی تھی۔ تھکے ہارے ذہنوں کو تفریح بھی مہیّا کرتا ہوں اور انھیں قانون کا احترام کرنا بھی سکھا تا ہوں۔ فریدی میرا آئیڈیل ہے جو خود بھی قانون کا احترام کرتا ہے اور دوسروں سے بھی قانون کا احترام کرانے کے لیے اپنی زندگی تک داؤ پر لگا دیتا ہے۔

مضمون کی ابتدا میں ہم ڈپریشن میں اچھی کتب کے مطالعے کی بات کر رہے تھے، یقین جانیں ابن صفی کو پڑھنا ایک ایسا حوصلہ عطا کرتا ہے جو اور کسی مصنف سے حاصل نہیں ہو پاتا۔ میں ایسے درجنوں لوگوں سے واقف ہوں جنھوں نے عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کا مکمل سیٹ کئی کئی مرتبہ پڑھ رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم جب دل شکستہ یا پریشان ہوتے ہیں تو ایسے میں ابن صفی کا مطالعہ ہمیں حوصلہ و ہمت عطا کرتا ہے۔

یہ بہت عجیب بات ہے کہ ابن صفی کے ناول بار بار پڑھنے کے باوجود ہر بار نیا مزہ دیتے ہیں، یہ صلاحیت دنیا میں بہت کم لکھنے والوں کو حاصل ہے۔ گویا ابن صفی کا مطالعہ بھی میر صاحب کی شاعری کی طرح کہ جب پڑھو سرشار ہو کر اٹھو۔ ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۸۰ء کی دہائی تک لکھے گئے یہ ناول یوں لگتا ہے کہ آج کے دور میں لکھے گئے ہیں۔ ان ناولز میں طنز و مزاح، رومانس، مار دھاڑ، شعر کا ذوق، زبان کی چاشنی، سریت، اعلیٰ اخلاقی قدریں، قانونی کی پاسداری، سائنس فکشن غرض ہر وہ چیز ملے گی جو اہل ذوق کے اطمینان کو کافی ہے۔

بلاشبہ ان کے مطالعے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابن صفی ایک جینیس تھے اور جو کچھ وہ لکھ گئے اس کے بعد کسی اور کے لیے ممکن نہ ہو سکا کہ اس کو ان کے انداز میں آگے بڑھائے۔

ان کا ایک شعر ہے جس میں اپنی بات مکمل کر گئے۔

جو کہہ دیا وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرارؔ
جو کہہ نہ پائے نہ جانے وہ چیز کیا ہوتی

درجنوں قلم کاروں نے انکی عمران سیریز اور جاسوسی دنیا کے کرداروں پر طبع آزمائی کی، ایک طویل فہرست ہے جس میں ایم اے راحت، ایس قریشی، ایم ایس قادری، مشتاق احمد قریشی، ایچ اقبال، مظہر کلیم اور کئی دوسرے شامل ہیں۔ میری نظر میں ماسوائے مشتاق احمد قریشی کے جو خود کو ابن صفی کا شاگرد کہتے ہیں، کوئی اور ان کے کرداروں کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ کچھ قلم کاروں نے اپنے کردار بھی تخلیق کیے جس میں ایچ اقبال کا پرمود اور ایم اے راحت کا صوفی بھی شامل ہے لیکن کوئی ابن صفی کے کرداروں کا پاسنگ بھی نہ تھا۔

کردار سازی کے معاملے میں ابن صفی کو ملکہ حاصل تھا، انھوں نے اپنے ناولوں میں ہیرو یا ولن ہر دو کرداروں میں اپنی تخلیقی صلاحیت کی انتہا پر جا کر کام کیا۔ ذہن کی نفسیاتی گرہوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے ایسے کردار تخلیق کیے جو آج لوگوں کی زبانوں پر ہیں جن کی خصوصیات دیکھ کر لوگوں نے انھیں اپنا آئیڈیل بنا ڈالا۔ مثال کے طور پر علی عمران کا کردار پھر اس کردار کے اندر عبدالمنان، پرنس آف ڈھمپ، ایکسٹو، رانا تہور جیسے چار کردار، گویا ایک کردار کے چار بہروپ، کیا اس طرح کا کردار تخلیق کرنا کوئی مذاق بات ہے؟ اچھے اچھوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور ساری تخلیقی توانائی خرچ ہوجاتی ہے۔ علی عمران کے ان چار کرداروں کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں اور جہاں ان کے استعمال کا محل آیا وہاں ان سے ہمیشہ منفرد کام لیا گیا، ابن صفی کے درجنوں ناولوں میں آپ کو ان

کرداروں کا کامیاب استعمال نظر آئے گا لیکن مجال ہے جو کہیں کسی قسم کی repetition نظر آ جائے۔ علی عمران کا کردار بطور علی عمران بھی کم دل چسپ نہیں، نفسیاتی پیچیدگیوں کے ساتھ چہرے سے احمق نظر آنے والا یہ نوجوان کس طرح ملک وقوم کی خدمت کرتا ہے یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ علی عمران کے کردار کے بارے میں ابن صفی خود اپنے ایک ناول میں لکھ چکے ہیں کہ کس طرح گھر کی سختیوں کی وجہ سے عمران کی شخصیت میں یہ متلون مزاجی آئی۔ رحمان صاحب کی شخصیت بھی عمران کی کردار سازی میں کھل ک بیان کی گئی، جب اس کی والدہ اسے دین کی طرف راغب کرنا چاہتی ہیں اور والد مغربی فکر کی طرف۔ یوں علی عمران کی وہ شخصیت ترتیب پاتی ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی اصول کی پابند نہیں ہوتی لیکن اس کا مقصد ہمیشہ نیکی کا ہوتا ہے۔ ثریا عمران کی چھوٹی بہن ہے جو ضدی بھی ہے اور اپنے بھائی کی حرکتوں سے نالاں بھی، ناول ڈاکٹر دعا گو میں آپ ثریا کردار بہت وضاحت سے پڑھ سکیں گے۔

پھر سیکریٹ سروس کے دوسرے کردار بھی انسانی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے تشکیل دیئے گئے خصوصا سنجیدہ اور بردبار صفدر یا کھلنڈرا اور دل پھینک تنویر۔ بلیک زیرو کا کردار بھی مشکل ترین اور دہرا بہروپ لیے ہوئے، جہاں وہ ایک طرف ایکسٹو بن کر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے وہیں طاہر بن کر دانش منزل کے عام سے ملازم کے روپ میں ملتا ہے جسے اس کے ماتحت کسی قابل نہیں سمجھتے۔

ابن صفی کے ذہن کو خدا نے عجیب طاقت عطا کی تھی، مجھے ان کے مطالعے کے دوران ہمیشہ یہ حیرت ہوئی کہ ایک انسان یک دم مختلف کرداروں کو استعمال کرتے ہوئے کیسے انصاف کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر فریدی اور عمران کا موازنہ کیا جائے تو فریدی پر ایک ناول لکھنے کے بعد کس طرح فوری طور پر عمران سیریز شروع کی جاسکتی ہے جس میں عمران کا کردار ایسا ہو کہ فریدی کی پرچھائیں بھی نہ پڑ سکے۔ یا حمید اور عمران کی حس مزاح اور حاضر جوابی ایک جیسی ہونے کے باوجود کس طرح دونوں الگ الگ تاثر قائم کرتے ہیں۔ یہ کوئی عام بات نہیں، ایسا کام کوئی جینئیس ہی کرسکتا ہے۔

دوسرے کرداروں کی بات کریں تو سوئس جولیانا فٹز واٹر اور افریقی جوزف یا اپنے ماحول سے اکتایا اور بغاوت پر آمادہ ظفر الملک یا اس کا پشتینی اور کھلنڈرا ملازم جیمسن ایسے کردار ہیں جن پر الگ سے مضامین لکھے جاسکتے ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہیں کسی ناول کے پیش رس میں ابن صفی نے یہ لکھا تھا کہ میرے بہت سے کرداروں کی نقل کر کے ناول لکھے گئے ہیں لیکن اگر کسی نے ظفر الملک اور جیمسن کی نقل کی تو میں قانونی چارہ جوئی کروں گا۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں اپنے ان دونوں کرداروں سے کتنی محبت ہوگی۔ عمران سیریز کا ایک اور بہت اہم کردار سپریٹنڈینٹ فیاض ہے، عمران کے دوست ہونے کے ساتھ ایک موقع پرست اور احسان فراموش انسان۔ ابن صفی نے اپنی اکثر کہانیوں کی تشکیل اور ان کو آگے بڑھانے کے لیے جن کرداروں سے کام لیا ان میں فیاض کا کردار سر فہرست ہے۔

عمران سیریز کے کرداروں میں ایک اور بہت اہم کردار سلیمان کا بھی ہے جو عمران کا باورچی اور چہیتا ہے، مالک اور نوکر کا عجیب رشتہ جس میں ایسی محبت ہے جو شاذ ہی حقیقت میں نظر آئے لیکن یہیں ابن صفی کی تحریروں کا وہ جوہر سامنے آتا ہے جس سے محبت اور مروت پر مبنی ایک بہترین معاشرے کی تشکیل ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ابن صفی کے تمام کردار اعلیٰ اخلاقی صلاحیتوں کے حامل ایسے کردار ہیں جن سے قاری نہ صرف محبت کرتا ہے بلکہ اپنی زندگی میں ان جیسا بننے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ صرف ہیرو کے کردار ہی نہیں، بلکہ ابن صفی کے کئی ولن بھی ایسی خصوصیات رکھتے ہیں کہ آخر میں ان سے قاری کو محبت ہوجاتی ہے۔ اس ضمن میں ایڈلاوہ، فنچ، علامہ دہشت ناک اور ہمبگ دی گریٹ سرفہرست ہیں۔ اگر ان کرداروں کے بارے میں الگ الگ لکھا جائے تو تحریر بہت لمبی ہوجاتی ہے۔ عمران سیریز کے منفی کرداروں میں تھریسیا اور سنگ ہی کے لازوال کردار بھی شامل ہیں جن کی اپنے دشمن علی عمران کے ساتھ عجب جذباتی وابستگی ہے، ہیرو اور ولن کا اس انداز کا رشتہ صرف ابن صفی ہی نبھا سکتے تھے اور انھوں نے اسے خوب نبھایا۔ کہیں الفانسے کو مار کر عمران تھریسیا کو بچاتا ہے تو کہیں عمران کے قتل کی خبر پا کر سنگ ہی اپنے ہی ساتھی کو مار دیتا ہے، عمران، تھریسیا اور سنگ ہی کا یہ ٹرائیکا جاسوسی ناولوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا ایک ہی ہے۔

عمران سیریز کے بعد جاسوسی دنیا یعنی کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کے کردار اردو میں جاسوسی ناول کی تاریخ کے انوکھے کردار ہیں۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ دوسرے لکھنے والوں نے عمران اور اسکے ماتحتوں پر تو طبع آزمائی کی لیکن کرنل فریدی جیسے لازوال کردار پر زیادہ کچھ لکھنے سے اجتناب برتا، اسکی وجہ یہ رہی کہ کرنل فریدی کا کردار ابن صفی کا وہ مشکل ترین کردار ہے جس پر قلم اٹھانے کی بابت اچھے سے اچھا لکھنے والے کی سانس پھول جاتی ہے اور وہ تھک ہار جاتا ہے۔ کرنل فریدی خود جناب ابن صفی کا پسندیدہ کردار تھا جسکا ذکر وہ اپنے پیش رس میں کر چکے ہیں۔ یہ مالی طور پر بے انتہا آسودہ، ایک نواب خاندان سے تعلق رکھنے والا ایسا نوجوان ہے جسے قانون کی پاسداری دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز رہی سو اس نے اپنی افتادِ طبع کی خاطر محکمہ پولیس میں بہ حیثیت انسپکٹر ملازمت کر ڈالی اور پھر ریاست نے اس کے کارناموں کی وجہ سے اسے آنریری کرنل کا عہدہ دیا۔ یہ ایک انتہائی ذہین اور جسمانی طور پر بے انتہا طاقتور کردار ہے۔ ابن صفی کے ناقدین یہ بات بھی کہتے پائے گئے کہ کرنل فریدی تو ایک فوق العقل اور مافوق الفطرت کردار ہے، گویا کوئی دیومالائی کردار۔ کسی حد تک ان کی بات درست بھی ہے۔ ابن صفی کا یہ کردار ہر طرح سے ایک آئیڈیل کردار ہے جو نفسانی خواہشات سے دور اور انسانی کوتاہیوں سے مبرا نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا اس لیے ہے کہ یہ خود ابن صفی کی خواہش تھی، وہ ایک ایسا کردار تخلیق کرنا چاہتے تھے جو صرف ان کا نہیں ان کے ہر قاری کے لیے رول ماڈل ہو۔ جو قانون کا پاسدار ہو اور مجرموں کو کڑی سزا دینا چاہتا ہو، جو غیر قانونی کام اور ہر قسم کے جرم کو اس دنیا سے ختم کر دینا چاہتا ہو، جو رشتوں کا تقدس جانتا ہو اور کسی کی جان بچانا اپنا فرض سمجھتا ہو۔ ظاہر ہے اس کے لیے ایک مشکل اور مختلف اور طاقتور کردار تشکیل دینا ضروری تھا لہٰذا کرنل فریدی جیسا کردار تخلیق کیا گیا۔ کرنل فریدی کے ساتھ کیپٹن حمید کا کردار بنایا گیا، حمید دوسری جنگِ عظیم کے محاذ سے زندہ لوٹنے والا ایک نوجوان جس کا دل جنگ کی تباہکاریاں دیکھ کر زندگی سے اچاٹ ہو چکا تھا، جس نے اپنے خونی رشتوں کو صرف اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ انھوں نے نوجوانی میں اسے وہ کچھ نہیں کرنے دیا جو وہ کرنا چاہتا تھا اور زبردستی فوج میں بھیج دیا تھا۔ حمید جو اپنی زندگی سے عاجز آ چکا تھا، کرنل فریدی کی تربیت میں آ کر ایک بہترین جاسوس کے طور پر سامنے آتا ہے، اور جس سے کرنل کو اپنے چھوٹے بھائیوں جیسی محبت ہوجاتی ہے۔

عمران سیریز کی طرح جاسوسی دنیا میں بہت زیادہ کردار نہیں، لیکن ان چند کرداروں سے ہی ابن صفی نے جاسوسی ادب میں ایسے ایسے شاہکار تخلیق کیے جو رہتی دنیا تک پڑھے جائیں گے۔ جاسوسی دنیا کا تیسرا اہم کردار گرانڈیل قاسم کا ہے، یہ ایک عجیب نفسیاتی کریکٹر، بے انتہا خوش خوراک اور بے انتہا طاقتور اور بے انتہا مالدار باپ کی اولاد۔ احمق ترین اور آسانی سے باتوں میں آ جانے والا۔

قاسم اور حمید کی نوک جھونک ناول کے مطالعے کے دوران چہرے پر مسکراہٹ تو اکثر لبوں پر قہقہہ لے آتی ہے۔

جاسوسی دنیا کے قابل ذکر ولن میں طاقت، تاریہ، ڈاکٹر ٹسڈل، جیرالڈ شاستری، نانوتہ، اور تیسری ناگن شامل ہیں۔ یہ تمام کردار اپنی مثال آپ ہیں اور فریدی سے ان کا ٹکراؤ نہ صرف دل چسپ ہے بلکہ اس میں فریدی کی کامیابی اور ان کی شکست کا انداز بھی قاری کا دل جیت لیتا ہے۔فریدی اپنے دشمن کو ہمیشہ کیف کردار تک پہنچاتا ہے، اور ایسا دشمن جو بہت لاف گزاف کرنے والا ہو اسے نشان عبرت بنا ڈالتا ہے۔عمران کے برعکس، سنگ ہی جب جب فریدی کے مقابل آیا بری طرح مار کھائی اور شکست کھا کر بھاگا۔

اہم بات یہ ہے کہ اتنے مختلف المزاج کرداروں کو ابن صفی نے اپنے ناولز میں جس طرح آزمایا ہے وہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔آپ ان کا ناول پڑھنا شروع کریں تو کہیں بھی بوریت کا احساس نہیں ہوتا، اکثر اوقات یہ دیکھا گیا کہ پڑھنے والے نے ناول شروع کیا اور ایک نشست میں تمام ناول پڑھ ڈالا یعنی ابن صفی کا طرزِ تحریر قاری کو ایسا جکڑ لیتا ہے کہ پھر وہ ناول ختم کیے بنا نہیں رہتا۔

کرداروں پر بات کرنے کے بعد آگے بڑھیں تو جو اہم چیز قاری کو حیران کر دیتی ہے وہ ابن صفی کی جغرافیے پر گرفت ہے۔خواہ وہ قبائلی علاقوں سے ہوتا ہوا ایران کا سفر ہو، یا شکرال سیریز میں قبائلی علاقوں کے اندرون کا، پرنس ہربنڈا کو لے کر افریقا جانا ہو یا ایڈلاوکی باطنی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے اسپین یا ہلاکت خیز سیریز میں افریقا کے جنگلات ہوں۔قاری کو یوں محسوس ہوگا جیسے وہ ان علاقوں میں ذاتی طور پر خود موجود ہے،ملکوں شہروں اور گلی کوچوں میں ابن صفی قاری کو لے کر یوں گھومتے ہیں جیسے وہ جہاں گرد ہوں اور دنیا کے یہ علاقے ان کے ایسے دیکھے بھالے ہوں جیسے وہاں کے کسی مقامی کے۔قاری ان کے ناولز کو پڑھنے کے دوران مفت کہ سیاحت کر لیتا ہے اور بعض مقام تو ایسے آتے ہیں کہ اس کا وہاں سے واپس آنے کا دل نہیں چاہتا۔یہ سیاحت بالکل بھی غیر فطری نہیں لگتی، ابن صفی کے قلم کی یہ عجیب صلاحیت ہے کہ وہ سطر در سطر قاری کو نئے تجربوں سے اور ذہنی ذائقوں سے لطف اندوز کرواتا جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ کسی ناول میں بوریت کا ذرا سا بھی احساس نہیں ہوتا۔اس کے ساتھ ہی ابن صفی نے اپنے جغرافیے بھی تشکیل دیے ہیں خصوصاً ساحلی جزیرے، مختلف چھوٹے بڑے شہر، شہروں میں مخصوص ہوٹل اور شراب خانے، چند سرد پہاڑی علاقے جہاں لومڑیوں کا شکار ہوتا ہے، مخصوص سڑکیں اور مختلف عمارات جیسے رانا پیلس، سائیکو مینشن اور دانش منزل۔اس معاملے میں سب سے اہم جغرافیہ زیرو لینڈ کا ہے جس پر مسلسل کئی ناولز لکھے گئے اور اس کی پراسراریت سے پردہ بھی نہیں ہٹنے دیا۔

ابن صفی کے ناولز کا ایک اور امتیاز ان کا سائنس فکشن ہے، کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ ان کی مستقبل بینی غضب کی تھی۔اندازہ لگائیے کہ سنہ ۵۰ء، ۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائیوں میں اپنے ناولز میں جن سائنسی ایجادات کا ذکر انھوں نے کیا ہے وہ آج یعنی ۲۰۲۲ء میں پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہیں، یہ ایک جینیئس کی پہچان ہے۔فے گزار اور الیکٹروگس جیسی ایجادات اب بنائی جا چکی ہیں، پچھلے دنوں کیل ٹیگاز کا بھی اشتہار فیس بک پر دیکھا کہ ایک ایسا آلہ تیار کیا جا چکا ہے اور باقاعدہ استعمال کی جا رہا ہے جو آپ کے لبوں کی حرکت کو کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ کر کے دوسرے تک منتقل کرتا ہے۔زیرو لینڈ کی یہ ایجاد پیاسا سمندر میں ابن صفی کب کا لکھ چکے۔آج کل جس آرٹیفشل انٹیلیجنس کا دور دورہ ہے اور جس کا ذکر مشہور فلم میٹرکس میں کیا گیا ہے ابن صفی اس کا ذکر اپنے مریخ کے سفر والے اس ناول میں کر چکے جس میں جیمسن گورنر بنا دیا جاتا۔ٹھنڈا سورج ابن صفی چالیس برس پہلے لکھ چکے اور پچھلے دنوں خبر آئی کہ چائنا

نے ایک مصنوعی سورج کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ دستِ قضا اور اس کا لاسلکی حربہ ہم ڈرونز کی صورت میں ذرا تبدیلی کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں، جس کو سیٹلائیٹ کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ زیرولینڈ کی بہت سی دوسری ایجادات جیسی ایجادات آپ اس وقت اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

شعری ذوق رکھنے والوں کے لیے ابن صفی کے ہاں جگہ جگہ نثر میں شاعری ہے، کتنے ہی پیراگراف ایسے ہیں جن کو اگر لائنوں میں تقسیم کرکے لکھ دیا جائے تو وہ ایک اعلیٰ نثری نظم کہلائے۔ کئی جگہ غزل اور نظم پر بات کی گئی ہے اور کہیں کہیں تو تنقید بھی کی گئی، چوں کہ آپ شاعر بھی تھے لہٰذا شعری محاسن پر کئی ناولز میں زبردست گفتگو ہے، کئی جگہ طنز ہے تو کئی جگہ مزاحیہ انداز میں شاعروں پر پھبتیاں بھی کسی گئی ہیں۔ شعر و ادب کا ذکر آیا ہے تو یہاں استاد محبوب نرالے عالم کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ استاد حقیقت میں خود کو بہادر شاہ ظفر کے خاندان کا چشم و چراغ بتاتے تھے اور کراچی میں اکثر آئی آئی چندریگر، برنس روڈ اور صدر میں دوستوں کی محفلوں میں نظر آتے تھے۔ ابن صفی نے ان کو اپنے ناولز میں باقاعدہ ایک کردار کے طور پر متعارف کیا اور عمران سیریز میں انکی ''فارسا'' شاعری سے قاری کو خوب لطف اندوز کیا۔ شاید یہ بات بہت سے لوگ نہ جانتے ہوں کہ استاد حقیقی زندگی میں ایک شخصیت تھے۔

آپ کے اکثر ناولوں میں غروب آفتاب اور شام کا منظر بہت خوب صورتی سے بیان کیا گیا، کہیں یہ شام پہاڑیوں پر پھسلتی نظر آتی ہے تو کہیں صحرا میں سمٹتی، برف زاروں پر نارنجی رنگ کی پچکاریاں مارتی ہے تو کہیں گھنے جنگل میں درختوں کی شاخوں سے چھن کر رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ اسی طرح مختلف ناولوں میں پہاڑوں، اور دریاوں کی منظرکشی ایسی ہے جس میں قاری خود کو کبھی سنگلاخ چٹانوں میں محسوس کرتا ہے تو کبھی دریاؤں کی سبک موجوں میں بہتا دیکھتا ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی دور سے آتی آوازوں اور پھر نظر میں اڑتی دھول کئی معرکوں میں خوب صورت شاعرانہ مناظر پیش کرتی ہیں۔ یہ سب کسی عام مضمون نگار کے بس کی بات نہیں کہ وہ بیک وقت جاسوسی ناول میں ایسے موضوعات کو سمو سکے۔

ایک اور کارنامہ ان ناولز میں رومانس کا بھی ہے، گیت اور خون نامی ناول میں ابن صفی نے غضب کا رومانس بیان کیا ہے، یہ کہیں سے بھی ایک جاسوسی ناول نہیں لگتا، ایک لڑکی کی رقیبانہ فطرت اسے اپنے محبوب کا تعاقب کرنے پر مجبور کرتی ہے اور اس تعاقب کے دوران اچانک تیز بارش میں اسے ایک ڈاک بنگلے میں رات بسر کرنا پڑتی ہے جہاں اس کا ساتھی عمران ہوتا ہے۔ یہ شروع سے آخر تک ایک رومانی ناول ہے جس میں جاسوسی بھی شامل ہے۔ کسی جاسوسی ناول میں اتنا اعلیٰ درجے کا رومانس شامل کرنا ابن صفی کا کارنامہ ہی ہوسکتا ہے۔

مشہور صحافی حسن نثار لکھتے ہیں کہ ہم نے ابن صفی سے اردو زبان سیکھی، اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ابن صفی نے اردو زبان کی کیسی خدمت کی۔ یہ وہ کارنامہ ہے جو ابن صفی سے پہلے صرف شعراء کے حصے میں آتا رہا جب غیر اہل زبان اساتذہ کو پڑھ کر زبان کے رموز سیکھا کرتے رہے، لیکن ابن صفی نے اپنے جاسوسی ناول کے ذریعے زبان کا نہ صرف ذوق پیدا کیا بلکہ وہ زبان بھی سکھائی جو اپنی صحت کے حوالے سے معتبر ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے کہا کہ ۱۹۵۶ء میں، میں جب لندن پڑھنے گیا تو والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے ہندوستان میں

چھپنے والے ابن صفی کے ناول بھیجنے کی صورت نکالیں۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۹۷۰ء/ ۱۹۶۰ء کہ دہائی میں ابن صفی نے آئی ایس آئی کے کچھ آفیسرز کی ٹریننگ کے لیے لیکچرز بھی دیئے جو جدید جاسوسی تکنیک پر مشتمل تھے۔

الہٰ آباد کے نارا میں پیدا ہونے والے صفی اللہ کے بیٹے اسرار احمد کو ابن صفی کے نام سے جانا جاتا ہے، آپ کا پہلا ناول دلیر مجرم تھا، کہتے ہیں کہ آپ ۲۶ برس کی عمر میں ہی برصغیر کے پڑھنے والوں کے حواس پر چھا گئے تھے۔ آٹھویں جماعت میں شاعری شروع کی تو ابتدا میں اپنے ماموں نوح ناروی سے اصلاح لی۔ مختلف قلمی ناموں سے کہانیاں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جن میں طغرل فرغان، عقرب بہارستانی اور سنکی سولجر کے نام مشہور ہوئے۔ پھر ابن صفی کے نام سے جاسوسی دنیا لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جسے بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔

آپ قیام پاکستان کے بعد (نارہ) الہٰ آباد یو پی سے ہجرت کرنے کے بعد کراچی میں مقیم ہوئے، کچھ عرصہ لیاقت آباد میں رہائش اختیار کی اور اسکے بعد ناظم آباد نمبر ۲ میں قیام پذیر رہے۔ دوسوگز کی ان ناظم آبادی ''کوٹھیوں'' کا ذکر انھوں نے اپنے ناول ''لاش گاتی رہی'' میں بہت لطیف طنزیہ پیرائے میں کیا۔

ابن صفی اپنی شدید بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد ۲۶ جولائی ۱۹۸۰ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔ ایک جینئس ہماری ظاہری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا لیکن ابن صفی اپنی تحریروں کے ذریعے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، اور کروڑوں لوگوں کے پسندیدہ مصنف ہیں جو انکے لیے ہمہ وقت دعائیں کرتے ہیں۔

حمیرا عالیہ ٭

ابنِ صفی کے نسائی کرداروں کا جنسی انتشار

ابن صفی نے اپنے ناولوں میں لاتعداد نسوانی کرداروں کی تخلیق کی ہے جو ضمنی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود تجزیاتی مطالعے کے متقاضی ہیں۔ان کرداروں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صفی کی نسوانی جذبات و کیفیات اور ان کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں پر گہری نظر تھی۔ان کرداروں کی حرکات و سکنات ، اسلوب اور اظہار خیال کے ذریعے ہمیں صنف نازک کے ہر زاویے کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔جاسوسی ادب کا کردار ہونے کے باوجود ان میں ارضیت اور حقیقت پائی جاتی ہے۔معاشرے کے مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے یہ نوع بہ نوع کے نسوانی کردار ہمیں عورتوں کی فطرت سے مکمل آگاہی عطا کرتے ہیں۔ایک طرف جہاں ابن صفی نے کئی مثبت اور شائستہ نسوانی کردار تخلیق کیے وہیں کچھ جنس زدہ عورتوں کو بھی اپنے ناولوں کا حصہ بنایا۔ان sexually abnormal عورتوں کے جنسی خلل کے مختلف اسباب وعلل کا انھوں تفصیلی ذکر تو نہیں کیا لیکن قصے میں پیش آنے والے واقعات و حادثات ان پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہیں۔

عورتوں کی جنسی نفسیات پر ابن صفی کی اچھی گرفت تھی۔ انہوں نے فحش نگاری سے گریز کرتے ہوئے مناسب ومتوازن لفظوں میں جنس کا ذکر کیا ہے۔ان کے متعدد کردار جنس زدہ ہیں جن کی بد نفسی یا کجروی کی جھلک ہمیں مختلف ناولوں میں نظر آتی ہے۔ان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔زیر نظر مضمون میں ہم ان نسوانی کرداروں کا جائزہ لیں گے جن کی نفسیات میں جنسی کجروی کو دخل حاصل تھا۔ابن صفی نے اپنے مختلف ناولوں میں کئی عورتوں کو مساکیت، سادیت اور نمفومینیا جیسی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا دکھایا ہے۔یہ تمام اصطلاحیں Psychosexual disorder کے زمرے میں آتی ہیں،جس میں اذیت دے کر یا لے کر جنسی تسکین حاصل کی جاتی ہے۔ذیل میں ہم چند ایسے ہی کرداروں کا جائزہ لیں گے جن کی نفسیاتی پیچیدگی کے باعث کئی انسانوں کو تکلیف اٹھانی پڑی تھی۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں ان جنسی اصطلاحات کی مکمل معلومات ہوں۔

ابن صفی کے ہاں مساکزم کا ذکر متعدد بار آیا ہے۔مساکیت ایک ایسی نفسیاتی بیماری ہے جس میں خود کو تکلیف پہنچا کر شہوت جگائی جاتی ہے نیز تسکین حاصل کی جاتی ہے۔یہ تکلیف توہین اور معمولی تشدد سے لے کر سخت تشدد اور کوڑے مارنے تک ہوسکتی ہے۔عموماً مساکسٹ اذیت رسانی کے دوران خود پر قابو رکھتے ہیں اور خود کے شدید زخمی ہونے سے پہلے بدسلوکی کو ختم کردیتے ہیں،لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ لذت کوشی کے دوران وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتے ،نتیجتاً انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

٭ ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، لکھنؤ یونی ورسٹی، لکھنؤ، ہندوستان۔ برقی پتا:humaira7.ha@gmail.com

آکسفورڈ لینگوجیز میں مساکزم کی تعریف درج ذیل ہے:

"The tendency to derive sexual gratification from one's own pain or humiliation."

(In general use) The enjoyment of an activity that appears to be painful or tedious.

ایسے کرداروں میں ایک قابل ذکر کردار تاریہ کا ہے جو بظاہر رام گڑھ کی معزز اور متمول ہستیوں میں شمار کی جاتی ہے۔لیکن پس پردہ مادام تاریہ متعدد جرائم میں ملوث ہے ۔ وہ طاقت کی تنظیم کی اہم رکن ہے اور ایک لمبی تڑنگی اور مضبوط عورت ہے جو اذیت کوش طبیعت کی حامل ہے۔وہ خود کو اذیت دے کر جنسی لطف اور تسکین حاصل کرتی ہے۔

تاریہ جنسی انحراف کی بہترین مثال ہے۔جنسی انحراف سے مراد جنسی لذت حاصل کرنے کے لئے ایسا طریقہ اختیار کرنا جو فطرت کے خلاف ہو۔تاریہ کو اپنے بدن پر لگنے والی چوٹ کی تکلیف میں لطف آتا ہے۔اور اسے اپنی جنسی جذبات پر قابو بھی نہیں ہے حتی کہ اس کی شہوت افراتفری کے عالم میں بھی جاگ اٹھتی ہے۔ایک موقعے پر جب عمارت میں گولیاں چل رہی ہوتی ہیں تو وہ موقع محل دیکھے بغیر حمید سے تسکین حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔اسے گولی لگ جانے یا زخمی ہونے کی پروا نہیں ہوتی بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا جنسی جذبات ابھرتے ہی وہ دنیا سے بے خبر ہوجاتی ہے۔اسے خود کونت نئی اذیتیں دے کر مزہ آتا ہے۔ناول نگار نے اسے بیک وقت nymphomaniac اور masochist بتایا ہے۔تاریہ کی اذیت پسندی کا نمونہ دیکھیے:

حمید نے جواب میں اس کے گال پر تھپڑ رسید کردیا اور وہ بھی بھوکی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹ پڑی۔حمید نے دوسرا ہاتھ رسید کیا اور تاریہ نے اس کا داہنا شانہ منہ میں بھر لیا۔حمید کو اس کے دانت گوشت میں اترتے محسوس ہوئے اور اس نے اس کی ہنسلی کی ہڈی میں اپنی چار انگلیاں ڈال اتنی قوت صرف کردی کہ تاریہ کو چیختے ہوئے اس کا شانہ چھوڑ دینا پڑا۔دوسرے ہی لمحے حمید اچھل کر پیچھے ہٹ چکا۔

''شائیں'' چمڑے کا چابک خلا میں چکرایا۔تاریہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔''میں یہیں تمہاری کھال گرادوں گا۔''

تاریہ کار کی طرف بھاگی۔حمید پیچھے سے شراپ شراپ چابک برساتا رہا۔کار کے قریب پہنچ کر وہ گرتے گرتے بچی۔اب وہ پھر کسی مظلوم کی طرح چیخنے کراہنے لگی تھی۔لیکن شاید وہ اس فکر میں تھی حمید کو یہیں چھوڑ کر نکل جائے۔

''تم ایسا نہیں کرسکتیں، میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔!'' حمید نے اس کے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔

وہ چیخ کر اس پر آرہی۔''نہیں ......نہیں!'' وہ کراہی۔حمید نے اس کے منہ میں انگلیاں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔''کانوں تک پھاڑ دوں گا تمہاری باچھیں......!''

''میں ہار گئی......اف......چھوڑو......خدا کے لئے۔''

حمید نے بڑی بے دردی سے اسے کار پر دھکیل دیا۔

''تم بڑے ظالم ہو!'' وہ اپنا منہ دبا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ شاید زبان دانتوں کے درمیان آ کر کٹ گئی تھی۔ نجانے کیوں حمید کے دل میں اس کے لئے رحم کا شائبہ نہیں تھا......اگر تاریہ فی الحقیقت مساکسٹ تھی تو ساری دنیا میں اس سے بہتر کلاسیکل مثال دشوار تھی۔'' (''جہنم کا شعلہ''، ص ۳۰۵، ۳۰۶)

انگلیاں گڑانا، چابک برسانا، بال کھینچنا اور پھر منہ میں انگلیاں ڈال کر چیرنا۔ یہ اذیت کی کتنی متفرق اقسام ہیں جو بیک وقت حمید تاریہ کو دے رہا تھا۔ اتنی ساری humiliation سہنے کے بعد اسے جو تسکین حاصل ہوتی ہے اس کی منظر نگاری ناول نگار نے کچھ اس طرح کی ہے۔

تاریہ کچھ نہ بولی۔ اب وہ اس انداز میں مزے لے لے کر ہولے ہولے کراہ رہی تھی جیسے کوئی اس کا بدن دبا رہا ہو۔ پھر دفعتہ خاموش ہو کر اس طرح کانپنے لگی جیسے سردی لگ رہی ہو۔ حمید کچھ بولے بغیر اسٹئیر کرتا رہا۔

پھر وہ اس طرح ساکت ہو گئی جیسے مر رہی ہو۔ حمید نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ (''جہنم کا شعلہ''، ص ۳۰۶)

ملاحظہ کریں اذیت ملنے کے بعد تاریہ کی جو کیفیت ہوئی اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لطف اندوزی کی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور جنسی تسکین حاصل کرنے کے بعد پرسکون ہو گئی۔

اسی زمرے کا دوسرا کردار ناول 'رلانے والی' کی مرکزی منفی کردار نوما اسکراٹا جس کے گرد پورے قصے کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ نوما نفسیاتی کج روی کی عمدہ مثال ہے۔ وہ ایک سفید فام عورت ہے اور دوسروں کو اذیت پہنچا کر لذت حاصل کرتی ہے۔ گو کہ پولیس کے نزدیک وہ محض منشیات کی ایک مجرمہ ہے لیکن درحقیقت وہ بھی ایک Sadist ہے اور اس بات کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ وہ لوگوں کو برہنہ کر کے انہیں ذلیل کرتی ہے اور ان پر چابک برساتی ہے۔ اس عمل سے اسے نفسیاتی حظ حاصل ہوتا ہے۔

آکسفورڈ لینگویجز کے مطابق سادیت پسند کی تعریف یوں درج ہے:

The tendency to derive pleasure,especially sexual gratification, from inflicting pain, suffering o humiliation on others.

اس کے اس عمل کا عقدہ تب کھلتا ہے جب اس کے چنگل سے بچ نکلنے والی ایک نیگریس گلوکارہ صفورا اتفاقیہ طور پر کیپٹن حمید سے ٹکرا جاتی ہے۔ دونوں کی دوستی ہوتی ہے اور صفورا، نوما کی پراسرار شخصیت کے کئی راز افشا کر دیتی ہے۔ درج ذیل اقتباس سے قاری اندازہ لگا سکتی ہے کہ نوما کس حد تک سادیت پسند تھی۔

اس نے مجھ پر اپنی نفرت انگیز نظریں ڈالیں تھیں اور کہا تھا کہ میں اسے کچھ گا کر سناؤں۔ یقین کرو......وہ رات بھر وہیں بیٹھی شراب پیتی رہی تھی اور میں گاتی رہی تھی۔ اتنی اذیت پسند عورت آج تک میری نظروں سے نہیں گزری۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے سارے کپڑے

اتار دوں۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئی۔لیکن اس کے دو آدمیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور پھر جب میں سکڑی سمٹی خود کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی اس نے مجھے چمڑے کے چابک سے مارنا شروع کیا۔میرا پورا جسم لہولہان ہوکر رہ گیا تھا۔پھر تین دن تک میری تیمار داری ہوتی رہی تھی ۔ابھی پچھلے زخم ہی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ چوتھے دن پھر اس نے میرے ساتھ وہی برتاؤ کیا۔

جب وہ مجھے چابک سے پیٹتی تھی تو اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی طمانیت نظر آتی تھی جیسے جھلسا دینے والی گرمی میں اس نے کسی ٹھنڈے مشروب کا پہلا گھونٹ لیا ہو۔ (''رلانے والی''، ص ۵۲،۵۲)

نوما کی نفسیاتی کج روی یہیں تک محدود نہ تھی۔ اس کے علاوہ، وہ نوجوان لڑکوں کو اپنے عشق کی زنجیروں میں جکڑ کر اپنا دیوانہ بناتی اور پھر انہیں مکمل عادی کر کے آزاد کر دیتی۔درجنوں لڑکے اس کی تلاش میں روتے ہوئے پائے گئے تھے جس کے باعث اس کا نام ''رلانے والی'' پڑ گیا تھا۔اسے لڑکوں کو اپنے لئے تڑپتا دیکھ کر تسکین حاصل ہوتی تھی۔صفورا ہی کی طرح وہ لڑکوں کو بھی برہنہ کر کے انہیں چابک سے لہولہان کرتی ۔اس کے تشدد کے باعث کئی نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

اسی اذیت پسندی کی ایک اور مثال ناول 'پتھر کی چیخ' کی لیڈی جہانگیر ہے۔لیڈی جہانگیر nymphomania (نمفومینیا) اور سادیت کی مریضہ ہے۔ابن صفی نے جس وقت یہ ناول لکھا ان دنوں ایسے موضوعات کو ادب کا حصہ بنانا Taboo سمجھا جاتا تھا۔جبکہ عصر حاضر میں یہ موضوعات فکشن میں بآسانی جگہ پا رہے ہیں۔یہ بات غور طلب ہے کہ آج سے ساٹھ ستر برس قبل ایک اردو ناول نگار نے ان مسائل کو ناول کا موضوع بنایا جو موجودہ وقت میں کثرت سے رائج ہیں۔مریم ویبسٹر ڈکشنری کے مطابق نمفومینئک کی تعریف یوں ہے:

A female who has an excessive desire for sexual activity.

(Merriam-Webster.com)

جدید اصطلاح میں نمفومینیا کو Hypersexuality کہا جاتا ہے۔اس میں عورت اپنے شوہر کے لئے شدید جنسی خواہش رکھتی ہے لیکن تشویشناک بات تب ہوتی ہے جب یہ خواہش اپنے شوہر کے لئے نہ ہوکر غیر مرد کے لئے جاگ اٹھتی ہے۔یہ اچانک اور انتہائی شدت سے پیدا ہونے والی شہوت ہے جس کی تسکین کے لئے عورت کو فوری طور پر کسی مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔اور وہ مرد اسے قانونی طور پر دستیاب نہ ہو تو وہ غیر قانونی راستے بھی اختیار کر لیتی ہے۔اس غیر متوازن جنسی خواہش کے پیچھے کون سی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں اس کی درست نشاندہی اب تک نہیں ہوسکی۔کیونکہ ہر کیس اپنے آپ میں منفرد ہوتا ہے۔

ابن صفی کے ناول 'پتھر کی چیخ' میں لیڈی جہانگیر کا کردار معاشرے کی نوجوان بیواؤں اور طلاق یافتہ خواتین کی ناآسودگی کی عمدہ مثال ہے۔کم عمری میں بیوہ یا طلاق یافتہ ہوجانے والی یہ عورتیں اپنی فطری جبلت کو دبانے میں جب ناکام ہوجاتی ہیں تو پھر وہ غلط راستوں سے اپنی شہوت کو تسکین پہنچاتی ہیں۔کیوں کہ جنسی لذت سے آشنا ہوجانے کے بعد انسان کا اس جبلت پر قابو پانا بیحد مشکل

ہے جب کہ وہ بھرپور جوان ہو۔متوسط طبقے کی عورتیں سماج کے ڈر اور بدنامی کے خوف سے کسی طرح اپنی خواہشات پر قابو پانے کی کوشش کر لیتی ہیں لیکن لیڈی جہاں گیر جیسی اعلی طبقے کی امیر اور آزاد خیال عورت کے لئے سماج کی حیثیت ثانوی تھی۔اس کے علاوہ اس کے پاس وسیع اختیارات تھے جن کا استعمال کر کے وہ اپنے جرم پر بآسانی پردہ ڈال لیتی تھی۔

لیڈی جہانگیر بھی ایک ایسی بدخصلت عورت تھی جو نوخیز لڑکوں سے وحشیانہ طریقوں سے اپنی ہوس پوری کرتی تھی۔اپنی اذیت پسندی کو تسکین دینے کے لئے وہ ان لڑکوں کو بعد ازاں قتل بھی کر دیتی تھی۔اعلی طبقے کی اس بیوہ کے فعل پیچھے اس کی جنسی ناآسودگی تھی جو اس کی بے راہ روی کا سبب بنی۔تاریہ کے برعکس لیڈی جہانگیر sadist بھی تھی جسے دوسروں کو اذیت دے کر لطف وسرور حاصل ہوتا تھا۔مساکزم کے برعکس Sadism میں انسان دوسرے شخص کو اذیت دے کر لطف حاصل کرتا ہے۔یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ عموماً سادیت پسند اذیت دینے کے لئے مساکسٹ لوگوں کا انتخاب نہیں کرتے، بلکہ وہ کسی نارمل انسان پر تشدد کرنا پسند کرتے ہیں اور اسے تکلیف سے بلبلاتے اور تڑپتے دیکھ کر انہیں بے پناہ لذت کا احساس ہوتا ہے۔یہ نفسیاتی خلل بعض دفعہ ہلکے پھلکے محبت کے کھیلوں سے بڑھ کر انتہائی تشدد تک پہنچ جاتا ہے۔سادیت پسند اکثر اپنی تسکین کے لئے اغوا اور عصمت دری جیسے جرائم کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

لیڈی جہانگیر بھی اسی خصلت کی حامل ہے جو اپنی جنسی جبلت سے مجبور ہو کر اس مرض کا شکار ہو جاتی ہے اور خطرناک مجرم بن جاتی ہے۔اس کی وحشیانہ لطف اندوزی کا منظر دیکھئے۔

> ایک کمرے میں عجیب وغریب منظر تھا۔ایک برہنہ عورت جس کے ہاتھ میں ایک چمکدار چھری تھی ایک دوسرے مردہ برہنہ جسم پر جھکی ہوئی تھی۔اس کی پشت انھی کی طرف تھی اسلئے چہرہ نہ دیکھا جاسکا۔وہ یکلخت اچھل کر دوسرے کمرے میں جاگھسی۔
>
> ''میرے خدا......!'' حمید تحیر آمیز انداز میں چیخا۔''یہ افروز تھی......ارے لیڈی جہانگیر۔''
>
> ---
>
> دفعتاً اس کی نظریں اس لاش پر پڑیں جس پر سے لیڈی جہانگیر اٹھی تھی۔وہ پچھلی لاشوں ہی کی طرح درندگی کا شکار ہوئی تھی۔(''پتھر کی چیخ''،ص۸۹،۹۰)

درج بالا منظر نگاری پہلی قرات میں منٹو کے کسی افسانے کا اقتباس معلوم ہوتی ہے۔لیکن برہنگی سے قطع نظر ابن صفی کے اس نفسیاتی کردار کی مثالیں فی زمانہ کثرت سے دیکھنے کو مل رہے ہیں۔سادیت کو ایڈونچر کے ایک طریقہ کار کے طور پہ دیکھا جانے لگا ہے اور اعلی طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں میں اس طرح کے جرائم بطور جنسی کھیل عام ہوتے جارہے ہیں۔

ابن صفی نے کچھ ایسے کردار بھی تخلیق کیے ہیں جو انسانوں کے برعکس جانوروں سے انسیت رکھتے ہیں نیز ان سے جنسی حظ حاصل کرتے ہیں۔لیڈی سنالنی تنویر کا کردار ناول 'سائے کی لاش' میں ضمنی حیثیت رکھتا ہے لیکن اس کردار کی پیچیدگیاں اسے اہم بناتی ہیں۔لیڈی تنویر ماضی میں ایک خطرناک بحری قذاق تھی جس نے سفید فام انگریزوں کو پریشان کر رکھا تھا۔اپنے بارے میں وہ خود یہ الفاظ کہتی ہے۔

جب میں اپنے قزاقوں سمیت کسی جہاز پر جا پڑتی تھی تو وہاں آگ ،خون چیخوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔

ابن صفی نے اس کا جو ظاہری حلیہ بیان کی اہے اس کے مطابق وہ ایک اذیت پسند عورت تھی۔اس کا ایک جوان بیٹا تھا جسے وہ بیحد پابندیوں میں رکھتی تھی یہاں تک کہ حکم عدولی کی صورت وہ اسے چابک سے بے تحاشا پیٹتی تھی۔اس نے اپنی شخصیت کو کافی پراسرار بنا رکھا تھا اور شہر سے باہر اپنی کوٹھی میں چند ملازموں کے ساتھ رہتی تھی۔کوٹھی کے ایک حصے میں اس نے ایک عجیب الخلقت جانور نما انسان پالا ہوا تھا جس کا نام مڈونگا تھا اور وہ لیڈی تنویر کا غلام تھا۔وہ ماضی میں ایک جادوگر اور ستارہ شناس تھا اور سینکڑوں میل دور سے طوفان کی بو سونگھ لیتا تھا۔مڈونگا کچا گوشت کھاتا تھا اور چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتا تھا۔تنویر اور مڈونگا کے درمیان جو تعلق تھا اسے ہم جنسی کجروی کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں۔

مڈونگا ایک طاقتور اور وحشی انسان تھا جو لیڈی تنویر کا پیر چاٹنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ قصے کے اختتام پر جب مڈونگا فریدی کی گولی کا شکار ہوتا ہے تو تنویر اس گھناؤنے مخلوق کی لاش سے لپٹ کر نہ صرف دیر تک روتی ہے بلکہ اس کے منہ پر بوسہ بھی دیتی ہے۔یہ عمل اس کی مڈونگا سے انسیت کو ظاہر کرتا ہے۔یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کے بچنے پر خوش ہونے کے بجائے واضح لفظوں میں مڈونگا کی موت کا دکھ ظاہر کرتی ہے۔

اسی طبقے کی ایک اور نمائندہ کردار ''اشاروں کے شکار'' کی لیڈی پرکاش ہے جو ایک پالتو چمپینزی کی مالکہ ہے۔وہ اپنی جنسی جبلت کو تسکین دینے کے لئے غیر فطری طریقے اپناتی ہوئی نظر آتی ہے۔حالانکہ ناول نگار نے اس پہلو کی وضاحت نہیں کی ہے لیکن کنایوں میں وہ لیڈی پرکاش کی حیوان پرستی کی جانب اشارہ کر دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا کرداروں کے تجزیے سے واضح ہو رہا ہے کہ ابن صفی کے ناولوں کا کینوس کتنا وسیع ہے۔ان ناولوں میں محض جرم اور قانون کی رسہ کشی نہیں ہے بلکہ اس میں سماج اور معاشرے کے سلگتے ہوئے مسائل کو بھی اس خوبی سے شامل کیا گیا ہے کہ ان ناولوں کو ہم بلا تردد عصمت چغتائی اور منٹو کی تحریروں کے بالمقابل رکھ سکتے ہیں۔ابن صفی کی خوبی ہے کہ وہ کسی مسئلے کو باقاعدہ موضوع بنا کر اس پر پندونصیحت کرنے کے بجائے اس کے تاریک پہلوؤں کی منظر کشی کرتے ہیں تا کہ معاشرے کو مسئلے کی نزاکت کا احساس ہو اور اس کے تدارک کی خاطر خواہ کوشش کی جائے۔اس کے لیے انہوں نے روایتی بیانیہ کے بجائے ایک قدرے مختلف بیانیے کا انتخاب کیا۔یہ وہ مسائل ہیں جو کم وبیش ہر طبقے میں پائے جاتے ہیں اور ان کا ارتکاب مرتکب کو آہستہ آہستہ جرم کے دہانے تک پہنچا ہی دیتا ہے۔لہٰذا ابن صفی نے جاسوسی ناولوں کو ذریعہ اظہار بناتے ہوئے ان مجرمانہ نفسیاتی رویوں کو موضوع بنایا اور معاشرے کا منافق چہرہ اجاگر کیا۔

عمران عاکف خان ❁

ابنِ صفی — نارتھ پول سے ساؤتھ پول تک!

وہ ایک پرکیف شام تھی، سورج کی سنہری ٹکیا سرخ ہوکر گہرائیوں میں اترتی جارہی تھی، نئی دہلی کے 'پیراماؤنٹ ہوٹل' میں اصحابِ کہف کے طرز پر چند فکرمند افراد پر مشتمل، ایک پرتکلف محفل جاری تھی۔ شرکائے محفل اردو ادب کے عہد زریں کا تذکرہ کررہے تھے کیوں کہ وہ موجودہ ادب میں رونما ہوچکیں ''بے ادبیوں/ بدعتوں'' سے اکتا چکے تھے، وہ جوگی تو نہیں تھے جن کا نگر میں ٹھکانا نہ ہوتا اور نہ ہی ان کے محبوب کا جنگل، پربت، دریا اور صحراؤں پر قبضہ تھا۔ وہ جدوجہد کرنے والے اور لائحۂ عمل تیار کرنے والے حساس افراد تھے۔ انھیں ہر صورت اس کثافت کو ادبی فضا سے صاف کرنا تھا، انھیں کل ہی تب پڑتی جب ان کا مدعا حاصل ہوجاتا۔ اسی فکرمندی اور تشویش کے عالم میں انھوں نے اپنی گفتگو کا آغاز اس طرح کیا:

''اردو ادب (نظم ونثر) کا کلاسیکی عہد کیا واپس آسکتا ہے؟ کچھ امکان یا دلاسا کن کوئی بات ہے؟!'' ایک شریک استفسار کررہا تھا۔

اس کی بات سن کر شرکائے محفل جانے کیوں ایک دم خاموش ہوگئے، ان کی آنکھیں پھٹیں اور ذہن ڈوب سے گئے۔ جیسے کوئی جواب نہ بن پارہا ہو۔ چند ساعات بعد پھر ایک دیگر شریک نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے پوچھا:

''اچھا چھوڑو یہ سب، کسی ایسے ادیب کے متعلق بتاؤ جس کا چرچا نارتھ پول سے ساؤتھ پول تک ہو...؟''

''ابن صفی'' بیشتر کے موٴنھوں سے بے ساختہ نکلا اور ٹیبل بجا دیا گیا۔ گویا بالاتفاق یہ تسلیم کرلیا گیا کہ ابن صفی دو جہات کے بلکہ شش جہت کے ادیب ہیں۔

اسم ابن صفی/ تذکرۂ ابن صفی کہیں چھڑے اور محفل ادب وفکر میں سریت اور توقیر شعروغزل کا ماحول برپا نہ ہو، ایسا ممکن ہی نہیں۔ چناں چہ اس محفل میں بھی ابن صفی غالب ہوگئے پھر تو ان کی شاعری، زبان زد اشعار/ مصرعوں اور ان کے مشہور/ شاہکار ناولوں، یادگار منفی ومثبت کرداروں، تحریروں میں در آئے قابل ذکر مقامات، شہرودیہات، مقامی وبیرونی دنیا، متنوع کیفیات وتاثرات، عجیب الخلقت وہیئت افراد، مجرم ومنصف کے مکالمے، لا اینڈ آرڈر کی صورت حال، شہری انتظام اور جنگل لا کے مناظر، سیاست وسماج، معاشروں کی تباہی اور علاج وتدارک، ناولوں کے بین السطور میں موجود خاموش پیغام کی تشریح۔ یہ ذکر کچھ اس طرح ہوا کہ کب شام نے دبیز چادر

❁ اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج لکشمن گڑھ، سیکر، راجستھان، ہندوستان۔ برقی پتا: imranakifkhan@gmail.com

شب اوڑھ لی، پتا ہی نہ چلا، ان کے سامنے رکھی کافی جم چکی تھی اور ان کے مگ ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

نارتھ پول جب اپنی حدود میں اضافہ کرتا ہے تو وہ ساؤتھ پول تک پہنچتا ہے اور جب ساؤتھ پول اپنی حدود میں اضافہ کرتا ہے تو وہ نارتھ پول تک پہنچتا ہے۔ حدود کا یہ انضمام ابن صفی کے فن، ادب، فلسفے، شعروغزل، فکرونظریے، فتوحات و دریافتوں کو بھی مدغم کر دیتا ہے، یوں ابن صفی آفاقی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں اور منطوق یا تحریرات ان کے اس شعر کی توضیح بن جاتے ہیں:

جو کہہ گئے وہی ٹھہرا ہمارا فن اسرار
جو کہہ نہ پائے نجانے وہ چیز کیا ہوتی

ابن صفی کی رخصت کو ۴۲-۴۳ سال [قریب نصف صدی] کا عرصہ ہوا چاہتا ہے مگر موبائل/سوشل میڈیا جنریشن کے عہد میں ذکر ابن صفی بالکل بھی عجیب نہیں لگتا کیوں کہ انھوں نے ان ایجادات و اختراعات اور انٹرنیٹ، ٹیکنالوجی، ڈیجیٹلائزیشن ٹولس کی پیشین گوئی بہت پہلے اپنے ہی عہد میں کر دی تھی نیز ان کا ممکنہ تخیل و تصور بھی بخش دیا تھا اور خدوخال بھی واضح کر دیے تھے، لہٰذا ۵-جی (اور عن قریب ۶-جی) کے عہد میں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ ان تخیلات و تصورات کی تشریح ہو رہی ہے اور ابن صفی ایک شارح کی صورت ذہن و قلب میں گھر کرتے جا رہے ہیں۔

ابن صفی کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے بالکل بھی نہیں لگتا کہ یہ پچاس اور اسی کی دہائی کی تحریریں ہیں، یہ تو آج کی یعنی E era- کی ابتدائی ہیئتیں لگتی ہیں۔ ہاں! کوئی کوئی تحریر/ ناول (بالخصوص فریدی-حمید سیریز) ایسا لگتا ہے جیسے عہد قدیم کی داستان ہو اور اسے کوئی 'عجوز کبیر' رات کے پہلے پہر سنا رہی ہو۔ کرنل فریدی کا جدید طریقۂ واردات کی قدیم اور روایتی انداز میں تفتیش کرنا (شاہی نقارہ، لیونارڈو کی واپسی، فرہاد-۵۹، پراسرار وصیت، خونی بگولے وغیرہ) یہ ابن صفی کی قدیم روایات و اقدار سے فطری وابستگی اور مشرقیت سے محبت کی اعلا مثال کی غمازی کرتا ہے۔ اس طرح وہ اردو ادب کے جدید اور قدیم عہد کے درمیان پل کا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح عمران سیریز کے ناول ان کے یہاں جدیدیت اور فریدی-حمید سیریز کے ناول قدامت کی علامت ہیں۔ تاہم اس قدامت سے مراد، روایتی قدامت نہیں ہے بلکہ اس میں بھی جدت پنہاں ہے۔ ابن صفی مستقبل کے اندھیروں میں دیکھنے والے اور ان میں موجود کیمیاوی ہیروں جواہرات کو تلاش کر کے باہر لانے والے وژنری ادیب ہیں۔ یہی سبب ہے کہ انھوں نے ناول بالخصوص جاسوسی ناول کو زندگی کے تمام مسائل اور جہات سے جوڑ کر اس کا مرتبہ معاصر ناول/فکشن سے بھی بلند کر دیا اور اسے ایک منفرد سمت بخش دی۔ ان کا مطمح نظر شب تیرہ سے نور کشید کرنا اور سیاہ رات کو صبح منور میں تبدیل کرنا ہے۔ یہی ان کی انفرادیت ہے اور یہی ان وہ امتیاز ہے جو انھیں ہزاروں جاسوسی ادیبوں اور قلم کاروں میں ممتاز کرتا ہے۔ نیز انھیں درجۂ امامت عطا کرتا ہے۔

ابن صفی کے ناولوں کی عبارتیں اور فضا، ان میں موجود قصے/ کاویات/مہا کاویات، کرداروں، ان کا پس منظر اور عمومی تاثر سب ایسا لگتا ہے جیسے یہ آفاقی سطور ہوں اور ان کا فیضان بھی اُسی طرح جاری ہو۔ میرا مدعا یہ نہیں کہ آہستہ آہستہ ان تحریروں کو آیات قرآن مقدس ہی تسلیم کر لیا جائے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ معاصر، ماقبل و مابعد کی بیشتر تحریروں کے مقابلے ابن صفی کی تحریروں کو فوقیت حاصل ہے،

وہ زندہ بھی ہیں اور بار بار پڑھی جانے والی بھی۔ ہندوپاک میں لاکھوں کی تعداد میں ان کی اشاعت وقرأت اسی کا ہی مظہر ہے۔

آج جس قدر گیمز، اپلی کیشنز اینڈ رائیڈ/ آئی فونس، موبائل سیٹس/ آئی پیڈس پر موجود ہیں، جس طرح کی ٹیکنالوجی اور ایجادات ہمارے معاشروں اور سماجوں کا لازمی جزو بن چکی ہیں اور جس قدر ہم اُنھیں اشیائے ضروریہ میں شمار کرتے ہوئے ان سے ہم آہنگ ہیں، اس کے واضح اشاریے ابن صفی کے ناولوں اور تحریروں میں موجود ہیں] وہ مستعار یا کنسپٹڈ ہی سہی[مگر اس سے انکار نہیں کہ ایشیائی اقوام کے لیے وہ نایاب اور محیر العقول تھیں۔ سچائی دراصل یہ ہے کہ ہر عہد میں حساس، فکرمند اور باشعور اذہان کو ایسے ہی عظیم مقاصد کے لیے پیدا کیا جاتا ہے اور قدرت ان سے ایسے ہی شاہ کارنامے انجام دلواتی ہے، پھر ہم انھیں لیجنڈ مانتے ہیں اور انھیں اپنا آئیڈیل بھی سمجھتے ہیں۔

ابن صفی نے اپنی نسل، اپنے عہد اور مابعد عہد کی نسلوں کو وہ شعور دیا اور تربیت کی جو اس کی ضرورت تھی، اس بات کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ یہ انتظام کچھ مخصوص زمانوں میں مخصوص افراد کے ذریعے مخصوص افراد اور نسلوں کے لیے ہوتا ہے۔ الٰہی تعلیمات و فرامین میں پیامبری کی مانند ابن صفی ادب کے پیغمبر اور رسول تھے جن کا نزول کرم خداوندی اور انعام الٰہی کا ہی مظہر ہے۔ ہم ان کی ذریت ہیں اور وہ ہمارے امام، امام شعروادب اور امام شعور وآگہی۔

مندرجہ ذیل چنندہ تحریروں کے اقتباسات ابن صفی کی اسی عہدیت اور آفاقیت کی گواہی دیتے ہیں:

> جانتی ہو آدمیت کی معراج کیا ہے؟ آدمیت کی معراج یہ ہی ہے کہ آدمی خود اپنے ہی مسائل حل کرلے۔ اگر اس نے مصنوعی سیارہ فضا میں پھینکنے کے بجائے سرطان کا کامیاب علاج دریافت کرلیا ہوتا تو میں سمجھتا ہوں کہ اب اس کے قدم اس راہ کی طرف اٹھ گئے ہیں جس کی انتہا اس کی معراج پر ہوگی اگر اس نے چاند تک پہنچنے کی اسکیم بنانے کے بجائے زمین کے ہنگامے پر امن طور پر فرو کرنے کا کوئی ذریعہ دریافت کرلیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اب یہ سمندر پیاسا نہیں رہے گا بلکہ خود کو سیراب کرنے کی صلاحیت بھی اس میں پیدا ہوچکی ہے۔ (۱)

اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان آج کے ترقی پذیر اور سائنسی عہد میں چاند ومریخ سے بھی آگے جانے کی جستجو میں ہے مگر اس کی خودا پنے تک رسائی نہ ہوسکی ہے، وہ ابھی تک اپنی معراج کا راز نہیں جان سکا ہے، اسی طرح وہ آدمی اور آدمیت کے فرض سے بھی غافل ہوگیا ہے۔ جدید عہد میں جہاں ہر ہاتھ موبائل/ گیجٹس ہے، کہاں اسے اپنی یا کسی اور کی پرواہ ہے، یہ مشاہدہ ہم آئے دن دیکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کی ترجمانی کی ہے:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا!

ہر دل عزیز اور دل گداز ابن صفی کی قدامت دیکھیے جسے وہ فریدی کے منھ سے بیان کررہے ہیں:

> قدامت پر پوری طرح جان دینے لگا ہوں۔ عورتوں، مردوں کے آزادانہ تعلقات کو اچھی نظروں

سے نہیں دیکھتا۔جنسی معاملات میں جذبات کی تہذیب ناممکن ہے۔اس سلسلے میں سائنٹفک بحث قطعی بکواس ہے۔ بچاؤ صرف پابندیوں میں ہے بعض مغربی عالم جنھیں میں گدھا سمجھتا ہوں اس سلسلے میں بڑی سائنٹفک قسم کی بحثیں چھیڑتے ہیں۔ان کا قول ہے کہ پابندیاں جنسی بے راہ روی کو جنم دیتی ہیں ...لیکن سوال یہ ہے کہ مغرب کدھر جارہا ہے۔ وہاں تو اب دونوں جنسوں کے باہمی تعلقات پر کسی قسم کی بھی پابندی نہیں رہ گئی۔لیکن میرا دعویٰ ہے کہ بعض مغربی ممالک کا ہر پانچواں آدمی جنسی بے راہ روی کا شکار ہے۔[۲]

یہ اقتباس خود اپنی تشریح ہے۔جدید عہد کا رزم نامہ، مغربیت اور اس کی غلامی پر مشرقیت اور اس کی آزادی کا تازیانہ۔تہذیبوں کے تصادم میں راہ نجات کا داعی اور انسان کی اصل جڑوں کی جانب لے جانے والی فکر انگیز تحریر۔

موجودہ عہد کی ایک ناقابل انکار حقیقت اور طویل سلسلہ جاتی کہانی کا عکس اس اقتباس میں دیکھیے:

''کیا بات ہے؟ حمید نے پوچھا:

پتا نہیں یہ آدمیوں کی سوسائٹی ہے یا جانوروں کا ریوڑ اخبار اٹھاؤ...تو...قتل وخوں، اغوا اور عصمت دری کے علاوہ کسی قسم کی خبریں نہیں دکھائی دیتیں۔''

آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

مستقبل کی طرف سے بے اطمینانی...خود اعتمادی کا فقدان۔

اس کا علاج بھی ہے کوئی؟

شافی علاج ہے۔مگر یہ دور ہے نئے تجربات کا۔ایک اسٹیج پر نئے تجربات بھی ختم ہوجائیں گے۔اس کے بعد پھر اسی دقیانوسی علاج کی طرف دنیا دوڑے گی۔اعتدال قناعت اور جہد مسلسل۔''[۳]

مستقبل کی جانب سے بے یقینی کتنا بڑا جرم اور مرض ہے۔اچھا خاصا انسان اس جرم اور بیماری کا شکار ہوکر تباہ ہوجاتا ہے، حالاں کہ مستقبل ہی تو ہے جو جس میں ہمیں جینا چاہیے اور حال کے اسباب سے اس کے محل تعمیر کرنے چاہییں، بصورت دیگر وہی ہوگا جو اِس اقتباس میں بیان ہوا ہے۔انسان مایوس ہوکر جرائم کے سائے میں پناہ لے گا، جرائم جو کہ امن و امان کے دشمن ہیں اور انسانوں کی اس کائنات کو ڈس جانے والے سیاہ ناگ بھی۔

اپنے انجام و آغاز سے قطع نظر ابن صفی کے ناولوں میں بیان کردہ یہ اصولی اور ضابطے کی باتیں، چست و راست فقرے یا حقائق و تجربات پر مبنی کلمات اسی طرح ان کی 'خلاقیت' یا 'تخلیق' ہی وہ راز ہے جو آج بھی انھیں مقبول عام و ہردل عزیز بنائے ہوئے ہے اور ان کی تحریریں تھکے تھکے اور بوجھل لمحوں کے لیے اکسیر ہیں۔وہ تحریریں زندگی کی نوید ہیں اور قاری کو روح افزا آکسیجن بھی فراہم کرتے ہیں۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ ابن صفی زیرک اور باشعور ادیب تھے اور کمال یہ ہے کہ وہ جینئس تھے [کسبی۔ وہبی سے ماورا]۔ان کا کوئی اس میدان میں استاد نہیں، وہ خود ہی اپنے فن کے استاد تھے۔انھوں نے اپنے لیے ادب میں انوکھی طرح ایجاد کی۔ان کا ایک اور

کمال یہ تھا کہ وہ اپنی تحریروں کی ابتدائی سطور سے ہی قاری کو تحریر سے ہم آہنگ کر لیتے ہیں، عالم یہ ہوتا تھا کہ آخری سطر تک قاری اس تحریر سے وابستہ رہتا ہے، پھر بھی اس کی تشنگی باقی رہتی ہے۔ان کا شہرہ آج بھی بلا شبہ نارتھ پول سے ساؤتھ پول تک ہے۔صرف ان کا ہی ذکر ہے، ان ہی کی باتیں—اور ہم 'صفیانے' تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان ہی کا عہد ہے۔

حوالہ جات

۱ ابنِ صفی، پیاسا سمندر، ۱۹۵۷ء: (عمران سیریز)

۲ ایضاً، زہریلا سیارہ، ۱۹۷۵ء، (فریدی-حمید سیریز)

۳۔ ایضاً، ہولناک ویرانے، ۱۹۵۵ء، (فریدی-حمید سیریز)

اعجاز بابو خان ٭

ابنِ صفی — لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

اردو ادب کی تاریخ میں چند ایسی شخصیات بھی نظر آتی ہیں جنھیں ان کی زندگی میں ان کے حقیقی ادبی مقام و مرتبے کے مطابق تسلیم نہیں کیا گیا اور اگر تسلیم بھی کیا گیا تو عوام کی جانب سے۔ ایسی شخصیات میں اردو کے پہلے عوامی شاعر نظیر اکبر آبادی کو اولیت حاصل ہے جنھیں اپنے زمانے کے بیشتر ناقدین اور تذکرہ نگاروں بشمول نواب مصطفی خاں شیفتہؔ (صاحبِ ''گلشنِ بے خار'') نے تو شاعروں میں شمار کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ نظیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ان کے بہت سے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر ہیں لیکن ان اشعار کی وجہ سے ان کو شاعروں میں نہیں گنا جا سکتا۔(۱)

مگر بعد میں جب ان کی شاعری کا تفصیلی مطالعہ ہوا تو پھر تمام ناقدین انھیں حقیقی عوامی شاعر ماننے پر مجبور ہو گئے اور آج بھی نظیر اکبر آبادی اپنی طرز کے منفرد شاعر مانے جاتے ہیں جنھیں مؤرخینِ ادب بھی ایک الگ اور نمایاں مقام دیتے ہیں۔

ماضی قریب میں بھی ایسی ہی ادبی ناانصافی کا شکار ہونے والے موجود ہیں جنھیں ان کے ہم عصروں نے کبھی وہ اہمیت نہ دی جس کے وہ حق دار تھے ان میں جاسوسی ادب کے بے تاج بادشاہ ''ابنِ صفی'' سب سے نمایاں ہیں جنھیں عوامی سطح پر تو غیر معمولی پزیرائی اور مقبولیت حاصل تھی لیکن نہ جانے کیوں اردو ادب کے محققین اور ناقدین ان کے کمال کو سراہنے کی بجائے خاموش رہے۔ مگر حقیقت کو کون بدل سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ابنِ صفی کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا اور ابنِ صفی کے کچھ ایسے قدردان بھی سامنے آئے جنھوں نے ابنِ صفی کو ان کے حقیقی مقام و مرتبے کے مطابق سراہا۔ یہی وجہ ہے کہ ابنِ صفی جو عوامی سطح پر تو ہمیشہ مقبول تھے اب ادبی سطح پر بھی ان کو سراہا جانے لگا ہے۔

ادبی تاریخ کی اہم شخصیات میں سے شاید ہی کوئی ایسی شخصیت ہو جس نے نوجوانی میں ابنِ صفی کو نہایت ذوق و شوق سے پڑھا اور پسند نہ کیا ہو لیکن آج وہی شخصیات ابنِ صفی کے متعلق رائے دینے یا ان کے بارے میں لکھنے کو تیار نہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ابنِ صفی کے متعلق لکھنے سے ان کے اپنے ادبی قد و قامت میں اضافہ ہوگا۔ لیکن یہ بات وقت کے ساتھ ساتھ ان کی سمجھ میں آئے گی اور وہ تمام شخصیات جو ابنِ صفی کو آج اہمیت دینے کو تیار نہیں ان کا ذکر کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

ابنِ صفی کا یہ کارنامہ تو سب مانتے ہیں کہ انھوں نے جاسوسی ادب کو نئی زندگی دی لیکن یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں

٭ لیکچرر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے طلبہ، گلزارِ ہجری، کراچی۔ فون: ۲۱۶۱۶۶۰-۰۳۴۴

عوامی کتب خانوں کو رواج دینے اور انھیں آباد کرنے میں بھی سب سے بڑا کردار ابنِ صفی ہی کا ہے۔ ان کے ناولوں کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ناول کی قیمت کے برابر عوامی کتب خانے فی گھنٹہ کرایہ وصول کرتے تھے لیکن پھر بھی پڑھنے والوں کی قطار لگی رہتی تھی۔ اکثر بزرگ اس حوالے سے اپنے مشاہدات بتاتے ہیں کہ ابنِ صفی کا ناول کسی کتب خانے سے حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا جسے ناول مل جاتا وہ وہیں کتب خانے کے باہر بیٹھ کر اس قدر محویت کے ساتھ اسے پڑھتا کہ اردگرد سے بے نیاز ہوجاتا اور دیگر امیدوار پڑھنے والے والے فرد کو قابلِ رشک نگاہوں سے تک رہے ہوتے یہاں تک کہ وہ ناول واپس کرے اور کوئی اور اس پر قبضہ جمالے۔ ایسی مقبولیت اردو کے کسی اور ادیب کو آغاز سے اب تک نہیں مل سکی۔

اردو میں جاسوسی ادب (سرّی ادب) کی تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اردو میں جاسوسی ادب کا آغاز تراجم سے ہوتا ہے۔ اکثر مصنّفین نے انگریزی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں جاسوسی کہانیوں اور ناولوں کا ترجمہ کیا یا ان سے ماخوذ کہانیاں مقامی ماحول کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی۔ اردو میں جاسوسی ناول متعارف کرانے کا سہرا ظفر عمر کے سر ہے جنھوں نے ۱۹۱۶ء میں ''نیلی چھتری'' کے نام سے فرانسیسی ناول کا ترجمہ کیا۔ اس کے بعد مرزا ہادی رسوا اور تیرتھ رام فیروز پوری نے ان کی تقلید میں مغربی جاسوسی ادب کے تراجم کیے۔ مرزا ہادی رسوا نے میری کوریلی (Marie Corelli) کے پانچ جاسوسی ناولوں کا ترجمہ کرکے ۱۹۲۸ء میں شائع کروایا۔ رسوؔا کا منفرد پہلو یہ ہے کہ انھوں نے طبع زاد ناولوں میں فکشن یا جاسوسی عنصر کو شامل نہیں کیا۔[۲] جب کہ تیرتھ رام فیروز پوری نے سو سے زائد جاسوسی ناولوں کا اردو میں ترجمہ کیا اس کے علاوہ متعدد طبع زاد ناول بھی لکھے۔

ابنِ صفی کو مجنوں گورکھپوری نے اردو کا پہلا طبع زاد ناول نگار قرار دیا ہے۔ ابنِ صفی نے اپنا پہلا جاسوسی ناول ''دلیر مجرم'' کے نام لکھا جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ابنِ صفی اردو میں جاسوسی ادب کے ایک ایسے آئیکون بن گئے جن کے معیار تک پہنچنا کسی اور کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ابنِ صفی سے قبل اردو میں جاسوسی ناول کی روایت اور تاریخ بہت مختصر ہے اور یہ صرف مغربی جاسوسی ادب کے تراجم تک محدود رہی۔ لیکن ابنِ صفی نے اس میدان میں جو نمایاں کامیابیاں حاصل کیں وہ اس قدر ہیں کہ صرف ان کا نام اور کام بھی جاسوسی ادب کی تاریخ میں پیش کردینے کے لیے کافی ہے۔ جاسوسی ادب میں ابنِ صفی کے لازوال ناول، ان کے تخلیق کردہ لافانی کردار اور سراغ رسانی اور سائنسی کہانیاں اپنے زمانے سے آج تک اسی طرح مشہور و معروف ہیں۔

جاسوسی ادب کو جب ادبی منظرنامے میں نظرانداز کیا جانے لگا تو ابنِ صفی نے اپنی ایک الگ جاسوسی دنیا تخلیق کرلی جسے وہ ابنِ صفی کی جاسوسی دنیا کہتے تھے۔ وہ اپنی جاسوسی دنیا میں مگن ہوکر ادبی دنیا کی بے اعتنائیوں سے پرے اپنے کرداروں کے ساتھ وقت گزارتے تھے اور یہی ان کی دنیا تھی۔

محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کہتے ہیں کہ: ''۱۹۵۰ء کی دہائی میں ابنِ صفی اس قدر مقبول تھے جتنی مشہور ہیری پوٹر کی مصنفہ جے کے رولنگ ہیں۔''[۳] قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ جے کے رولنگ کے ناولوں پر فلمیں بھی بنیں، ان کے کرداروں کو کارٹونز میں پیش کیا گیا ان کے ناموں پر پارک بنائے گئے اور آج مصنفہ برطانیہ کی امیر ترین شخصیات میں شمار کی جاتی ہیں۔ یہی نہیں ان کو سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر بھی بے انتہا سراہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان اور اردو میں جاسوسی ادب کا اثاثے ''ابنِ صفی'' کے

ساتھ جو سلوک ہمارے مؤرخینِ ادب اور ناقدین نے کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ یہاں تک کہ نیاز فتح پوری جیسے بڑے نقاد نے ابنِ صفی کو اردو ادب کے لیے ناسور قرار دیا۔ یہ تو بھلا ہو بابائے اردو مولوی عبدالحق کا جنھوں نے ابنِ صفی کو اردو ادب کا بڑا محسن قرار دیا[۴] اور بابائے اردو کی یہ رائے آج حرف بہ حرف پوری ہوتے ہوئے محسوس کی جاسکتی ہے۔

ابنِ صفی سے قبل مغربی ادب کے کچھ کردار ترجمہ ہوکر یہاں بھی شہرت حاصل کر چکے تھے جن میں شرلاک ہومز اور جیمز بانڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ایسے میں کوئی ایسا کردار تخلیق کرنا آسان نہ تھا جو خصوصیات اور مقامیت کے ساتھ ان مغربی کرداروں کا مقابلہ کرسکیں لیکن ابنِ صفی نے فریدی اور عمران جیسے جاسوسی کرداروں کو جس طرح پیش کیا وہ قابل داد ہے۔ یہ کردار بلا شبہ اردو کے بہترین کرداروں کے ساتھ پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اردو ادب میں ان کے علاوہ بھی سیکڑوں کردار ہیں جو اپنے تخلیق کار کے ساتھ آج بھی زندہ ہیں لیکن ابنِ صفی ان سب میں اس لیے خاص اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کے تخلیق کردہ لافانی کردار فریدی اور عمران کو نہ صرف ان کے زمانے میں بلکہ آج بھی مختلف مصنّفین استعمال کررہے ہیں لیکن ان کرداروں کو دیکھ کر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''کہاں وہ بات بھلا مولوی مدن کی سی۔''

ابتدائی جاسوسی ناولوں میں عریانیت، بے حیائی اور رومانیت عروج پر تھی۔ ایسے میں نوجوانوں اور کچے ذہن کے بچوں کی اخلاقی حالت خراب ہونے کا اندیشہ تھا شاید یہی وجہ ہے کہ جاسوسی ادب کو ادبی تاریخ میں نظر انداز کیا جاتا رہا لیکن ابنِ صفی نے اپنے ناولوں کے ذریعے ذہنی و اخلاقی درستی کا کام بھی سرانجام دیا اور رومانیت سے نکل کر نوجوانوں کو اپنے وطن سے محبت اور قانون کی پاسداری کرنے اور جرائم سے نفرت کرنے کا پیغام دیا۔ کچھ لوگوں کا یہ اعتراض بھی ہوتا ہے کہ ان کے ناولوں کے ذریعے نوجوانوں میں جرائم کی دنیا سے شناسائی ہوجاتی ہے اور بعض تخریبی ذہن کے نوجوان اس سے متاثر ہوسکتے ہیں لیکن یہ اعتراض اس لیے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ ان کے ناولوں میں ہمیشہ حق اور سچ کی فتح اور قانون کی حکمرانی دکھائی جاتی ہے جب کہ معاشرے میں اچھائیوں کے فروغ اور تعمیری کاموں کی ترغیب بھی دی جاتی ہے جس سے کوئی بھی باشعور نوجوان اچھائی کی جانب راغب ہوسکتا ہے۔

ہمارے ادبی حلقوں میں ادبِ عالیہ (Classical Litrature) اور مقبولِ عام ادب (popular Litrature) کی بحث بھی عام ہے۔ اکثر ناقدین مقبول عام ادب کو ادبِ عالیہ میں شمار کرنے سے کتراتے ہیں جب کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ مقبول عام ادب، ادبِ عالیہ سے زیادہ مشہور، مقبول اور عوامی سطح پر زیادہ پسندیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ اسی بحث کے حوالے سے ابنِ صفی نے ماہنامہ ''عالمی ڈائجسٹ'' میں اپنے مضمون ''میں نے لکھنا کیسے شروع کیا'' میں لکھتے ہیں:

> افسانوی ادب خواہ کسی پائے کا ہو محض ذہنی فرار کا ذریعہ ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی معیار کی تفریح فراہم کرنا ہی اس کا مقصد ہوتا ہے جس طرح فٹبال کا کھلاڑی شطرنج سے نہیں بہل سکتا اسی طرح ہماری سوسائٹی کے ایک بہت بڑے حصے کے لیے اعلیٰ ترین افسانوی ادب قطعی بے معنی ہے تو پھر میں گنے چنے ڈرائنگ روموں کے لیے کیوں لکھوں؟ میں اسی انداز میں کیوں نہ لکھوں جسے زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ شاید اسی بہانے عوام تک کچھ اونچی باتیں بھی پہنچ جائیں۔[۵]

ابنِ صفی کی بالا رائے ادبِ عالیہ اور مقبولِ عام ادب کے حوالے سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ آج بھی ادبِ عالیہ اور مقبولِ عام ادب میں وہی فرق ہے جو کھیلوں میں شہرت، مقبولیت اور پسندیدگی کے اعتبار سے شطرنج کے مقابلے میں فٹبال کا ہے۔ ممکن ہے سنجیدہ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لیے مقبول عام ادب وہ اہمیت نہ رکھتا ہو لیکن اسے ادبی منظرنامے سے بالکل الگ کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ اس حوالے سے ہمارے ناقدین اور ادبی مؤرخین کو اپنی روش میں ذرا تبدیلی کرنا ہوگی تاکہ کسی اور کے ساتھ ابنِ صفی جیسی زیادتی نہ ہو۔ جہاں تک بات ان کے ناولوں میں مقصدیت یا اصلاح کی ہے تو یہ بھی ابنِ صفی کا کمال ہے کہ انھوں نے مقصدیت کو اپنے فن پر حاوی نہیں کیا بلکہ شعوری یا لاشعوری طور پر انھوں نے اپنے ناولوں میں وطن پرستی، معاشرے کی بھلائی، تعصب کی تباہ کاریوں اور فرقہ واریت کے نقصانات کی جانب توجہ دلائی ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے :

> کسی افواہ کو دوسروں تک پہنچانے والا نادانستگی میں دشمن کی مدد کرتا ہے۔ اس وقت قومی یکجہتی کی حفاظت کرنا ہی قوم ملک کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ ایسی افواہوں کو اپنی ذات سے آگے نہ بڑھنے دیجیے جس سے صوبائی تعصب یا فرقہ واریت کے زہر پھیلنے کا خدشہ ہو۔[۶]

گوکہ یہ اقتباس ابنِ صفی کے اس ناول کا ہے جو ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا لیکن آج بھی ہمارے حالاتِ حاضرہ اور معاشرتی رویوں کی ترجمانی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ یہ ابنِ صفی کے خیالات ہیں جو ادب یا ادب برائے زندگی کے دائرے میں نہیں آتے۔ ایسی بات کسی شاعر کے کلام میں ہوتی یا کسی اور نثری صنف میں پائی جاتی تو ناقدین موصوف کو آفاقی خصوصیات کا حامل قرار دے کر ہمیشہ کے لیے اردو ادب میں زندہ کرنے کی کوشش کرتے۔ بہرحال ابنِ صفی کو ادبی تاریخ میں تو شاید وہ شہرت مقبولیت اور مقام نہ مل سکا جس کے وہ حقدار تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عوامی سطح پر جس قدر شہرت، مقبولیت اور پزیرائی انھیں ملی، ناقدین تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ عمل خوش آئند ہے کہ اب ابنِ صفی کے کارناموں کو سراہنے کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اور ادبی منظرنامے میں انھیں دیر سے سہی مگر شامل کر لیا گیا ہے۔ امید ہے کہ اسی طرح دیگر شخصیات کے کارناموں کو بھی سراہا جائے گا۔

ابنِ صفی نہ صرف بہترین ناول نگار تھے بلکہ بطور شاعر بھی ان کی صلاحیتیں کسی سے کم نہ تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ناول نگاری کی شہرت و مقبولیت نے اور مصروفیات نے انھیں شاعری سے کسی قدر دور ہی رکھا لیکن چوں کہ شاعری کے ذریعے ہی وہ ادبی دنیا میں داخل ہوئے تھے لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ شاعری سے انھیں فطری دل چسپی تھی اسی لیے ناول نگاری کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی جاری رہی۔ ان کی شاعری میں کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین امتزاج دیکھنے میں آتا ہے۔ ان کے ہاں رومانیت بھی ہے تو فکر و فلسفہ بھی اور سماجی رویوں کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی جو حقیقت پسندی ان کے ہاں ہے وہ انھیں بلاشبہ درجہ اول کے شعراء میں شمار کرنے کے لیے کافی ہے۔ یوں تو ان کے بہت سارے اشعار مثالوں میں پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن میں چند اشعار پر ہی اس یقین کے ساتھ اکتفا کروں گا کہ آپ میری بات کی تائید کریں گے۔

لب و رخسار و جبیں سے ملیے   جی نہیں بھرتا کہیں سے ملیے
گھٹ کے رہ جاتی ہے رسوائی تک   کیا کسی پردہ نشیں سے ملیے

بجھ گیا دل تو قیامت ہوگی پھر کسی شعلہ جبیں سے ملیے
بالآخر تھک ہار کے یاروں ہم نے بھی تسلیم کیا
اپنی ذات سے عشق ہے سچا باقی سب افسانے ہیں
چاند کا حسن بھی زمین سے ہے چاند پر چاندنی نہیں ہوتی
جب دلوں میں غبار ہوتا ہے ڈھنگ سے بات بھی نہیں ہوتی

ابنِ صفی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی تحریریں، ان کے ناول ان کی شاعری اور سب سے بڑھ کر ان کی نفیس شخصیت ہمیشہ انھیں اپنے احباب اور قارئین میں زندہ رکھیں گی۔

حواشی

۱۔ نظیر اکبرآبادی، دیوان نظیر، (مرتبہ: مرزا فرحت اللہ بیگ)، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۲ء، ص ۱۶
۲۔ مرزا حامد بیگ، ترجمے کا فن، (دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۵ء) ص ۳۳
۳۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان، عکسی رائے، مشمولہ، کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا، مرتبہ: راشد اشرف، (کراچی: بزمِ تخلیقِ ادب، ۲۰۱۲ء)، ص ۹
۴۔ محمد حنیف، سرّی ادب کا بے تاج بادشاہ، مشمولہ، کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا، مرتبہ: راشد اشرف، محولہ بالا، ص ۲۹
۵۔ محمد فیصل، ابنِ صفی: شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۷ء)، ص ۵۶
۶۔ ابنِ صفی، ہلاکو اینڈ کو، بحوالہ: ابنِ صفی کے ناولوں میں مقصدیت، اسحاق اطہر صدیقی، مشمولہ، کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا، مرتبہ: راشد اشرف، محولہ بالا، ص ۲۶

گردوپیش

وفیات

- معروف ادیب، نقاد اور محقق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ۱۵رجون ۲۰۲۲ء کو امریکا میں انتقال کر گئے۔ وہ ۱۱رفروری ۱۹۳۰ء کو ضلع لورا لائی، بلوچستان کے قصبے دُکی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد دھرم چند نارنگ بلوچستان ریونیوسروس میں افسرِ خزانہ تھے۔ مادری زبان سرائیکی تھی۔ ابتدائی تعلیم موسیٰ خیل اور پشین میں حاصل کی جب کہ میٹرک ۱۹۴۶ء میں لیہ (مظفرگڑھ) سے کیا۔ فورٹ سنڈے من کالج، کوئٹہ میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے کہ اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان سے ہندوستان چلے گئے اور وہاں دلّی کالج سے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کیا۔ دہلی یونی ورسٹی سے ایم اے اردو (۱۹۵۴ء)، پی ایچ ڈی (۱۹۵۸ء)، پنجاب یونی ورسٹی سے فارسی آنرز (۱۹۶۱ء)، دہلی یونی ورسٹی سے ڈپلوما اِن لنگوئسٹکس (۱۹۶۴ء) کیا۔ انڈیانا یونی ورسٹی، امریکا سے سمعیات اور تشکیلی گرامر پر خصوصی کورس (۱۹۶۶ء) کیا۔ نارنگ صاحب نے ۵۸۔۱۹۵۷ء میں سینٹ اسٹیفن کالج، دہلی میں اردو ادب پڑھایا۔ ۱۹۶۱ء میں دہلی یونی ورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۸ء میں وسکانسن یونی ورسٹی، امریکا میں اردو کے وزیٹنگ پروفیسر رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امریکا کی منیسوٹا یونی ورسٹی میں ناروے کی اوسلو یونی ورسٹی میں بھی پڑھایا۔ ۱۹۷۴ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی میں پروفیسر تعینات ہوئے۔ ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۵ء تک دوبارہ دہلی یونی ورسٹی میں بطور پروفیسر ایمریطس رہے۔ نارنگ صاحب نے تقریباً چونسٹھ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے پینتالیس اردو میں، بارہ انگریزی میں اور سات کتابیں ہندی میں ہیں۔ ان کی معروف کتابوں میں ''ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات''، ''املا نامہ''، ''ادب کا بدلتا منظر نامہ''، ''ادبی تنقید اور اسلوبیات''، ''امیر خسرو کا ہندی کلام''، ''سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ''، ''اردو افسانہ، روایت اور مسائل''، ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں''، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، ''ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت''، ''جدیدیت کے بعد''، ''ولی دکنی، تصوف، انسانیت اور محبت کا شاعر''، ''انیس اور دبیر''، ''بیسویں صدی میں اردو ادب''، ''فراق گورکھپوری''، ''اطلاقی تنقید''، ''سجاد ظہیر''، ''اردو کی نئی بستیاں''، ''اقبال کا فن''، ''فکشن شعریات''، ''کاغذ آتش زدہ''، ''تپش نامۂ تمنا''، ''جدید ادبی تھیوری''، ''غالب، معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات''، *Urdu*، *Karkhandari Dialect of Delhi Urdu*، *Readings in Literary Urdu Prose*، *Language and Literature: Critical Perspectives* شامل ہیں۔

❃❃❃

انجمن کی تازہ مطبوعات

فون (شعبۂ فروخت): ۰۳۳۲-۲۷۹۰۸۴۳

۱۔ تہذیبی تنوع اور اردو ناول	ڈاکٹر مہرونہ لغاری	۱۲۰۰ روپے
۲۔ تنقید اور جدید اردو تنقید (اشاعت چہارم)	ڈاکٹر وزیر آغا	۵۰۰ روپے
۳۔ اردو ادب کی تحریکیں (اشاعت دوازدہم)	ڈاکٹر انور سدید	۱۰۰۰ روپے
۴۔ مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر مع تنقیدی مضامین	سیّد علی امام/ ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی	۱۲۰۰ روپے
۵۔ اردو ادب میں دہشت گردی کی ارتقائی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر ثروت اختر (قرۃ العین طارق)	۱۰۰۰ روپے
۶۔ نابغۂ لسان و ادب: محمد شان الحق حقی دہلوی	ڈاکٹر عرفان شاہ	۱۲۰۰ روپے
۷۔ جدید اور مابعد جدید تنقید	ڈاکٹر ناصر عباس نیّر	۱۲۰۰ روپے
۸۔ اردو نثر میں مزاح نگاری کا سیاسی اور سماجی پس منظر	ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۱۴۰۰ روپے
۹۔ اردو کی ادبی تاریخیں	ڈاکٹر گیان چند	۱۵۰۰ روپے
۱۰۔ اردو اور عالمی صحافت کی ایک نادر تاریخ	ڈاکٹر طاہر مسعود	۱۱۰۰ روپے
۱۱۔ منگل سُوتر (ناول)	پریم چند/ ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر حسن منظر	۶۰۰ روپے
۱۲۔ پریم چند گھر میں	شِو رانی/ ہندی سے ترجمہ: ڈاکٹر حسن منظر	۱۰۰۰ روپے
۱۳۔ علی عباس حسینی کے افسانے (دو جلدیں)	مرتبہ: نند کشور وکرم (جلد اوّل)	۷۰۰ روپے
	(جلد دوم)	۷۵۰ روپے
۱۴۔ اردو میں ارمغانِ علمی کی روایت	ڈاکٹر خالد ندیم	۵۰۰ روپے
۱۵۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر): تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بی بی امینہ	۵۰۰ روپے
۱۶۔ روسی ادب (دو جلدیں یک جا)	پروفیسر محمد مجیب	۷۰۰ روپے
۱۷۔ تلمیحاتِ راشد	ڈاکٹر عابد خورشید	۴۰۰ روپے
۱۸۔ پنج آہنگ (غالب کے فارسی خطوط ’آہنگِ پنجم‘ کا اردو ترجمہ)	مترجم: محمد عمر مہاجر، مرتب: فریسہ عقیل	۳۰۰ روپے
۱۹۔ اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر	ڈاکٹر طارق کلیم	۴۵۰ روپے
۲۰۔ پاکستانی اردو افسانے میں سیاسی شعور	ڈاکٹر تحسین بی بی	۵۰۰ روپے
۲۱۔ سرسیّد احمد خان: حالات و افکار (اشاعتِ نو)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۲۰۰ روپے
۲۲۔ اردو کی نثری داستانیں (نیا اضافہ شدہ ایڈیشن)	ڈاکٹر گیان چند	۱۲۰۰ روپے
۲۳۔ قواعدِ اردو (اشاعتِ نو)	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۴۰۰ روپے
۲۴۔ اردو تنقید کا ارتقا (اشاعتِ نو)	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۵۰۰ روپے
۲۵۔ اردو، قومی یک جہتی اور پاکستان (اشاعتِ نو)	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۳۰۰ روپے
۲۶۔ مطالعۂ غالب کی جہتیں	مرتبین: ڈاکٹر فاطمہ حسن، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر رخسانہ صبا	۴۰۰ روپے

ملکی و بین الاقوامی معروف ادبی شخصیات اور دانشوروں کی ابن صفی کے متعلق رائے:



افتخار عارف، معروف شاعر، ادیب، دانش ور

جاسوسی دنیا" اور ابنِ صفی میرے بچپن کی خوش گوار یادوں کا حصہ ہیں لکھنؤ کے ایک قدیمی محلے وزیر گنج کے نکڑ پر ایک چھوٹی" سی دکان میں ایک لائبریری تھی، ایک آنہ لائبریری کہلاتی تھی، اس میں اردو کے رسالے ناول رکھے جاتے۔ میں نے وہیں سے درسی کتابوں کے علاوہ کتب بینی کا آغاز کیا تھا۔ اسی برس کی عمر ہونے آئی الحمدللہ کتاب سانس کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ غالب نے کہا تھا جو آدمی کا شوق ہو وہی اگر وسیلۂ رزق ہو جائے تو سب سے بڑا عیش۔ سو یہ نعمت میسر رہی۔ "جاسوسی دنیا" جب آتا تو ایک آنے کے بجائے چار آنے میں ملتا، گویا بلیک ہوتا، مجھے وہ ایک آنے ہی میں ملتا، میں رات بھر میں ختم کرکے اٹھتا۔ فریدی، حمید، قاسم، ریکھا سب۔ میرے عزیزوں کی طرح تھے۔ "جاسوسی دنیا" مری شخصیت کی بنیاد میں شامل ہے۔

اردو تنقید نے ان سے صرفِ نظر کیا۔ ابنِ صفی کی جیسی رواں اور مستحکم نثر بہت کم لکھی گئی۔

ابنِ صفی میرے محسنوں میں شامل ہیں، اردو کے محسن ہیں۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے اُن کی خدمات کے اعتراف کی یہ دستاویز قابلِ تحسین ہے۔



امجد اسلام امجد، معروف شاعر، ادیب، ڈراما نویس

ابنِ صفی کا مجھ پر سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان کی وجہ میری پڑھنے کی عادت پختہ ہوئی اور پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔

ان کے ناولوں میں جو روانی تھی، دل کشی تھی، جو زبان کا استعمال تھا اور اس کے ساتھ ساتھ جس طرح وہ قاری کو ساتھ لے کر چلتے تھے، یہ ایسی چیزیں تھیں جو لڑکپن میں بہت اچھی لگتی ہیں۔ پھر جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں، ان میں دل چسپی کی مزید تہیں نکلتی چلی جاتی ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ شفیق الرحمٰن اور ابنِ صفی دو ہی ایسے لوگ تھے جنھوں نے پچاس اور ساٹھ کی دہائیوں میں جو نسلیں پروان چڑھی ہیں، ان کے پڑھنے کے شوق کو مہمیز دینے میں بہت بڑا کردار ادا کیا، انھیں اس سے بڑا مقام ملنا چاہیے تھا جو اُنھیں ملا ہے۔ ابنِ صفی اپنے اس خوب صورت کارنامے کی وجہ سے بہت ستائش کے مستحق ہیں۔



انور مقصود ۔ ڈرامہ نگار ،مزاح نگار، مصور،شاعر

شاعر اگر شاعری سے توجہ ہٹا کر ادب کی کسی اور صنف کی طرف دھیان دیتا ہے تو اس میں کوئی ایسا کارنامہ ضرور سرانجام دیتا ہے جو اسے مدتوں زندہ رکھ سکے۔ ابنِ صفی بنیادی طور پر ایک شاعر تھے، اسرار ناروی کے تخلص سے شعر کہتے تھے اور اپنے بچپن میں نوح ناروی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ پھر آپ نے نوجوانی میں جاسوسی ادب لکھنا شروع کیا اور 26 برس کی عمر میں ہی برصغیر میں ناول پڑھنے والوں کے حواس پر چھا گئے۔ ابنِ صفی ایک بڑے ادیب تھے اور انھوں نے عام آدمی کو تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی زندہ رکھا۔ ایسی کوشش جس میں مشکلات کا مقابلہ، قانون کی پاس داری، کم زوروں کی مدد اور معاشرے کی اخلاقی تربیت پیشِ نظر ہو۔ وہ جس زمانے میں "جاسوسی دنیا" لکھ رہے تھے، دوسری جنگِ عظیم اور برصغیر کی تقسیم کا زمانہ تھا، انھوں نے اپنے سامنے دنیا کو خاک و خون ہوتے دیکھا اور اسی دوران ایک بہت بڑا مقصد پورا ہوتے ہوئے دیکھا، وہ بڑا مقصد پاکستان کا بننا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں نئے خواب لیے پاکستان چلے آئے۔ ان کی نظر میں کسی معاشرے میں فرد کی کردار سازی کے لیے سب سے اہم چیز انصاف کی فراہمی اور قانون کی پاس داری تھی۔ اور اپنے ناولوں کے ذریعے انھوں نے انصاف اور قانون کی پاس داری کا زندگی بھر پرچار کیا۔ ابنِ صفی نے اپنے لاکھوں پڑھنے والے قاری پیدا کیے، نوجوان سے لے کر بزرگ تک، ہر عمر کے لوگوں میں ان کے ناول ذوق و شوق سے پڑھے جاتے۔ لوگ ہر ماہ اُن کے ناول کا بے چینی سے انتظار کرتے اور ناول مارکیٹ میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا۔ آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ ابنِ صفی جیسے قاری برصغیر میں شاید ہی کسی اور ادیب کو نصیب ہوئے ہوں۔ میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ ایک عام آدمی کی وہ تربیت تھی جس کے بعد اسے مشکلات سے لڑنے کے حوصلہ ملنا، اعلیٰ اخلاقی قدروں کی سربلندی اور قانون کا وہ احترام سکھانا تھا جو کسی اور ادیب سے اتنی آسانی سے ممکن نہ ہوا۔ انھوں نے سنہ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں اپنے ناولوں میں جو زبان استعمال کی وہ اتنی نئی اور عام فہم تھی کہ آج بھی پڑھنے پر نئی اور آج کی زبان محسوس ہوتی ہے۔ ان کے طرزِ نگارش نے عام لوگوں میں اردو زبان کا وہ ذوق و شوق پیدا کیا کہ دوسری زبان والے اردو سیکھنے پر مجبور ہوئے۔ انھوں نے خود ایک جگہ لکھا کہ مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ میں ادب کی بھی کچھ خدمت کروں۔ عجیب بات ہے کہ جب میرا کوئی ناول بہت پسند کیا جاتا ہے تو مجھ سے ادب کی خدمت کرنے کی فرمائش ضرور کی جاتی ہے۔ بھائی آپ مجھے صرف اردو کی خدمت کرنے دیجیے۔ اس کے باوجود کی صرف و نحو کی غلطیاں مجھ سے بھی سرزد ہوتی ہوں گی۔ آپ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب مجھے کسی سندھی بنگالی بھائی کا خط بہ ایں مضمون ملتا ہے کہ محض آپ کی کتابیں پڑھنے کے شوق میں اردو پڑھ رہا ہوں، پڑھ کر سنانے والوں کا احسان کب تک لیا جائے۔ بڑے ادیب کی سب بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ وہ آنے والے زمانوں کو دیکھ کر لکھتا ہے، اس کی نگاہ بہت دور تک دیکھ سکتی ہے۔ ابنِ صفی نے ساٹھ ستر برس پہلے جو ادب تخلیق کیا وہ آج کا ادب ہے۔ مستقبل بینی کی صلاحیت ان کو خدا کی طرف سے عطا کی گئی تھی۔ ان کا اس دور کا لکھا سائنس فکشن آج کی ایجادات بیان کر رہا تھا۔ پچھلے دنوں کپل ٹیگاز کا اشتہار فیس بک پر دیکھا کہ ایک ایسا آلہ تیار کیا جاچکا ہے جو آپ کے لبوں کی حرکت کو کسی بھی دوسری زبان میں ترجمہ کرکے دوسرے تک منتقل کرتا ہے۔ زیرو لینڈ کی یہ ایجاد "پیاسا سمندر" میں ابنِ صفی کب کی لکھ چکے۔ آج کل جس آرٹی فیشل انٹیلی جنس کا دور دورہ ہے اور جس کا ذکر مشہور فلم "میٹرکس" میں کیا گیا ہے، ابنِ صفی اس کا ذکر اپنے مریخ کے سفر والے اس ناول میں کرچکے جس میں جیمسن گورنر بنا دیا جاتا ہے۔ "ٹھنڈا سورج" ابنِ صفی چالیس برس پہلے لکھ چکے اور پچھلے دنوں خبر آئی کہ چائنا نے ایک مصنوعی سورج کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ دستِ قضا اور اس کا لاسلکی تجربہ ہم ڈرونز کی صورت میں دیکھ سکتے ہیں جس کو سٹیلائٹ کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ستر برس پہلے کون کہہ سکتا تھا کہ جن سائنسی ایجادات کو وہ لکھ رہے ہیں، ایک وقت آئے گا، جب اُن کا استعمال عام ہوگا۔

علی عمران اور کرنل فریدی ابنِ صفی کے دو لازوال کردار ہیں۔ دونوں کرداروں میں جس بنیادی چیز کو مقدم رکھا گیا، وہ اُن کی اعلیٰ ترین اخلاقی خصوصیات ہیں۔ یہیں سے ابنِ صفی اپنے پڑھنے والوں کی وہ تربیت کرتے ہیں جس کے ذریعے ایک مثالی معاشرے کی تشکیل ممکن ہوسکے۔ ان دونوں کرداروں کی بنیادی صفات میں حق گوئی، بہادری، ایمان داری، قانون کی پاس داری اور انصاف کی فراہمی ہے۔ ان دونوں کرداروں جیسی شہرت اور مقبولیت اردو کی تاریخ میں شاید ہی کسی اور کردار کو ملی ہو۔ میرے ایک دوست سجاد صاحب جن کا تعلق اندرونِ سندھ سے ہے، میرے پاس اکثر تشریف لاتے تھے۔ اوائل ملاقات میں جب میں نے ان سے اردو سے رغبت کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے کہا، "مجھے اردو سے پیار، غالبؔ اور فیض کی وجہ سے نہیں، ابنِ صفی کی وجہ سے ہوا ہے۔" بلکہ ایک دفعہ کہنے لگے کہ اگر ہماری فوج میں کرنل فریدی ہوتا تو پاکستانی فوج اپنی تینوں جنگیں جیت جاتی۔ ابنِ صفی کی زندگی میں اور اُن کی وفات کے بعد کتنے ہی لکھنے والوں نے اُن کے ان کرداروں پر کہانیاں لکھ کر اپنی روزی روٹی کا بندوبست کیا۔ ان کے پڑھنے والوں کا دائرہ پورے برصغیر میں پھیلا رہا اور آج تک اُن کے ناولز اسی ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں جیسے آج سے ستر برس پہلے پڑھے جاتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد پہلے لیاقت آباد اور پھر تاحیات ناظم آباد میں رہائش رہی۔ ابنِ صفی اپنی شدید بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد 26/ جولائی 1980ء کو کراچی میں انتقال فرما گئے۔



زاہدہ حنا، ادیب، دانشور

انجمن ترقیٔ اردو سو سال سے زیادہ قدیم ہے۔ تقسیم کے بعد اس کے دو حصے ہوئے، ایک حصہ ہندوستان میں رہ گیا اور ایک حصے کو مولوی عبدالحق پاکستان لے آئے۔ اس کے تحت نہایت وقیع کتابیں شائع ہوئیں اور دو علمی جرائد بھی پابندی سے شائع ہوتے رہے۔ چند دنوں پہلے اس کے ماہنامے ''قومی زبان'' کی مدیر ڈاکٹر یاسمین فاروقی نے جب مجھے بتایا کہ وہ ابنِ صفی نمبر مرتب کر رہی ہیں تو مجھے بہت حیرت ہوئی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ابنِ صفی کی تخلیقی اپج کے بارے میں لکھوں تو میں نے فوراً وعدہ کر لیا لیکن اسے بروقت پورا نہ کر سکی۔ ابنِ صفی میرے پسندیدہ لکھنے والے رہے ہیں۔ وہ دن مجھے یاد آئے جب کراچی کے ریگل سنیما پر ان کے نئے ناول کو خریدنے والوں کی قطار لگتی تھی اور ان کے پڑھنے والے استہزائیہ نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ ایک علیحدہ بات ہے کہ انھی کے ناول ثقہ لوگوں کے تکیوں کے نیچے ملتے۔ میں ان ہی دنوں ''عالمی ڈائجسٹ'' سے وابستہ ہوئی اور میں نے ابنِ صفی سے نیاز حاصل کیے اور انھوں نے ہمارے لیے ایک قسط وار ناول لکھا۔ زمانہ کس طرح پلٹتا ہے، میں نے اس وقت دیکھا جب کئی ثقہ ادیب آتے تھے اور ان کی قسط پڑھ کر چلے جاتے تھے۔ کوشش ان کی یہ ہوتی تھی کہ وہ ان کے جملوں میں کوئی نقص نکالیں۔ حالانکہ میں نے ان میں سے کسی کو ابنِ صفی کی نثر میں نقص نکالتے نہیں دیکھا اور ابھی چند برس پہلے میں نے ان کے کئی ناولوں کے انگریزی ترجمے دیکھے۔ خود ابنِ صفی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا۔ وہ جو اپنی زندگی میں ایک عوامی لکھنے والے سمجھے جاتے تھے، ان کے بارے میں یاسر جواد نے اپنے ''انسائیکلوپیڈیا ادبیاتِ عالم'' میں لکھا ہے کہ جب عالمی شہرت یافتہ جاسوسی ناول نگار اگاتھا کرسٹی پاکستان آئیں تو انھوں نے ابنِ صفی سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ابنِ صفی مغل اعظم کے بسائے ہوئے شہر الٰہ آباد میں 1928ء میں پیدا ہوئے۔ وہ زمانہ تھا جب پڑھے لکھے گھرانوں کے نوجوان گاتے، گنگناتے پیدا ہوتے تھے۔ ابنِ صفی کو بچپن سے ہی شاعری اور نثر نگاری کا شوق تھا۔ 24 برس کی عمر سے انھوں نے جاسوسی ناول لکھنے شروع کیے۔ ''دلیر مجرم'' ان کا پہلا ناول تھا جو چھپا اور ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ اس کی خوشبو پاکستان بھی پہنچی۔ کچھ دنوں ان کے ناول اسمگل ہوئے جس طرح ''شمع دہلی'' اور ''کھلونا دہلی'' اسمگل ہوتے تھے، کچھ دنوں بعد وہ خود پاکستان آ گئے۔ ان کے کردار کرنل فریدی، کیپٹن حمید اور عمران اس زمانے میں نوجوانوں تو کیا بزرگ، خواتین اور مردوں کے بھی محبوب کردار تھے۔ ابتدا میں انھوں نے فریدی کو انسپکٹر کا رینک دیا تھا۔ اب سے تیس چالیس برس پہلے تک ابنِ صفی کا نام چلتا سکّہ تھا۔ ان کے کیسے کیسے نقل کرنے والے پیدا ہوئے۔ کوئی اکرم الٰہ آبادی تھا اور کوئی اے صفی لیکن کوئی بھی انھیں مات نہ دے سکا۔ وہ لوگ جو انھیں چاہتے تھے، وہ ''اصل'' اور ''نقل'' کا فرق جانتے تھے۔ آج آکسفورڈ اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے ہمارے بعض رہنما جس قدر کثیف زبان استعمال کرتے ہیں، کاش انھوں نے ابنِ صفی کو پڑھا ہوتا جنھوں نے شائستگی سے گری ہوئی زبان کبھی استعمال نہیں کی۔ میں نے ایک تندور والے کو ان کے ناول اپنے اَن پڑھ کام کرنے والوں کو پڑھ کر سناتے اور پھر ابنِ صفی کی چٹخارے دار زبان ان ہی ناولوں کے ذریعے سکھاتے دیکھا ہے۔ وہ موجود نہیں رہے لیکن ان کے چاہنے والے موجود ہیں۔ ان کے درجات کی بلندی کی دعا کرتے ہیں۔



حمید شاہد ۔ ادیب، مترجم

کہیں میں نے ابن صفی کا اپنا بیان پڑھا تھا کہ سات آٹھ سال کی عمر میں اُنہوں نے طلسم ہوش ربا کی سات جلدیں پڑھ لی تھیں اور تصور ہی تصور میں ملکہ براں شمشیر زن کو شہزادہ ایرج کی بہ جائے اپنے آپ ہر عاشق ہوتا پاتے تھے۔ کم سنی میں طلسم ہوش ربا پڑھنے اوراپنے تصور میں خود کہانی کا کردار ہو جانے کا تجربہ ایسا تھا جو اُن کے تخیل کو مستحکم کر گیا تھا۔ اسی ہرے بھرے تخیل کی عطا ہے کہ انہوں نے اردو ادب میں اپنے لیے بالکل الگ راستہ بنایا اور یہ ایسا راستہ تھا کہ کسی اور نے اس راہ پر چلنا چاہا تو بہت جلد اس کی سانسیں پھول گئیں۔ جس راستے کی میں بات کر رہا ہوں وہ جاسوسی ناول نگاری کا کٹھن راستہ ہے۔ جس زمانے میں ہم نے ادب پڑھنا شروع کیا اس زمانے میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والی کتابوں میں عمران سیریز اور جاسوسی ناول تھے۔ عمران سیزیز کا نام ابھی تک استعمال ہو رہا ہے مگر وہ مقبولیت جو ابن صفی کا مقدر ہوئی تھی کوئی اور کیسے ہتھیا سکتا تھا۔ مجھے ان کے وہ کردار اب بھی نگاہوں کے سامنے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں جو انہوں نے تراشے تھے ۔ فریدی ہو یا عمران، انہیں کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔ کسی بھی کردار کو لکھتے ہوئے وہ اس کی قامت اور حلیہ قاری کو ذہن نشین کروا دیتے تھے۔ ابن صفی زبان کا خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے ناول جرائم کی دنیا سے متعلق ہوتے مگر وہ جرائم کے بارے میں پڑھنے والے کے دِل میں نفرت بھی ابھار دیتے تھے۔ کہہ لیجیے جہاں وہ اپنے قاری کو بہتر زبان سکھا رہے ہوتے، اُسے مطالعے کی طرف راغب کر تے وہیں سماج کا بہتر فرد بننے کی طرف مائل بھی کر رہے تھے۔ کرداروں کو ایک تناؤ کی کیفیت میں پہنچانا اور قاری کے اندر اتنا تجسس ابھارنا کہ وہ مطالعے پر مائل رہے؛ یہ قرینہ وہ جانتے تھے ۔ ابن صفی کا اردو ادب کے جرائد میں اگرچہ ذکر نہ ہونے کے برابر رہا اور جب ہم میں سے اکثر لکھنے کی طرف گئے تو ان سے دور ہوتے گئے مگر اُن کی کتابیں مقبول عام رہیں۔ جن دنوں شمس الرحمن فاروقی صاحب نے ابن صفی کے چار ناولوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا تو سب حیران ہوئے تھے۔ میں نے بھی اُن سے اس بارے میں استفسار کیا تھا۔ ان کا جواب تھا کہ "ابن صفی کے ناولوں کے ترجمے کے لیے جب مجھ سے رابطہ کیا گیا تو میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہ تھا۔ میں نے ابن صفی کو پڑھ رکھا تھا اور اگر مجھے کوئی فکر تھی تو یہ کہ شاید ان کے کام کا ترجمہ مشکل رہے گا۔ وہ بہت عمدگی سے اردو محاورہ استعمال کر جاتے تھے جو شاید ترجمے میں پوری طرح نہ آپاتا۔" فاروقی صاحب بات بدل کر ترجمے کی مشکلات کی طرف لے گئے تھے ۔ خیر واقعہ یہ ہے کہ فاروقی صاحب کو خود بھی جاسوسی کہانیاں اور خوفناک کہانیاں بہت پسند تھیں ۔ آپ "شب خون" کے پرانے شمارے اٹھا کر دیکھ لیں ان میں آپ کو ایسی کئی کہانیوں کے تراجم مل جائیں گے جو انہوں نے انگریزی سے کیے تھے ۔ ایسے تراجم پر فاروقی صاحب نے بہ طور مترجم اپنا نام دینے کی بجائے کسی اور نام دے دیا تھا۔ فاروقی صاحب کا یہ کام میں نے مجموعہ شمس الرحمٰن فاروقی میں جمع کر دِیا ہے ۔ میرا اپنا خیال یہی ہے کہ ابنِ صفی سے ان کی دلچسپی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی اور وہ ایسے فکشن کو ادب کے مرکزی دھارے میں ہی گردانتے تھے ۔ خیر کہنا یہ ہے کہ ابن صفی کا کام ایسا ہے جسے بھلایا نہیں جا سکے گا ۔ بلاشبہ شروع شروع میں انہوں نے کئی ناول انگریزی سے ترجمہ کیے ۔ خود ابن صفی کے مطابق ایسے ناولوں کی تعداد آٹھ کے قریب رہی ہوگی مگر پھر وہ رواں ہو گئے ۔ یہ ابنِ صفی کا ہرا بھرا تخیل ہی تھا کہ وہ مسلسل لکھنے کی طرف راغب رہے۔ اڑھائی سو کے قریب ناول لکھنے والے اَن تھک ادیب کو چاہے ناقدین نے اس طرح یاد نہ رکھا ہو جیسا ان کا حق تھا مگر انہیں مسلسل اپنا قاری میسر رہا اور ایک سے زیادہ نسلوں کو انہوں نے متوجہ رکھا اور یہ اپنی جگہ بہت اہم بات ہے۔ اہم بات بھی اور ابن صفی کو سب سے منفرد بنا دینے والی بھی۔



غازی صلاح الدین، معروف صحافی و دانش ور

یہ سنہ پچاس کی دہائی کی بات ہے جب میں، اپنے لڑکپن کے زمانے میں، ہندوستان گیا۔ وہاں، علی گڑھ کے ایک ہاسٹل میں، میں نے یہ منظر دیکھا کہ ایک کمرے میں، دو لڑکے اپنے بستروں پر لیٹے ابنِ صفی کا ایک ہی ناول پڑھ رہے تھے۔ پتا چلا کہ جب وہ دوڑے دوڑے ابنِ صفی کا تازہ ناول خریدنے بک اسٹال پر پہنچے تو اس بات پر جھگڑ پڑے کہ پہلے وہ ناول کون پڑھے گا۔ اس ضد کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں نے اپنا اپنا ناول الگ خریدا اور ہاسٹل پہنچ کر اسے پڑھنے میں جُٹ گئے۔ اور اب، ایک اتنی پرانی یاد کے پس منظر میں جاگنے والی ایک سوچ: یہ جانتے ہوئے کہ جاسوسی ادب اکثر نوجوانوں کے ذوقِ مطالعہ کی پرورش کرتا ہے، کیا ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ آج ہمیں کسی ابنِ صفی کی آئی ایم ایف کے معاشی سہارے سے زیادہ ضرورت ہے؟



پروفیسر ڈاکٹر انوار احمد، سابق صدر، شعبہ اردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان

اسرار احمد (ابنِ صفی) کی زندگی میں بہت سوں نے ان کا نام چُرایا (ملتے جلتے نام رکھے این صفی، ابّن (تشدید کے ساتھ) صفی) پورے پورے ناول چربہ کیے یا جعلی ایڈیشن شائع کیے مگر ابنِ صفی منفرد اور ممتاز تھے۔ کرنل فریدی اور حمید تو چلیے شرلاک ہومز کے سائے تلے پروان چڑھے مگر عمران ان کا طبع زاد کردار تھا اور عوام تو کیا خواص کو بھی پسند تھا۔ چہرے پر حماقت برستی تھی بظاہر ڈرپوک دکھائی دیتا تھا مگر یہیں سے اس کی طاقت ظاہر ہوتی تھی۔ جب مخالف کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بہت بہادر، ذہین اور پیچیدہ تالے اور ہتھکڑیاں کھولنے والا ہیرو ہے۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ ممتاز شیریں جب آخری ایام میں علیل تھیں اور ان کے شوہر صمد شاہین دوسری شادی کے منصوبے بنا رہے تھے تو ان کی دلچسپی جاسوسی ادب سے بڑھ گئی تھی اور سیدھی بات ہے کہ کوئی سنجیدہ قاری ہو، ادبی ذوق رکھنے والا ہو تو وہ ابنِ صفی کو ہی پڑھنا پسند کرتا تھا کہ ان کی زبان میں ادبی چٹخارہ تھا اور آئن فلیمنگ کے 007 کی طرح اپنے ہیرو کو جنس اور شراب میں ڈوبا ہوا نہیں بلکہ پاکستانی شرم و حیا میں ڈوبا ہوا دکھاتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ابنِ صفی کے بیٹے نے ان سے منسوب ویب سائٹ قائم کی۔ دو ایک یونی ورسٹیوں میں ان پر ڈاکٹریٹ کے مقالے لکھے گئے اور اب یہ بات بہت خوش آئند ہے کہ انجمن ترقی اردو کا جریدہ

"قومی زبان" اردو کے مقبول ترین ناول نگار کے لیے خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔



پروفیسر مظفر شہ میری، سابق وائس چانسلر، ڈاکٹر عبدالحق اُردو یونی ورسٹی، کرنول، آندھرا پردیش، بھارت

مجھے یہ جان کر ازحد مسرّت ہوئی کہ انجمن ترقی اردو پاکستان کا ماہنامہ رسالہ "قومی زبان" ماہ جولائی میں "ابنِ صفی نمبر" شائع کررہا ہے۔ میری طرف سے ہدیۂ تبریک قبول فرمائیے۔ مجھے اس ضمن میں یہ چند سطور لکھتے ہوئے ازحد خوشی ہورہی ہے۔ یہ میرے لڑکپن کی بات ہے، جب میں درست اُردو لکھنا اور شستہ اُردو بولنا سیکھ رہا تھا، ابن صفی کے ناولوں نے میری بڑی رہنمائی کی تھی۔ میں بسا اوقات نہایت فخر و مسرت کے ساتھ اعتراف کیا کرتا ہوں کہ دسویں جماعت کے پہنچتے پہنچتے میں نے ابن صفی کے تمام ناول پڑھ لیے تھے اور جس کا خاطر خواہ اثر میری زبان پر پڑا تھا۔ میں فریدی کے مقابلے میں عمران کو پسند کرتا تھا؛ آج بھی وہی میری پہلی پسند ہے۔ میرے ایک دوست سید نثار احمد ہیں؛ لڑکپن میں ہم عمران کے مکالموں اور اُس کی حرکتوں کو دوستوں پر آزماتے تھے۔ ہمارے جو دوست ابن صفی کو نہیں پڑھتے تھے، ہم اُن پر بھاری پڑتے تھے۔ اصل میں ہم نے اُسی زمانے میں سمجھ لیا تھا کہ ابن صفی یا اُن کے کرداروں کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک خاص طرح کے ذوق و ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو لوگ ابن صفی کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں وہ دراصل مطالعے کی خوش گوار محویت (Mindset) اور اس کی برکتوں سے محروم ہوتے ہیں۔ ہم نے ابن صفی سے صرف زبان ہی نہیں سیکھی بلکہ آدابِ معاشرت کے ساتھ قانون کا لحاظ کرنا سیکھا۔ اگر آپ ہمارے لڑکپن سے ابن صفی کو نکال دیں گے تو اُس میں سے ایک دوست، رہنما اور فلسفی چھن جائے گا جو نوجوانوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا ہے؛ اُن سے ہنسی مذاق کرتا ہے اور انھیں آدابِ زندگی سے واقف کراتا ہے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ میرے طلبہ جو یک لخت پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھنے بیٹھ جاتے ہیں، وہ کچھ روز ابن صفی کو پڑھ کر آئیں تاکہ اُنھیں لکھنا آئے۔ ایک آخری بات۔ میری آرزو ہے کہ مجھے ابن صفی کے ناولوں کے وہی پرانے ایڈیشن مل جائیں جنھیں خوش نویس لکھا کرتے تھے۔ اُن کی بات ہی نرالی تھی۔ آج کمپوز کیے ہوئے ایڈیشن آتے ہیں اور ایک ایڈیشن میں چار چار ناول ٹھونس دیے گئے ہوتے ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ ہم ابن صفی کو نہیں کسی اور پڑھ رہے ہیں۔ خدا لگتی کہوں یہ جدید ایڈیشن میرا ماضی مجھ سے چھین لیتے ہیں۔ خدا خیر کرے۔



پروفیسر مہر افشاں فاروقی۔ اردو اور جنوبی ایشیائی ادب۔ یونیورسٹی آف ورجینیا۔ امریکہ

میرے ابا (شمس الرحمان فاروقی) جاسوسی ناول بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے میرے نانا ابا کے ہاں ابن صفی کی جاسوسی ناولوں کا ذخیرہ تھا۔ نکہت پبلی کیشنز والوں سے اچھے مراسم تھے۔ شب خون کا دفتر بھی اسی علاقہ میں تھا۔ ابن صفی کا انگریزی ترجمہ والد صاحب نے بڑے شوق سے کیا۔ جاسوسی دنیا سے ان کی کتنی یادیں وابستہ تھیں۔
انجمن ترقی اردو پاکستان نے ابن صفی پر اشاعت خاص کا اہتمام کرکے ایک معروف اور اہم ناول نگار کو یاد کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔



پروفیسر ڈاکٹر السید ابراہیم محمد ابراہیم ۔ سربراہ شعبہ اردو ۔ جامعہ الازہر ۔ مصر

ابنِ صفی اردو ادب کا ایک جانا پہچانا نام، اعلیٰ درجے کے ناول نگار اور اردو زبان کے عظیم ناول نگار تھے۔
وہ 26/جولائی 1928ء کو پیدا اور 26 جولائی 1980ء کو انتقال کر گئے۔
ابن صفی نے 1955ء میں "خوفناک عمارت" کے عنوان سے میں پہلا جاسوسی ناول لکھا۔

اس کے بعد انہوں نے درجنوں ناول اور کہانیاں لکھیں- ابن صفی کے ناولوں کے موضوعات دلچسپ اور نرالے تھے اور ان کا اندازِ بیان بھی سب سے الگ تھا۔ وہ موضوع کی طرف جتنی اہمیت دیتے تھے اتنی ہی اہمیت زبان کو دیتے تھے۔ ابنِ صفی صرف تفریح اور قارئین کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھتے تھے، بلکہ وہ ہمیشہ معاشرے کو بہتر بنانے کے مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے اور جو کچھ لکھتے اس میں کوئی نہ کوئی تعلیمی اور اخلاقی پیغام ضرور ہوتا تھا۔ لہٰذا ابن صفی کے ادب کو محض تفریحی ادب نہیں کہا جاسکتا۔ ان کے ادب میں فکری و ذہنی تربیت بھی پوری طرح نمایاں ہے۔
اردو ادب میں ابن صفی کی اہمیت کے پیشِ نظر، شعبۂ اردو، جامعۃ الازہر نے 2015ء میں ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی اجازت دی جس میں ابن صفی کے حیات وآثار، ان کے فن، اور اردو ادب کی خدمت میں اور بالخصوص جاسوسی ناول کے میدان میں ان کی کوششوں کا احاطہ کیا جائے، اور ان کے کسی ناول کا عربی میں ترجمہ کیا جائے- چنانچہ "ابن صفی کے ناول 'دہشت گرد' کی روشنی میں اردو جاسوسی ناول" کے موضوع پر الازہر یونیورسٹی کی اسکالر "نادیہ محمود جمعہ" نے 2019ء میں میری نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کر لیا، "دہشت گرد" کا عربی میں ترجمہ کیا، اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔



اطہر فاروقی، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی

میرے لیے ذاتی طور پر یہ خبر انتہائی خوشی کی ہے کہ "قومی زبان' ابن صفی پر خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے جس کے لیے میں انجمن ترقی اردو اور پاکستان کے ارباب حل و عقد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔جب اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظام برباد ہو گیا تو اس کے بعد کی اور چار نسلیں ابن صفی کے ناولوں کی وجہ سے ہی اردو پڑھ سکیں۔ دینی مدارس کے نصاب میں اردو ادب کی شمولیت یا تو نا کے برابر ہوتی ہے یا پھر اردو ادب دینی مدارس میں شجر ممنوعہ ہے۔ جن دینی مدارس میں اردو ادب کی تعلیم کا انتظام ہے بھی، وہاں بھی ابن صفی معتوبین کی فہرست میں شامل رہے مگر دینی مدارس کے طلبہ جس ذوق و شوق سے
اس ناول نگار کو پڑھتے تھے، اور آج بھی پڑھتے ہیں اس کی کوئی دوسری مثال ہمارے سامنے نہیں ہے۔ابن صفی جو صاف ستھری اور آسان زبان لکھتے تھے، اس طرح لکھنے کے لیے بڑی ریاضت کی ضرورت ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ ابن صفی مطالعات کے لئے نئی جہات اور جولان گاہوں کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کے لیے رہ نما ہوگا۔



پروفیسر ڈاکٹر شاداب احسانی، سابق صدرِ شعبہ اُردو، جامعہ کراچی

اردو ادب پر گنگا جمنی تہذیب کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، خاص طور سے یہ الٰہ آباد اردو ادب پر چھایا نظر آتا ہے۔ چونکہ ہم نے دیکھا کہ شمس الرحمٰن فاروقی، الٰہ آباد کی نمائندگی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسرے موثر ترین جن کا تفتیشی سطح پر بڑا کام ہے، وہ ہیں ابنِ صفی۔ ابنِ صفی اگر نہ ہوتے تو فیروز تیرتھ پوری جتنا بھی جاسوسی ادب لکھ لیتے لیکن یہاں تک نہ پہنچ پاتے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی ناول، افسانہ، نظم یا نثر جو بھی ہو، وہ جب تک اپنے اصل سے نہیں جڑتی، اس کے میلانات سے وابستہ نہیں ہوتی ہے تو اس کا ابلاغ ممکن نہیں ہوتا ہے۔ جاسوسی ادب ایک عرصے تک مطعون رہا کہ جاسوسی کے ساتھ "ادب" نہ لکھا جائے۔ یہ ادبی نوعیت نہیں ہے بلکہ ڈائجسٹ جیسی نوعیت زیادہ ہے لیکن جب ہم اس کے قارئین کی تعداد دیکھتے ہیں تو وہ بے مثال رہی ہے۔ اور میں سمجھتا تھا ابنِ صفی نے کبھی کوئی کتاب کسی کو تحفے میں نہیں دی ہو، انھوں نے جو کچھ لکھا وہ سب فروخت ہوجاتا تھا۔ وہ ہر دل عزیز ہونے کے علاوہ بہت ہی معروف ادیب تھے اور جاسوسی ادب کو ہم مغربی جہت سمجھتے ہیں لیکن میرے خیال میں ہمارے ہاں جاسوسی ادب کے موجد بھی وہی تھے اور خاتم بھی وہی۔ الٰہ آباد کی سرزمین پُراسراریت کا خمیر لیے ہوئے ہے۔ ادبی رسالے "شب خون" اپنے نام کے حوالے سے جاسوسیت کا حامل ہے جب کہ ابنِ صفی کی تفتیشی نوعیت جاسوسی ادب کا لازوال حوالہ قرار پاچکی ہے



پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد زبیری۔ سابق چیئرمین شعبہ ابلاغ عامہ۔ جامعہ کراچی۔ محقق۔ صحافی

بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں اردو کے عام قسم کے ناول اور چند رسالے شوق سے پڑھے جاتے تھے لیکن پھر ایک دھماکا سا ہوا اور دو چھوٹی چھوٹی ماہ وار کتابوں کے لیے ایک دیوانگی شروع ہوگئی۔ یہ کتابیں تھیں "رومانی دنیا" اور "جاسوسی دنیا۔" آخر الذکر ابن صفی لکھتے تھے— اور ان کے دو کردار فریدی اور حمید ہر گھر میں گھنٹوں زیرِ تذکرہ اور زیرِ تبصرہ آنے لگے۔ کچھ لوگ فریدی کے طریقہ کار کے عاشق تھے اور بہت سے دوسرے حمید کی حرکتوں پر جان دیتے تھے۔ میں نے بہ چشم خود دیکھا کہ "جاسوسی دنیا" کی آمد کے دنوں میں لوگ بار بار اسے بیچنے والی دکان پر پوچھنے کے لیے آتے تھے—
کیا "جاسوسی دنیا" کا شمارہ آگیا؟ بعد میں 'عمران سیریز' بھی شروع کردی گئی اور نشہ دو آتشہ ہوگیا۔ ابن صفی نے رومانی اور صادق سردھنوی کے تاریخی ناولوں کے درمیان جس مہارت سے اپنی جگہ بنائی۔ یہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اس زمانے کو اب ستر پچھتر سال ہوتے ہیں اور کمال ہے کہ دیوانگی اب بھی کم نہیں ہوتی۔ کتابیں اب تک بار بار شائع ہوکر بک رہی ہیں اور پڑھی جارہی ہیں۔ یہ مقبولیت اردو کے کم ہی ادیبوں کے حصے میں آئی ہے۔



پروفیسر ڈاکٹر یونس حسنی، سابق صدرِ شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

ہمارے یہاں جاسوسی ادب غیر معیاری ہونے کے باعث ادب سے بے دخل کر دیا گیا اور اسے سوءِ ادب خیال کیا جاتا رہا۔ ابنِ صفی نے جاسوسی ادب کو ادبی اہمیت عطا کی مگر پھر بھی سکّہ بند ناقدین نے اسے خاطر میں لانے سے گریز کیا۔ مگر یہ ابنِ صفی کا ادبی اسلوب تھا جس نے آج اردو کے جاسوسی ادب کو وزن و وقار بخشا۔ انھوں نے اظہار کی غیر معمولی صلاحیت سے اعلیٰ ادبی نہج پر پہنچایا اور فریدی، حمید، عمران اور متعدد مجرمانہ کرداروں کی تخلیق کے ذریعے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منوایا بلکہ جاسوسی ادب کو اردو میں قابلِ ذکر اور اہم مقام پر لا کھڑا کیا۔



ڈاکٹر عظمیٰ فرمان، صدر نشیں، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی

بہت خوشی کی بات ہے کہ انجمن سے "ابنِ صفی نمبر" شائع کیا جا رہا ہے۔ جاسوسی ادب اردو میں بہت کم ہے اور جب جاسوسی ادب کی بات کی جائے تو ابنِ صفی کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ ایسا کون ہے جس کی زندگی کا ایک اہم جزو ابنِ صفی نہ رہے ہوں۔ ابنِ صفی اور اشتیاق احمد دو ایسے نام ہیں جنھیں ہم نے دیوانوں کی طرح پڑھا ہے۔ ایک چسکہ ہوتا تھا۔ ہم ان کا ناول پڑھے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ تلاش کرکے، دوستوں سے مانگ کر، لائبریریوں سے، پرانی کتابوں سے خرید کر کسی بھی طرح حاصل کرکے پڑھتے تھے۔ ان کے جو کردار تھے، ان پر ہم باقاعدہ اپنے دوستوں سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ خاص طور پر عمران، ایک بے وقوفانہ، بے پروا لڑکے کا کردار جو بے انتہا ذہین، انتہائی اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اور میرا پسندیدہ کردار کرنل فریدی کا تھا۔

جاسوسی ادب میرا خیال ہے کہ اہم اس لیے اتنے شوق سے پڑھتے ہیں کہ ہم اس میں ایک نئی جہت ملتی ہے جیسے کہ عام ناولوں میں خیر و شر کے درمیان معرکے دکھائے جاتے ہیں یا معصومیت اور چالاکی کے درمیان لیکن جو مسٹری ہوتی ہے اس میں جو معرکہ آرائی ہوتی ہے، وہ دو ذہین لوگوں کے درمیان اور ذہانتوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اور اس میں جو زیادہ ذہین ہوتا ہے، وہ جیتتا ہے۔ اسی لیے ہمیں ہمیشہ اس میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ اردو میں کیوں کہ ایسی چیزیں بہت کم تھیں، اسی لیے ہم نے ابنِ صفی کو شروع سے آخر تک پڑھا اور اس وقت پڑھنا چھوڑا جب ہمیں معلوم ہوا کہ اب ابنِ صفی ناول نہیں لکھ رہے، کچھ اور لوگ ہیں جو ان کے نام سے لکھ رہے ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے کہ ابنِ صفی کو یاد کیا جا رہا ہے اور ان کے نام کا نمبر نکالا جا رہا ہے۔ یقیناً وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ہمیں مطالعے کی پکی عادت ڈالی اور اوّلین ریڈنگ کرنا وہیں سے شروع کی۔

اس میں بہت بڑا ہاتھ ابنِ صفی کا ہے اور یہ کریڈٹ انھی کو جاتا ہے۔



اے ایچ خانزادہ، سیکریٹری پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس (دستور)

ابن صفی کے نام سے شہرت پانے والے اسرار احمد، اردو کے ان صاحبانِ قلم میں سے ایک ہیں کہ جن کے قلم کی کاٹ، ٹھاٹھ باٹ، شان اور دھمک اب تک محسوس کی جا رہی ہے اور یہ کہ اسے مدتوں محسوس کیا جاتا رہے گا۔ قلم کے اس دھنی کی زبان و بیان کی صحت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ لوگ اپنی اردو درست کرنے کے لئے ابن صفی کو اب بھی پڑھتے ہیں۔ جو اور جس قدر بھی کام اب شروع ہوا ہے اسے بہت پہلے شروع ہونا چاہیے تھا۔ ابن صفی نمبر نکالتے اور مبارک باد اور تحسین کے حق دار ہیں۔



پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اَر، صدر، شعبۂ اُردو اور چیئرمین، شرقیات ریسرچ سینٹر، استنبول، ترکیہ

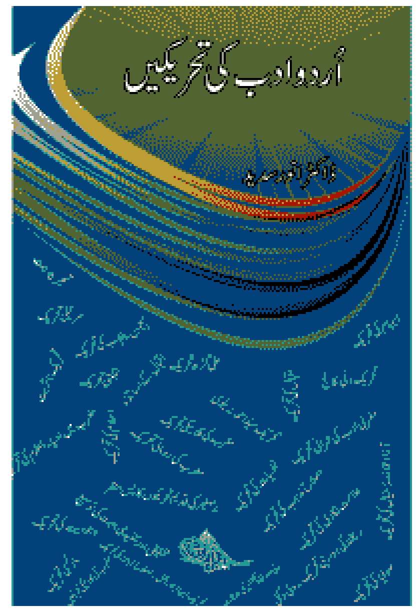
ادب میں روایت کا دامن مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر آگے بڑھتے جانا بھی کچھ کم اہم نہیں ہے لیکن روایت کو برقرار رکھتے ہوئے نئی راہ نکالنا اصل کارنامہ ہے۔ یہ دعویٰ تو ہرگز درست نہ ہوگا کہ ابن صفی جاسوسی یا سری ادب کے بانی ہیں لیکن یہ تسلیم کرنے میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے کہ اردو ادب میں جاسوسی ادب کی روایت ابن صفی نے ہی قائم کی اور بڑی شان کے ساتھ قائم کی۔ ابن میری نگاہ میں یہ صورت حال صدیوں پہلے جیسی ہے جب عرب کے اہل زبان نے مارے نخوت کے الف لیلہ کو نظر انداز کر دیا۔ پھر کئی زمانے بیت جانے کے بعد اہل مغرب نے جب اس اچھوتی داستان کا ڈنکا بجایا تو لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ اصل ادب تو یہی ہے۔ جدید ترکی ادب میں سری ادب کا سلسلہ احمد مدحت آفندی کے ناول "اسرارِ جنایت" سے شروع ہوا اور مغربی ادب سے تراجم کے ساتھ سلطنت عثمانیہ میں بالخصوص عبدالحمید خان ثانی کے عہد میں سری، جاسوسی یا جس طرح ترکی زبان میں ہم کہتے ہیں "پولیسیّہ ادب" کا بہت چرچا ہوا اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ اردو ادب اور ابن صفی کا بھی ہے۔ ابن صفی نے تیز رفتاری کے ساتھ لکھا جو لکھا، اسے بہت زیادہ پڑھا گیا۔ بات یہ ہے کہ الم غلم کی عمر زیادہ نہیں ہوتی کچھ دیر تھوڑا بہت شور مچا کر از خود فنا کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ ابن صفی کے لکھے کو کم و بیش نصف صدی ہوتی ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی برقرار ہے۔ سبب کیا ہے، سبب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا، اس میں مقصد تھا، داستانی ادب کی طرح اس میں ایسا خیال جاگزیں تھا جو بعد میں حقیقت بنا، یہی تو زندہ ادب کی شناخت ہوتی ہے۔ ہماری بہن ڈاکٹر یاسمین سلطانہ فاروقی نے تاریخی علمی و ادبی مجلے قومی زبان کا ابن صفی نمبر نکالنے کا فیصلہ کیا ہے جس پر میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ابن صفی نمبر نہ صرف ابن صفی کے کام پر تحقیق میں اضافے کا باعث بنے گا بلکہ سری ادب کی ترقی کی راہیں بھی کشادہ کرے گا۔



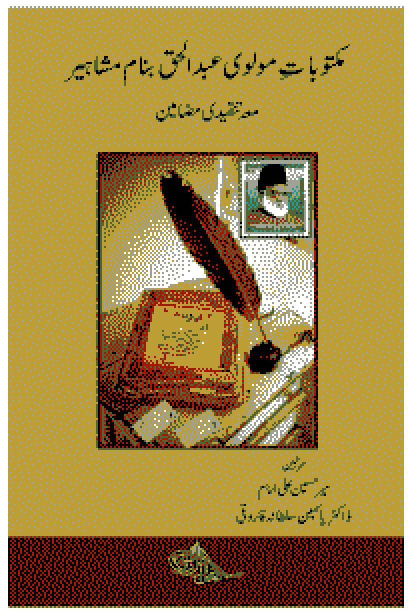
ڈاکٹر کیومرثی۔ سربراہ شعبہ اردو۔ تہران یونیورسٹی۔ ایران

ہم سب نے کچھ نہ کچھ جاسوسی ناول پڑھے ہوں گے۔ ابنِ صفی اردو ادب کے جاسوسی ادب میں اونچا مقام رکھتے ہیں اور شہرت رکھتے ہیں بلکہ جاسوسی ادب کے بانی ہیں۔ انھوں نے اپنا پہلا جاسوسی ناول 1957ء میں "ٹھنڈی آگ" شائع۔ انھوں نے بہت معیاری ناول لکھے ہیں۔ ان کے ناول میں مقصدیت کے علاوہ ایک فکری اور ذہنی تربیت بھی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل انھوں نے جاسوسی ناولوں میں بڑے لازوال کردار تخلیق کیے۔ ان کے ناول بہت شوق سے پڑھے جاتے تھے اور آئندہ بھی پڑھے جاتے رہیں گے۔ انھوں نے ادب کو خواص سے نکال کر عوام تک پہنچا دیا۔

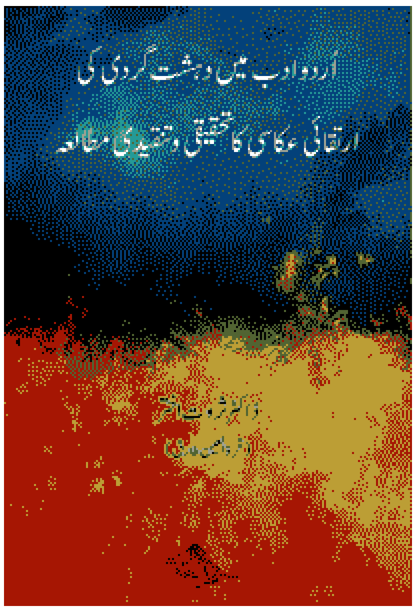
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



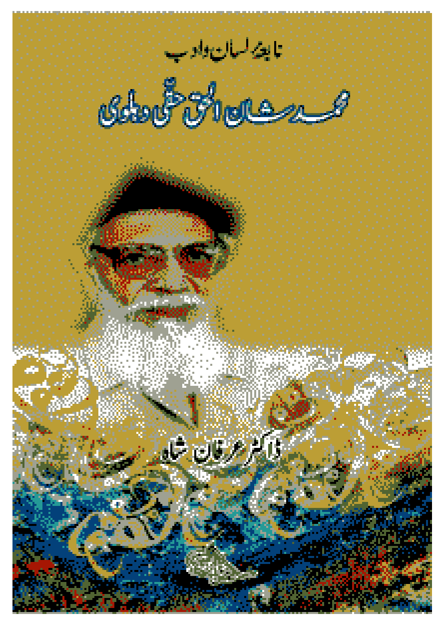
طبع شدہ قیمت:۱۰۰۰روپے



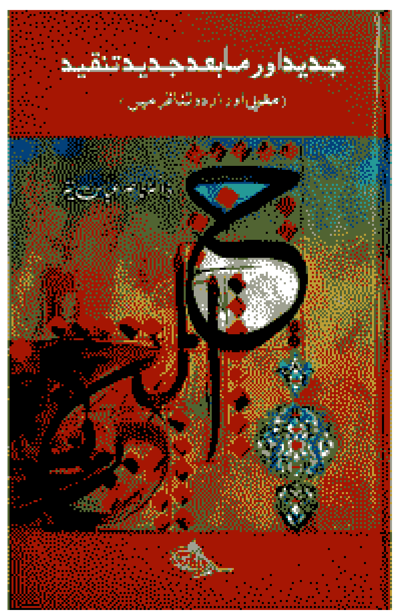
طبع شدہ قیمت:۱۲۰۰روپے



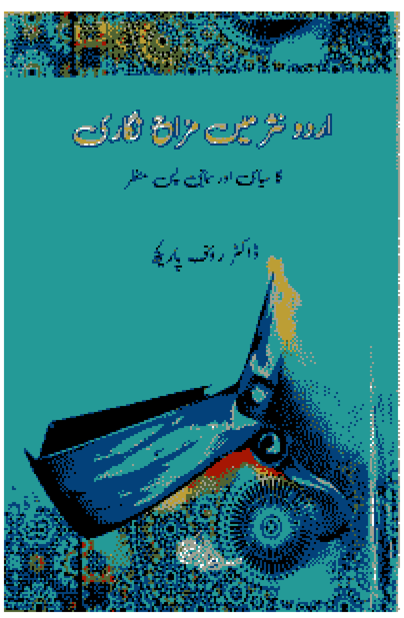
طبع شدہ قیمت:۱۰۰۰روپے



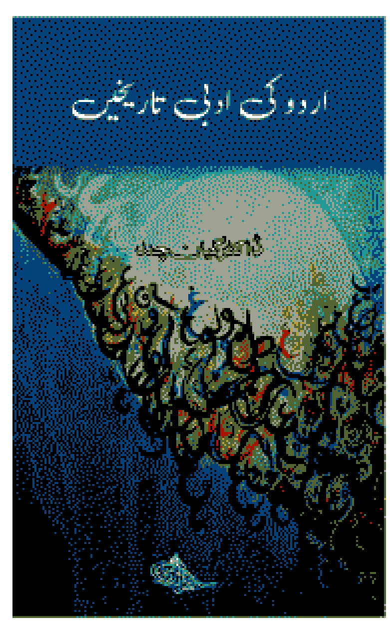
طبع شدہ قیمت:۱۲۰۰روپے



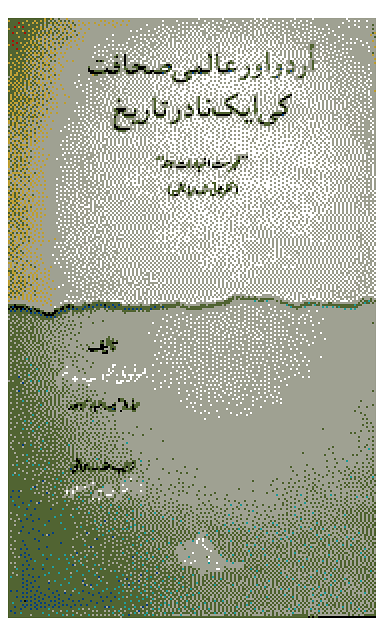
طبع شدہ قیمت:۱۲۰۰روپے



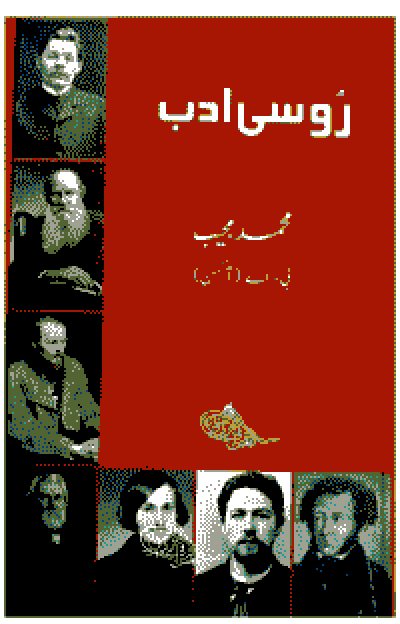
طبع شدہ قیمت:۱۴۰۰روپے



طبع شدہ قیمت:۱۵۰۰روپے

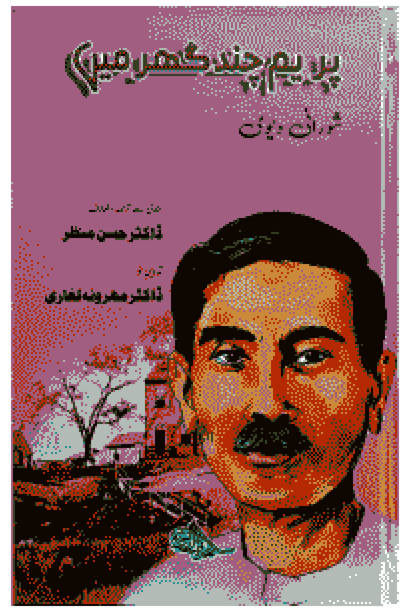


طبع شدہ قیمت:۱۱۰۰روپے

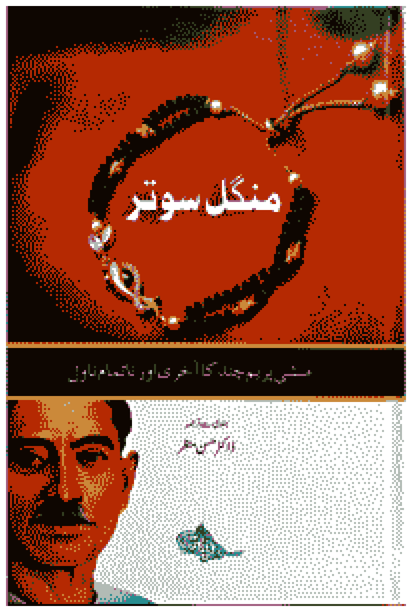


طبع شدہ قیمت:۷۰۰روپے

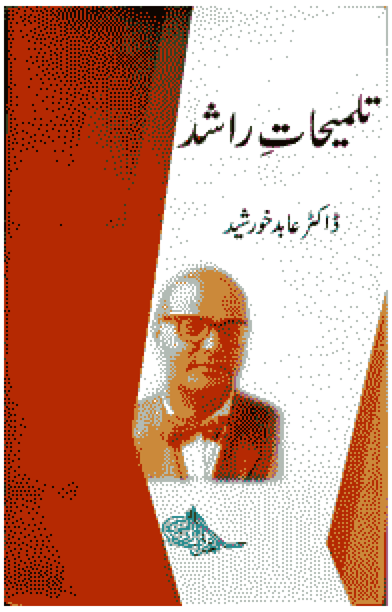
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



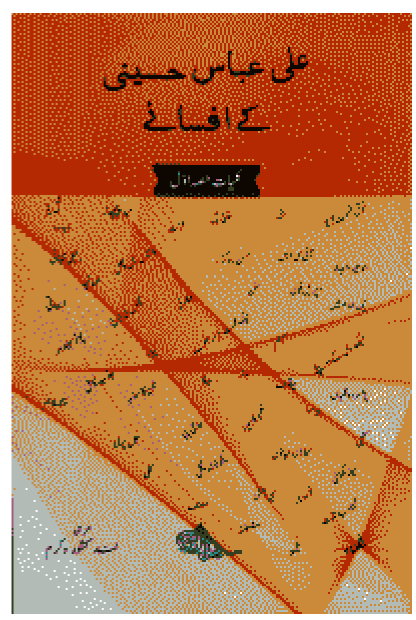
طبع شدہ قیمت: ۱۰۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۶۰۰ روپے



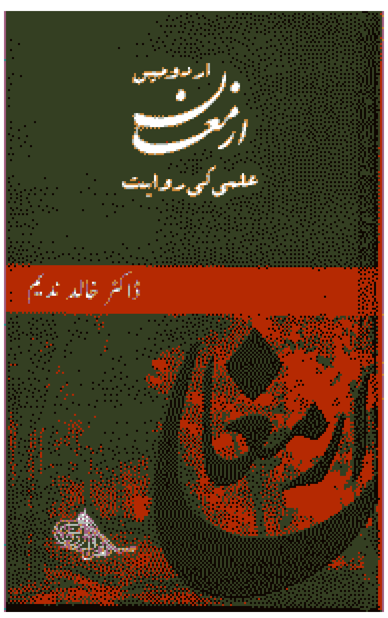
طبع شدہ قیمت: ۴۰۰ روپے



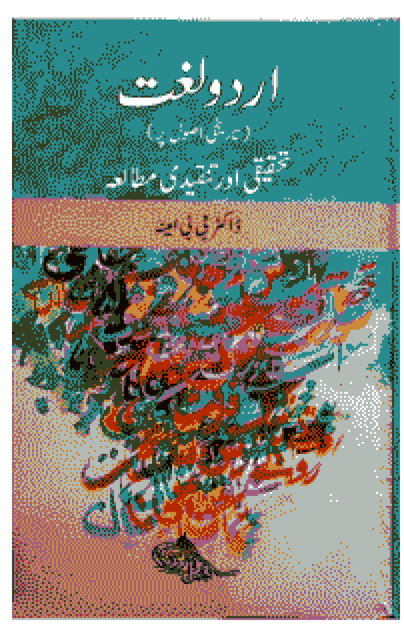
طبع شدہ قیمت: ۷۰۰ روپے



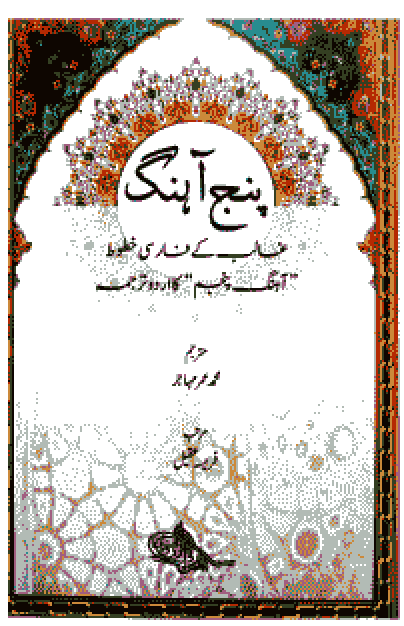
طبع شدہ قیمت: ۷۵۰ روپے



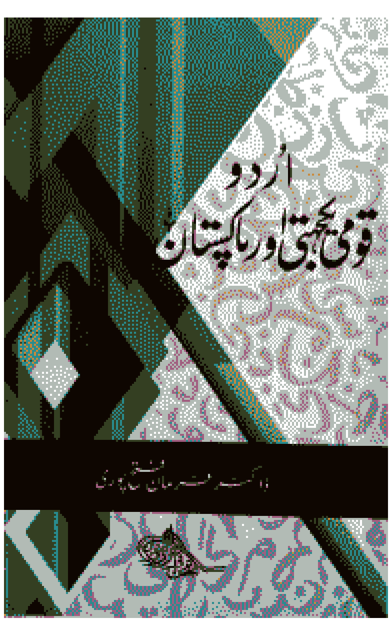
طبع شدہ قیمت: ۵۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۵۰۰ روپے

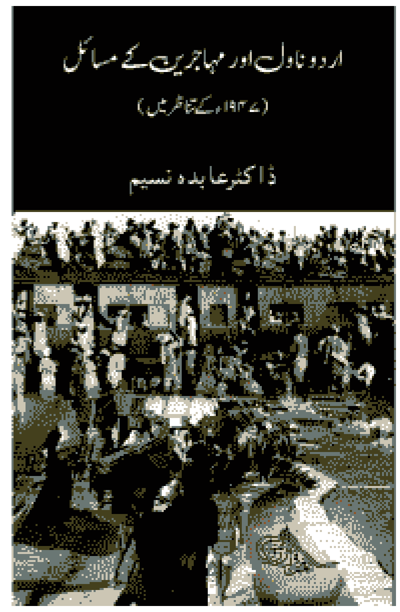


طبع شدہ قیمت: ۳۰۰ روپے

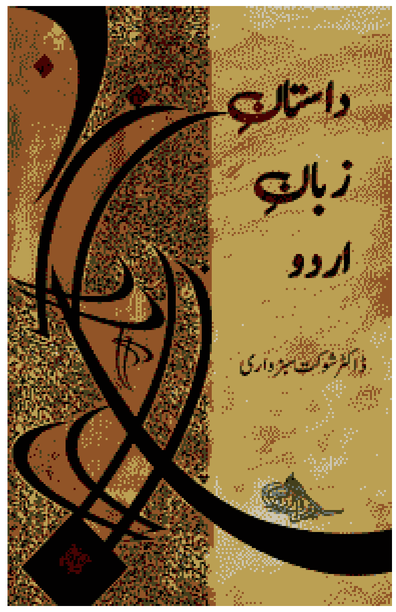


طبع شدہ قیمت: ۳۰۰ روپے

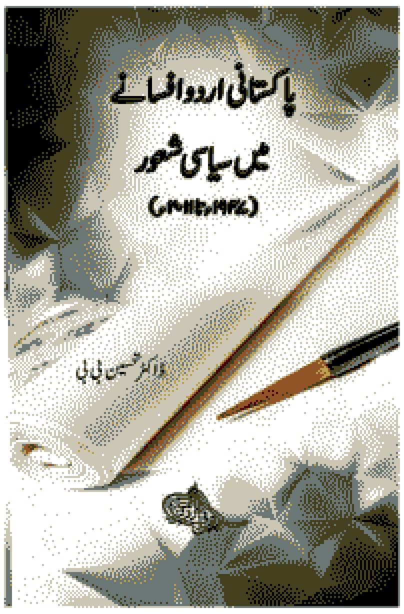
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



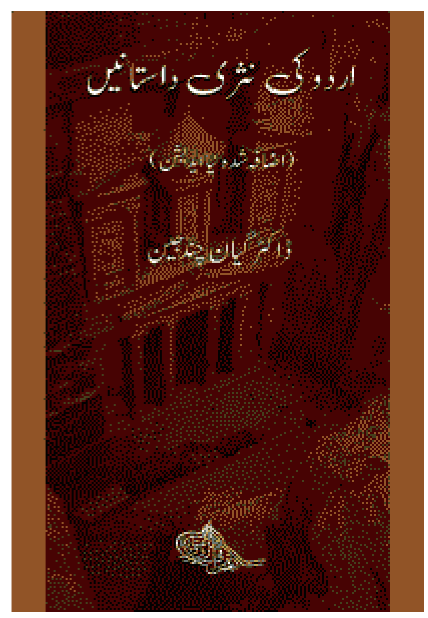
طبع شدہ قیمت: ۵۰۰ روپے



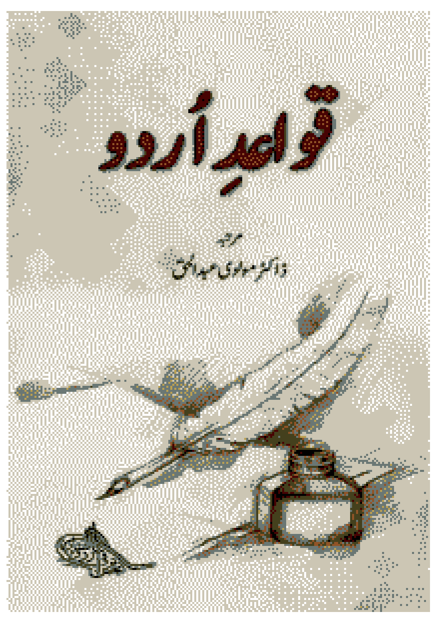
طبع شدہ قیمت: ۳۰۰ روپے



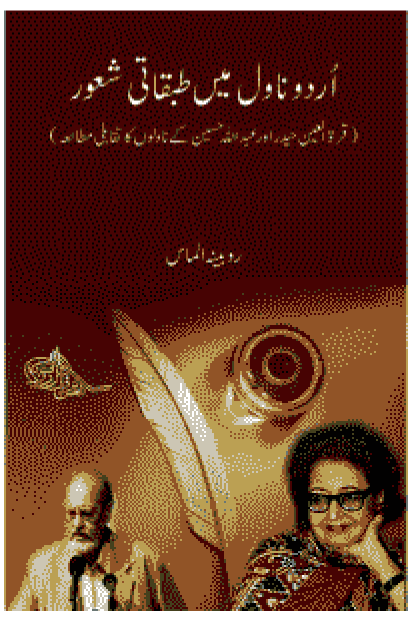
طبع شدہ قیمت: ۵۰۰ روپے



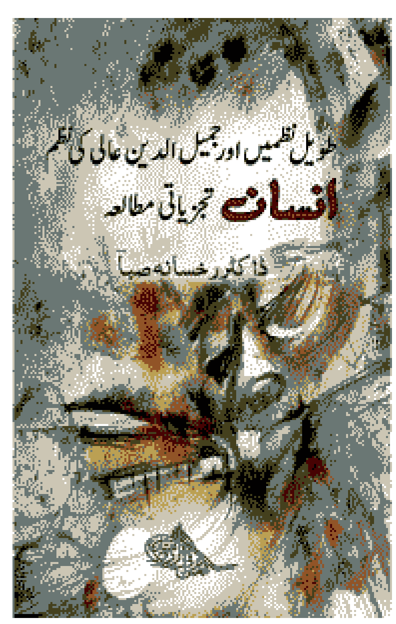
طبع شدہ قیمت: ۱۲۰۰ روپے



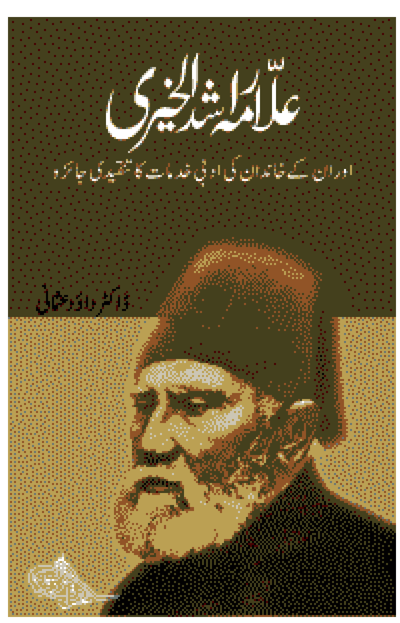
طبع شدہ قیمت: ۴۰۰ روپے



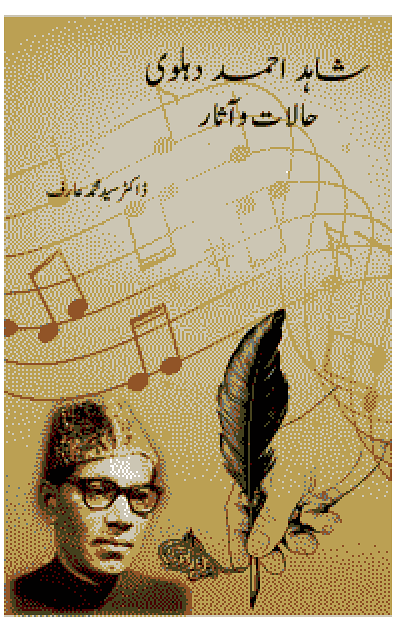
طبع شدہ قیمت: ۵۰۰ روپے



طبع شدہ قیمت: ۸۰۰ روپے

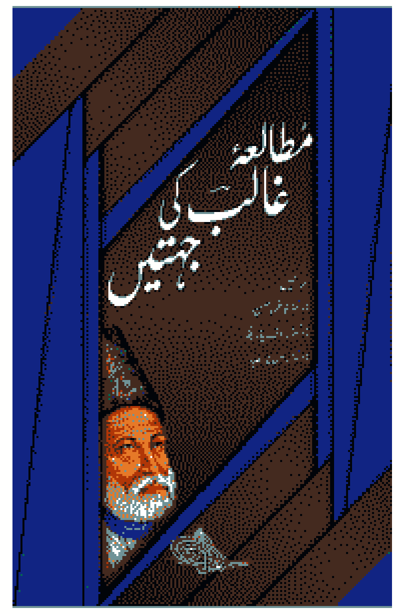


طبع شدہ قیمت: ۲۶۰ روپے

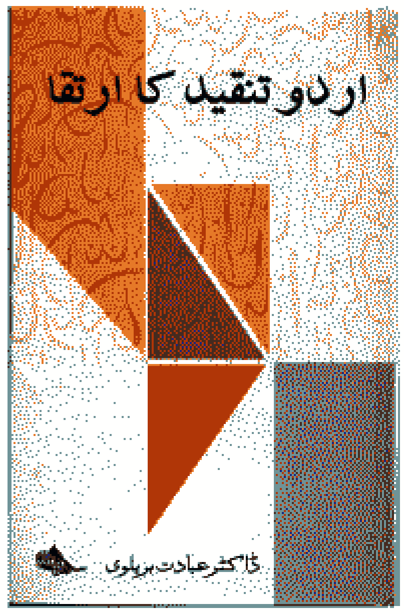


طبع شدہ قیمت: ۴۰۰ روپے

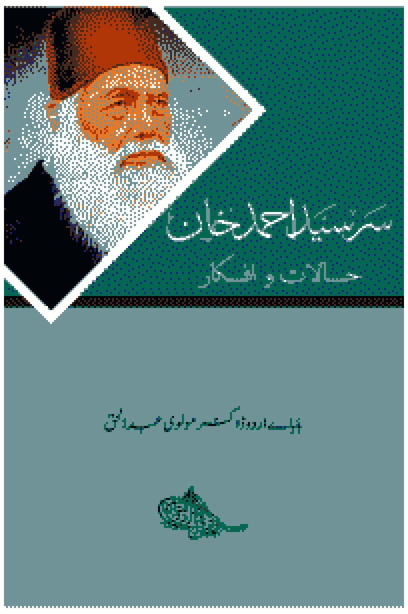
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



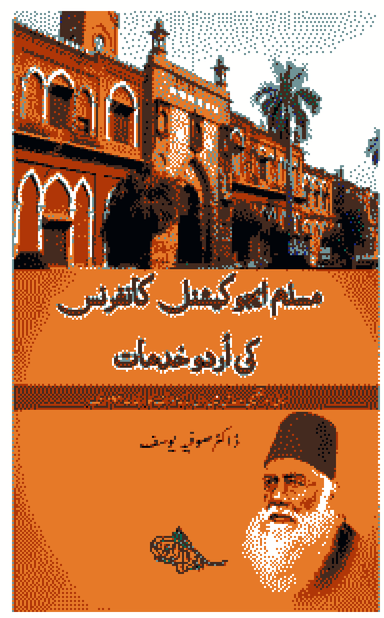
طبع شدہ قیمت:۴۰۰روپے



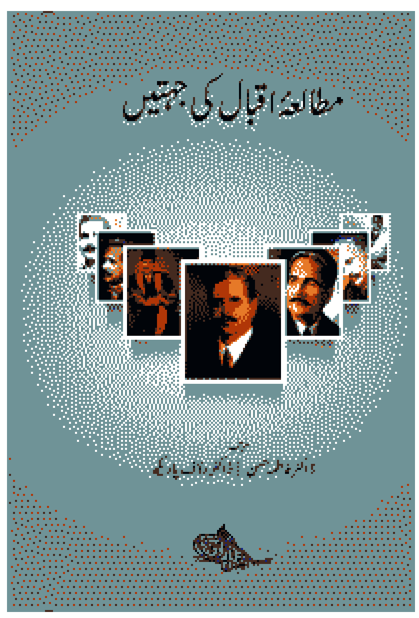
طبع شدہ قیمت:۵۰۰روپے



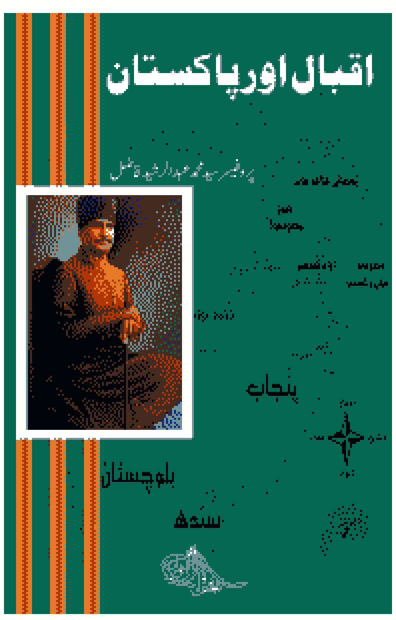
طبع شدہ قیمت:۲۰۰روپے



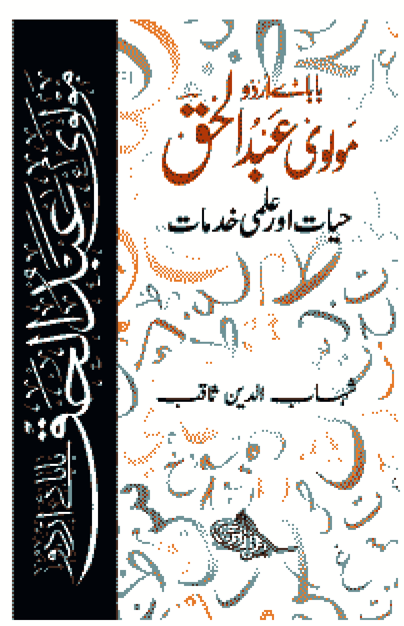
طبع شدہ قیمت:۴۰۰روپے



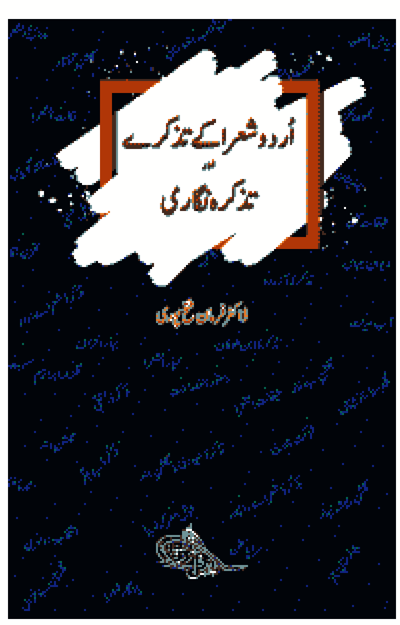
طبع شدہ قیمت:۴۴۰روپے



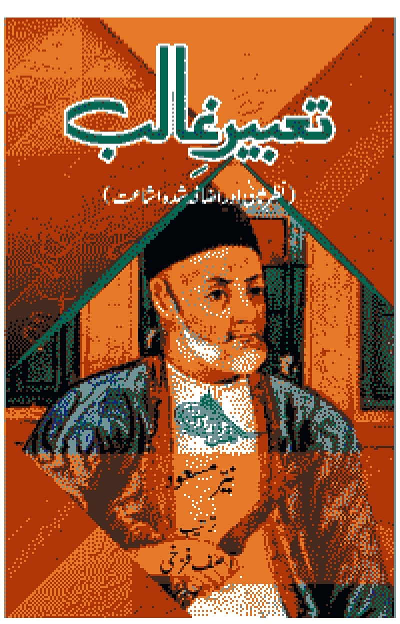
طبع شدہ قیمت:۲۰۰روپے



طبع شدہ قیمت:۳۰۰روپے

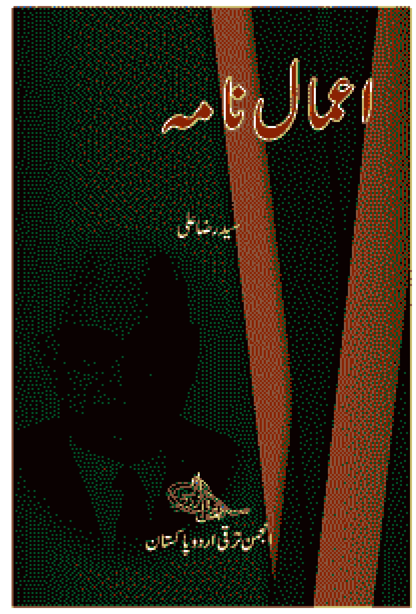


طبع شدہ قیمت:۷۶۰روپے

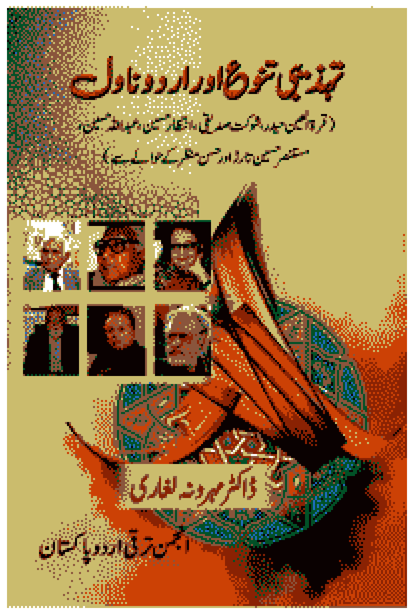


طبع شدہ قیمت:۳۶۰روپے

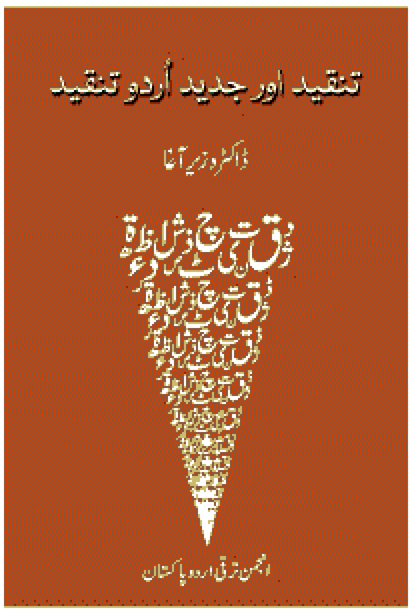
مطبوعات انجمن ترقی اُردو پاکستان



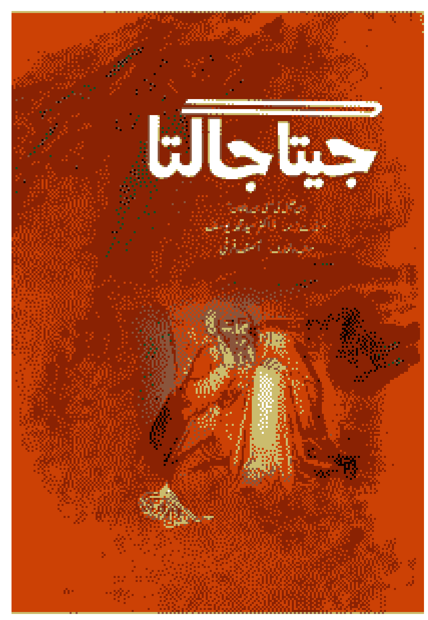
زیر طبع



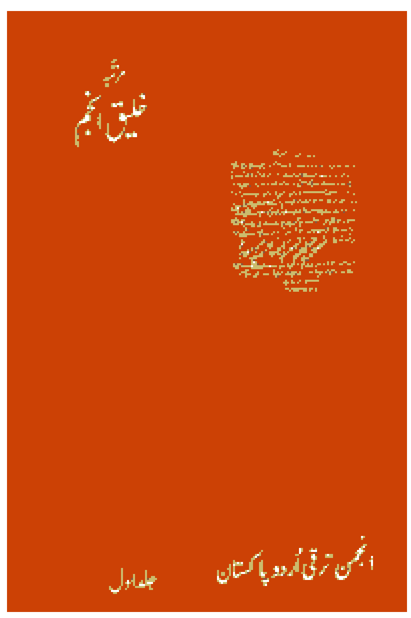
طبع شدہ قیمت:۱۲۰۰روپے



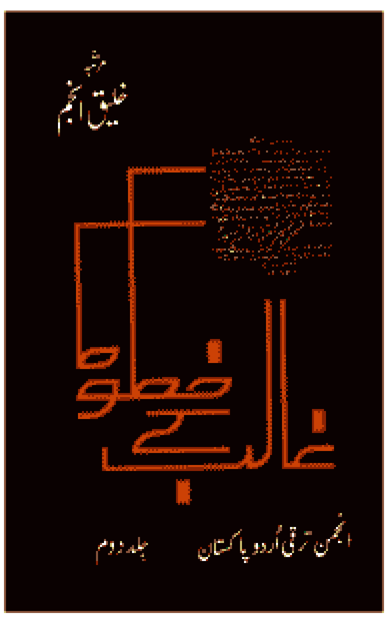
طبع شدہ قیمت:۵۰۰روپے



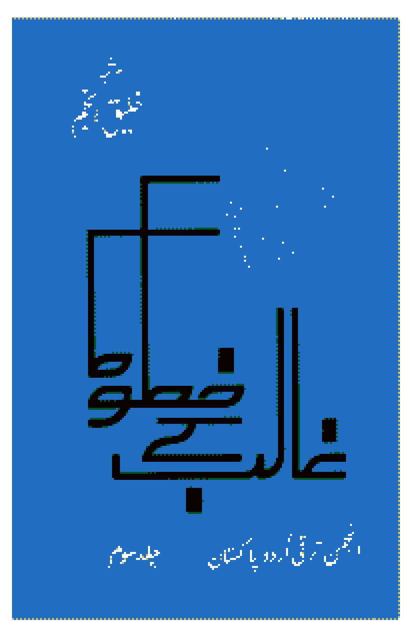
طبع شدہ قیمت:۲۰۰روپے



طبع شدہ قیمت:۴۰۰روپے



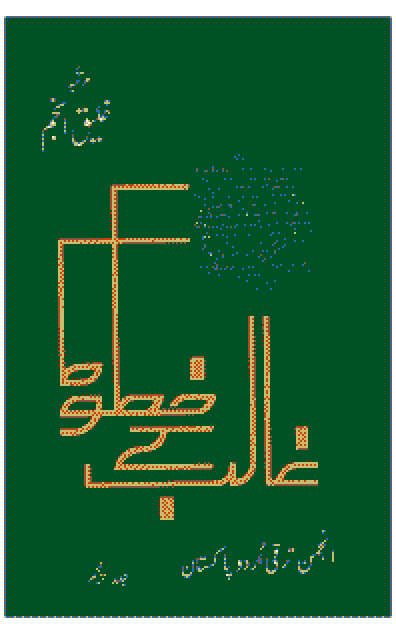
طبع شدہ قیمت:۴۰۰روپے



طبع شدہ قیمت:۴۰۰روپے



طبع شدہ قیمت:۶۰۰روپے



طبع شدہ قیمت:۲۰۰روپے